پیروڈی: نقد و انتخاب

(نثری پیروڈی)

جلد دوم

مرتبہ

امتیاز وحید

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پیروڈی: نقد و انتخاب

(نثری پیروڈی)

جلد دوم

پیروڈی: نقد و انتخاب

(نثری پیروڈی)

جلد دوم

مرتبہ

امتیاز وحید

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2013
تعداد	:	550
قیمت	:	133/- روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1709

PARODY: NAQD-O-INTIKHAB-VOL.II
Edited by : IMTEYAZ WAHEED

ISBN :978-81-7587-927-0

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، C-7/5، لارنس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی-110035
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشاعتی منصوبوں کا ایک اہم حصہ قارئین کے لیے عوامی ادب (Popular Literature) کی فراہمی ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ طنز و مزاح زبان کی ایک نمایاں خوبی ہے، جس سے زندہ زبانیں بہرہ مند ہوتی ہیں۔ اردو زبان اس حوالے سے متمول ہے کہ طنز و مزاح کی روایت اردو زبان کی ابتدا ہی سے پائی جاتی ہے۔ امیر خسرو سے منسوب چٹکلوں سے لے کر جعفر زٹلی، امیر خاں انجام، سودا اور انشا کی شاعری کے ساتھ نثر میں غالب، سرشار، ملا رموزی سے تا حال اُنھوں کہ ادب کی توانا روایت موجود ہے۔ پیروڈی طنز و مزاح کی ایک صورت ہے، جس کا فن عہد ارسطو سے لے کر آج تک مختلف اصناف ادب اور فنون لطیفہ میں رائج رہا ہے۔ یہ ایک ایسا تخلیقی عمل ہے جو نقل ہوتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت کی وجہ سے امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ فن تخلیق کار اور قاری دونوں سے ذہانت اور جودت طبع کا متقاضی ہے۔ اردو شعر و نثر میں اس کا خوب چلن رہا ہے تاہم فی زمانہ اردو ادب کے اس خوبصورت فن سے بے اعتنائی نظر آتی ہے۔

پیروڈی پر بہت کم مضامین لکھے گئے ہیں۔ اب جب کہ اس طرف امتیاز وحید نے سنجیدہ پیش رفت کی ہے اور پیروڈی کے فن پر ایک مبسوط کتاب تحریر کی ہے، اس فن کے خد و خال نمایاں

ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ امتیاز وحید ایک تازہ فکر نوجوان ناقد ہیں۔ انھوں نے جس سنجیدگی سے اس موضوع کے ابعاد کو اپنی دلچسپی کا محور بنایا ہے، اس سے اردو میں اس کے کئی پہلوؤں کے روشن ہونے کے امکانات ہیں۔ یہ کتاب پیروڈی شناسی کے باب میں بلاشبہ ایک اضافہ ہے۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ بھی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں شائع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی، بولی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں معیاری کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ انگریزی اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ کونسل کی دیگر مطبوعات کی طرح 'پیروڈی: نقد و انتخاب' کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
(ڈائرکٹر)

ترتیب

	سپاس نامہ	مرتب	vii
	قصہ پیروڈی کے انتخاب کا	مرتب	xi
	مقدمہ	مرتب	xv
1	• اخبارات سیاہہ در بارہ معلی	جعفر زٹلی	01
	• نکاح نامہ	〃	03
2	نسخۂ حکیم	شاہ حاتم	05
3	لندھن کا مثالی دربار	ملا رموزی	08
4	اردو کی آخری کتاب	پطرس بخاری	12
	• لاہور کا جغرافیہ	〃	23
5	بار خاطر	شوکت تھانوی	30
6	جدید جغرافیہ پنجاب	سندباد جہازی	36
7	استاد بوٹے خاں گلزار کا حال	خضر تمیمی	49
8	• غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں	کنھیا لال کپور	56
	• میر کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ	〃	70

•	سلیم اور انار کلی	〃	76
•	کہار گھاٹ	〃	120
9	غالب کے خطوط	فرقت کاکوروی	122
10	آسمانی کتاب	فکر تونسوی	139
11	انگریز ہندوستان میں	یوسف ناظم	154
12	تزکِ نادری	ڈاکٹر شفیق الرحمٰن	178
•	سفرنامہ جہاز باد سندھی کا	〃	213
13	اردو کی آخری کتاب	ابن انشا	247
14	غالب کے نئے خطوط	انور سدید	257
15	آبِ وفات	ظفرل فرغان	264
16	آموختہ خوانی میری	احمد جمال پاشا	271
•	کیوڑا ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	〃	278
•	بیگن و بنگال کا جادو	〃	293
17	اطلاع مزید متعلقہ درخواست مراعات	حسن مثنیٰ انور	308
18	رسالہ در معرفت ابن انشا	مشفق خواجہ	311
19	قصہ پہلے گریجویٹ درویش کا	مجتبیٰ حسین	326
20	غالب کا غیر مطبوعہ خط	مخلص بھوپالی	338
21	مولانا آزاد کے نام	فاروق نشتر	341
22	تفہیم غالب (جدید)	عبدالرحمٰن وکیل	344
23	مقدمہ فلمی شعر و شاعری	فیاض احمد فیضی	347
24	تبصرہ نگاری	محمد خالد اختر	357
25	فلیپ نگاری	ظفر کمالی	364
	ماخذ		367

سپاس نامہ

نثری پیروڈی کے اس انتخاب میں شامل بیش تر اصحابِ قلم اب اس عالمِ آب و گل سے کوچ کر چکے ہیں، اللہ انھیں غریقِ رحمت کرے۔ پیروڈی پر ایم۔فل کا مقالہ لکھنے کے سبب میرے پاس نثری پیروڈیوں کا ایک قابلِ لحاظ سرمایہ اکٹھا ہو گیا تھا تاہم بعض پیروڈیوں تک رسائی میں ہمیشہ کی طرح ہمارے مخلص احباب اور کرم فرماؤں نے اپنا تعاون پیش کیا، جن کا شکریہ مجھ پر فرض ہے۔ طغرل فرغان (ابن صفی) کی اہم نثری پیروڈیوں میں سے شامل انتخاب پیروڈی 'آبِ وفات' کی فراہمی اردو بک ریویو کے مدیر مخدوی عارف اقبال صاحب کے تعاون سے ممکن ہو سکی۔ اس انتخاب کا بیش تر مواد جامعہ ملیہ اسلامیہ کی لائبریری سے حاصل ہوا، جس کی حصولیابی میں عزیزی ڈاکٹر خالد مبشر اور حافظ عبدالکریم رضوان احمد کا بڑا ہاتھ ہے۔ شگوفہ پیروڈی نمبر کی زیراکس کاپی بطورِ خاص ڈاکٹر خالد مبشر کی محبت اور تگ و دو کا نتیجہ ہے جس سے اس انتخاب کی دو پیروڈیاں 'انگریز ہندوستان میں' اور 'تزکِ نادری' حاصل ہوئیں۔

پیروڈی پر میرے اس ذوق کو اس وقت جلا ملی جب ڈاکٹر ظفر کمالی کی صورت میں اللہ نے میری رہنمائی کا سامان فراہم کیا۔ مارچ 2010 میں ڈاکٹر موصوف عالمی ظرافت کانفرنس دہلی میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے تو انھوں نے میری درخواست پر دارالاقامہ 'مہاندی' جے۔ این۔ یو

میں قدم رنجہ فرما کر مجھے اپنی محبتوں سے سرفراز کیا، تب سے ان کا فیض جاری ہے۔ انتخاب ہٰذا کے جملہ مشمولات میں ان کے مفید مشورے شامل ہیں۔ جعفر زٹلی، شاہ حاتم اور انور سدید کی پیروڈیوں کے علاوہ کیور کی پیروڈی 'گیار کماتر' اور احمد جمال پاشا کی پیروڈی 'چمن و بنگال کا جادو' کی شمولیت انھی کی ایما پر ممکن ہو پائی، موخرالذکر دونوں پیروڈیاں وہ سیوان سے میرے لیے تحفتاً لائے تھے۔ بعد کے دنوں میں انھوں نے تبصرہ نگاری پر محمد خالد اختر اور فیاض احمد فیضی کی پیروڈی 'مقدمہ فلمی شعر و شاعری' بذریعہ ڈاک ارسال کی۔ مشفق خواجہ کی پیروڈی 'رسالہ در معرفتِ ابن انشا' بھی اسی ڈاک سے موصول ہوئی۔ اپنی یافت کو کسی اور کے کھاتے میں ڈال کر خوش ہونے کا ہنر کوئی ان سے سیکھے۔ علمی رشد و ہدایت کی یہ مثال آج کے دور میں عنقا ہے۔ وہ لفظ اور اسلوب ڈھونڈھنے سے نہیں ملتا جو ان کے دستِ شفقت اور طلق الیدین فطرت کا نعم البدل ہو۔ اس کی جزا تو بس میرے خالق کے پاس ہے۔ اللھم اعطہ خیراً من اعطبنی اکراما۔

اس مرحلے سے گزرتے ہوئے کئی بار اس نیاز مند کو ڈاکٹر مظہر احمد سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا اور نثری پیروڈی میں 'لفظی پیروڈی' کے تعلق سے ان کے تذبذب نے مجھے اس محاذ پر از سرِ نو غ تلاش و تحقیق کی تحریک دی، جس سے 'لفظی پیروڈی' کے امکان اور اہلِ ادب کے یہاں اس کی روایت پر چند لائقِ اعتنا حوالے مقدمے میں میری بحث کا حصہ بن سکے۔ لہٰذا اس حوالے سے ان کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر فرض ہے۔

انور سدید کی پیروڈی 'غالب کے نئے خطوط' کی زیراکس خدا بخش خاں اورینٹل لائبریری پٹنہ کے ضابطے کے مطابق ممکن نہیں تھی تاہم یہ جوکھم بھرا کام میرے عزیز ڈاکٹر اسلم کی محبت نے سرانجام دیا۔ ڈاکٹر اسلم نے مکمل کتاب کی زیراکس فراہم کی اور خوش ہوتے رہے کہ آپ کے کسی کام آسکا۔ کتاب کے تکمیلی مرحلے میں بھائی ڈاکٹر اظہار ندیم کے توسط سے 'جدیدیت' پر جناب اے۔ رحمان (چیرمین عالمی اردو ٹرسٹ) کی پیروڈی 'تفہیمِ غالب' اس انتخاب کا حصہ ہو سکی۔ اس انتخابی مہم میں مدیر شگوفہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، ڈاکٹر صادق، قمر سیوانی اور پیروڈی کے بزرگ ناقد مخدومی لفضل جاوید صاحبان کے مشوروں نے بھی ہمارا حوصلہ بڑھایا اور استقامت کی سبیل پیدا کی۔ عزیزی عبدالرافع اور بھائی تہذیب صدیقی نے تصحیح میں میرا ہاتھ بٹایا اور اب اس مرحلۂ شوق

کی آخری ساعتوں میں صدیق مکرم ڈاکٹر التفات امجدی کی محبت مجھے تازہ دم کررہی ہے۔وہ استاد گرامی ڈاکٹر ظفر کمالی سے کسب فیض کی راہ کی جملہ ترسیلی دشواریوں کو نہایت خاموشی سے برداشت کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں،اس کے لیے میں ان کا اور اس مہم کے جملہ معاونین احباب کا ممنون ہوں۔ان کے تعاون کے بغیر اس کام سے عہدہ برآ ہونا مشکل تھا۔

قصہ پیروڈی کے انتخاب کا

'بسم اللہ' دیباچۂ فسانہ نغمہ زنی عندلیب خانہ، رنگین ترانہ، راست براست بلا کم و کاست، یعنی قصہ نثری پیروڈی کے انتخاب کا۔

اے صاحبو! خدا آپ کا بھلا کرے۔ مدّت مدید و عرصہ بعید کا ذکر ہے کہ مادرِ علمی جے این یو کے قیام کے زمانہ میں حسب معمول ایک بقرعید (21 / دسمبر 2007) ہم اپنے پیر و مرشد خواجہ محمد اکرام الدین مدظلہ العالی کی سرکاری قیام گاہ پر مدعو ہوئے۔ ہمارے شفیق اتالیق لذیذ کباب، گوشت کی بھنی بوٹیوں پر ہمیں متوجہ کرتے ہوئے از راہِ محبت خود ہماری تعلیمی صورت حال کا ذکر چھیڑا، اور ہماری ادبی دلچسپیوں میں اپنی دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کئی سوالات داغے۔ صاحبو! ہوش جاتا رہا اور کباب کی لذت کافور ہونے لگی تبھی خداوند کریم نے غیبی امداد سے حواسِ نابکار پر قابو پانے کا نسخہ مرحمت فرمایا یعنی ذہن میں پیروڈی کا نثری سرمایہ کوندا اور اس طرح صاحبان ہم نے ہمیشہ کی طرح اپنے مرشد کو رام کیا اور اپنی انٹلکچوئل شبیہ (Intellectual Image) پر حرف نہ آنے دیا۔ استاد کو قائل کرنا تو خیر وقتی ضرورت تھی مگر کیا معلوم تھا کہ ہم خود شکار ہو رہے ہیں۔ استاد نے مطالبہ کر ڈالا کہ اس پر کام کیا جائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم کمر بستہ ہوئے اور فی امان اللہ کہہ کر اس انجان وادی کا رخ کیا جس کے سوتے سیدنا

میر جعفر زٹلی اور شاہ حاتم سے گزر کر پطرس بخاری سے ہوتے ہوئے موجودہ عہد کی طنزیہ اور مزاحیہ ادبی نگارشات کو سیراب کرتے ہیں۔

ابتداً حوصلے کا یارا تھا چنانچہ ذرا قریب گیا تو مُرغانِ نوا سنج کی زمزمہ پردازی دل کو لبھانے لگی، ہر جانب سے طوطی کی صدا آنے لگی، رباب کی آوازِ خُوش کانوں میں گونجنے لگی، انواع واقسام کی خوشبوؤں سے دماغ معطر تھا اس طرح دن رات ایک کیا اور پیروڈی کا خطیر سرمایہ اکٹھا کیا، طباعت کے مرحلہ سے گزر کر جب پروف ریڈنگ کا عمل جاری تھا تبھی صاحبو! قضا وقدر کا بے رحم فیصلہ سامنے آیا۔ آٹھ مہینے قبل جو 'ایمن' ہماری زندگی میں بہار بن کر آیا تھا اچانک اسے کسی کی نظر لگ گئی، لاکھ جتن کیے مگر وہ ہم سے روٹھ گیا، ہم سے ہمارا حوصلہ چھوٹ گیا۔ دل نے کہا "اے مَردِ ناداں! مزید کوشش عبث ہے، دنیاداری چھوڑ، رب سے ناطہ جوڑ کیونکہ دنیا سرائے فانی ہے، موت تمھیں بھی آنی ہے، رب سے ڈر، آخرت کی تیاری کر"۔

اے عزیز از جان قاری! اس کے بعد مت پوچھ کہ پیروڈی کی اس انتخابی مہم کو ہم نے کہاں چھوڑا، ہم اس سے ایسے روٹھے جیسے خزاں کا پھول ڈالی سے اور 'ایمن' ہم سے، مکمل دو سال ہمیں اس کا مطلق خیال تک نہ گزرا کہ معاً ایک شب جب ہم انٹرنیٹ پر لفظ 'Parody' کی تلاش کر رہے تھے، امدادِ غیبی کے ہاتھوں 'ظفر کمالی' کے آستانے (Blog) پر پہنچے، اردو طنز وظرافت کے اس علمبردار کا بلاگ ہندی بھاشا میں دیکھ کر ہم تذبذب میں پڑ گئے اور اس تصویر پر نگاہ ڈالی جو جبہ ودستار کے باوصف خالص مولویانہ نوعیت کی، زیبِ بلاگ تھی۔ شرعی داڑھی، کشادہ پیشانی اور اندرونِ چشمہ چمکتی آنکھوں سے ذہانت عیاں تھی اور کتابی چہرے سے حلم وبردباری اور بصیرت جھانک رہی تھی۔ بلاگ پر دیوناگری رسم الخط میں ایک پیروڈی 'بندے ماترم' بھی اس مردِ باریش کے تعارف کا حصہ تھی جو مضحک پیرائے میں زعفرانی ذہنیت، اور ہندستانی حکومت پر اس کے مضر اثرات کا محاسبہ تھی۔ اسے پڑھ کر ہم نے محسوس کیا کہ جیسے ہمیں اسم اعظم ہاتھ آ گیا ہو، دل نے کہا اے ناداں! ہوش کے ناخن لے، حاتم طائی کی طرح اپنے قصے کو زیادہ طول نہ دے کیوں کہ تیرے عہد کا سامع بڑا عجلت پسند واقع ہوا ہے۔ اس کے پاس تعیشات زیست کی کمی نہیں بلکہ 'وقت کی کمی' ہے۔ اور تو اس بزرگ صاحبِ کمال کو ڈھونڈنے میں حاتم طائی کی طرح ہفت اقلیم سر کرنے کا قصد

مت کر، یہ ریلائنس موبائیل لے، اسے کان اور منہ کے پاس لا اور اس بزرگ صاحب کمال کو ہیلو (Hello) کہہ جو کہ ظفر کمالی ہے۔ صاحبو! اس طرح یہ 'انتخاب' جس پر لخت جگر 'ایمن' کے جانے سے خاک پڑ چکی تھی، اس بزرگ کی حوصلہ افزائی سے تازہ دم ہونے لگی، دل کا بوجھ جس کو کہ مولانا ابوالکلام آزاد 'غبار خاطر' کہتے تھے، ہلکا ہوا، ہمیں نئی زندگی کی آہٹ سنائی دینے لگی، ہم دل اور اپنے مرشد 'ظفر کمالی' کے ہاتھوں مجبور ہوئے اور اس نثری انتخاب کا پلندہ بغل میں دبائے پھر سے لائبریری اور کمپوزر کا طواف کرنے لگے۔

اے حوصلہ مند قاری! کہیں اس طویل داستان سے تیرے حوصلے تو ٹھنڈے نہیں پڑ رہے ہیں اور تو کہیں بور تو نہیں ہو رہا ہے؟ تو لے اب ہم تیرے زیر مونچھ مسکرانے کا سامان فراہم کرتے ہیں اور اس شعر سے داستان گوئی کی روایت کا احیاء کرتے ہیں۔

ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکر ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

اے باذوق قاری! اس شعر میں ترنم کا یہ عالم ہے کہ ہر شعر کی ذرت لے پر تین تالہ بج سکتا ہے اور دلپت لے پر بھی۔ اس میں تیری طبیعت ہری کرنے کی ساری خوبیاں موجود ہیں، دیکھ 'بزم' بھی ہے، پیکر ناز، آہ و فغاں اور انبساطی کیفیت کا اظہار یہ 'ہنس ہنس' کا ذکر خیر بھی ہے، لہٰذا بھنگ کے شربت کی تمھیں چنداں ضرورت نہیں۔ ایمانداری کی بات ہے کہ یہ شعر میرا نہیں بلکہ مخدوم محی الدین کا ہے، پابند شاعری کے لیے میری طبیعت ہمیشہ سے غیر حاضر رہی ہے گرچہ میں آزاد نظم بڑی آزادی سے کہہ لیا کرتا ہوں، یہ جو تو میرے نام کے ساتھ 'وحید' کا اضافہ دیکھ رہا ہے وہ اپنے مرشد کی کامل پیروی کا نتیجہ ہے، اسے شاعر کا تخلص سمجھنے کی غلطی مت کر، ہمارے مرشد کا کمال ہے کہ وہ 'ظفر' یاب ہی نہیں بلکہ 'کمالی' بھی ہیں۔ تمھیں یہ بتا کر مزید حیرت زدہ کر سکتا ہوں کہ شاعری میں ہمارے پیر پہلوان السارن ہیں کیوں کہ انھوں نے خود جس مرشد کی اطاعت قبول کی ان کا شاعری سے دور کا بھی علاقہ نہیں تھا وہ بڑے نثار تھے اور دنیائے ادب (طنزیہ اور مزاحیہ) میں اپنے جمال اور ادب پر اپنی شاہانہ مقدرت کی بنا پر 'احمد جمال پاشا' کہلاتے تھے۔

اے چالاک قاری! کیا تو یہ سمجھ رہا ہے کہ اب تو عالم تحیرات سے نکل آیا تو یہ تیری بھول ہے، یہ بتا کر میں تمھیں پھر تحیرات کی دنیا میں واپس ڈھکیلتا ہوں کہ میرے پیر شاعر نے اپنی رشد و ہدایت میں مجھ جیسے نو مشق طالب علم کو بھی شامل کر لیا ہے جو شعری ذوق سے تہی دامن ہے اور اسی لیے بڑی آزادی سے آزاد نظم کی دہائی دیتا ہے۔ گویا اس طرح میرے مرشد وہ درمیانی کڑی ہیں جس کے سلف اور خلف دونوں نثر والے ہیں، نثر کی دو طرفہ آندھی سے اپنے چراغ سخن کو بچائے رکھنا بلکہ بتدریج اس کی لو کو تیز تر کرنا کمالات نہیں تو کیا ہے۔ 'ظفر کمالی' کی وجہ تسمیہ یہی ہے۔

اے معزز قاری! ہم نے تو تمھیں کافی انٹرٹین کیا اس لیے تمھیں یہ بتا کر آزردہ خاطر نہیں کرنا چاہتے کہ مخدوم محی الدین کا وہ شعر جو ابھی تمھیں سنایا ہے، دراصل اس داغہائے دل کا ترجمان ہے جو اس انتخابی مہم میں ہم نے برداشت کی ہیں۔ چونکہ تو حساس قاری ہے اس لیے یقین ہو چلا ہے کہ ہماری کیفیت سے تو واقف ہو چکا ہے، مزید واقفیت تیری آنکھ بھگو سکتی ہے، لہٰذا اس گوہر گراں مایہ کو سنبھال کر رکھ اور مجھ بد طالع کے انجام سے خدا کی پناہ مانگ۔

اے صاحبو! صبر کا دامن تھامے رکھیو کیوں کہ یہ قصہ بس ختم ہوا چاہتا ہے۔ مخدومی ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین مدظلہ العالی اور مرشد استاد ظفر کمالی دامت برکاتہم کے علاوہ اس انتخابی راہ سلوک میں جہاں پیر وڈی کے جو پیش رو بزرگ ملے اور قدم قدم پر جن کی ضیاء کو ہم اس منزل کی تاریکی مٹانے میں بروئے کار لائے ان میں کرم فرما ڈاکٹر مظہر احمد، فاضل بزرگ فضل جاوید، سیدنا استادی ڈاکٹر صادق اور مشفق و مہربان اے۔ رحمان (چیرمین عالمی اردو ٹرسٹ) اور پروفیسر شفیع شیخ صاحبان خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس قصہ میں چونکہ دل و دماغ سے نہ جدا ہونے والے شیر خوار 'ایمن' کی یادوں کی خوشبو ہے اس لیے صاحبان یہ حقیر انتخابی تحفہ اسی کی یاد سے وابستہ کرتے ہیں کہ اس کے علاوہ من کی شانتی کی کوئی سبیل نہیں۔ اس حقیر سراپا تقصیر درویش کا یہ قصہ یہیں تمام ہوتا ہے۔ اس کے لکھنے اور پڑھنے والے دونوں کا بھلا ہو۔

مقدمہ

طنز اپنی کیفیت میں طبیب کا عملِ جراحی ہے تو مزاح نشتر سے پیدا شدہ زخم کو مندمل کرنے کا نام۔ فکاہیہ ادب میں یہ دونوں کیفیات تشخیصِ مرض سے لے کر صحت یابی اور افاقہ کی علامتیں ہیں۔ 'حفظانِ صحت' کی طرح 'حفظانِ انبساط' کی روایت وجودِ انسانی سے علاقہ رکھتی ہے۔ تمدن کے ارتقائی عمل میں طنز اور مزاح کا کلیدی کردار انتشارِ حیات سے گلو خلاصی کی صورت میں ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔

اردو ادب میں اوّلاً یہ روایتیں درباری سطح پر معرض وجود میں آئیں مگر اس کی صحت مند قدریں بڑی حد تک ہجو نگاری کی بدولت تقریباً دب کر رہ گئیں، شعرا کی آپسی چشمکوں نے بھی اس کا قافیہ تنگ کرنا چاہا تاہم بہت جلد یہ عوامی دھارے میں تبدیل ہو گئیں اور وہ سوتے جو ہجو، معاصرانہ چشمک اور ہزلیات کی راہ سے پھوٹے تھے، غالب، اودھ پنچ اور اکبرالہ آبادی تک متموج آبشار کی صورت میں تبدیل ہو گئے۔ مرورِ ایام کے ساتھ زندگی کی کثافتوں سے نبرد آزما اس صنف کی کئی شکلیں بنیں، اور اس کے کئی روپ معرض وجود میں آئے۔ 'پیروڈی' انھی انحوکہ تسلسل کی ایک کڑی ہے۔

'پیروڈی' ایک بدیسی اصطلاح ہے۔ اس کا ماخذ یونانی زبان کا لفظ ''پیروڈیا'' ہے جو ''جوابی نغمہ'' (Counter Song) کے لیے بولا جاتا تھا۔ یعنی وہ نظم جو کسی نغمہ کے جواب میں مخالف

گروپ کی طرف سے گائی جاتی ہے اور جس میں اس نظم کے اسلوب کی نقالی کی جاتی ہے۔قدیم یونان کے ایک گمنام شاعر غالباً Hipponax of Ephesus نے سب سے پہلے 'ہومر' کے رزمیہ اسلوب کی پیروڈی یا نقل 'مینڈک اور چوہے کی جنگ' (Batrachomyomachia) ایک نظم میں کی تھی۔رومن ادب میں پیروڈی مزاحیہ مقصد کے تحت کسی شاعر کی دوسرے شاعر کے ذریعہ کی گئی نقل کو کہتے ہیں، جب کہ فرنچ کے نوکلاسیکی ادب میں پیروڈی نظم کی ایک ایسی قسم ہے، جس میں مزاحیہ مقصد کے پیش نظر کسی فن پارے یا تخلیق کے طرز اور اسلوب کی نقل کی جاتی ہے۔

انگریزی کی تمام معتبر لغات میں لفظ ''پیروڈی'' میں ایک چیز جو قدر مشترک ہے وہ ہے پیروڈی کو نقل (Imitation) کے مفہوم میں استعمال کرنا۔یہ الگ مسئلہ ہے کہ نقل کسی ادبی فن پارے، موسیقی کے کسی راگ یا طرز کی کی گئی ہے یا کسی مخصوص اسلوب تحریر یا کلام یا پھر سرکس کے بازی گر کے کرتب کی کی گئی ہے۔نقل کی نوعیت کیا ہے؟ کسی فن پارے کا اسلوب ہی نقل کے زمرے میں شامل ہے یا صرف فن پارے کی زمین اور اس کی روح اور فکر بھی پیروڈی کا روپ اختیار کرتے ہیں۔

قدیم یونان میں پیروڈیا سے مراد وہ نغمہ یا گیت ہے، جو کسی گائے ہوئے گیت کی سنجیدگی اور نغمے کی مقدس فضا اور اس کے سحر آفریں تاثر کے جادو کو توڑنے کے لیے گایا جائے۔ظاہر ہے کہ سحر آفریں تاثر کو توڑنے کے لیے سنجیدگی میں مزاحیہ رنگ کی آمیزش ہی سب سے کارآمد ہو سکتی ہے۔لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ قدیم یونان میں سنجیدہ نغموں کو مضحک پیرائے میں بدل دینے کے فن کو پیروڈیا کہا جاتا تھا۔ایسے نغمے اکثر وہ رزمیہ گیت ہوتے تھے جو جنگوں کے دوران فوج میں جوش و جذبہ پیدا کرنے کے لیے گائے جاتے تھے۔جنگ کے بعد اکثر ان نغموں کے الفاظ میں ردوبدل کے ساتھ مزاحیہ رنگ دے دیا جاتا تھا اور اپنی غیر معمولی سنجیدہ اور ساکت زندگی میں کیف و سرور کے چند لمحے حاصل کر لیے جاتے تھے۔رفتہ رفتہ پیروڈی کی روایت عام ہوتی گئی اور اس نے ادبی حیثیت اختیار کر لی۔

اردو میں پیروڈی کے لیے تحریف نگاری، تقلید معکوس، مضحک نقالی اور ہجویہ تقلید جیسی اصطلاحیں رائج ہیں تاہم بابائے اردو مولوی عبدالحق نے جمہور علما ادب سے اختلاف کرتے ہوئے 'تضحیک' کو پیروڈی کا اردو متبادل بتایا ہے جو کہ درست نہیں ہے کیونکہ 'تضحیک' پیروڈی سے پیدا ہونے والی کیفیت ہے نہ کہ بذات خود پیروڈی۔فی زمانہ اردو مصطلحات کے برعکس علمائے ادب

نے لفظ 'پیروڈی' ہی کو اردو ادب میں اختیار کرنے کی وکالت کی ہے کیونکہ متبادل اردو مصطلحات سے پیروڈی کے جامع تصور کی کلیتہً نمائندگی نہیں ہو پاتی۔ ناول، فکشن، ڈراما، ہائیکو، ترائیلے جیسی خالص انگریزی اصطلاحوں کی طرح 'پیروڈی' کو بھی اردو ادب میں اپنا لیا ہے۔ معروف پیروڈی نگار غلام احمد فرقت کاکوروی اور ڈاکٹر مظہر احمد نے اس خیال کی پُر زور حمایت کی ہے۔ ڈاکٹر مظہر احمد کے بقول:

> ''لفظ پیروڈی ہی وہ لفظ ہے جو نہ صرف اس صنف کے لیے مشہور ہو چکا ہے بلکہ قابل قبول بھی ہے۔ یوں بھی مضحک نقالی، تقلید، ہجو یا تحریف نگاری پیروڈی کے مفہوم کو پوری طرح ادا نہیں کرتے''۔ (پیروڈی (انتخاب) مظہر احمد، ص۔10)

انگریزی ادب میں پیروڈی کی روایت بڑی قدیم ہے اور چوں کہ اردو میں یہ صنف یونانی الاصل ہونے کے باوجود انگریزی کے زیر اثر آئی ہے، اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی ادب میں پیروڈی کا مفہوم و معنی اور اس کے تدریجی ارتقا کا مختصر پس منظر بھی سمجھا جائے۔

''انگریزی ادب میں ''پیروڈی'' کا پہلا استعمال بن جانسن نے اپنی تخلیق "Every Man in his Humour" میں کیا۔ اس مخصوص اصطلاح کے استعمال کی اس نے کوئی وجہ نہیں بتائی بلکہ اس کے خیال میں یہ لفظ قارئین کے کچھ حلقے میں پہلے ہی سے جانا سمجھا جاتا تھا۔ اٹھارہ سال بعد جان ڈرائڈن (John Dryden) دوسرا ادیب ہے جس نے ادب میں ''پیروڈی'' کا استعمال کیا۔ اپنے ''Preface to the Satires'' میں وہ وضاحت کرتا ہے کہ ''پیروڈی کسی شاعر کے اسلوب کی کمیوں اور خامیوں کی شدت کو خفیف یا ہلکا کرنے کے مقصد سے کی جانے والی نقل ہے۔''

> "Parody is an imitation of one poet's style for the purpose of making light of a fault in it."

''ڈرائڈن نے چونکہ لفظ طنز (Satire) کا استعمال کیا لہٰذا اس کی تعریف کی روشنی میں پیروڈی اپنے سابقہ استعمال سے قدرے مختلف ہو گئی اور اس طرح اس نے ایک خالص بدیسی (یونانی) اصطلاح پیروڈی کا استعمال بناوٹی رزمیہ (Mock-heroic) کے لیے کیا جس کے لیے جدید ادبی صنف میں کوئی اصطلاح رائج نہیں تھی۔

یہ سمجھنا اہم ہے کہ اٹھارھویں صدی سے قبل پیروڈی کو عموماً Musical Quotation کے متوازی ایک تاثر یا آرائش سمجھا جاتا تھا۔ "Mac Flecknoe" میں ڈرائڈن نے پیروڈی کی شکل میں ایک پوری نظم مذاق اڑانے کے مقصد سے کہی۔ اپنی اس نظم میں اس نے Virgil's Aenied کی نقل کی ہے لیکن یہ نظم Thomas Shadwell کے متعلق تھی جو ایک معمولی درجے کا ڈراما نگار تھا۔ دونوں میں واضح فرق یہ ہے کہ Virgil کے دلیرانہ کردار اور Shadwell کا کمزور اور معمولی کردار اسے اور معمولی بنا دیتا ہے۔ Aeneas کے لباس میں Shadwell کی شخصیت مزید مضحکہ خیز نظر آتی ہے۔ دور بحالی (Restoration) اور اٹھارھویں صدی کے اوائل کی دیگر پیروڈیاں ڈرائڈن کی پیروڈیوں ہی کی طرح ہیں۔ یہ کسی سنجیدہ چیز کی نقل کرتے ہوئے احمق انسان، یا معمولی درجہ کی خصلتوں کا مذاق اڑاتی ہے۔ اسے ہجاوئی رزمیہ (Mock-heroic) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایک ایسی صنف ہے جس کا سہرا عموماً Samuel Butler اور اس کی نظم Hudibras کو دیا جاتا ہے۔ Alexander Pope کے Peri Bathos کے زیر اثر بعد میں حد درجہ سنجیدہ یا اعلیٰ ہونے اور اوچھے یا ادنیٰ کے فرق کو Bathos کے طور پر جانا جانے لگا"۔

انیسویں صدی میں شعری پیروڈی کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس نے لکھا ہے:

"......انیسویں صدی میں اس صنف کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ خاص طور سے نظم کی پیروڈی کو اس عہد کا شاید ہی کوئی صاحب طرز شاعر ہو جس کے اسلوب کا خاکہ نہ اڑایا گیا ہو یا جس نے اپنے ہم عصر شعرا کے بارے میں پیروڈی کے انداز کی نظمیں نہ لکھی ہوں۔ شیلی نے ورڈز ورتھ کی مشہور نظم Peter Bell, A Tale کی پیروڈی لکھ کر فطرت کے اس پجاری کے فن اور ذکشن کو ہلا کر رکھ دیا۔ سوینبرن نے ٹینی سن کی شاہکار نظم In Memoriam کی جو پیروڈی لکھی تھی، اسے اپنے زمانے میں ٹینی سن کی نظم سے کم شہرت حاصل نہ تھی"۔ (پیروڈی کا فن، تلاش و توازن، ڈاکٹر قمر رئیس، ص۔157)

"بیانیہ نثر کے لیے لفظ پیروڈی کا استعمال اولاً جوناتھن سوئفٹ (Jonathan Swift) نے کیا اور اس کی وجہ غالباً پیروڈی کی تعریف کے تعلق سے سوئفٹ کی یہ غلط فہمی ہے کہ پیروڈی کی اصطلاح صرف کسی اسلوبیاتی نقل کے لیے بولی جاتی ہے جس کا مقصد کسی چیز کی اہمیت کو گھٹا کر بیان کرنا ہو۔

"A Tale of a Tub" کے پیش لفظ "The Apology for the &c." میں سوئفٹ کہتا ہے کہ پیروڈی کسی مصنف کی قلعی کھولنے کی غرض سے کی جانے والی نقل ہے۔ مختصراً پیروڈی، مزاحیہ نقل (Mockery) اور سنجیدہ تمسخر (Burlesque) سے ذرا مختلف ہے۔ اور زبان کے تئیں سوئفٹ کی توجہ کے مدنظر ایسا لگتا ہے کہ وہ اس حقیقت سے واقف تھا، درحقیقت سوئفٹ کی پیروڈی کی تعریف شاید وہی ہے جو ڈرائڈن کے واضح پہلوؤں کی توضیح کے اختیار شدہ فطرت یا مستعار الفاظ کی ہے۔

سوئفٹ کے بعد پیروڈی کی اصطلاح کا استعمال مزاحیہ نقل (Mockery) کے لیے بطور خاص بیانیہ نثر کے لیے بہ کثرت ہوا۔ بیسویں صدی کے آخری عرصے میں ادب کے ماہرین نے پیروڈی کو ہجو گویوں کے شعوری عمل کے بجائے صنفی ضرورت، حوالہ جاتی پن (Referentiality) اور بین المتونیت (Intertextuality) کی شرائط کے بہ طور متعارف کرایا ہے۔ اس طرح تمام صنفیں جدت کی فضا میں شروع ہوتی ہیں، صنفی توقعات کے ساتھ بول چال میں پروان چڑھتی ہیں اور پیروڈی میں اختتام پذیر ہوتی ہیں۔

کچھ فلمی صنف کے ماہرین پیروڈی کو کسی صنف کے ارتقا میں بہ طور خاص فلم میں فطری ارتقا کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر کلاسیکی دور کے بعد مغربی ماہرین نے پایا کہ ہر صنف کی روایت پیروڈی کے دور سے گزرتی ہے۔ جس میں ان روایات کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ چوں کہ ناظرین نے ان مغربی کلاسیکیت کو پہلے ہی دیکھ رکھا ہے۔ لہٰذا وہ کسی نئے مغربی فن پارے کی توقع رکھتے تھے اور جب یہ توقعات کے برخلاف الٹی ہو جاتی تھیں تو ناظرین قہقہہ لگاتے تھے۔

انگریزی کے نثری ادب میں بھی قابلِ ذکر پیروڈیوں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ بیانیہ نثر کے حوالہ سے ڈاکٹر قمر رئیس رقم طراز ہیں:

> ''...اسی صدی میں جیمس جوائس نے اگر عامیانہ انداز کے صحافتی قصوں کو (جو اس زمانہ میں بے حد مقبول تھے) پیروڈی کا موضوع بنایا تو اسٹیفن لیکاک نے جاسوسی قصوں کی ہیجان خیزی، تجسس آفرینی اور خوف و ہراس کی مجرمانہ فضا کو اپنی پیروڈی کا ہدف بنایا جس میں جوائس نے انگریزی نثر کے نمائندہ اسالیب کو بھی بڑی کامیابی سے پیروڈی کے رنگ میں پیش کیا ہے اور قریب سے دیکھا جائے تو ایک بڑے کینوس پر اس کا عظیم

ناول یولیسس بھی پیروڈی ہے جس میں ایک طرف اس نے حقیقت نگاری کی روایت
اور دوسری طرف رزمیہ قصوں کے کرداروں کی عظمت و شوکت کا مضحکہ اڑایا ہے"۔

('پیروڈی کا فن' تلاش و توازن، ڈاکٹر قمر رئیس، ص۔158)

اس اجمالی جائزے سے اردو ادب میں پیروڈی کے مفہوم، تصور اور بنیادی خدوخال کا خاکہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے اور یہ نکتہ صاف ہو جاتا ہے کہ کسی سنجیدہ نظم یا نثر کی مضحک نقالی پیروڈی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی تصنیف کی صرف کورانہ تقلید ہی پیروڈی کا مدعا ہے بلکہ پیروڈی الفاظ و معانی کی ایسی فنکارانہ الٹ پھیر کا نام ہے، جو ادب پارے کو ظریفانہ پیرایہ عطا کرے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق:

"پیروڈی یا تحریف کسی تصنیف یا کلام کی ایسی لفظی نقالی کا نام ہے جس سے اس تصنیف یا کلام کی تضحیک ہو سکے۔ اپنے عروج پر اس کا منتہا ادبی یا نظریاتی خامیوں کو منظرِ عام پر لانا ہوتا ہے"۔

(اردو ادب میں طنز و مزاح، وزیر آغا، ص۔56)

ڈاکٹر وزیر آغا نے مزاح اور طنز کے ضمن میں لکھا ہے کہ مزاح نگاری اپنے نمود کے لیے جن عناصر کی رہینِ منت ہے ان میں بالترتیب موازنہ (Camparision)، طریق تکرار (Repetition)، مزاحیہ صورتِ واقعہ (Humorous Situation)، مزاحیہ کردار (Humorous Character) اور پیروڈی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ جملہ عناصر مزاح نگار کا حربہ (Trick) ہیں جن کی مدد سے طنز و مزاح کے لیے بنیادیں فراہم کی جاتی ہیں اور زیرِ لب تبسم، ہنسی اور قہقہہ جس کا ظاہری اظہار ہیں اور پس پشت اصلاح، جمود و تعطل اور حد درجہ سنجیدہ فضا میں ادب کی بقا کے لیے خونِ گرم حاصل کرنا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر موصوف کی مذکورہ بحث میں یہ امر قابلِ غور ہے کہ آیا پیروڈی دیگر اسبابِ طنز و مزاح کی طرح مزاح نگار کا صرف ایک آخری حربہ ہی ہے یا اس سے اوپر اٹھ کر اس کی کوئی اپنی انفرادی حیثیت بھی ہے؟ تو پتہ چلتا ہے کہ:

"...... پیروڈی صرف مزاح نگاری کا حربہ نہیں بلکہ طنز نگار بھی اس سے بدرجۂ اتم فائدہ اٹھاتا ہے۔ تاہم یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ تحریف کی حیثیت محض ایک حربے

کی سی نہیں بلکہ یہ تو ایک علیحدہ صنف ادب کا درجہ بھی حاصل کر چکی ہے اور نتیجتاً ایک علاحدہ مطالعے کی طالب ہے"۔ (اردو ادب میں طنز و مزاح، وزیر آغا، ص۔56)

اس کے برعکس سید احتشام حسین نے پیروڈی کو ایک ادبی صنف نہ تسلیم کرتے ہوئے اسے محض وقتی اور لمحاتی تفریح تک محدود رکھنے کی وکالت کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"انسان آلام حیات اور جان لیوا سنجیدہ مصروفیات سے لڑنے کے لیے تفریح کے سیکڑوں ذرائع اور خوش باشی کے لاتعداد پہلو پیدا کر لیتا ہے، وہ چٹنے کی بات پر تو خیر ہنستا ہی ہے (بشرطیکہ بعض لوگوں کی طرح چنے سے اس کی صحت نہ خراب ہوتی ہو) سنجیدہ باتوں کو بھی توڑ مروڑ کر ان میں مضحک پہلو نکال لیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پیروڈی بھی اسی نوع کی ایک کوشش ہے۔ میں خود کو اس بات کے ماننے پر آمادہ نہ کر سکا ہوں کہ پیروڈی کو بھی ادبی محفلوں میں جگہ دی جائے...... میرا خیال ہے کہ اسے محض وقتی تفریح تک محدود رکھنا چاہیے اور ایک ادبی صنف قرار دے کر اعلیٰ ظرافت اور مفکرانہ طنز کا مد مقابل نہیں بنانا چاہیے"۔

(اسکالر پیروڈی نمبر، مدیر، احمد جمال پاشا، ص۔15)

اسی طرح Earnst Hemingway نے اس کی صنفی حیثیت کو فروتر گردانتے ہوئے پیروڈی کو قلم کار کی آخری پناہ گاہ قرار دیا ہے اس کے الفاظ میں

"The Parody is the last refuge of the frustrated writer. Parodies are what you write when you are associate editor of the Harvard Lampoon. The greater the work of literature, the easier the Parody. The step-up from writing Parodies is writing on "W". (www.great-quotes.com)

معلوم نہیں پروفیسر سید احتشام حسین نے پیروڈی کے صنفی وجود کی عدم قبولیت پر اس کی تخلیقی فنی چابکدستی، تنقیدی اور اصلاحی افادیت کے فنی اور افادی پہلو سے کیوں کر صرف نظر کیا۔ "سنجیدہ باتوں کو توڑ مروڑ کر ان میں مضحک پہلو نکال لینا" کوئی طفلانہ شغل یا محض شعبدہ بازی نہیں

بلکہ گہری بصیرت اور خلاقانہ ذہانت چاہتی ہے۔' کیور ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ' جیسی مایہ ناز پیروڈی کیا عمیق مطالعہ کے بغیر ممکن ہے؟ اقبال کے شکوہ اور جواب شکوہ کی زمین پر رقم ہونے والی دلاور فگار اور علامہ شہباز امروہوی کی پیروڈیوں کے وجود اور اس کے اعجاز کو محض لفظی الٹ پھیر کہہ کر انکار کیا جا سکتا ہے؟ شوکت تھانوی کی پیروڈی 'مومن (دنیا میں)'، 'وزیروں کی نماز' اور ظفر کمالی کی 'بند ے ماترم' جیسی پیروڈیوں کو عصری تقاضوں کے ضمن میں ہرگز بے معنی نہیں گردانا جا سکتا۔

E. Hemingway کا خیال بھی انتہا پسندی پر مبنی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا قلم کار کے لیے پیروڈی سب سے آسان مشغلہ ہے جہاں سے وہ اپنا تخلیقی سفر بہ آسانی شروع کر سکتا ہے۔ مگر امر واقعہ ایسا نہیں ہے۔ البتہ بغض وعناد اور بد نیتی اس فن کی روح کے منافی ہے لہٰذا ذہنی تعصب اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ کسی تخلیق کی پیروڈی خود اس کے فنی دائرے سے خارج ہے یہی وجہ ہے کہ E. Hemingway کے خیال کو سنجیدگی سے نہیں لیا جا سکتا۔

وزیر آغا کی مذکورہ تعریف کی روشنی میں کسی تصنیف کی نقل جس کا نمونہ اصل تخلیق سے ملتا جلتا ہو اور صرف الفاظ کے معمولی رد وبدل سے مزاح کا پہلو نکل آئے پیروڈی ہے۔ اس نوعیت کی پیروڈی کا مقصد تفریح طبع اور وقتی طور پر ذہنی فرحت کا سامان بہم پہنچاتا ہے اور اس کا بنیادی وصف ہنسی کے جذبات کو تحریک دینا ہوتا ہے۔ مختصر طور پر یہ فن اصل مضمون کا مضحکہ خیز چربہ اتارتا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے پیروڈی میں جدت اور جودت کو ناگزیر جانا ہے۔ ان کے بقول:

> "پیروڈی میں جدت اور جودت کا ہونا ضروری ہے۔ اصل کی نقل اس طور پر کرنا یا اس میں ظرافت کا پیوند لگانا کہ تھوڑی دیر کے لیے نقاب یا پیوند کی تفریحی حیثیت اصل کی سنجیدہ حیثیت کو دبا دے، پیروڈی کا ہنر ہے"۔
>
> (کچھ پیروڈی کے بارے میں، رشید احمد صدیقی، اسکالر پیروڈی نمبر، ص۔10)

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی یہ تعریف ڈاکٹر وزیر آغا کی تعریف میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اصل کی ظریفانہ نقل کی بات یہاں بھی کہی گئی ہے مگر ساتھ ہی جدت اور جودت کو لازمی عنصر بھی گردانا ہے۔ الفاظ کے ہیر پھیر سے نیاپن تو پیدا کرتا ہے مگر پوری ذکاوت، ذہانت، شعور اور سوجھ بوجھ کے ساتھ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی پیروڈی کوئی طفلانہ شغل نہیں بلکہ علمی پختگی اور

شعوری ہوش مندی کی متقاضی ہے۔ اس پائے کا پیروڈی نگار فطرتاً نہایت اعلیٰ مذاق کا حامل ہوگا اور وہ شعوری طور پر سنجیدہ مزاح اور لغو اور لایعنی کلام میں خطِ امتیاز کھینچنے پر قادر ہوگا۔ اس پہلو پر ڈاکٹر اعجاز حسین کی یہ رائے نہایت معقول لگتی ہے:

> ''پیروڈی نگار کو موزوں طبع ہونے کے علاوہ لطافت پسند اور سنجیدہ مزاج بھی ہونا چاہیے۔ یہ نہ محسوس ہونا چاہیے کہ وہ پیروڈی محض ہنسانے کے لیے لکھ رہا ہے۔ اس کا کلام دوسروں میں گدگدی پیدا کردے گا مگر یہ نہ محسوس ہو کہ وہ گدگدانے کے لیے انگلیاں بڑھا رہا ہے''۔

(اردو شاعری کا فنی ارتقاء، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص۔526)

پیروڈی کی تخلیق کا مقصد محض ہنسی کے جذبہ کو تحریک دینا نہیں ہے بلکہ اس فن کے ذریعے فطری جذبہ تفریح کو اس طور پر تحریک دینا ہے کہ انسان کی طبیعت میں خود بخود انبساط اور طرب کی کیفیت جنم لے لے اس درجہ غایت احتیاط اور فنی رکھ رکھاؤ کے بعد جو تخلیق سامنے آئے گی وہ یقیناً اعلیٰ قدروں کی حامل ہوگی اور اپنی اہمیت کے اعتبار سے اصل تخلیق کی طرح قابل اعتنا ہوگی۔ بقول رشید احمد صدیقی:

> ''اعلیٰ پائے کی پیروڈی اتنی ہی قابل قدر ہوتی ہے جتنی کہ وہ عبارت یا شعر جس کی پیروڈی کی گئی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پیروڈی کا فن کس ذہانت اور ذکاوت کا طلب گار ہے''۔

(کچھ پیروڈی کے بارے میں، رشید احمد صدیقی، اسکالر پیروڈی نمبر، ص۔10)

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی مندرجہ بالا تحریر پیروڈی کے فن کو نہ صرف اعتبار بخشتی ہے بلکہ اس صنف کو اصل فن پارہ کے مساوی اساسی بنیاد بھی فراہم کرتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کبھی کبھی پیروڈی کی شہرت اس فن پارہ سے بھی زیادہ دیرپا ثابت ہوتی ہے جس سے پیروڈی کی گئی ہے۔ اس کی ایک زندہ مثال ''ہنری فیلڈنگ (1742) کی Joseph Andrews ہے جو سموئل رچرڈسن کی نہایت سنجیدہ اور غم ناک فضا میں لکھے ناول Pamela یا (1740) Virtue Rewarded کی پیروڈی ہے۔ لیوئس کارول کی بیش تر پیروڈیاں مثلاً: "You Are Old, Father William" اصل فن پارہ سے زیادہ بہتر طور پر جانی جاتی ہیں۔

پیروڈی کی مذکورہ تعریفوں کی روشنی میں پیروڈی کا دائرہ کار (Scope) اور اس کا حجم قدرے محدود اور مختصر نظر آتا ہے۔ لفظی الٹ پھیر، اصل کی نقل، پیروڈی نگار کے لیے مطلوب مذاق اور ذوق لطیف وغیرہ جہات ہی پیروڈی کا مدعا معلوم ہوتا ہے جب کہ مندرجہ بالا تعریف پر صرف خاص قسم کی پیروڈیوں کا ہی اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علی الرغم پیروڈی کو ایک بڑے کینوس پر ہم اس وقت دیکھتے ہیں جب اس کا رشتہ تنقید سے جڑتا ہے۔ دراصل پیروڈی تنقید جیسے لطیف فن سے متعلق ہے جو معنوی طور پر سب سے لطیف اور موثر صنف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کھنیا لال کپور پیروڈی کو "مزاحیہ تنقید کی سب سے مشکل صنف" خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اچھی پیروڈی لکھنا پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے"۔ بہرکیف عام حالات جس تنقید کے لیے موزوں نہ ہوں وہاں پیروڈی ہنسی ہنسی میں اپنا کام کرجاتی ہے۔ غالباً انھی وجوہات کو مدنظر رکھتے ہوئے ممتاز پیروڈی نگار شفیق الرحمٰن نے لکھا ہے کہ

> "پیروڈی نہ تو محض طنز ہوتی ہے اور نہ نری تضحیک، یہ ایسی خوشگوار سی تنقید ہوتی ہے جو بری معلوم نہیں ہوتی (خصوصاً اسے جس پر پیروڈی کی گئی ہو) پچھلی صدی میں لندن کے تھیٹروں میں نامور شعرا کے کلام پر پیروڈی کی جاتی تھی۔ کئی مرتبہ شعرا بطور تماشائی دیتے تھے لیکن انھوں نے برانہیں مانا"۔

(اسکالر پیروڈی نمبر، مدیر، احمد جمال پاشا، ص۔12)

سرسید ہال کے طلبہ کی جانب سے منعقدہ پیروڈی کانفرنس (1957) میں احمد جمال پاشا نے پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مضمون 'آشفتہ بیانی میری' کو 'طرز نگارش میری' کی تحریفی قبا پہنائی جہاں رشید صاحب بھی موجود تھے۔ وہ نہ صرف اس سے محظوظ ہوئے بلکہ انعام سے بھی نوازا۔

احمد جمال پاشا نے بھی تنقید سے پیروڈی کا رشتہ استوار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "پیروڈی کو طنز و مزاح اور کارٹون کے خاندان کا فرد کہنا درست ہوگا۔ اس میں تضحیک سے تنقید کا کام لیا جاتا ہے مگر اس کا منصب تضحیک ہرگز نہیں۔ اسی وجہ سے یہ ایک مشکل فن ہے، اسے مزاحیہ تنقید میں اعتدال اور توازن کی سخت ضرورت ہوتی ہے، اس میں کسی سنجیدہ تخلیق کے کو بڑ پوری فنکاری کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں، اس کا کمال یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے کو بڑ پن کو دیکھ کر ہنس پڑتا ہے اور ہنسی ہنسی

میں اصلاح کی صورت نکل آتی ہے، ہنسی ہنسی میں جو کام ہو جائے وہ بڑا مبارک کام ہوگا۔ یہ مبارک کام پیروڈی انجام دیتی ہے''۔

(اسکالر پیروڈی نمبر، مدیر، احمد جمال پاشا، ص۔12)

چنانچہ اس نوعیت کی تنقید کا شکار ادب میں بڑھی ہوئی جذباتیت، کوئی خاص اسلوب بیان یا انفرادیت ہوتی ہے۔ آل احمد سرور کے مطابق 'پیروڈی انفرادیت کو آسیب بنا کر پیش کرتی ہے'۔ اسی طرح ڈاکٹر قمر رئیس کے نزدیک پیروڈی شعر و ادب کے کسی خاص اسلوب، رجحان یا کوئی قابل ذکر فن پارے کی کمزوریوں کو ظاہر کرتی ہے۔ معاصر اہل ادب کی بے اعتدالیوں کی روک تھام اور انھیں متوازن کرنے جیسے مقاصد پیروڈی کے محرک ہیں۔ شعرا کے انداز تحریر یا اسلوب کا چربہ اتارنا بھی پیروڈی کی ذمے داری ہے۔ اسی سبب سے تخلیق کار میں فنی اسالیب کی سوجھ بوجھ، پرکھ اور شعر و ادب کا اعلیٰ مذاق جیسی صلاحیتیں ضروری خیال کی جاتی ہیں۔ ان تمام پہلوؤں کا احاطہ پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے یوں کیا ہے:

''پیروڈی کا اطلاق صحیح طور پر اس ادبی تنقید پر ہوگا، جس میں مصنف کسی طرز نگارش یا طرز فکر کی کمزوریوں کو یا ان پہلوؤں کو جن کو وہ کمزور سمجھتا ہے، نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے پیروڈی تنقید کی ایک لطیف قسم ہے۔ مگر بعض اعتبارات سے عام تنقید سے زیادہ موثر اور کارگر''۔ (طنز و مزاح تاریخ و تنقید، طاہر تونسوی، مضمون: پیروڈی اردو ادب میں، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، ص ص۔145-146)

پروفیسر موصوف کی تحریر کی روشنی میں پیروڈی اپنی وسعت اور دائرہ کار میں نہ صرف پر مزاح تفریح اور ہنسنے ہنسانے کا عمل ہے بلکہ اس کے فرض منصبی میں لطیف طنز اور پُر مزاح تنقید کے توسط سے کمیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کرنا بھی شامل ہو گیا ہے۔ اس طرح پیروڈی طنز کی اعلیٰ خوبی یعنی اصلاح کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ پیروڈی کا محور زیادہ تر ادبی رجحانات اور اسلوب بیان ہے۔ اس کے علاوہ لفظی پیروڈی میں بلا استثنا بھی شعبہ ہائے حیات پر کڑی تنقید کی جا سکتی ہے۔ سید محمد جعفری اور مجید لاہوری کی پیروڈیاں اس کی عمدہ مثالیں ہیں جب کہ فرقت کاکوروی کی پیروڈیاں ادبی رجحانات اور اسلوب نگارش کا خاکہ اڑاتی ہیں۔ پیروڈی میں 'اصلاح' کے درجے کو اولیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے خیال میں

پیروڈی ہر قسم کی انتہا پسندی اور بے لگامی کو قابو میں لانے کا فن ہے اور اس کے ذریعہ ادبی کمزوریوں اور حد سے متجاوز جذباتیت کو ہدفِ ملامت بنایا جا سکتا ہے اور سماجی ناہمواریاں، زندگی کی خامیاں اور کمیاں پیروڈی کے پیرائے میں اجاگر کی جا سکتی ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن کی رائے میں پیروڈی ''غلط پندار، گمراہ خودی اور حد سے بڑھی انانیت میں تناسب اور توازن پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے بہت سے گروہوں، قوموں یا ادبی نسلوں کی مسیحائی طنز و مزاح کے ہاتھوں ہوئی ہے اور پیروڈی بھی اسی کی ایک شکل ہے''۔

(اسکالر پیروڈی نمبر، مدیر، احمد جمال پاشا، ص۔17)

اعلیٰ اور معیاری پیروڈی کے لیے ضروری ہے کہ جس تصنیف کی پیروڈی کی جا رہی ہو وہ مشہور ہو اور اعلیٰ درجہ کی ہو یا کسی مشہور تخلیق کار سے منسوب ہو۔ پیروڈی دراصل نقل ہے اور نقل کی شناخت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اصل کا خاصا شہرہ نہ ہو لہٰذا پیروڈی نگار کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ اصل تصنیف اعلیٰ اور عمدہ ہو اور پیروڈی پڑھتے وقت قاری کا ذہن خود بخود اصل فن پارے کی طرف چلا جائے وہیں یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ فن پارے کے تئیں اس کا تعلق عاشقانہ ہو۔ سر تھیوڈور مارٹن نے

"Let no one parody a poet unless he loves him"

(A theory of Parody: The teaching of 20th century Art form, by Linda Hitcheon, University of Illinous Press p. 30)

کے ذریعے غالباً پیروڈی کے اسی محرک پہلو کو زیادہ واضح طور پر اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آل احمد سرور کے نزدیک ''پیروڈی میں بدنیتی کی گنجائش نہیں'' (اسکالر پیروڈی نمبر، مدیر، احمد جمال پاشا، ص۔8) ہے۔ بدنیتی اور ذاتی بغض و عناد کی بنا پر تخلیق شدہ پیروڈی اپنے ہدف اور مقصد میں صفر ہو گی نہ کہ عمدہ اور اعلیٰ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ پیروڈی نگار جس ادیب یا فن پارے کی پیروڈی کر رہا ہے وہ اس کا پسندیدہ ادیب ہو اور اس کا اسلوب اس کے ذوق و شوق کو بھائے۔ تاہم یہ دونوں باتیں لازمی نہیں ہیں۔ پیروڈی ایسے فن پارے کی بھی ہوتی ہے جسے پیروڈی نگار پسند نہیں کرتا اور وہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار پیروڈی کے پیرائے میں کرتا ہے۔ فرقت

کاکوروی کی 'مداوا' اور 'ناروا' اس کی اہم مثالیں ہیں۔ فکر اور اسلوب کی خامی کی جانب اس کا اظہار احمد جمال پاشا نے عبادت بریلوی کی پیروڈی میں کیا ہے۔

پیروڈی ایک لطیف فن ہے۔ پیروڈی نگار کا بنیادی کام اصل فن پارہ اور پیروڈی میں توازن اور اعتدال کو قائم رکھنا ہے۔ عدم توازن تخلیق کار کو فن کی بلندی سے اتار دیتا ہے اور پھر وہ پیروڈی لغو اور تفریحی درجے سے آگے کی چیز نہیں رہ جاتی۔ فن کی اس لطیف نزاکت کو پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مخصوص انداز بیان میں دیکھیے:

> ''آپ نے سرکس میں مسخرے کو دیکھا ہوگا وہ اپنے ساتھی بازی گر نمبر ایک کے کرتب کی نقل کرتا ہے وہ اپنے طور پر وہی سب دکھاتا ہے جو بازی گر دکھاتا ہے۔ دونوں کے دکھانے میں صرف تکنیک کا فرق ہے۔ ایک کے کرتب پر آپ محوِ حیرت رہ جاتے ہیں دوسرے کی نقل پر ہنستے ہنستے لوٹ جاتے ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ مسخرا فن کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ بازی گر کا ہمسر ہوتا ہے بلکہ بازی گر پر اس کو یہ فوقیت حاصل ہوتی ہے کہ جو کرتب بازی گر جان کو خطرے میں ڈال کر دکھاتا ہے، مسخرا محض چند قلابازیوں میں دکھا دیتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ہم بازی گر کے کرتب کا جس شوق سے مشاہدہ کرتے ہیں اس سے کسی طرح کم شوق سے مسخرے کی قلابازیوں کا مشاہدہ نہیں کرتے۔ یہاں غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس کرتب کو بازی گر اپنی جان خطرے میں ڈال کر دکھاتا ہے، اسی کو مسخرا اپنی آبرو خطرے میں ڈال کر دکھاتا ہے۔ مسخرے کی آبرو کسی غیر مسخرے کی آبرو سے کم نہیں ہوتی۔''
>
> (اسکالر پیروڈی نمبر، مدیر، احمد جمال پاشا، ص۔ 8)

مذکورہ اقتباس میں رشید احمد صدیقی نے پیروڈی کے فن کی نزاکت کا ادراک کیا ہے۔ سرکس کا جوکر یا مسخرہ اصل بازی گر کی تقلید میں جن حرکات و سکنات کے ذریعہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے وہ بذات خود اصل کی طرح تقلید یا نقل کا فن (Art of Imitation) ہے۔ دونوں کے فن میں صرف تکنیک کا فرق ہے۔ ایک کا کمال اس قدر سنجیدہ اور پُر خطر ہے کہ دیکھنے والے پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے جب کہ مسخرے کے عمل میں تفنن طبع اور غم غلط کرنے کے اتنے سامان

موجود ہیں کہ تماشابین ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ مسخرے کی نقل میں اصل فنکار کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح پیروڈی کسی ادبی فن پارے کی زمین اور اس کی شاہراہ پر ہی چلتی ہے اور جس میں اصل فن پارے کا رچاؤ اور عکس پوری طرح دیکھا جاسکتا ہے۔ مسخرے کا فنی کمال تماشابینوں کے قہقہوں کی زد میں آکر دب سا جاتا ہے۔ یہی صورت حال پیروڈی نگار کی ہے۔ مگر اس کے باوجود پیروڈی نگار کی شخصیت، اصل تخلیق کار سے کسی طرح کم نہیں ہوتی اور پیروڈی پڑھتے وقت گرچہ قاری کا ذہن اصل فن پارے کی طرف چلا جاتا ہے اور بادی النظر میں پیروڈی نگار کی صلاحیتیں ماند پڑتی نظر آتی ہیں مگر فی الواقع یہ اس کے فن کی خامی نہیں بلکہ پیروڈی نگار کی اصل کامیابی ہے کہ اس نے اپنے مخصوص تفریحی کارنامے سے قاری کا ذہن اصل فن پارے کی طرف موڑ دیا۔ فن کار کا یہی رویہ اسے فنی اعتبار بخشتا ہے اور یہی عمدہ پیروڈی کی علامت ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس پیروڈی میں مواد کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی 'ادبی عیاری' کو بھی اہم گردانتے ہیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اسلوب یا فن پارے کی ہیئت اور موڈ کے ساتھ پورا پورا انصاف اور وفاداری کا معاملہ روا رکھا جائے۔

> ''مواد کے ساتھ ہی عیاری پیروڈی کار کے تخیل کے ساتھ ساتھ اس کے فکر و شعور کو بھی آزادی دیتی ہے اور اس بہانے وہ پیروڈی میں اپنے عہد کی زندگی، بدلتی ہوئی قدروں اور معاشرتی و سیاسی حالات کو بھی طنز و تضحیک کا ہدف بنا سکتا ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اسے اس اسلوب یا فن پارے کی ہیئت اور موڈ کے ساتھ پوری وفاداری برتنا ہوگی۔ جس کو اس نے سامنے رکھا ہے۔ اسی لیے کامیاب پیروڈی کا معیار یہ قرار دیا گیا ہے کہ اسے پڑھ کر قاری خود پتہ لگائے کہ اس آئینہ میں کس کا خاکہ اڑایا جارہا ہے۔''

('پیروڈی کا فن'، تلاش و توازن، ڈاکٹر قمر رئیس، ص ص۔ 55-154)

پیروڈی نگار حیات و کائنات کا ایک حساس اور باشعور واقف کار ہوتا ہے۔ شعبہ ہائے زندگی کے رموز و علائم پر اس کی گہری نظر ہوتی ہے اور یہی عوامل اسے تنقیدی بصیرت عطا

کرتے ہیں۔ کسی فن پارے کو پیروڈی کا پیراہن عطا کرتے وقت اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے احساس، شعور اور وجدانی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور ادبی، سماجی، سیاسی اور معاشرتی کمیوں اور خامیوں پر جرأت مندانہ تبصرہ کرے۔ یہ سب کچھ فن پر پوری گرفت کے بغیر ناممکن ہے۔ زبان و بیان پر قدرت ہو تو فنی توازن کا ا[illegible]ن ہوسکتا ہے۔ لفظوں کے ہیر پھیر، برمحل استعمال، ابہام، رعایتِ لفظی، صنائع بدائع اور الفاظ کے مزاج اور فضا سے شعوری ہم آہنگی پیروڈی نگار کا لازمی اثاثہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلیمان اطہر جاوید پیروڈی نگار کے لیے 'جرأتِ رندانہ' کو لازمی قرار دیتے ہیں اور یہ صفات مذکورہ لوازمات سے متصف ہوئے بغیر ممکن نہیں اس لیے کہ پیروڈی نگار ان قدروں پر ضرب لگاتا ہے جو عوامی جذبات سے مربوط ہوتی ہیں اور جنھیں عوام میں قبولِ عام حاصل ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پیروڈی نگار کے لیے جرأت، بے باکی اور ہمت ایک وصفِ ناگزیر کی حیثیت رکھتی ہے مگر جرأت اور بے باکی میں اعتدال شرط ہے۔ بے اعتدالی پیروڈی کے فن کو ابتذال اور بے کیف نقالی کا شکار بنا سکتی ہے۔

سائمن ڈیؤ نیر نے پیروڈی کی تفہیم میں فلسفیانہ لب و لہجہ اپناتے ہوئے اسے 'بڑھاپا' سے تعبیر کیا ہے جو دراصل زندگی کی پیروڈی ہے۔ اس کے الفاظ میں "Old age is life's Parody"۔ اسی نکتے کو شوکت تھانوی نے زیادہ مربوط طور پر آگے بڑھاتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں، وہ حالات ہی دراصل ان حالات کی پیروڈی ہیں جن سے ہم گزر چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی جتنی بسر کرنا تھی وہ تو بسر کر چکے اب زندگی کی پیروڈی کر رہے ہیں"۔ (اسکالر پیروڈی نمبر، مدیر، احمد جمال پاشا، ص۔3)

گویا آل احمد سرور کے الفاظ میں پیروڈی "وہ آئینہ ہے جو محبوب کی جھریاں دکھاتا ہے"۔ (اسکالر پیروڈی نمبر، مدیر، احمد جمال پاشا، ص۔3) جھریاں قانون فطرت کا منطقی اظہار ناہمواری ہے جب کہ پیروڈی فن اور زندگی کی ناہمواری کو سامنے لانے کا شعوری فن ہے۔

پیروڈی کے مقصد کے تعین کے سلسلہ میں دو متضاد آرا کہ اسے صرف اصلاحی اور تعمیری ہونا چاہیے یا اس کا مقصد صرف تفریحی اور ذوق طبع کی تسکین ہو، کے مابین ڈاکٹر داؤد رہبر کا یہ مسلک

انتہائی معتدل اور منصفانہ معلوم ہوتا ہے کہ "...ان دونوں گروہوں کو ایک طرح کا سمجھوتہ کر لینا چاہیے۔ وہ یوں کہ ایک اصلاحی تنقید کی شرط چھوڑ دے اور دوسرا تفریح محض کی" (فارسی اور اردو میں پیروڈی کا تصور، ڈاکٹر داؤد رہبر، ادبی دنیا ستمبر، 1946)۔ پیروڈی کو اسی رویے سے ترقی مل سکتی ہے۔ صرف اصلاحی تنقید ہی کی شرط سے اس میں وہ دلچسپی باقی نہیں رہے گی جو پیروڈی کا طرۂ امتیاز ہے اور صرف تفریحی مقصد سے اس کی افادیت خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس لیے پیروڈی میں جہاں اصلاح کا مقصد پوشیدہ ہو وہیں اس کی اساس تفریح کے ستون پر بھی استوار ہونی چاہیے۔

منظوم پیروڈی کے بالمقابل نثری پیروڈی کا سرمایہ ہمارے ادب میں نسبتاً کم ہے۔ کیونکہ نثر کی سنگلاخ زمین منظوم فن پارے کی بہ نسبت زیادہ مشکل اور طولانی ہے یہی وجہ ہے کہ نثری زمرے میں منظوم پیروڈی کی سی طغیانی نہیں پائی جاتی۔ نثری پیروڈیاں بیش تر اسلوبِ بیان اور موضوعات پر محیط نظر آتی ہیں تاہم نثر میں لفظی پیروڈی کے امکان سے کلیتہً انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ پیروڈی کی تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ پطرس بخاری نے اپنی خلاقانہ ذہانت سے نثر میں لفظی پیروڈی کے امکان کو فروغ دیا ہے۔ محمد حسین آزاد کی 'اردو کی پہلی کتاب' کی درج ذیل عبارت اور اس کی پیروڈی میں پوشیدہ لفظی پیروڈی کے امکان کو زیادہ واضح طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

> "ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے، باپ حقہ پی رہا ہے اور دیکھ دیکھ خوش ہوتا ہے، بچہ آنکھیں کھولے پڑا ہے، انگوٹھا چوس رہا ہے، ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کے منہ تک رہی ہے اور پیار سے یہ کہتی ہے کہ میری جان! وہ دن کب آئے گا کہ میٹھی میٹھی باتیں کرے گا"۔ (محمد حسین آزاد)

> "ماں بچے کو لیے بیٹھی ہے، باپ انگوٹھا چوس رہا ہے اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے، بچہ حسبِ معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے، ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کو تک رہی ہے اور پیار سے حسبِ ذیل باتیں پوچھتی ہے"۔ (پطرس بخاری)

پطرس نے پیروڈی کے لیے جو تانا بانا تیار کیا ہے وہ بعینہٖ اصل متن کی پیداوار ہے، صرف و نحو، ہیئت اور صیغے سے تعرض کیے بغیر محض چند لفظی الٹ پھیر کے ذریعہ تفنن آمیز پہلوؤں کو ابھارا

ہے اور اس طرح اصل عبارت اپنے مخصوص تعلیمی سیاق اور ماحول سے نکل کر ایک جداگانہ لسانی حدود میں داخل ہوگئی ہے۔

پطرس نے "حسب ذیل" کے اضافہ سے ماں بیٹے کی گفتگو اور مولانا آزاد کے جملوں — "ہم بڑھے کب ہوں گے، تو کمائے گا، آپ کھائے گا! ہمیں کھلائے گا" سے تفنن کے مزید امکانات کو ڈھونڈ نکالا ہے اور اسے وسعت دیتے ہوئے جو سوالات قائم کیے ہیں وہ بھی محض معمولی لفظی تصرف کی کرشمہ سازی سے انجام پایا ہے۔ سوالات دیکھیے — ہم بڑھے کب ہوں گے؟، تو کب کمائے گا؟، آپ کب کھائے گا اور ہمیں کب کھلائے گا؟

لفظی پیروڈی کے لیے ذہانت کے ساتھ تخلیقی استعداد اور سنجیدہ غور و فکر کا مادہ درکار ہے، عبارت اور متن پر جو سنجیدگی ہوتی ہے وہ عموماً تفہیم مطالب تک محدود رہتی ہے، تاہم پیروڈی چونکہ کسی موجود متن کی کوکھ سے ہی جنم لیتی ہے لہٰذا تفہیم بھی اس درجے کی ہو جو تخلیقی امکان کے دروازے تک آپ کی رہنمائی کر سکے۔ ظاہر ہے پیروڈی کی نمود اسی صورت میں ممکن ہے۔ موضوعاتی اور اسلوبیاتی پیروڈی کے برعکس لفظی پیروڈی زیادہ نازک اور لطیف ہوتی ہے اور فنی رکھ رکھاؤ اور ہوشمندی چاہتی ہے۔

نثر میں لفظی پیروڈی کے سلسلے میں شرر کے نام مولانا حالی کے ایک طویل مکتوب کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے جسے حالی نے ایک مسلمان اخبار کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ اخبار کی عبارت یہ ہے۔

> "جب تک اہل ہنود کے لیڈر اور ان کے سربرآوردہ اخبارات اپنی پالیسی نہ بدلیں گے اور دل سے مسلمانوں کی بہبودی کے اسی طرح خواہاں نہ ہوں گے جس طرح اپنے ہم قوموں کے ہیں اس وقت تک کسی بیرونی تدبیر سے اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا"۔

مولانا حالی نے اخبار کی مذکورہ رپورٹ پر اپنی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ "اس کے جواب میں ہندو نکتہ چیں اس طرح مطالبہ کر سکتا ہے کہ:

> "جب تک مسلمانوں کے لیڈر اور ان کے سربرآوردہ اخبارات اپنی پالیسی نہ بدلیں گے اور دل سے ہندوؤں کی بہبودی کے اسی طرح خواہاں نہ ہوں گے جس طرح اپنے ہم

قوموں کے ہیں اس وقت تک کسی بیرونی تدبیر سے اتحاد پیدا نہیں ہوسکتا"۔

(مکاتیب حالی، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، طبع اول، ص۔56)

مذکورہ اخباری رپورٹ کی عبارت محض دو لفظوں 'مسلمانوں' اور 'ہندوؤں' کے معمولی الٹ پھیر سے مخالف سمت اور مفہوم میں تبدیل ہو گئی ہے اور اس کا وار پوری طرح پلٹ گیا ہے۔ یہ نثر میں لفظی پیروڈی کی اچھی مثال ہے۔ فضا، ساخت، ماحول، گرامر سبھی کچھ موجود ہیں مگر پیروڈی نے اسے اس کے تخلیقی ماحول سے نکال کر اس میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ پیروڈی کے نشتر کی بدولت اس میں وہ بھی کچھ موجود ہے جو اصل عبارت کا مدعا ہے۔ یہی رفعت لفظی پیروڈی کا مطلوب ہے۔

نثر میں لفظی تحریف کی ایک اور عمدہ مثال سرسید کے اس ریمارک میں دیکھی جا سکتی ہے جس کا تذکرہ مولانا حالی نے حیات جاوید میں کیا ہے۔ مسجد کانپور کے انہدام کے سلسلے میں سرسید تہمتوں کی زد میں تھے۔ اس پر سرسید نے تہذیب الاخلاق میں ایک وضاحتی آرٹیکل لکھا، تفصیل ملاحظہ فرمائیے:

"اودھ اخبار میں جس کے ایڈیٹر اس وقت مرحوم غلام محمد خاں تپش تھے، یہ فقرہ چھپا تھا۔ "اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں یہ مضمون نہایت دیر میں چھپا، یعنی اس وقت جب کہ سید صاحب کی بدنامی تمام دنیا میں مشتہر ہو چکی"۔۔۔۔۔لیکن اگر ہمارے دوست اس فقرہ کو یوں ارقام فرماتے تو شاید لفظ بدنامی کے صحیح معنی ہو سکتے ــــ "یہ مضمون نہایت دیر میں چھپا، یعنی اس وقت جب کہ تمام اخباروں کی بدنامی تمام دنیا میں ہو چکی"۔ پھر لکھتے ہیں "ہم کو امید ہے کہ خدا وہ دن بہت جلد لائے گا کہ ہماری قوم بدنامی کے صحیح معنی سمجھے گی اور ہمارے ملک کے اخبار خود اپنی عزت کرنی سیکھیں گے"۔

(حیات جاوید، الطاف حسین حالی، بار پنجم، ص ص۔564۔565)

سرسید کے تحریفی ریمارک میں اخباری فقرہ کا راست نشانہ صرف اس کے خلاف پڑ گیا ہے بلکہ اس میں پوشیدہ امکان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سرسید نے اپنے اصلاحی پیغام کی گنجائش بھی نکال لی ہے۔

نثر میں لفظی پیروڈی میں مضمر تخلیقی امکان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عہد حاضر میں ظفر کمالی نے نثری فن پارے میں لفظی پیروڈی کا نہایت بلیغ شاہکار پیش کیا ہے۔ ان کے طنزیہ و مزاحیہ مجموعۂ کلام 'ظرافت نامہ' کی پشت پر ان کی تصویر کے نیچے وہ عبارت مندرج ہے جو شعرا اور فن شاعری سے متعلق ٹی ایس ایلیٹ کی رائے پر مبنی ہے۔ لفظی تصرف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پیروڈی نگار نے اپنی ذہنی اپج سے لفظی پیروڈی کے باب میں جو جوت جگائی ہے وہ اس فن سے شغف رکھنے والوں کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔ اصل متن کی کوکھ سے پیدا ہونے والی عبارت ملاحظہ ہو۔

> ''یوں تو بے سرے پن یہاں تک کہ پھٹی ہوئی آواز کی بھی اہمیت ہے لیکن ظفر کمالی کی شاعری میں خوش آہنگی ہے۔ ان کے یہاں لفظوں کی ترتیب و نشست کا نظام ایسا ہے جس کے ذریعے اترتے چڑھتے جذبات کو خوبصورت آہنگ عطا کرنے میں مدد ملی ہے۔ یہ چیز مجموعی نظم کی موسیقانہ ساخت کے لیے بے حد ضروری ہے۔ ظفر کمالی نے اپنی ظریفانہ نظموں میں اس کا خیال رکھتے ہوئے انھیں وزن و وقار عطا کیا ہے۔ وہ اپنے ظریفانہ مذاق کو ایک اکائی کی شکل میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور بالآخر ایک نظریۂ حیات تک پہنچنا جانتے ہیں۔ انھیں لطف اندوزی اور مذاق کو فلسفہ میں تبدیل کرنے کا ہنر معلوم ہے۔ اس سے اس کا فن زیادہ گہرا، زیادہ وسیع اور زیادہ ترقی یافتہ ہو گیا ہے۔ ذکاوت و ہوش مندی، فہم و فراست اور اس جیسی دیگر صفات ایک ساتھ شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ظفر کمالی کے یہاں ان کی یکجائی حیرت زدہ کرنے والی ہے شاعری کی اگر کوئی چوتھی آواز ہو سکتی ہے تو اس کی سب سے روشن مثال ظفر کمالی کی شاعری ہوگی''۔ (ٹی، ایس، ایلیٹ)
>
> (ظرافت نامہ، ظفر کمالی، کتاب کے فلیپ سے)

یہ پیروڈی 'ایلیٹ کے مضامین' از جمیل جالبی کے مضامین اور اس کے متعدد جملوں کو مربوط طور پر ترتیب دے کر معرض وجود میں لائی گئی ہے۔ پوری عبارت از خود ایلیٹ کی ہے البتہ اس میں تصرف محض اتنا ہے کہ 'ظفر کمالی' کا اضافہ کیا گیا ہے اور شاعری کی آواز میں لفظ 'تیسری' کو 'چوتھی' سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ عبارت نثر میں لفظی پیروڈی کا عمدہ نمونہ بن گئی ہے۔

نثر میں لفظی پیروڈی کے حوالے سے پیروڈی 'برشاخ آہو' کی انفرادیت اس معنی میں ہمیشہ مسلّم سمجھی جائے گی کہ کسی تصرف یا حذف واضافہ کے بغیر سبط اختر نے نظم 'شاخ آہو' کو نثری پیکر عطا کیا ہے۔ پیروڈی میں کارفرما لفظی تصرف کے تعلق سے 'اسکالر' پیروڈی نمبر کے ایڈیٹر احمد جمال پاشا کی یہ شہادت قابلِ غور ہے کہ:

"یہ پیروڈی ن،م، راشد کے مجموعہ کلام 'ایران میں اجنبی' کی ایک نظم 'شاخ آہو' کا نثری پیکر ہے۔ مصنف سبط اختر نے اس میں ایک لفظ کی تصنیف بھی اپنی طرف سے نہیں کی ہے"۔ (اسکالر پیروڈی نمبر، مدیر، احمد جمال پاشا، ص۔ 74)

ان مثالوں سے بیانیہ نثر میں پوشیدہ لفظی پیروڈی کے امکانات سے بحث مقصود ہے، جو ظاہر ہے موثر طریقۂ اظہار ہونے کے ساتھ مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔

لفظی پیروڈی کے برعکس موضوعات، پیرائے اظہار اور اسلوب بیان کو اپنا کر لکھی جانے والی نثری پیروڈی کی روایت البتہ اردو ادب میں زیادہ حوصلہ افزا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ

"......نثر میں پطرس سے قبل اول تو پیروڈی کا نمونہ ہی مشکل سے ملتا ہے اور اگر کہیں ایک آدھ چیز نظر بھی آتی ہے تو اس کی ادبی حیثیت کچھ زیادہ بلند نہیں"۔

(تلاش و توازن، ڈاکٹر قمر رئیس، ص۔ 160)

نثری پیروڈی کے تعلق سے ڈاکٹر موصوف نے جو رائے قائم کی ہے وہ ادب میں عمومیت سے تسلیم کی جاتی ہے غالباً اس کی وجہ انحو کہ ادب میں پطرس کا مقام و مرتبہ ہے۔ بات اس حد تک ضرور درست ہے کہ نثری پیروڈی کی باقاعدہ تنظیم اور شعوری تحریک مضامین پطرس کی دو پیروڈیوں — 'اردو کی آخری کتاب' اور 'لاہور کا جغرافیہ' سے ملی ہے۔ لیکن پطرس کو نثری پیروڈی کا نقاش اول نہیں کہا جا سکتا۔ دیانت دارانہ تجزیہ کی رو سے منظوم پیروڈی کی طرح نثری پیروڈی کی بازیافت کا سہرا بھی جعفر زٹلی (1653۔1713) کے سر جاتا ہے۔ سترھویں صدی کے پر آشوب عہد میں جعفر زٹلی کی ذہنی کیفیت اور اس کے ادبی رویے کو سامنے رکھنا اہم ہوگا۔ یہ پورا عہد اپنے تاریخی پس منظر میں غیر معتدل، غیر متوازن، انتشار و بدامنی اور سماجی نارسائیوں کے ساتھ ساتھ سیاسی اتھل پتھل کا دور ہے۔ یوں تو اورنگ زیب کے زمانے سے ہی سماجی انتشار شروع ہو گیا تھا

گر چہ اس وقت تک کوئی ریاست خود مختار نہیں ہوئی تھی تاہم اس کے بعد چند برسوں میں ہی خانہ جنگی اور ریاستوں کی خود مختاری نے مغل سلطنت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ اورنگ زیب کی وفات (3/ مارچ 1707) کے بعد بھائیوں کی آپسی لڑائی نے اسے اور بھی کمزور کر دیا۔

جعفر زٹلی اس عہد کا عینی شاہد ہے، مغلیہ سلطنت کا عروج، اورنگ زیب اور بعد کے سماجی اور سیاسی انتشار پر اس کی گہری نظر ہے۔ اقتدار اور شاہانِ اقتدار کی نااہلیوں اور لغزشوں سے وہ دل برداشتہ ہے اور قدروں کی پامالی اسے ان ناہمواریوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ احتیاط اور مصلحت کوشی اس کا مسلک نہیں بلکہ اصلاح پسندی کا طریقۂ کار اس کے یہاں صورِ اسرافیل ثابت ہوتا ہے جس کے شور سے مملکت کے ایوانوں میں بھی رعشہ ہے۔ وہ غیر پاکیزہ تلخیوں کے ازالے کے لیے ہجو گوئی بلکہ فحش کلامی اور برہنہ گفتاری پر اتر آتا ہے۔ بالآخر بادشاہ وقت فرخ سیر کے سکہ کی مضحک نگاری پر قتل ہو جاتا ہے۔ اس سیاق میں جعفر زٹلی بجا طور پر ''شہیدِ پیروڈی'' اور اس صنف کا بانی قرار پاتا ہے۔

جعفر کے سرمایۂ شعر و نثر پر فحشیات، دشنام طرازی، بدکلامی اور اس کے سماجی سیاق اور سروکار سے قطع نظر فنی طور پر یہ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہیں کہ سکہ کے شعر کی مضحک پیش کش در اصل 'پیروڈی' ہے۔ سکہ ہے:

سکہ زد از فضلِ حق بر سیم و زر
پادشاہ بحر و بر فرخ سیر

جعفر کی مضحک صورت گری یہ ہے:

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہ تسمہ کش فرخ سیر

جعفر کا مذکورہ شعر اصل شعر کی پیداوار ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح پیروڈی اصل فن پارے کی پیداوار ہوتی ہے۔ عناصر، ہیئت، لب و لہجہ، فضا اور رنگ و آہنگ اصل شعر کے بالکل مماثل ہیں۔ پیروڈی کی فنی ضرورت بھی انھی خصائص اور لوازمات کا تقاضا کرتی ہے۔ اس شعر میں اصل شعر کے بالمقابل لفظی تصرف سے کام لیا گیا ہے اور لفظی تصرف پیروڈی کے تخلیقی عمل میں

ایک ناگزیر اوزار (Tool) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے جعفر کا شعری جواب اپنے رویے اور منہج میں غیر شعوری طور پر مستقبل کی ایک صنف کی بنا رکھ گیا اور غالب امکان ہے کہ ادبا ے طنز و مزاح کے لیے بھی روش اس نوع اور رنگ کی تخلیقات کا پیش خیمہ بن گئی اور غیر شعوری طور پر ادبی تقلید کا یہ چلن ہماری شعری اور نثری روایت کا حصہ بنتا چلا گیا۔ اس خیال کی تائید کے بطور ''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' کی درج ذیل شہادت ملاحظہ فرمایئے:

''اردو میں پیروڈی کے اولین نمونے میر جعفر زٹلی کے یہاں ملتے ہیں''۔

احتجاج اور بغاوت کی یہی 'تحریفی روش' (Parodical behaviour) اس کی نثری تحریروں کا بھی خاصہ ہے۔ کلیات میر جعفر زٹلی کے بیش تر نثر پارے اس زمرے میں آتے ہیں جو اپنے عہد کے مروجہ اسلوب، طرز بیان اور روایات کا قلع قمع کرتے ہیں۔ یہ وہی روش ہے جو صنفی طور پر پیروڈی کہلاتی ہے۔

جعفر زٹلی کی حسب ذیل عبارت ملاحظہ ہو۔ یہ 'نسخۂ چورن' کے عنوان سے درج ہے۔

''الو کا پٹھا،..... مینڈک کی کانچ، شفتالو کا پات، اسکندر کی جڑ، پرانی کھوپڑی کی چھانو، لکھی جنگل کی چونٹی کا پوتا، دو سیر دودھ ہرنی کا،..... کیوڑ کی جڑ، قرنفل کا تخم، مال زادی کی تل کی چل، گھر والی کی اوجھ، کونی کی سسکی، زنانے کا نخرہ،..... چمگادڑ کی چربی، مکھی کا بھیجا، کھٹمل کا کلیجہ، جونک کا انڈا.......

ترکیب: ان سب بستوؤں کو ملا کر کھرل کرے اور ساتویں دن سات گولیاں بنا کر نگلی پیئے، نہار سر، باسی پاؤں کھائے۔ مرد کھتا ہو تو سر شندہ ہے، کر دکھتی ہو تو کمر شندہ ہے''۔ (ذٹل نامہ، کلیات میر جعفر زٹلی، مرتبہ رشید حسن خان، ص۔ 117)

قطعیت سے یہ کہنا دشوار ہے کہ جعفر زٹلی نے کس حکیم کے کس نسخے کو سامنے رکھ کر یہ تحریف لکھی ہے البتہ یہ امر شبہ سے بالاتر ہے کہ یہ تحریر قدیم زمانہ کے حکما اور نسخہ نویسی کے لیے ان کی ادق زبان اور پیرایۂ اظہار کی تحریف ہے۔

جعفر زٹلی کے نثری سرمائے میں ایسی تحریریں بکثرت ملتی ہیں جو اخبار دربار معلی کے ان مشمولات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں جن سے جعفر متنفر نظر آتا ہے۔ یہ تحریریں ''اخبارات سیلہہ''

دربارِ معلیٰ'' کے تحت ملتی ہیں۔ عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ یہ واضح طور پر ''اخبارِ دربارِ معلیٰ'' میں شائع حکومت حامی خبروں اور تحریروں کے خلاف بطور احتجاج معرض وجود میں آئی ہیں۔ رشید حسن خاں کے مطابق اس کے —

''بیشتر اندراجات حکومتِ وقت، یعنی اورنگ زیب کی حکومت اور امرائے دربار کی کمزوریوں کے اشارہ نما ہیں۔ مزاح اور تمسخر کے پردے میں سماجی اور انتظامی خرابیوں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں...... نظم ونسق کی بعض خرابیوں کے بیانات تو ایسے ہیں جنھیں اس زمانے کے سماجی اور حکومتی مسائل کے مطالعے کے ذیل میں قابلِ توجہ نشانات کے طور پر سامنے رکھا جاسکتا ہے''۔

زبان فارسی زدہ ہے، کہیں کہیں اردو الفاظ، جملے اور اردو محاورے خلط ملط ہو گئے ہیں۔ تاہم فنی طور پر ان کی سرشت میں وسیع تر تقلید اور تتبع موجود ہے جو پیروڈی کا تخلیقی طریقہ کار رہا ہے۔ 'اخباراتِ سیاہہ' دربارِ معلیٰ' کے محض چند مختصر نمونے ہمارے انتخاب کی زینت ہیں۔

مسلم سوسائٹی میں نکاح کی مروجہ روایت پر جعفر زٹلی کی پیروڈیوں میں سے ایک پیروڈی بطور نمونہ ہمارے اس انتخاب میں شامل ہے۔ جعفر کا یہ نکاح نامہ مسلم معاشرے میں نکاح کے مروجہ دستور اور خطبہ نکاح کی مضحک نقالی ہے۔ یہی صورت حال جعفر زٹلی کے یہاں اس نوع کی دوسری تحریروں میں بھی پائی جاتی ہے جو وسیع پیمانے پر اپنے عہد کی پر تکلف عبارت، بے ڈھنگے پن اور روایات کا تمسخرانہ محاسبہ کرتی ہیں۔ شرح ضامنی، انعامات، التماس در مضمون ترکاری اور درجنوں رقعات اسی قبیل کی پیروڈیاں ہیں۔

نثری پیروڈی کے ابتدائی خدوخال وضع کرنے کے حوالے سے پیروڈی کی تاریخ میں شاہ حاتم (1700۔1783) کا کارنامہ بھی کچھ کم توجہ طلب نہیں۔ جعفر زٹلی کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے شاہ حاتم نے اطبا اور ان کے نسخوں کا خاکہ اڑانے کے لیے ایک ایسا نسخہ مرتب کیا ہے جس میں جمیل جالبی کے بقول ''ناممکن الحصول چیزوں کو اکٹھا کر کے مزاح پیدا کیا گیا ہے'' اور اس کی اہم ترین خوبی کی نشاندہی کرتے ہوئے جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ جعفر زٹلی کی فارسی پر مبنی زبان کے علی الرغم ''شاہ حاتم کی اس مزاحیہ نثر کی بنیاد اردو ہے''۔ اس کی ایک جھلک آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

"نسخہ مفرح الضحک معتدل من طب الظرافت جسے چنگا بھلا کھائے سو بیمار ہو جائے۔

چاندنی کا روپ، دوپہر کی دھوپ، چڑیل کی چوٹی، بھتنے کی لنگوٹی، پریوں کی نظر گزر، دیو کی نظر، جوگی کی جھری، ایڈ بھینسا سور کی، تھیا تھیا کے بھر۔

کبوتر کی غٹ غوں، مرغی کی کٹکوں، چیل کی چل چل، کیڑوں کی کل بل، پشم خایہ ببر، جوگائی شتر، بکری کی میں، کوے کی ٹیں، آٹھو آٹھو رتی۔...... عرق نعناع، عرق بابا، عرق ماما، خمیرہ فالودہ، ورق نورتن، شربت اجل، آدھی آدھی مٹھی۔

ڈھول جھکڑ، لات مکی، گھونسا گھانسی، گالی گلوچ، اکتا بچی، تاتا تھیری، بولی ٹھولی، ہی ہی کھی کھی، دانتا کل کل، کوسا پیچھی، بھیت لعنت، پھٹے منہ اتنے ہوں۔

ان سب دواؤں کو لے کر رات ہو نہ دن ہو، نہ صبح ہو نہ شام ہو، نہ باسی پانی ہو نہ تازہ پانی، اس میں بھگا کر تالی کی سل، مٹی کے بٹے سے پیسے۔ پھر مکڑی کے جالے کی صافی میں چھان کر فرشتے کے موت میں خشخاش کے ساتویں حصے برابر گولی باندھے۔ وقت نزع کے بلغم کے دودھ سے ایک کف یا پھانکے، کھانے پینے، سونے بیٹھنے، دیکھنے بولنے، سننے سونگھنے سے پرہیز کرے اور جب خوب بھوک لگے تو اتنی نوے ہزار دوں سے زیادہ نہ کھاوے۔ حاتم کہتا ہے ایک روگ سے حزر روگ کو پیدا کرے۔ جس کا ہزار نام ایک اللہ۔ نسخہ تمام شد۔"

(تاریخ زبان اردو، جمیل جالبی، حصہ اول، جلد دوم، طبع پنجم، ص ص۔ 447-449)

شاہ حاتم کی یہ پیروڈی ہمارے انتخاب میں شامل ہے۔

1877 اور اس کے بعد کے زمانے میں نثری پیروڈی کے کینوس کو اودھ پنچ نے کافی وسعت بخشی، مغرب سے اپنے متصادم نظریات اور مشرقیت کے اپنے مخصوص زاویہ نگاہ نے ان میں مغربی آداب و معاشرت کو لے کر نقالی کا وہ رنگ بھر دیا کہ ان کے فن پاروں میں مغربی طرز معاشرت کے مضمرات از خود ابھر کر سامنے آنے لگے۔ منشی سجاد حسین کی زیر قیادت اودھ پنچ کی پوری ٹیم نے اپنی تخلیقات میں اس فن کے تقاضوں کو بخوبی نبھایا اور عمدہ نمونے پیش کیے۔

''انڈے بچے والی چیل چلباڑ'' جیسی موضوعاتی پیروڈی اسی عہد کی یادگار ہے جو منشی سجاد کے اشہب قلم سے اس وقت معرض وجود میں آئی جب 1899 میں لکھنؤ میں کانگریس کے اجلاس کے اعلان پر انگریز نوازوں نے طوفان بدتمیزی برپا کر رکھا تھا۔ پیروڈی 'کھلے خط اور سر بستہ مضامین' بھی اسی عہد کی ناہمواریوں پر ضرب لگاتی ہے۔ رمز و کنایہ میں فرنگی نظام حکومت اور اس کے حکام کی نااہلی حتیٰ کہ ملکہ وکٹوریہ اور دیگر اعیان مملکت کی بھی خبر لی گئی ہے۔ پیروڈی دیکھیے:

> ـــ ''مولوی گلیڈ اسٹن صاحب طول عمرہ، عائے غیر نصیب شاباد
>
> ایسے زمانے میں جب کہ چاروں طرف سے سوائے شر و فساد، ہر ملک سے سموم بغض و عناد کے جھونکے آرہے ہیں تمھارے حق میں اس سے بڑھ کر مناسب دنیا میں شاید ہی کوئی اور دعا ہوگی''۔

(اردو نثر میں پیروڈی کا فنی ارتقاء، قطب الدین اشرف، زبان و ادب پٹنہ، ص۔98)

مغرب کے عروج میں سائنسی ایجادات و اختراعات کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے اودھ پنچ کے مغرب بےزار قلمکاروں نے مغرب کے اس پہلو کو طنز و تمسخر کا خوب نشانہ بنایا۔ نواب سید محمد آزاد کی تحریر ''نئی روشنی کا انسائیکلو پیڈیا'' سے درج ذیل اقتباس حاضر خدمت ہے جو مذکورہ پہلو کی عمدہ تحریف کہی جاسکتی ہے۔

> ''......کھوپڑیالوجی: یہ نہایت مفید بکار آمد فن متعلق جراحی ہے۔ یہ بات بخوبی ثابت ہے کہ کھوپڑی کی موٹی پتلی دبیز اور ہلکے ہونے پر آدمی کے دماغی قویٰ کی طبیعت کا دارومدار ہوتا ہے۔ جتنی دبیز کھوپڑی ہوگی اتنی ہی وہ دماغی قویٰ کے حق میں مفید ہے''۔
>
> (اردو نثر میں پیروڈی کا فنی ارتقاء، قطب الدین اشرف، زبان و ادب پٹنہ، ص۔100)
>
> ''......ڈیم کالوجی: یہ خاص فن اس امر کی تحقیق سے متعلق ہے جو صرف حال کے زمانے کے ہندوستانی مصنفوں، شاعروں اور مؤلفوں میں پایا جاتا ہے اور نہایت درجہ حسرت ناک ہے''۔
>
> (اردو نثر میں پیروڈی کا فنی ارتقاء، قطب الدین اشرف، زبان و ادب پٹنہ، ص۔100)

"...... پیروڈی: یہ فن نہایت عجیب و پیچیدہ اور پر استعمال ہے۔ مادہ اس کا "پیروڈ" لاطینی ہے جس کے معنی ہیں کیڑے چیز کو قلیل زمانے میں بہت تنگ سوراخ سے نکالنا"۔

(اردو نثر میں پیروڈی کا فنی ارتقاء، قطب الدین اشرف، زبان وادب پٹنہ، ص۔99)

نثری پیروڈی کے ضمن میں نواب سید محمد آزاد کے مضمون "اشتہار مسرت باد" کی تحریفی روش بھی خاصی دلچسپ ہے جس میں ایک مجرد مشتہر کی طویل فہرست کو قلم بند کیا گیا ہے۔ شادی بیاہ کے لیے عموماً دولہا یا دلہن کے لیے جس نوعیت کے اشتہار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ نواب صاحب کی یہ تحریر اسی کی مضحک تحریف ہے۔ مشرقی ماحول میں لڑکے کے لیے عموماً خاندان، صغرسنی، دینی تعلیم، فیشن سے دور صوم وصلوٰۃ کی پابند دین دار گھرانے کی لڑکی مطلوب ہوتی ہے جب کہ پیروڈی میں اس کے متضاد اوصاف گنوائے گئے ہیں جس نے صورت حال کو خاصا مضحکہ خیز بنا دیا ہے اور اس طرح نئی نسل کی مغرب پسند ذہنیت پر بھی چوٹ کی گئی ہے۔

......"مشتہر ایک مجرد شخص ہے۔ اس کو ایک ایسی بیوی کی ضرورت ہے جس میں صفات ذیل ہوں۔ عالی خاندان چنداں ضروری نہیں۔ مگر اس کے خون میں تازگی ہو۔ پختہ سن کی عورت ہو، یعنی چالیس اور پچاس کے اندر۔ کاٹھی مضبوط، قویٰ درست، صحت نہایت اچھی ہو، تعلیم وتربیت اس انداز کی ہو کہ متوسط اور اعلیٰ درجہ کی تہذیب یافتہ انگلش، گانے بجانے کا سلیقہ، ناچنے میں اگر کمال نہ ہو تو اتنا دم خم ضرور ہو کہ ایک دو جنٹلمین کو بال پارٹی میں تھکا دے۔ نئی روشنی کی گھڑ دوڑ، گھڑ سواری اور مہذب کھیلوں سے واقف ہو۔ اور ہر طرح کی آب وہوا کی سختی کو برداشت کر سکے"۔

(اردو نثر میں پیروڈی کا فنی ارتقاء، قطب الدین اشرف، زبان وادب پٹنہ، ص ص۔100-101)

نثری پیروڈی کی کوئی بحث اس وقت تک ادھوری سمجھی جائے گی جب تک ملا رموزی کی تحریفی فتوحات کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ آج کے شستہ انداز تحریر کے دور میں ان کی تحریر کا طلسم گرچہ ٹوٹتا بکھرتا محسوس ہوتا ہے مگر اپنے وقت میں اسے نہ صرف مرغوب ترین انداز بیان کی صورت حاصل تھی بلکہ اس طرز نگارش نے معاصر اہل قلم کو بھی اس کی خوشہ چینی پر آمادہ کیا۔

ملا رموزی کی طرز تحریر دراصل قدیم عربی و فارسی اور قرآن شریف کی ترجمہ نویسی کا تتبع ہے جس میں مولویانہ اردو میں عربی کتب کی خارجی ہیئت، طرز تخاطب اور اظہار بیان کے نقائص پر چوٹ کی گئی ہے۔ ملا صاحب کا حساس عہد اوراس کی معاشرتی سرگرمیاں بھی اس کی زد میں ہیں۔

طرز تخاطب کی تحریف ملاحظہ کیجیے:

—"امابعد! اے مسجدوں سے جوتا چرانے والو! خبر داری اور آگاہی ہے واسطے تمھارے"۔

ترجموں کی خارجی ہیئت کی پیروڈی کا نمونہ دیکھیے:

"اے اکبرآباد کے گانے والے شاعرو!

نہیں ہے اور البتہ تحقیق نہیں ہے مفید شوق شاعری کا، بیچ زمانہ طالب علمی کے واسطے طلبا کے۔ کیوں کہ قسم ہے دو چار تھانے داروں کی کہ جولڑکا بیچ شروع موسم جوانی کے پڑ جاتا ہے۔ بیچ شغل شاعری اور مضمون نگاری کے تو تباہ ہو جاتا ہے۔ سلسلۂ تعلیم اس کی کا سبب سے نحوست میز کرسی کے کہ تباہ ہو رہی ہے۔ دولت مسلمانوں کے بیچ خریداری میز کرسیوں کے درآنحالیکہ باپ دادا تمھارے بیٹھا کرتے تھے اوپر فرش قالین کے مگر اسے راستہ بتلایا فرنیچر کا تعلیم نے اسلامیہ اسکولوں کی نے میز کرسی کا۔ اگر چہ آراستہ ہو جاتے تھے کمرے اور کوٹھیاں فرش ہندوستانی سے بہت ارزاں مگر اب نہیں تشریف رکھتے اوپر فرش دیسی کے یہ غلام ہندوستانی تمباکو فروش مگر اوپر کرسیوں اور میز عمدہ کے"۔

(اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت اور ہم عصر رجحانات ایک جائزہ، ڈاکٹر قمر رئیس، ص۔35)

ملا رموزی نے مسجع اور مقفیٰ عبارت آرائی، تفسیر جیسی دینی اور تبلیغی میدان میں مطالب و معانی میں شخصی قابلیت کے اظہار، غیر رواں اور لکنت زدہ تراجم کے خلاف جو احتجاجی روش اختیار کی، اس سے وہ سلجھی اور رواں طرز اظہار کی افادیت کھل کر سامنے آئی جس سے ہم آج لطف اندوز ہو رہے ہیں اور یہ سارا کارنامہ پیروڈی کے حربے سے انجام پایا۔

شاملِ انتخاب 'لندھن کا عتابی دربار' ملا رموزی کی ایک نمایندہ پیروڈی ہے۔ اس میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جن کی نشاندہی ملا رموزی کی طرزِ خاص 'گلابی اردو' کے حوالے سے کی گئی ہے۔

نثری پیروڈی کی تحریک کو انقلابی پیش رفت سے ہم آہنگ کرنے میں پطرس بخاری کا نام سرِفہرست ہے۔ پطرس نے مختصر لکھا مگر یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ پطرس کے مضامین میں شامل دس میں سے دو مضامین کی بنا محض فنِ پیروڈی پر رکھی گئی ہے۔ اس سے صنفِ پیروڈی پر پطرس کی سنجیدگی اور قادرالکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ غالباً پطرس کی تخلیقی استعداد کے اعتراف ہی کے بطور آلِ احمد سرور نے یہاں تک لکھا ہے کہ "اگر کسی شخص نے 'مضامین پطرس' نہیں پڑھے تو اس کی تعلیم ادھوری ہے" اور یہ بھی کہا کہ 'اردو میں پیروڈی کی شعوری کوشش سب سے پہلے پطرس نے کی"۔ یہ بات گرچہ حقائق سے میل نہیں کھاتی تاہم یہ دونوں اشارے پطرس کو ایک بلند پایہ پیروڈی نگار کی حیثیت سے متعارف کراتے ہیں۔

ہمارے انتخاب میں شامل 'اردو کی آخری کتاب' اور 'لاہور کا جغرافیہ' بالترتیب مولوی محمد اسماعیل اور محمد حسین آزاد کی شاملِ نصاب درسی تالیف کی پیروڈیاں ہیں جن میں پطرس نے بنیادی عبارت کی ساخت، مختصر جملے، بے زارکن یکسانیت اور بچوں کی لفظیات وغیرہ پہلوؤں کو برقرار رکھتے ہوئے معمولی لفظی تصرف کے سہارے انھیں تضحیک اور تفنن آمیز بنا دیا ہے اور اس طرح پیروڈی کے باب میں ایک نادر لفظی پیروڈی کا اضافہ کیا ہے۔ جب کہ 'لاہور کا جغرافیہ' جغرافیہ نویسی کے قدیم طرزِ تحریر کی اسلوبیاتی نقالی ہے۔ یہ پیروڈی اس نوع کی غیر محقق تحریر سے بیزاری کا اعلان کرتی ہے، جو ٹھوس معلومات کے بغیر محض روایۃً ضبطِ تحریر میں آتی رہی ہیں۔ لاہور کی سماجی زندگی بھی اس پیروڈی کی زد میں آئی ہے جو ظاہر ہے موضوع کے سیاق میں اپنا جواز رکھتی ہے۔

"...... جو سیاح لاہور آنے کا ارادہ رکھتے ہیں ان کو یہاں آمد و رفت کے ذرائع کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہیے...... جو سڑک بل کھاتی ہوئی لاہور کے بازار میں سے گزرتی ہے تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جسے شیر شاہ سوری نے بنوایا تھا، یہ آثارِ قدیمہ میں شمار ہوتی ہے۔ اور بہ حد احترام کی نظروں سے

دیکھی جاتی ہے۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جوں کی توں موجود ہیں جنھوں نے کئی سلطنتوں کے تختے الٹ دیے تھے"۔

(پطرس کے مضامین، پطرس بخاری، ص ص۔98۔99)

پطرس کے بعد نثری پیروڈی کے باب میں شوکت تھانوی نے اپنی شہرۂ آفاق تحریر 'سودیشی ریل' اور 'بار خاطر' سے اپنی عظمت و شہرت کا چراغ روشن کیا اور پیروڈی کے ارتقائی سفر کی رفتار دو چند کی۔ سودیشی ریل شوکت کی شہرت کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا اور غالباً اس میں پوشیدہ فلسفۂ نظام و فکر کے معنوی نقائص کو جو طشت از بام کرنے کی سعی کی گئی ہے اس نے بعض ناقدین کو اس مغالطے کا شکار بنایا ہے کہ یہ معنوی پیروڈی ہے۔ بہ نظر غائر اس کے مطالعے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ حالات و واقعات کا جو تانا بانا شوکت تھانوی نے تیار کیا ہے وہ محض تصوراتی اور افسانوی ہے نہ صورت حال اس حد تک مخدوش تھی اور نہ ہی یہ شاہکار کسی فن پارے کے وجود سے اپنا علاقہ رکھتا ہے۔ لہٰذا یہ پیروڈی کے دائرے سے خارج ہے۔ البتہ ہمارے انتخاب میں شامل 'بار خاطر' مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط 'غبار خاطر' کی پیروڈی ہے جس میں پیروڈی نگار نے مولانا آزاد کے خطوط کی محض زمین استعمال کی ہے۔ مکتوب خود ان کی طرف سے لکھا گیا ہے تاہم مکتوب الیہ حضرت جگر مرادآبادی ہیں۔ مولانا آزاد کی افتادِ طبع اور ذوق کے مطابق ان کے خطوط میں جس طرح چائے نوشی کا بازار گرم ہے بعینہٖ یہی فضا شوکت تھانوی نے اپنی مکتوباتی پیروڈی میں پان سے اپنے تعلق خاطر کے تذکرے سے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چائے کو جس طرح فنجان سے قرب کا واسطہ ہے۔ پان کی مناسبت سے وہی تاثر پاندان سے ابھر کر سامنے آتا ہے۔ مکتوب آزاد کے بالمقابل شوکت تھانوی کی پیروڈی کا انداز دیکھیے:

"......وہی صبح کا روح افزا وقت ہے۔ چائے پی رہا ہوں اور آپ کی یاد تازہ کر رہا ہوں۔ آپ سن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں لیکن روئے سخن آپ ہی کی جانب ہے۔ اس سلسلۂ عمل کی ہر کڑی چائے کے ایک گھونٹ اور سگریٹ کے کش کے باہمی امتزاج سے ڈھلتی جاتی ہے اور سلسلۂ کار دراز ہوتا جاتا ہے۔ مقصود اس درازنفسی سے اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مخاطبت کے لیے تقریب سخن ہاتھ آئے......"۔ (غبار خاطر)

''......وہی صبح کا جان لیوا وقت ہے۔ دھوپ ہر طرف پھیل چکی ہے جس کی ہلکی ہلکی آنچ محسوس کر رہا ہوں۔ بستر پر لیٹا ورزش کر رہا ہوں جس کو اصطلاح عام میں انگڑائیاں کہتے ہیں۔ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ مگر نیند کا ارمان باقی ہے۔ کاش کچھ دیر اور سو لیتا۔ مگر نیند اب آنکھوں سے طوطا چشمی کر رہی ہے۔ ناچار اٹھ بیٹھا اور پاندان کی طرف دست طلب بڑھا دیا۔ میں اس پہلے پان کو صبوحی کہتا ہوں......''۔ (بار خاطر)

(بار خاطر، شوکت تھانوی، آزاد بک ڈپو امرت سر، ص۔ 91)

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیروڈی میں تعین وقت اور اصل ماحول سے بھی نسبت قائم رکھنے کی شعوری کوشش کارفرما ہے۔ البتہ اصل عبارت 'صبح کا روح افزا وقت' کے برعکس پیروڈی میں 'جان لیوا وقت' سے بالکل متضاد کیفیت کا احساس ہوتا ہے اور اسی کی مناسبت سے دھوپ اور ہلکی ہلکی آنچ کا جواز نکل آتا ہے۔ یہ پیروڈی کا حسن ہے۔ تازہ دم ہونے کا عمل جس طرح چائے کے گھونٹ اور سگریٹ کے کش کے باہمی امتزاج سے ترکیب پاتا ہے ٹھیک اسی طرح تازہ دم ہونے کے لیے پیروڈی میں پان کی طرف دست طلب بڑھنے لگتا ہے۔

پیروڈی نگار نے کمال فنکاری سے پیروڈی کو انھی جذبات، ماحول، اسلوب، ساخت اور قریب قریب الفاظ سے مجسم کیا ہے جو اصل کا امتیازی وصف ہے، اس رکھ رکھاؤ نے پیروڈی کو فنی بلندیوں سے آشنا کر دیا ہے جو ظاہر ہے بعد کے قلم کاروں کے لیے نشان منزل ثابت ہوا۔

رشید احمد صدیقی نے گرچہ براہ راست فن پیروڈی کو اپنے وجدان سے وہ تابانی نہیں بخشی جو مزاحیہ ادب کے دوسرے گوشوں کے حصے میں آئی ہے تاہم وہ اس فن کے زبردست مؤید اور حمایت کار تھے بلکہ اردو ادب میں اس فن کے نباض، نکتہ داں اور مرشد کی حیثیت رکھتے تھے۔ اہل خرد جانتے ہیں کہ بلند پایہ تخلیقی ادب اور بلند پایہ تخلیق کار— تصنیف الرجال میں کس کی تخلیق آسان اور ترجیحی اولیت کا حامل ہے۔ اگر جواب آخرالذکر ہے تو بلاشبہ رشید احمد صدیقی کو احمد جمال پاشا جیسے پیروڈی کے پیکر مجسم کا سنگ تراش اور خالق کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ان کے زیر سرپرستی سرزمین سرسید سے اس فن کے نہ جانے کتنے نکتہ داں اور نباض پیدا ہوئے۔

رشید احمد صدیقی کی تخلیقات میں گاہے بہ گاہے پیروڈی کی خوشبو محسوس کی جاسکتی ہے۔ 'غالب کی خوش بیانی' میں پیروڈی کے خدو خال دیکھے جاسکتے ہیں جب کہ 'ارہر کے کھیت' کو بعض ناقدوں نے موضوعی پیروڈی کے خانے میں ڈالا ہے۔ اس طرح نثری پیروڈی کے فروغ میں رشید احمد صدیقی نے اس صنف کی جہت متعین کرنے میں فعال کردار نبھایا ہے۔

بیانیہ پیروڈی کے حوالے سے کنھیا لال کپور کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کپور نے سنجیدگی سے نثری پیروڈی کی روایت کو اپنی شعوری کاوش کی جولان گاہ بنایا اور سطحی روش سے ہٹ کر نئے جوش، امنگ اور نئے طرز اظہار کے ساتھ اس فن کو اس کے نقطۂ کمال تک جا پہنچایا ہے۔ غالباً یہ ان کی افتادِ طبع کی پکار تھی کہ انھوں نے فطری طور پر سرزمین پیروڈی سے اپنا تخلیقی سفر شروع کیا اور 1942 میں 'غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں' لکھ کر دنیائے ادب میں مقبول ہوئے۔ یہ پیروڈی بنیادی طور پر ترقی پسند ادبی تحریک، نظم معریٰ اور آزاد نظم نگاری کا تحریفی محاسبہ ہے۔ 'سنگ و خشت' میں شامل اس پیروڈی میں کپور کا عہد، اس عہد کی شاعرانہ روایت، شعرائے جدید کی ناہمواریاں اور ان کے تشدد پسند رویے پر چوٹ کی گئی ہے۔ پیروڈی کی فضا اور اس کا انداز ڈرامائی ہے۔ دورِ جدید کے شعرا کی ایک محفل میں جنت سے تشریف لا رہے مرزا غالب کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ پیروڈی کا امکان مرزا غالب کی اس خواہش میں ڈھونڈا گیا ہے کہ وہ نئے دور کے شعرا سے شرف نیاز حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہیں سے پیروڈی کے پردہ میں دورِ جدید کی شاعری اور اس کی کمیوں سے پردہ اٹھنا شروع ہو جاتا ہے۔ صورت حال اس وقت دلچسپ ہو جاتی ہے جب دورِ جدید کے نمائندہ شعرا کے اسما کی تحریف پر نظر پڑتی ہے۔

تصدق حسین خالد، قربان حسین خالص، فیض احمد فیض، غیظ احمد غیظ، میراجی، ہیراجی، راجا مہدی علی خاں، راجہ عہد علی خاں، اندر جیت شرما، بکرما جیت ورما، قیوم نظر، عبدالحی نگاہ، رفیق احمد خاور، رفیق احمد خوگر اور ن۔م۔ راشد، م۔ن۔ ارشد کے محرف منتخب اسما کے ساتھ شریک مجلس ہیں۔

مرزا غالب کے پہنچتے ہی خوش گپیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ غالب بتاتے ہیں کہ جنت میں آسائش و آرام کے باوجود ایک شعر بھی موزوں نہ کرسکا۔ صدر مجلس م۔ن۔ ارشد مشاعرے کا آغاز

مرزا غالب کے کلام سے کرنا چاہتے ہیں۔ شمع کی فرمائش پر غالب کو بتایا جاتا ہے کہ یہ نیا دور ہے اور اس کی روایت کے مطابق انھیں پچاس کینڈل پاور کے بجلی کے لیمپ کے سامنے پڑھنا ہوگا۔ جدید شعرا غالب کے کلام پر ہنستے ہیں اور ان کے شعر کو بے معنی بتایا جاتا ہے۔ غالب کے شعر ۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

کو ڈاکٹر قربان حسین خالص کی رائے میں اس طرح موزوں کیا جائے تو زیادہ مناسب رہے گا۔

خط لکھیں گے کیونکہ چھٹی ہے ہمیں دفتر سے آج
اور چاہے بھیجنا ہم کو پڑے بیرنگ ہی
پھر بھی تم کو خط لکھیں گے ہم ضرور
چاہے مطلب کچھ نہ ہو
جس طرح میری ایک نظم کا
کچھ بھی تو مطلب نہیں
خط لکھیں گے کیونکہ الفت ہے ہمیں
میرا مطلب ہے محبت ہے ہمیں
یعنی عاشق ہیں تمھارے نام کا

اس پر تعجب اور افسوس کے عالم میں مرزا غالب کا یہ تبصرہ سامنے آتا ہے ۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

اس محفل میں میراجی 'جنون'، عبدالحی نگاہ، 'عشق' اور غیض احمد غیض اپنی مقبول نظم 'لگائی' پیش کرتے ہیں۔ جدید شاعری کے پیر و مرشد ن۔م۔ ارشد سے کلام کی فرمائش کیے جانے پر وہ اپنی نظم 'بدلہ' سناتے ہیں جو غالب کی ''فہم سے بالاتر ہے—''۔ 'عشق' کو مرزا غالب نظم تسلیم نہیں کرتے۔ جدید شاعری پر بحث ہوتی ہے۔ راجا عہد علی خاں کی نظم 'ڈاکخانہ' غالب کو حیرانی میں ڈال دیتی ہے۔ پھر ہیراجی اپنی نظم 'بیگن'، بکرماجیت ورما ایک گیت 'برہن کا سندیس' اور 'کبوتر' پیش کرتے ہیں۔ مرزا غالب

پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ دروازے کی طرف دیکھتے ہیں اور 'بول کبوتر بول، بول کبوتر بول۔ بول کبوتر بول—" کے شور وغل سے متوحش ہو کر کمرے سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

اس شاہکار پیروڈی میں ڈرامائی کیفیت کے ساتھ شوخ طنز کا پہلو غالب ہے۔ جدید شاعری کا محاسبہ کرتے ہوئے یہ پیروڈی اس کی خامیوں کو کامیابی کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اس میں فیض کی نظم "تنہائی" کی پیروڈی کو اہل نظر نے بہت سراہا ہے۔ پیروڈی 'لنگائی' میں شاعر کے فن اور اس کے انداز تخیل کو کمال فنکارانہ ہنرمندی سے پیش کیا گیا ہے۔

ن۔م۔ راشد کی مقبول زمانہ نظموں 'انتقام' اور 'دریچے کے قریب' میں سیاست کے نفسیاتی جائزے اور 'انتقام' میں ظاہر ہونے والے ردعمل کے منفی اور مضحکہ خیز پہلوؤں کو پیروڈی کے ذریعے نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ ساری بحث جدید شاعری، آزاد نظم کی فنی خامیوں اور بے راہ روی کے حوالے سے کی گئی ہے۔ جس میں جدید دور کے شعرا کے مجلسی آداب اور کسی کو خاطر میں نہ لانے والی ان کی روش کو راست نشانہ بنایا گیا ہے۔ کرسی صدارت غالب جیسے مہمان استاد کے بجائے ن۔م۔ ارشد کو سونپ دی جاتی ہے۔ پیروڈی میں واضح طور پر احساس ہوتا ہے کہ غالب کے زمانے میں آداب محفل کی روایت پر وقت کی دھول پڑ چکی ہے۔ شعرا نہ صرف اپنے مہمان استاد غالب کا مذاق اڑاتے ہیں بلکہ ان کا شعر بھی مہمل بتایا جاتا ہے۔ اس انداز میں یہ پیروڈی 'آداب محفل'، 'شعر فہمی' اور کلاسیکی ذوق سے تہی دامن جدید شعرا کی شعری خامیوں کو سامنے لاتی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ جدید شاعری کی تعفن آمیز طوالت دو مصرعوں والی غزل کے اعجاز، جامعیت اور حسن سے کس طرح خالی ہے۔ اس میں نہ شعریت ہے اور نہ شعری نغمگی کا سحر۔ ارشد اور غیض جیسے جدید شاعری کے اماموں کی نمائندگی کے پس پردہ پیروڈی میں یہ پیغام بھی پوشیدہ ہے کہ جدید شاعری کے نام پر شعر وسخن کی مٹی خود امام فن کہلانے والے جدید شعرا کے ہاتھوں پلید ہو رہی ہے۔ اس پیروڈی کے نرغے میں جدید شاعری کی مغلق علامتوں، ابہام اور لغویت جیسے نقائص کے علاوہ ردیف قافیہ جیسے فنی نظم وضبط سے بغاوت اور جمالیاتی لطافتوں سے ہٹ کر بم، بھوک، بیکاری، انقلاب، ڈاک خانہ، بینگن، کوے اور کبوتر جیسے غیر شاعرانہ موضوعات کو لے کر کی جانے والی شاعری اور بے کیف شاعرانہ رویے پر بھرپور حملہ ہے۔ جدید

شاعری میں پایا جانے والا عدم توازن از خود مترشح ہو جاتا ہے اور اس طرح یہ پیروڈی کپور کے تحریفی وجدان کا آئینہ بن جاتی ہے۔

امتیاز علی تاج کے ڈرامے 'انارکلی' کی پیروڈی کنھیا لال کپور نے 'سلیم اور انارکلی' کے عنوان سے کی ہے اور بڑی فنکاری سے اصل تخلیق کے قدیم کردار کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ہے۔ 64 صفحات پر مشتمل یہ پیروڈی مجموعہ 'گرد کارواں' میں شامل ہے۔ اس پیروڈی میں سلطنت مغلیہ کے قابل ذکر تاریخی کرداروں — ہز مجسٹی اکبر، بیربل (ہز مجسٹی کا پرائیویٹ سکریٹری)، ابوالفضل وزیر اعظم، فیضی وزیر داخلہ، ٹوڈرمل وزیر زراعت، خانخاناں وزیر خارجہ، ملا دو پیازہ وزیر طنز و مزاح، پرنس سلیم، نادرہ عرف انارکلی، ہز مجسٹی مریم زمانی، سراغ علی خان افسر اعلیٰ سی آئی ڈی وغیرہ کو جدید فیشن سے ہم آہنگ کر کے اس کی آڑ میں موجودہ حکمرانوں کی معاشرتی بے راہ روی، ذہنی کھوکھلا پن اور 1960 کی عبوری تہذیب کے بے ڈھنگے پن کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

اس پیروڈی میں دس مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ تان سین سے بیزار اکبر ریڈیو سیلون سے لتا منگیشکر اور طلعت محمود کے ریکارڈ سنتے نظر آتے ہیں، بیربل کے گھر ٹیلی فون کی سہولت ہے اور وہ پارکر پن (51) سے لکھتا نظر آتا ہے جو اس وقت جدید فیشن کی علامت تصور کیا جاتا تھا۔ ابوالفضل عمدہ قسم کے شارک اسکین کے سوٹ میں خدا حافظ کے بجائے 'گڈ بائی' کہتے نظر آتے ہیں۔ ملا دو پیازہ اور بیربل ایک دوسرے کو چور کہتے ہیں کیوں کہ یہ دونوں 'امریکن بک آف جوکس' نامی ایک ہی کتاب سے لطیفے چراتے ہیں۔ سلیم کو انگریزی سوٹ میں ملبوس بی ایس سی کا طالب علم دکھایا گیا ہے جب کہ 'انارکلی' غرارہ اور قمیص پہنے ایک فیشن پرست الھڑ کالج اسٹوڈنٹ نظر آتی ہے۔ یہ دونوں فلم 'لیلیٰ مجنوں' کا سیکنڈ شو دیکھتے ہیں اور دوران گفتگو بار بار انگریزی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں جو بڑی خوبی سے ہماری قدیم اقدار و روایات پر جدید انگریزی تہذیب کی آمد کی جانب اشارہ کرتا ہے اور موجودہ زمانے کے یونیورسٹی کلچر کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ پیروڈی میں کرداروں کی گفتگو کے ذریعہ کلاسیکل میوزک، ریڈیو کی تقریروں، ہندستانی فلموں، ہندستانی شاعروں کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ اس ڈرامے کی پیروڈی اور اس کی غرض و غایت کو کپور نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"یہ سب کچھ میں نے اس لیے کیا کہ وہ بدنما دھبہ آپ کے دامن پر قریب چار صدیوں سے لگا آرہا تھا، اسے یکسر دھو دیا جائے تا کہ بیسویں صدی کے لوگ انصاف پرور اور عدل گستر اکبر کو روایت کی بجائے حقیقت کے آئینہ میں دیکھیں اور خود فیصلہ کریں کہ آیا اکبر جیسا اعلیٰ نسب اور عالی دماغ شہنشاہ انار کلی کو زمین میں زندہ دفنانے کا حکم صادر کر سکتا ہے۔"

طوالت کے باوجود اس پیروڈی میں مکالموں کی درستی، روانی اور شگفتگی کا جو عالم ہے وہ شروع سے آخر تک قائم ہے۔

'شیشہ و تیشہ' کی آخری پیروڈی 'میر کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ' ایک عمدہ پیروڈی ہے جس میں میر کے کلام میں مالیخولیا کی علامات کی نشاندہی کی آڑ میں نفسیاتی تنقید اور اس کے نقادوں کی اس روش سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ کس طرح یہ حضرات سیدھے سادے اشعار کو تل کا تاڑ بنا دیتے ہیں اور نکتہ آفرینی کے نام پر لایعنی نکات پیدا کرنے کے فراق میں لگے رہتے ہیں۔ پیروڈی نگار کے اچھوتے خیالات، شوخ پیرایۂ اظہار اور غور و فکر نے اس پیروڈی کو صف اول کی پیروڈی میں لا کھڑا کیا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"معلوم ہوتا ہے کہ میر کو مالیخولیا کا دورہ موسم بہار میں پڑتا تھا۔ ایک شعر میں اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی
دھوم ہے پھر بہار آنے کی

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی! مگر افسوس جن لوگوں کو اس دوانے کی فکر لازم تھی انھوں نے مجرمانہ غفلت کا ثبوت دیا۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں اگر نواب آصف الدولہ چھ ماہ کے لیے میر کو کسی سینے ٹوریم میں بھیج دیتے تو......!"۔

(میر کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ، کنھیا لال کپور، شیشہ و تیشہ، مکتبہ لاہور، 1961)

'گرد کارواں' کپور کی ایک بلند پایہ پیروڈی ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد کی شہرۂ آفاق کتاب 'غبار خاطر' کے خطوط کے فارم میں لکھی گئی ہے۔ جس میں مولانا ابوالکلام کی شخصیت کے سیاسی پہلو کو نشانہ بناتے ہوئے عربی فارسی الفاظ کو ہندی اور فارسی رسم الخط میں لکھ کر آزاد کی ہندی کی حمایت

پر چوٹ کی گئی ہے پیروڈی نگار نے اس پیروڈی کے ذریعہ اردو کے تئیں مولانا آزاد کی خاموشی اور سیاسی مصلحت پر اردو کی قربانی کا نوحہ رقم کیا ہے۔

کپور کی پیروڈیوں کی فہرست بڑی لمبی ہے۔ متذکرہ پیروڈیاں کپور کی کامیاب اور نمائندہ پیروڈیاں ہیں جو ہمارے انتخاب کا حصہ ہیں۔

فرقت کاکوروی کا نام نظم اور نثر دونوں حوالوں سے اہم ہے۔ پیروڈی کو اردو ادب میں بطور فن استحکام بخشنے میں فرقت نے کلیدی کردار نبھایا ہے۔ 'مداوا' (1944) فرقت کی پیروڈی کا پہلا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے ترقی پسند تحریک کے غیر متوازن رویے کے حامل تمام اہم اور قابل ذکر شعرا کے کلام کی نکتہ چینی کی اور بقیہ شعرا کو اپنے دوسرے مجموعے 'ناروا' (1946) کے دامن میں سمیٹ لیا۔ ان کی پیروڈی کا تیسرا مجموعہ 'غالب خستہ کے بغیر' (1969) ہے۔ فرقت کا آخری کارنامہ 'قد مچے' (1970) کی پیروڈیاں ہیں جو جدیدیت کی تحریک میں عدم توازن، ریاضیاتی اور فارمولہ بند شاعری، کلاسیکی آداب، اقدار اور فنی رکھ رکھاو کے محاسبہ کے لیے مختص ہیں۔

''غالب خستہ کے بغیر'' میں شامل فرقت کی مکتوباتی پیروڈیاں غالب کے اسلوب اور انداز میں لکھی گئی ہیں۔ یہ چھے خطوط ہیں جو مرزا غالب کی طرف سے پیروڈی نگار نے ہمایوں کبیر، علی عباس حسینی، بابائے اردو مولوی عبدالحق، وقار عظیم، جوش ملیح آبادی اور شوکت تھانوی کے نام تحریر فرمائے ہیں۔ پیروڈی کے قالب میں یہ جملہ مکاتیب نہایت دلچسپ ہیں جن میں غالب کے اسلوب میں مکتوب الیہ کی شخصیت کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطوط غالب سے عالم برزخ سے لکھوائے گئے ہیں۔ ماہنامہ بیسویں صدی میں پہلی بار جب یہ خطوط شائع ہوئے تو اس وقت یہ سبھی مکتوب الیہم بقید حیات تھے۔ قارئین نے فرقت کاکوروی کے اس تحریفی انداز کو بہت سراہا اور یہ حقیقت ہے کہ اپنے ہدف اور مشمولات کے اعتبار سے آج بھی اس کی دلچسپی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے بلکہ اردو کی موجودہ صورت حال کے تناظر میں ان کا مطالعہ کیا جائے تو ان خطوط میں عصری آگہی کی روح سانس لیتی نظر آئے گی۔ زبان و بیان کے شیدائی اور شعر و سخن کے پیر و مرشد غالب کا سہارا لے کر پیروڈی نگار نے تقسیم ہند کے بعد ہندستان میں اردو کے ساتھ جاری ناانصافی اور اردو کے چوٹی کے علمبرداروں کی پاکستان مہاجرت سے اردو کی ترقی پر پڑنے والے

منفی اثرات پر روشنی ڈالی ہے۔ پیروڈی نگار نے ان خطوط میں غالب کا اسلوبیاتی تتبع کیا ہے جو مکتوب نگاری میں ید طولیٰ رکھتے تھے تا کہ قارئین کو غالب کے دلکش انداز میں عصری مسائل سے آگاہ کیا جائے۔ یہ جملہ مکتوبات ہمارے انتخاب کی زینت ہیں۔

برصغیر ہند و پاک میں نثری پیروڈی کو رفعت آشنا کرنے میں شفیق الرحمٰن کی پیروڈیوں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ گہری سماجی اور ادبی بصیرت نے ان کے اسلوب میں وہ ندرت اور جدت پیدا کی جس سے ان کی پیروڈیوں نے فنی بلندیوں کی نئی تاریخ رقم کی ہے۔ نثری پیروڈیوں کا جو بے کراں سمندر کنھیا لال کپور کے یہاں ٹھاٹھیں مارتا محسوس ہوتا ہے وہی طغیانی اور موج بلا خیز شفیق الرحمٰن کی خلاقانہ پیروڈی میں بھی موجزن ہے۔ تزک نادری، قصہ چہار درویش، قصہ حاتم طائی بے تصویر، قصہ پروفیسر علی بابا کا، سفر نامہ جہاز بادسندھی، اور زنانہ اردو مخط و کتابت جیسی مایہ ناز پیروڈیوں میں ان کے فکر و فن کی عظمت دیکھی جا سکتی ہے۔

ہمارے انتخاب میں شفیق الرحمٰن کی دو نمائندہ پیروڈیاں — 'تزک نادری' اور 'سفر نامہ جہاز بادسندھی' شامل ہیں۔ 'تزک نادری عرف سیاحت نامہ ہند' شاہکار پیروڈی کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ طویل پیروڈی دراصل قدیم تزک شاہی کی مضحک تقلید ہے۔ جو تفصیل سے سینتالیس ذیلی عناوین کے تحت تاریخی معنویت کے حامل نادر علی شاہ کے شب و روز کے حالات سے واقف کراتی ہے۔ انداز بالکل وہی ہے جو قدیم تزک شاہی کا ہوا کرتا تھا۔ اس میں تزک نویسی کے روایتی بلند بانگ دعوؤں کا طنطنہ ہے، بادشاہ کی شان و شوکت اور اس کے قوت بازو کی دہائی دی گئی ہے۔ دہلی پر نادر علی شاہ کی قتل و غارت گری اور لوٹ مار کو محض لاٹھی چارج بتا کر بادشاہ کے ظلم و زیادتی پر پردہ ڈالنے کی شعوری کوششیں کی گئی ہیں۔ اپنے اقبال کے نغمے الاپے گئے ہیں اور مفتوحہ ممالک میں پیش آنے والے تجربات اور مشاہدات کو خاصی اہمیت دے کر بیان کیا گیا ہے جو شاہی روزنامچہ کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ اس طرح یہ پیروڈی اپنی تقلیدی روش میں بادشاہوں کے قدیم اور روایتی انداز روزنامچہ نویسی کے حدود میں داخل ہو گئی ہے اور قدیم طرز معاشرت، فکر اور رسم و رواج سے اس طرح پردہ اٹھاتی ہے کہ اس معاشرت کا کوڑھ از خود عیاں ہو جاتا ہے۔ دور حاضر کے مابین پائے جانے والے تضادات اور یک رنگی کی آمیزش سے طنز

کے متعدد پہلو ابھرتے ہیں۔ جس میں رشوت ستانی، تملق پرستی، حلیہ سازی، مے نوشی، سیاسی دنگے اور فساد، فیشن پرستی، ہندی فوج کی آرام طلبی، اسکینڈل، میڈیا کا بے جا استعمال، لیڈری اور پیری مریدی، رجعت پسندی اور ترقی پسندی، شعر وسخن اور نظم آزاد پر طنز ونشتر کی بارش کی گئی ہے جو ظاہر ہے قدیم اور جدید معاشرت میں یکساں طور پر توجہ طلب ہیں۔ یہ پیروڈی اس طرح دو متضاد عہد اور اس کے یکساں اقدار کی خامیوں پر ناقدانہ نگاہ ڈالتی ہے۔ جس میں فن پیروڈی کے فاضل ناقد فضل جاوید کے الفاظ میں ''پڑھنے والا قہقہہ لگاتے ہوئے بھی ان نقائص کو دیکھ لیتا ہے جس کی نشاندہی پیروڈی نگار کا مقصد ہے''۔

ڈاکٹر شفیق الرحمٰن کی ایک اور مقبول پیروڈی جو ہمارے انتخاب میں شامل کی ہے، وہ ''سفرنامہ جہاز بادسندھی کا'' ہے۔ یہ پیروڈی بنیادی طور پر تنقید کی خامیوں کو اجاگر کرتی ہے اور ان طریقوں پر روشنی ڈالتی ہے، جنھیں اپنا کر لوگ نہ صرف سطحی شہرت حاصل کرتے ہیں، بلکہ نقاد بھی کہلاتے ہیں۔

نثری پیروڈی کی روایت کو فکر تونسوی نے بڑے تزک واحتشام سے آگے بڑھایا ہے اور خاصی پیروڈیاں تخلیق کی ہیں۔ ان کی پیروڈی 'دہلی جو ایک شہر ہے' جغرافیہ اور تاریخ نویسوں کو نشانہ بناتی ہے۔ جب کہ مکتوب نویسی کے مروجہ روایتی طرز بیان کو انھوں نے 'لو لیٹرز' کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ 'تواریخ دلی کا آخری باب'، 'آہ فکر تونسوی'، 'ایک مصرع کا جشن اجرا'، 'موڈرن ہنو پدلیس' اور 'آسمانی کتاب' وغیرہ ان کی قابل ذکر پیروڈیاں ہیں۔

ہم نے اپنے انتخاب میں فکر تونسوی کی پیروڈی 'آسمانی کتاب' کو شامل کیا ہے۔ یہ تونسوی کا سب سے جداگانہ رنگ ہے۔ یہ پیروڈی گہری طنزیہ اساس رکھتی ہے۔ طرز ادا اور اسلوبیاتی زمرے کی یہ شاہکار پیروڈی قدیم مذہبی اور فقہی کتب کے اسلوب اور پیرایۂ بیان میں لکھی گئی ہے۔ زبان اور اظہار مطالب کی سطح پر ٹھہراؤ اور تقدس آمیز لہجہ جو عموماً صحیفوں کی زبان اور طرز اظہار کی نمایاں خوبیاں ہیں، پیروڈی میں موجود ہیں۔ لہجے کی قدامت اور جملوں کی ساخت بھی پیروڈی کو فنی طور پر کسی مقدس صحیفۂ سماوی کے ماحول میں لے جاتی ہے۔ فقہی کتب سے ہم آہنگی کے بطور پیروڈی متعدد ابواب میں منقسم ہے۔ یہ تقسیم ہند وپاک کے المناک قضیے پر مبنی ہے جو فی نفسہٖ سنجیدگی اور متانت چاہتا ہے۔ ایک دل پاش اور حساس تار کو چھیڑنے کے لیے پیروڈی نگار کو ایک ایسی

سنجیدہ زمین کی تلاش تھی جس کے سہارے وہ اس خونچکاں آفتِ سماوی کا اظہار کرتا۔ لہٰذا اس کے لیے پیروڈی نگار نے مذہبی فضا، زمین اور لہجے کا انتخاب کیا اور پیروڈی خلق کی۔ پیروڈی کے مباحث ذہن وفکر کو کچوکے لگاتے ہیں، تقسیم ملک کے سیاق میں تکرتونسوی کے یہ سارے تیر ونشتر حقیقت پر مبنی ہیں، بلکہ بسا اوقات حقائق اس سے زیادہ سفاک اور زخم اس سے زیادہ گہرے رہے ہیں جنھیں پیروڈی اپنے طنزیہ اسلوب میں بیان کرتی ہے۔ بہ ظاہر اس میں مزاح کی کارفرمائی نظر نہیں آتی لیکن اسے پڑھتے ہوئے اگر آپ کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھے تو سمجھ لیجیے کہ یہ تبسم نہیں بلکہ وہ استہزائی کیفیت ہے جو انسان پر کبھی موت کی بستی سے گزرتے ہوئے طاری ہو جایا کرتی ہے۔ یہ 'آسمانی کتاب' ہے جو ایک ساتھ پاکستان اور ہندستان کے مہاجروں اور شرنارتھیوں پر اتری ہے، دراصل یہ ایک شرنارتھی کے دل کا غبار ہے جسے اس نے پیروڈی کے پیرائے میں پیش کیا ہے۔ باب اول 'پیدائش کے بیان میں' سے یہ عبارت دیکھیے:

اور ابتدا میں خداوند خدا نے انگریز کو اور اس کی سیاست کو پیدا کیا۔
اور انگریز چالاک اور سفاک تھا اور اس کے اندر سیاست تھی اور خدا کی روح اس کے ساتھ تھی۔
اور انگریز نے کہا ''جدا ہو جاؤ'' سو جدائی ہو گئی، اور خدا نے جدائی کو دیکھا کہ اچھی ہے
اور خدا نے ہندو کو مسلمان سے جدا کیا اور جدائی کو پاکستان کہا۔ سو پاکستان ہو گیا۔
پھر خدا نے کہا۔ پاکستان کے اور ہندستان کے بیچ میں شرنارتھی ہووے۔ سو ہو گیا۔ شرنارتھی کا رنگ موافق زمہریر کے تھا۔ اور اس کی چشم میں آگ تھی۔ پھر یہ آگ نور کا تقدس ہوئی۔ یہ تقدس ہر آزاد انسان کا ہووے خداوند خدا نے ایسا کہا۔
سو خداوند کا حکم اٹل بنا۔ آدم کے بیٹے شرنارتھی بنے۔ مہاجر بنے، کیونکہ وہ تو خدا کے بتائے ہوئے نعرے لگانا لازم کرتے تھے نفرت اور حقارت اور درندگی عام کرنا طلب کرتے تھے۔ اور ان شرنارتھیوں کے اور ان مہاجروں کے اوپر تسلط جائز ٹھہرا۔
لا الہٰ کا۔ ست سری اکال کا۔......
تب خدا کے عظیم اور ارفع بیٹوں نے کہا۔ زمین کا لہو قلیل مقدار میں نہیں بہنا چاہیے۔ کہ ایسا آزادی کے شایان میں مناسب نہیں تھا۔ سو آزادی کی شان کا فیصلہ

ظہور میں آیا۔ یعنی شرنارتھی مہاجر کے بدلے میں اور مہاجر شرنارتھی کے بدلے میں مُہاں ہوا"۔ (آسانی کتاب، فکر تونسوی، ص۔68)

دورِ حاضر میں کنھیا لال کپور اور شفیق الرحمٰن کی صحت مند تحریفی امانت کو احمد جمال پاشا نے نئی جہت اور نئے امکان سے روشناس کرایا اور اس صنف کو اس مقام پر لا کھڑا کیا جہاں اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے اردو پیروڈی عالمی ادبیات پیروڈی سے نظریں ملا سکتی ہیں۔ ان کے یہاں صاحب طرز انشا پردازوں اور ناقدین کے اسلوب نگارش کی پیروڈی کی بڑی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ آموختہ خوانی میری، کپور ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ اور گلیسر بوائے کا خط اس سلسلہ کی اہم تحریفی کڑیاں ہیں۔ جسے غیر معمولی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

معاشرتی خامیوں سے پردہ اٹھانے کے ضمن میں فردوسی کے منظوم شاہکار شاہنامہ، کی نثری پیروڈی 'رستم امتحان کے میدان میں'، 'غدر 1857 کے اسباب'، 'چین و بنگال کا جادو'، 'طلسمات الو'، 'تسخیر دل'، 'چند حسینوں کے خطوط' اور مختصر پیروڈیوں میں 'درخواستیں مطلوب ہیں'، 'اشتہار'، 'آپ کی قسمت کا ایک ہفتہ' اور 'زائچہ سال نو' وغیرہ قابل ذکر پیروڈیاں ہیں۔

ہمارے انتخاب میں احمد جمال پاشا کی تین پیروڈیاں شامل ہیں۔ دو طرز ادا اور اسلوب بیان کے حوالے سے اور ایک معاشرتی خامیوں کے حوالے سے۔ 'آموختہ خوانی میری' طرز ادا کی پیروڈی کا عمدہ نمونہ ہے جو رشید احمد صدیقی کی تحریر 'آشفتہ بیانی میری' کا اسلوبیاتی تتبع ہے۔ یہ پیروڈی رشید احمد صدیقی کے اسلوبِ خاص کو نشانہ بناتی ہے۔ اس میں بات میں بات پیدا کرنے، مزید نکتے ڈھونڈ نکالنے، نتیجے کے طور پر عموماً اپنے موضوع کے حدود سے نکل جانا، الفاظ کی مزاحیہ فکر انگیز کیفیت کو الفاظ کی صوتیاتی آہنگ سے کشید کرنے، جیسی رشید احمد صدیقی کی اسلوبیاتی خصوصیات موجود ہیں۔

"میرا تجربہ تو بتاتا ہے کہ لوگ سیر و تفریح کے بہانے گھر کا سودا خرید لاتے ہیں اور خرید و فروخت کے بہانے سنیما دیکھ آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاں خرید و فروخت ہوگی وہاں لوگ سنیما دیکھیں گے اور جہاں پر سیر سپاٹے کے امکانات ہوں گے وہاں لوگ خرید و فروخت کرتے نظر آئیں گے خرید زیادہ فروخت کم، میرے خیال میں یہ

عجیب وغریب بات ہے جو عجیب تو کم مگر غریب زیادہ ہے...... دراصل میں دیہاتی ہوں تخلیقاً شہری کہلاتا ہوں اور اخلاقاً تعلیم یافتہ۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ مجھے تعلیم یافتہ دیہاتی سمجھیں یا دیہاتی تعلیم یافتہ۔ مجھے خود معلوم نہیں کہ میں دیہاتی پہلے ہوں اور تعلیم یافتہ بعد میں یا تعلیم یافتہ پہلے اور دیہاتی بعد میں۔ خدا آپ لوگوں کا بھلا کرے کہ اس وقت مجھے دیہات اور تعلیم یافتہ دونوں یاد آ گئے لیکن آپ معاف فرمائیں۔ مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ میں کچھ غیر متعلق باتیں کرنے لگا ہوں''۔

'کپور ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ' اس سلسلہ کی سب سے کامیاب پیروڈی ہے۔ فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے پیروڈی نگار نے اپنے عہد کے اہم صاحب طرز انشا پردازوں اور ناقدوں کی تحریری انفرادیت اور مخصوص ماحول کو لے کر انھی کے انداز میں یہ پیروڈی لکھی ہے۔ ظفر کمالی کے بقول ''اس پیروڈی میں احمد جمال پاشا فن کی اس بلندی پر جا پہنچے ہیں جس کے آگے کسی فن کار کی رسائی نہایت دشوار ہے''۔ مجموعہ 'اندیشہ شہر' میں صرف وہی حصہ شامل ہے جس میں رشید احمد صدیقی، احتشام حسین، کلیم الدین احمد، عبادت بریلوی اور قاضی عبدالودود کے اسلوب تحریر کی پیروڈی کی گئی ہے۔ جب کہ پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تحریر خاص کے تتبع میں لکھے گئے اجزا مکمل شکل میں صرف ''اسکالر'' پیروڈی نمبر ہی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہمارے انتخاب میں یہ پیروڈی مکمل صورت میں شامل ہے۔

یہ پیروڈی بڑی کامیابی سے طرز مخصوص کا تعاقب کرتی ہے۔ مثلاً عبادت بریلوی کے یہاں طوالت اور پیچیدہ بیانی کے علاوہ بے جا تکرار اور بیزاری کا جو عام رجحان پایا جاتا ہے اس میں مبالغے کا سہارا لے کر اسے نمایاں کیا گیا ہے اور اس نوع کی بے جا طول نویسی کو نشانہ بنایا گیا ہے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد کے اسلوب نقد کا پیچھا کرتے ہوئے پیروڈی میں وہی کیفیت موجود ہے جو کلیم الدین احمد کی تحریری شناخت ہے مثلاً ان کا انتہا پسندانہ رویہ، دوٹوک اور راست انداز، ادیبوں اور نقادوں کی ایک ساتھ تعریف اور مذمت جیسے تنقیدی رویے وغیرہ۔ ذیل کی عبارت پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں کلیم الدین احمد کی گہری چھاپ موجود ہے۔

خیالات میں ذرا سی تبدیلی کے ذریعہ مزاح کی نہ صرف کیفیت پیدا ہوئی ہے بلکہ اس سے پیروڈی نگار کا مقصد بھی ہاتھ آ گیا ہے۔

"اردو میں طنز و مزاح کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ مفکر کا نقطۂ خیال ہے یا زبرے کی موہوم کر......ان کتابوں کے دیباچے پڑھتا گویا جہاد کرنا ہے......ان تمام باتوں کے باوجود کسی نے اب تک "نرم گرم" سے بہتر کارنامہ نہیں پیش کیا۔ یہ خیال کہ "نرم گرم" اردو میں طنز و ظرافت کا بہترین کارنامہ ہے نہایت حوصلہ شکن ہے......ان کی وقعت مشاعروں کی سبحان اللہ سے زیادہ نہیں"۔

قاضی عبدالودود کا اسلوب نسبتاً ادق اور مشکل ہے۔ مخطوطے یا کسی کتاب پر اشاروں میں پیروڈی نگار نے کمال ہوشیاری سے ان کی 'تبصراتی روش' کا تعاقب کیا ہے اور اس کا سرا قاضی صاحب کے اسلوب سے جا ملایا ہے۔

"اس مخطوطے کو اختلاط طباعت کی کثرت کی وجہ سے کالعدم سمجھا جائے۔ اس لیے میں اس سے استشہاد نہیں کروں گا۔ اقتباس بالاص 92 سطر 20، خط جو میں نے اپنی خوش دامن کو تحریر کیا تھا۔ حاشیہ نمبر 7 مجھے باکی پور لائبریری میں ایک مخطوطہ بوسیدہ اور سقم حالت میں کوڑے کے مضامین کال گیا ہے۔ خاندان میں جملہ پرسان حال کو اس کی خوش خبری پہنچا دو کہ فی زمانہ اس سے جہاد میں مصروف ہوں...... یہ مہملات کا ایک نادر مجموعہ ہے جو 12x22 فٹ کے 622 رم صفحات پر مشتمل ہے۔ 17 سطری صفحات بھی مل جاتے ہیں مگر نایاب نہیں......"

اسلوبیاتی تقلید میں مصنف کی معمولی لغزشوں اور کوتاہیوں پر قاضی صاحب کی گرفت کے ساتھ ان کے مخصوص لب ولہجہ کا حسن بھی دیکھا جا سکتا ہے جو واضح طور پر الفاظ پر پیروڈی نگار کی گرفت کی دلیل ہے۔ عبارت کی خشکی اور بے کیفی کے باوجود ظرافت آمیز اسلوب، توازن اور احتیاط اس پیروڈی کے محاسن ہیں۔

معاشرے میں پھیلے توہمات اور برائیوں کو عام کرنے کے تعلق سے سفید پوش عاملوں اور جادوگروں کے کردار سے پورا سماج واقف ہے۔ تطہیر معاشرہ کی اپنی صالح مہم میں احمد جمال پاشا نے گمراہی پھیلا کر اپنا الو سیدھا کرنے والوں کی زبردست گرفت کی ہے۔ 'طلسمات الو' اور

'تسخیر دل' جیسی پیروڈیوں کی آڑ لے کر گنڈے تعویذ، جادو، ٹونے، ٹوٹکے، تنتر منتر اور متعدد عملیاتی کرشموں کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔ 'چین و بنگال کا جادو' اس زمرے کی ایک نہایت دلچسپ پیروڈی ہے جسے ہم نے انتخاب میں شامل کیا ہے۔ اس میں مستعمل زبان، لب و لہجہ اور ماحول کامیابی سے اپنے ہدف کو نشانہ بناتے ہیں اور سماج کو مکر و فریب کے اس نظام سے متنبہ کرتے ہیں جس کا مقصد عوام کی بھلائی نہیں بلکہ کنبہ پروری اور ذاتی منفعت ہے۔

جغرافیہ نویسی کے قدیم اور روایتی اندازِ تحریر کو پامال کرنے والی نثری پیروڈی کی جس روایت کو پطرس نے آگے بڑھایا تھا وہ چراغ حسن حسرت (سند باد جہازی) سے گزرتے ہوئے 'حیدرآباد کا جغرافیہ' کے عنوان سے کلیم اللہ (حیدرآباد) کی پیروڈی میں ملتجائے کمال کو چھو جاتی ہے۔ شہر حیدرآباد کے تاریخی و جغرافیائی پس منظر کو لے کر زیندر لوتھر نے نہایت فنکاری سے پیروڈی کے جملہ تقاضوں کی تکمیل کی ہے۔ جغرافیہ نویسی کی زمین پر رقم کی گئی پیروڈیوں میں آپ بالترتیب ماضی کے عظیم الشان تاریخی شہر لاہور، خطۂ پنجاب اور حیدر اور ٹیپو کی سرزمین حیدرآباد کی نظارہ آسائی سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

شاملِ انتخاب 'پنجاب کا جغرافیہ' جغرافیہ نویسی کے روایتی اسلوب میں رقم کی گئی ایک عمدہ پیروڈی ہے جس نے چراغ حسن حسرت کو کامیاب نثری پیروڈی نگار کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ صوبۂ پنجاب کی سیاست میں نمایاں اہمیت کی حامل سیاسی شخصیات اور ان کی سیاسی کارکردیوں کو لے کر لکھی جانے والی یہ پیروڈی بڑی خوبی سے قدیم نصابی طرزِ جغرافیہ نویسی کی یاد تازہ کرتی ہے۔ پہاڑ، ندی، نالے، دریا، نہریں، سمندر، چٹیل میدان، ٹیلا، درّہ، جھیلیں اور اس قبیل کی دیگر اصطلاحوں سے سیاسی قائدوں کی جو مرقع کشی کی گئی ہے وہ داد طلب ہے۔ یہ پیروڈی ایک مخصوص عہد کی سیاسی صورتِ حال کو سامنے لاتی ہے جس سے کماحقہٗ لطف اندوز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ تقسیم ملک سے پہلے صوبۂ پنجاب کی سیاست سے آپ واقف ہوں۔ بطور نمونہ یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے: ''دریائے ویرا''

> روایت ہے کہ یہ دریا شری سوامی گنیش دت جی مہاراج کی جٹا سے نکلتا ہے اور بھارت ورش کے سناتن دھرمی نرناری کو لابھ پہنچاتا ہے اس لیے پرانے خیال کے ہندو اس دریا

کو بہت مقدس سمجھتے ہیں۔ کسی زمانے ست پڑا کے ساتھ ساتھ بہتا تھا۔ اب بھار کو
پربت کے پاس سے گزرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ریت میں سونے چاندی کے
ذرات ملتے ہیں۔ ہندوؤں کے دوسرے مقدس دریاؤں کی طرح یہ بھی غیرزراعت
پیشہ دریا ہے۔ یعنی اس کے کنارے زراعت کے بجائے صرف بیج بیوپار ہوتا ہے"۔

مکتوباتی ادب میں غالب اور آزاد نے جو نقش ثبت کیے اس نے مکتوباتی پیروڈی کے لیے نئی زمین فراہم کی چنانچہ فرقت کاکوروی کے متذکرہ خطوط غالب کی تحریفی روایت کو متاخرین پیروڈی نگار نے بڑے جوش وخروش سے آگے بڑھایا۔ یہی صورت حال شوکت تھانوی کی 'بار خاطر' اور کپور کی 'گبار کھاتر' نے بھی پیدا کی۔ اس ضمن میں ضیاء الدین شکیب مجتبیٰ حسین اور تخلص بھوپالی کا نام اہمیت سے خالی نہیں جنھوں نے غالب کے انداز میں خطوط لکھ کر مکتوباتی پیروڈی کی تحریک کو مزید تقویت بخشی ہے۔ یہ خطوط لطف وانبساط سے مملو ہیں۔ ان کا مطالعہ عصری ماحول میں غالب کی یاد دلاتا ہے۔ تخلص بھوپالی کی یہ مکتوباتی پیروڈی ہمارے انتخاب میں شامل ہے۔

دور حاضر میں غالب کے انداز تحریر کو انور سدید نے پیروڈی 'غالب کے نئے خطوط' میں جدید زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ہے جو نثری پیروڈی میں انور سدید کو ایک کامیاب پیروڈی نگار کی حیثیت سے متعارف کراتے ہیں۔ 136 صفحات پر مشتمل 'غالب کے نئے خطوط' انور سدید کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ماہنامہ 'تخلیق' کے مدیر اظہر جاوید کے نام لکھے تھے۔ یہ کل پندرہ خطوط ہیں جو مکتوب غالب کے طرز خاص اور اس کی حدود میں رہ کر لکھے گئے ہیں۔ ان نئے خطوط کے قالب میں پاکستان کی سات سالہ ادبی سرگرمیوں اور مسائل کی بازگشت سنائی دیتی ہے جو 75 تا 1982 کے عرصے پر محیط ہیں۔ یہ خطوط گرچہ علی مقصود حمیدی کے ایک خط جو غالب کے اسلوب نگارش میں شائع ہوئے تھے، کے جواب میں ایک اضطراری ردعمل کے بطور معرض وجود میں آئے تاہم انور سدید کی اس کوشش نے عہد حاضر میں صنف پیروڈی کی معنویت کو بحال کرنے میں اہم کردار نبھایا ہے۔ اہل نظر نے موصوف کی اس کوشش کو تحسین کی نظروں سے دیکھا اور علمائے ادب نے اس کا اعتراف کیا۔ انور سدید کے نام ایک خط میں ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا کہ "......ہمارے یہاں چھوٹی

چھوٹی تحریفیں تو لکھی گئی ہیں، کتابی سائز کی یہ غالباً پہلی (پیروڈی) تحریف ہے"، تو گویا نثری پیروڈی میں یہ کاوش ایک مکمل کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ انور سدید کے مطابق اس

"......میں جس صنفِ ادب کو آزمانے کی کوشش کی گئی ہے وہ بلاشبہ پیروڈی ہے اور اس کا ماڈل غالب کے لازوال خطوط ہیں۔ میں نے اس پیروڈی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے غالب سے ہی استفادہ کیا ہے اور خطوطِ غالب سے ایسے بے شمار ٹکڑے اقتباس کیے ہیں جنھیں موجودہ زمانے کے ادبی مسائل اور شخصیات پر آسانی سے منطبق کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ان خطوط کا بیشتر حصہ غالب سے مستفاد ہے، میں نے ضرورتِ تازہ کے تحت صرف ان کی ترتیب یا مقامِ ظہور بدلنے کی جسارت کی ہے"۔

گویا فنی نقطۂ نظر سے ان خطوط کی اہمیت مسلم ہے۔ خطوط کافی طویل ہیں لہٰذا ہم نے انتخاب میں فقط ایک خط پر ہی قناعت کی ہے۔

فرقت، شوکت اور کپور کی روایت کو فاروق نشتر نے بڑی سلیقہ مندی سے آگے بڑھایا ہے۔ پیروڈی آزاد کے نام 'ایک معتقد ابوالکلام کا کھلا خط' میں نشتر کا قلم آزاد کے تحریری کمالات کے پہلو بہ پہلو رواں ہے اور مکتوباتی پیروڈی کے ضمن میں خاصے کی چیز ہے۔ یہ ہمارے انتخاب کا حصہ ہے۔

نظم معریٰ، آزاد نظم اور ترقی پسند تحریک کی خامیوں کے خلاف جس طرح پیروڈی نگاروں نے صف بندی کی اور انھیں اعتدال اور سلامت روی سے قریب کرنے کے لیے آگے آئے وہ بات بعد کی ادبی کارگزاریوں، نظریے اور تحریکوں میں پائی جانے والی خامیوں، نظریاتی شدت، تبلیغی روش، پیچیدہ، غیر مبہم اور مخصوص رموز و علائم کے حوالے سے دیکھنے میں نہیں آئی۔ 'جدیدیت' کی اساسی تشکیل میں جس طرح اظہار کے گنجلک پیرایے اپنائے گئے، لایعنی قسم کے تشبیہ و استعارات، مغرب سے مستعار بے معنی تراکیب، مغلق اور مرعوب کن، چند مخصوص الفاظ و مصطلحات کا سہارا لیا گیا وہ یقیناً ردِ عمل کا متقاضی تھا۔ جدیدیوں کے اس رویے کے خلاف صف آرا جناب اے۔ رحمٰن (چیرمین عالمی اردو ٹرسٹ) کی پیروڈی 'تفہیم غالب (جدید)' جدیدیت کی انھی روش پر قدغن لگاتی ہے اور ان کے مجموعات (Totality) کو حدفِ تنقید بناتی ہے۔ یہ پیروڈی جدیدیت کے علمبردار اور اردو کے فاضل ناقد شمس الرحمٰن فاروقی کی سلسلہ وار تحریر تفہیم

غالب' کا تحریفی تتبع اور 'جدیدی ابہام' کا تضحیکی محاسبہ کرتی ہے جو نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ جدیدیت کی پوری ادبی اور فکری بے اعتدالیوں پر اپنی نوعیت کی واحد مثالی پیروڈی ہے۔

نثری پیروڈی کے باب میں ابن انشا کی 'اردو کی آخری کتاب' کسی کارنامے سے کم نہیں۔ ان کی یہ تحریفی کتاب دراصل قدیم اور روایتی درسی کتب کی طرزی تقلید اور پیروڈی ہے۔ ظاہراً یہ ابتدائی درجات اور ثانوی نظام تعلیم کے نقائص سے بحث کرتی ہے اور ماہرینِ تعلیم کو مروجہ صورت کی اصلاح پر آمادہ کرتی ہے مگر فی الحقیقت اس آڑ میں پیروڈی نگار کا وسیع مشاہدہ اور اس کی تنقیدی نگاہ ان مسائل اور پہلوؤں کی تہہ میں دبی ناہمواریوں پر مرکوز ہے جو سماجی، ملکی اور بین الاقوامی ناانصافیوں کے بطن سے جنم لیتے ہیں اور جو کسی نہ کسی طرح سماجی انتشار کا باعث ہے۔ اس حوالے سے یہ کتاب پیروڈی ملکی اور معاشرتی سیاسی انتشار اور اس سے پیدا ہونے والی کیفیت کا ماحصل کہی جاسکتی ہے۔ یہ کتاب چوں کہ قدیم درسی کتب کا تحریفی تتبع ہے لہٰذا اس کے مشمولات بھی جغرافیہ، تاریخ، گرامر، ریاضی، ابتدائی سائنس، حیوانات، پرند، گردوپیش کی اشیا، مناظر قدرت اور چند امتحانی سوالات جیسے قدیم اور روایتی درسی کتب کا مزاج رکھتے ہیں۔ ہر سبق کے اخیر میں مشقی سوالات بھی اسے قدیم درسی کتب سے شعوری طور پر ہم آہنگ کرتے نظر آتے ہیں تاہم اس میں سموئے گئے خیالات مضحک ہونے کے باوجود سنجیدہ امور کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس طرح یہ پیروڈی بچوں کی نصابی کتاب نہ ہو کر بالغ اہل نظر کے لیے لمحۂ فکریہ بن گئی ہے۔ ہم نے اس انتخاب میں 'ایک سبق گرامر کا' اور 'ریاضی کے قاعدے' کو شامل کیا ہے جو کئی پہلوؤں سے نمایاں خوبیوں سے متصف ہیں۔

محمد حسین آزاد کی شہرۂ آفاق تصنیف 'آبِ حیات' کا اسلوب بیان پیروڈی نگاروں کا محور خاص رہا ہے۔ اس ضمن میں 'سائیں علی حیدر فندک' کے عنوان سے محمد خالد اختر کی پیروڈی، مجموعہ 'فی الحال' میں یوسف ناظم کی 'اردو کی پہلی کتاب (جدید)' کے چند سبق' اور بعینہٖ اسی عنوان سے مجموعہ 'ناٹ آؤٹ' میں ڈاکٹر شیخ رحمن اکولوی کے علاوہ کنہیا لال کپور کی 'اردو ادب کا آخری دور' اور بھارت چند کھنہ کی 'اردو کی پہلی کتاب کی پہلی کہانی' اس سلسلے کی قابلِ ذکر پیروڈیاں ہیں۔ مولانا خضر تمیمی اور تغرل فرغان (ابن صفی) کی پیروڈیاں جو بالترتیب 'آبِ وفات' اور 'استاد بوٹے خاں

گلزار کا حال' کے عناوین کے تحت لکھی گئی ہیں، اس قبیل کی نمائندہ پیروڈیاں ہیں۔ آخرالذکر دونوں پیروڈیاں ہمارے انتخاب میں شامل ہیں۔ یہ دونوں پیروڈیاں 'آبِ حیات' کی وضع قطع میں لکھی گئی ہیں اور خوب ہیں۔

نثری پیروڈی میں کپور کی 'چار ملنگوں کی داستان' اور شفیق الرحمٰن کی 'قصہ چہار درویش' نے داستان نویسی کی جس تحریفی روایت کی نیو ڈالی تھی، اے حمید کی 'قصہ پہلے درویش کا'، شاہد صدیقی کی 'قصہ درویشاں' اور ابوالکلام کی پیروڈی 'ماڈرن قصہ دو درویش' کو انھی روایات کی ارتقائی توسیع کہا جاسکتا ہے۔ داستان گوئی کے فنی لوازمات سے بھرپور یہ پیروڈیاں عصری زندگی کے مسائل کی تفہیم میں معنویت سے خالی نہیں۔ مجتبیٰ حسین کی 'سند باد جہازی کا سفر نامہ' بھی عمدہ پیروڈی ہے اور اسی زمین پر رقم ہونے والی شفیق الرحمٰن کی 'سفر نامہ جہاز باد سندھی کا' کی روایت کو خوبصورتی سے آگے بڑھاتی ہے۔

بہ طرز جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ مجتبیٰ حسین کی پیروڈی 'قصہ پہلے گریجویٹ درویش کا' جو ہمارے انتخاب میں شامل ہے داستانی طرز اسلوب کی نمائندہ پیروڈی ہے۔ انداز وہی روایتی قصے کہانیوں کا سا ہے۔ ماحول، آب و ہوا، فضا اور لب و لہجہ قدیم داستان سے ماخوذ ہے جب کہ اس میں قصہ عصرِ حاضر کے بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوانوں کا رقم ہوا ہے۔ قدامت میں جدت اس پیروڈی کا حسن ہے۔ جدید زندگی کی سچائیاں جس طرح اس پیروڈی میں سمٹ آئی ہیں اس نے عصر حاضر کے تعلیمی نظام اور اس کی پروردہ نئی نسل کو درپیش مستقبل کے خدشات اور مسائل کا آئینہ بنا دیا ہے۔ عصری معنویت کے ساتھ پیروڈی مقصد اور فن دونوں تقاضوں سے متصف ہے۔

'انگریز ہندوستان میں' یوسف ناظم کی قابل ذکر پیروڈی ہے جس میں بڑی خوبصورتی سے اٹھارھویں صدی کے ہندستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے 'حکومتی کاروبار' کا محاسبہ کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں کمپنی کے حکام اور اراکین پر بھی مضحک روشنی پڑتی ہے جو قدیم شاہی روزنامچہ کے انداز میں بڑی دلچسپی سے سپردِ قلم کیا گیا ہے۔ طنز و تضحیک کی یہ فضا تاریخی حقائق سے باہم مربوط ہے اور شفیق الرحمٰن کی تزک نویسی کے تحریفی تسلسل کو آگے لے جاتی ہے۔

نثری پیروڈی کے حوالہ سے مولانا حالی کی شہرۂ آفاق تنقیدی تصنیف 'مقدمہ شعر و شاعری' کو فیاض احمد فیضی نے بڑی فنکارانہ مہارت سے 'مقدمہ فلمی شعر و شاعری' کی شکل میں پیروڈی کا قالب عطا کیا ہے۔ اور آج کے ماحول میں جنم لینے والی بے کیف فلمی شاعری پر وہی رویہ اپنایا ہے جو شعری نقد و تنقیح میں مولانا حالی نے اپنے مقدمہ میں اپنایا ہے۔ نثری پیروڈی کے باب میں فیاض احمد فیضی کی یہ تحریف ایک خوشگوار اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

مشفق خواجہ نے 'رسالہ در معرفت ابن انشا' کے عنوان سے رسائل کی بڑی دلچسپ پیروڈی لکھی ہے۔ پیروڈی نگار نے صنفِ رسائل نویسی کے معلوم عناصر، اجزا اور ماحول کو لے کر تحقیق، تخلیقیت، مزاح اور ادبی لطافتوں کا ایسا بازار گرم کیا ہے کہ قاری داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ پیروڈی دراصل 16 رجون 1973 میں ادارہ یادگار غالب کراچی کی جانب سے منعقدہ ایک شام کی یادگار ہے جس کے ذریعے مرحوم ابن انشا کو خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا۔

پیروڈی کی ابتدا 'تمہید' کے روایتی انداز سے ہوتی ہے جس میں دنیائے فانی کی شہرت اور بقائے دوام کی فلسفیانہ موشگافیوں کے ذریعے دنیا کی بے ثباتی اور عظمت و شہرت کی بے وقعتی کی گرہیں کھولی جاتی ہیں اور خبردار کیا جاتا ہے کہ '' آج جو لوگ محققوں پر اعتراض کرتے ہیں، انھیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کل اُن کی ذاتِ گرامی بھی کسی نہ کسی محقق ہی کی وجہ سے حیاتِ ثانی حاصل کرے گی۔ لہٰذا محققوں پر اعتراض کرنا خود اپنی ادبی حیات بعد الموت کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے''۔

'سببِ تالیف' رسالہ نگاری میں کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ قلم کار عموماً اس بات کا ضرور خیال رکھتا ہے کہ وہ رسالہ لکھنے کے اسباب و عوامل سے قاری کو مطلع کرے۔ رسائل نویسی کے فنی تقاضوں سے پیروڈی کو باہم مربوط کرتے ہوئے پیروڈی نگار نے رسالہ تحریر کرنے کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے قاری کو ایک ایسے ادیب سے متعارف کرایا ہے ''جس کا نام گزشتہ صدی کی پانچویں دہائی سے لے کر موجودہ صدی کی پہلی دہائی تک سکۂ رائج الوقت کی حیثیت رکھتا تھا'' اور افسوس ظاہر کیا ہے کہ '' آج یعنی اکیسویں صدی کے ربع آخر میں بیشتر لوگ اس عظیم صاحب قلم کے کارناموں سے تو کیا نام سے بھی واقف نہیں'' کیوں کہ '' نئی نسل تو خیر اُردو زبان ہی سے نابلد

ہے، وہ بھلا اس ادیب کو کیا جانتی ہوگی۔ ہاں کچھ پرانے زمانے کے بزرگ ایسے موجود ہیں جنھوں نے اپنے بچپن میں اس ادیب کو دیکھا یا پڑھا تھا، سو اُن کے تعاون سے اور بعض دستیاب شدہ نادر تذکروں اور کتابوں کی مدد سے ہم یہ رسالہ لکھ رہے ہیں جس کا نام "رسالہ در معرفت ابن انشا" رکھا ہے کہ شاید اس سے تاریخ تصنیف نکلتی ہو۔ امید ہے علمی حلقوں میں ہماری اس کوششِ رائیگاں کو پسند کیا جائے گا"۔

'تمہید' اور 'سبب تالیف' کی صراحت کے ساتھ ہی رسالہ نگار ابن انشا کے 'نام'، 'وطن'، 'تعلیم و تربیت'، 'تصانیف' اور 'معاصرین' کی تحقیق و جستجو پر اپنی قوت صرف کرتا ہے، جو عموماً روایتی نوعیت کی رسالہ نویسی کا مخصوص انداز اور متعینہ فارمیٹ رہا ہے۔ ایک مختصر رسالے میں جس طرح متعلقہ بحث کے ابعاد پر جامع گفتگو کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور نادر نکتے بیان کیے جاتے ہیں، پیروڈی میں فن رسالہ نویسی کے ان تمام پہلوؤں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً 'نام' کے تحت تحقیقی گھوڑے کچھ اس انداز سے دوڑائے گئے ہیں۔

"نام کے سلسلے میں خود ابن انشا کا ایک بیان ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہمارے اصلی نام میں ایک چوپائے (ابن انشا کا اصل نام شیر قیصر تھا) کا نام آتا ہے، اس لیے ہم نے اصلی نام ترک کرکے "ابن انشا" اختیار کیا۔ یہ جاننے کے لیے کہ کس چوپائے کا نام ابن انشا کے اصلی نام میں شامل تھا، ہم نے حیوانیات کے متعدد ماہرین سے رجوع کیا اور حیوانیات کی خاص خاص کتب حوالہ دیکھیں، لیکن افسوس کہ ہمیں کسی چوپائے کا ایسا نام نظر نہیں آیا، جو ابن انشا سے مطابقت رکھتا ہو۔ یہ مسئلہ مزید تحقیق کا محتاج ہے اور چونکہ ہم حیوانیات کے ماہر نہیں، اس لیے اس مسئلہ کو یہیں چھوڑتے ہیں تاکہ کوئی دوسرا محقق اس کو اٹھالے، اور پھر جھاڑ پونچھ کر اس پر مزید تحقیق یا طبع آزمائی کرے"۔

(رسالہ در معرفت ابن انشا، مشفق خواجہ، تخلیقی ادب، شمارہ 5، اکتوبر 1985)

غور کرنے سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ خالص تحقیقی طرز نگارش کا تتبع ہے، اصل نکتہ تک رسائی حاصل کرنے میں محقق جس طرح اشخاص و رجال سے ملاقاتیں کرتا ہے، جو قلم اٹھاتا

ہے، مطلوبہ شعبہ کے مراجع، حوالہ جاتی کتب اور رسائل دیکھتا ہے، غیر معمولی عرق ریزی سے اپنی تحقیقی یافت کو علمی دنیا کے روبرو پیش کرتا ہے اور وہ لاینحل پہلو یا گوشے جو باوجود بسیار تلاش وجستجو کے ہاتھ نہیں آتے، مستقبل پر انحصار رکھتا ہے یا پھر اسے کسی تازہ دم محقق کے حوالہ کر دیتا ہے تا کہ اس کی تحقیق کا مطلوبہ سرا کسی کو ہاتھ آجائے اور علمی دنیا فیض یاب ہو، محولہ عبارت میں وہ سبھی تحقیقی محاسن موجود ہیں اور چونکہ اس کی بنا فن پیروڈی پر ہے لہٰذا تحقیق کی انتہائی خشکی اور سنجیدگی میں بھی انبساطی کھنک موجود ہے۔

رسالہ نگاری کا آخری رکن 'خاتمہ' ہوتا ہے جس میں قلم کار خاکساری سے کام لیتے ہوئے اپنی بساط بھر علمی فیض رسانی سے عہدہ برآ ہوتا ہے، بھول چوک کے لیے معافی چاہتا ہے اور اخیر میں دعاؤں اور نیک خواہشات کا خواستگار ہوتا ہے۔ پیروڈی 'رسالہ در معرفت ابن انشا' میں فن رسالہ نگاری کے تمام گوشے روشن ہیں۔

نثری پیروڈی کی دنیا کا ایک اور نادرہ کار شاہکار حسن مثنیٰ کی 'اطلاع مزید ملسلکہ درخواست مراعات' ہے جو اس انتخاب میں شامل ہے۔ یہ پیروڈی روایتی نوعیت کے درخواستوں کی طرز پر لکھی گئی ہے اور بڑی مہارت سے درخواست دہندہ کی اقتصادی بے بضاعتی کا احوال پرووسٹ اور ذمہ داران ہاسٹل کے روبرو پیش کرتی ہے۔ تاریخی پس منظر میں زمینداری نظام کے خاتمے سے درآئی اقتصادی بدحالی اور پھر اس کے دور رس اثرات کے زیر اثر تعلیمی پسماندگی کا احوال بڑے موثر انداز میں بیان ہوا ہے۔ یہ پیروڈی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مخصوص تناظر میں Full Freeship اور Half Freeship کی استدعا پر مبنی ہے اور اخیر تک قاری پر پوری گرفت رکھتی ہے۔ حسن طلب کا یہ تحریفی انداز نرالا ہے۔

نثری پیروڈی کے ذخیرے میں ایک معتد بہ حصہ تبصرہ نما پیروڈیوں کا بھی ہے۔ اس نوع کی پیروڈیوں کا ہدف غالباً کتابوں پر تبصرہ کا وہ قدیم اور روایتی انداز ہے جو انتہائی خشک اور اپنی یکسانیت کے سبب تھکا دینے والا ہے۔ کتاب پڑھے بغیر تبصرہ کتب میں غیر متعلق باتوں سے بھائی جانے والی تبصرہ کی بساط یعنی طرز نگارش اور مبصر سبھی امور اس نوع کی پیروڈیوں کی زد میں ہیں۔ خرافات خر، 'شیطان کی کھوپڑی عرف زندہ طلسمات یعنی آدھی رات کی چیخ'، ظہیر آفاق کی

'قبرستان کے اوراق — ایک جائزہ' کے علاوہ شگوفہ کے بیشتر شماروں میں اس قبیل کی نثری پیروڈیوں کا بازار گرم ہے جو رسمی اور روایتی طرز تبصرہ نگاری کے خلاف صف آرا ہیں۔

ہمارے انتخاب میں دورِ حاضر کے ممتاز طنز و مزاح نگار محمد خالد اختر کی دو تبصراتی پیروڈیاں شامل ہیں جو بڑے احسن طریقے سے فن تبصرہ نگاری کا مضحک جائزہ پیش کرتی ہیں۔ محمد خالد اختر کی یہ پیروڈیاں تبصرہ نگاری میں جاری غیر علمی اور غیر تحقیقی روش کے خلاف صف آرا ہیں اور اصلاحِ حال کا متقاضی ہیں۔

پیروڈی 'اندھے بٹیر و دیگر پرندے' سے یہ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

"'اندھے بٹیر و دیگر پرندے' اردو زبان میں اپنے اچھوتے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ فلکی صاحب ٹوبہ ٹیک سنگھ کے مشہور بٹیر بازوں اور شکاریوں میں سے ہیں اور ادب میں نئے نئے جلوہ نما ہوئے ہیں۔ ہم اسے ادب کے لیے نیک فال سمجھتے ہیں اور وفورِ مسرت سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فلکی صاحب قلم کے بھی اتنے دھنی ثابت ہوئے ہیں جتنے جال اور غلیل کے۔ ان کے قلم نے رنگینی بیان میں کھل کر طرارے بھرے ہیں۔

......نام کتاب، اندھے بٹیرے، کی موزونیت کا جواز پیش کرتے ہوئے فلکی صاحب نے رائے ظاہر کی ہے کہ بٹیرے جب پکڑے جاتے ہیں تو دانے کے لالچ میں اندھے ہو جاتے ہیں اور ان کو پس و پیش بجھائی نہیں دیتا۔ فلکی صاحب یہ کہتے ہیں تو ایسا ہی ہوگا۔ ہمارا علم اس میدان میں صفر ہے۔ بہرحال نام کے موزوں ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ ادبی جمود کے اس دور میں یہ جدت قابل ستائش ہے اور فرح بخش بھی"۔ (کھویا ہوا افق، محمد خالد اختر، ص ص۔ 89-90)

تدوینِ متن کے سلسلے میں ذیل کی باتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔

• شامل انتخاب پیروڈیوں میں عام فہم اور بسا اوقات غیر مانوس انگریزی الفاظ کا بکثرت استعمال ہوا ہے۔ ان الفاظ کی درست ہجے (Spelling) کی طرف بطور خاص توجہ دی گئی

ہے۔ان میں یکسانیت (Consistency) پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ متن کی موزونیت (Accuracy) قائم رہے اور کسی مخصوص لفظ کی سمجھ میں کسی قسم کا اشکال باقی نہ رہے۔

- انگریزی کے وہ الفاظ جو اردو میں بکثرت مستعمل نہیں بلکہ ان کا استعمال کسی خاص سیاق میں کیا گیا، ان کی وضاحت کے لیے بریکٹ میں ان الفاظ کی Spelling کا اہتمام کیا گیا ہے تاکہ اردو رسم الخط میں ہونے کی وجہ سے جو اشتباہ درپیش تھا، وہ رفع ہو جائے۔ ایسا کرتے ہوئے ان انگریزی الفاظ کو خطِ منحنی (Italic) میں کر دیا گیا ہے تاکہ یہ امتیاز باقی رہے کہ یہ اصل متن کا حصہ نہیں بلکہ تسہیلِ متن کی غرض سے لائے گئے ہیں۔
- وہ عبارتیں جو کسی مخصوص قدیم ادبی سرمایہ کے ماحول میں لکھی گئی ہیں، بسا اوقات پیچیدہ اور دشوار فہم ہیں۔ ایسی نثر کی تسہیل کے لیے اعراب کا اہتمام کیا گیا ہے اور بعض جگہ اوقاف کے استعمال کے ذریعے طویل جملوں کی دشواری پر قابو پانے کی کوشش کی گئی ہے۔

امتیاز وحید

5 رفروری 2013

(جعفرزٹلی)

اخبارات سیاہہ دربارِ معلّی

(1)

"ستھادر سنگھ راٹھور عرض نمود کہ نوکران پشت انداز خاں سلاح خودی فروشند، کسے بہ نرخ کاہ نمی گیرد۔ فرمودند: سپاہی کا مال جھانٹ کا بال"۔

(2)

"یک پہر و پنجاہ گھڑی روز برآمدہ غسل خانہ فرمودند۔ عرضداشت خان جہاں بہادر بہ نظرِ اقدس گذشت۔ خلاصۂ مضمون آنکہ از مقدم ایں پیر غلام در بلدۂ لاہور بجز شغال و روباہ و کجو و کژدم و افعی، اصلاً و مطلقاً اثرِ انسان نہ ماندہ، نرخِ غلّہ بہ قیمتِ جواہر برابر شدہ۔ بہ ہمیں دستور باغ و بوستان نزہت افزائے اطراف و جوانب را سوختہ، صد صد کروہی آبادانی طرّق و جنگل از چپ و راست صاف صاف و دکا دکا نمودہ، و میانۂ شہر را نمونۂ دشتِ کربلا کردہ، و خشت خشبِ قلعہ را پراندہ بہ ہوا رسانید۔ رعایا برایا را از جرعۂ ارادتِ خود سرمست و مخمور ساختہ بہ جہنم فرستاد، و جمیع حرکات و سکنات و تحیات و طیبات و زاکیات بلدۂ مذکور را در تحت الثریٰ گرفتہ۔ باوجود ایں قدر سعی و تردد دریں پیر غلام لطفِ حضرت معطّل است ـــ فرمودند: بھکّی داڑھی چکنے منہ"۔

2

(3)

''عصمت پناہ بی بی چہ خاچوتی التماس نمود کہ حضرت در تسخیرِ ملکِ دکھن چناں مشغول اند کہ از خرابی ملکِ ہند خبر ندارند۔ فرمودند: اوکھلی میں سر دیا تو دھمکوں سے کیا ڈرنا''۔

(4)

''ناظر صفا صفا التماس نمود کہ دیہات مفسداں متصل اکبرآباد بسیار اند، ازیں جہت بر شہر ڈاکا می آید۔ فرمودند: ندی کنارے رُوکھڑا اَنت اٹھ ہوئے بناس''۔

نکاح نامہ

استغفر اللہ، استغفر اللہ! نہ در شریعت نہ در طریقت نہ در معرفت نہ در حقیقت بدیں قواعد کہ چہار شوہر زندہ دارد۔ بدیں رسوائی و روسیاہی و فضیحتی دریں مجلس حاضرہ آمدہ بجہت مسماۃ بی بی بیقرار خاتون، بنت شلیتہ و بلیتہ خانم۔ بہ مقابلہ دو دینار چہ بینہ[1] و یک اَدھوڑی[2] و یازدہ سرخ[3] مسیہ و پشینہ۔ شیطان و شیطان بچگاں شاہد آمدند و مقر شدند۔ پری و پری زادگاں تجسس نمودند، و خر و خر بچگاں حاضر آمدند بجہت عصمت خراب بی بی مذکور۔

بہ زنی خواستی و قبول کردی؟ نوشہ گوید: کیہ من دانم۔ یاراں گفتند: آمین، گگروں گوں۔ اٹھ کنی کے دریں مجلس و دست بوسی کرد۔ پڑھو فاتحہ خیر، اللّٰھم پاپک و بھکجھک، آمین باد بہ حرمت الگوزہ والپاد۔

لہٰذا چہار شرط خارج از شریعت گوش کن۔ یکے آنکہ ہر داہ و غلام کہ داشتہ باشی؛ داہ[۴] را بجائے دختر شمار و غلام را بہ حق بی بی بگذار۔ دوم آنکہ اگر ہمسایہ یا سبزی فروش در خانہ تو در آید، بگذار، کہ بی بی ازیں شیوہ عار ندارد۔ سوم آنکہ اگر بی بی را بزنی، چناں بزن کہ طاقت جنبیدن بہ چار پائی نہ ماند؛ و خون از دُخابر نشود کہ بر تو حرام بودہ است۔ چہارم آنکہ از نیت سفر کنی، اوّل فکر و سامان بی بی کن کہ بعد تو بے نفقت نہ خواہد ماند۔

1۔ بجزینہ: چمڑے کا۔

2۔ اَدھوڑی: گائے یا بھینس کا کمایا ہوا (مقررہ طریقے کے مطابق بنایا ہوا) چمڑا؛ نرمی کی ضد۔

3۔ ثُمر نسخے کا آٹھوں حصہ: رتّی۔

4۔ داہ: کنیز، باندی

(شاہ حاتم)

نسخۂ حکیم

''نسخۂ مفرح الضحک معتدل من طب النظر افت جسے چنگا بھلا کھائے سو بیمار ہو جائے۔

چاندنی کا روپ، دوپہر کی دھوپ، چوڑیل کی چوٹی، بھتنے کی لنگوٹی، پریوں کی نظر گزر، دیو کی نظر، جوگی کی بھرکی، اینڈ بھینسا سور کی، تیس تیس ٹکے بھر۔

کبوتر کی غٹ گوں، مرغی کی ککڑوں، چیل کی چل چل، کیڑوں کی رکل بل، پشم خایہ ہیر، جوگائی شتر، بکری کی میں، کوے کی ٹمس، آٹھ آٹھ رتی۔

مچھر کا بھیجا، ڈائن کا کلیجا، دریا کی موجوں کا بل، غول بیابانی کی چہل، چھا کی پیر، چڑیوں کی بھیر، بیچھوے کی انگڑائی، پھووس کی جمائی، بارہ بارہ ماشہ۔

بتال کا تارا، اُلو کی چنگی، برف کا انگارا، جونک کی پسلی، فاختہ کی ہنسلی، بڑھاگل کے انڈے کی زردی، پرند کا اوڑنا، مرغابی کا تیرنا، ساڑھے تین تین عدد۔

چیپے کا گوز، بانک کا چوز، مینڈک کی ٹرٹر، گلہری کی جرجر، امرد کی ڈھاڑی کا بال، شیطان کا انزال، الو کا کھر، چڑیا کی ٹھر، پانچ پانچ گز۔

بڑھیا کی بکارت، بھڑوے کی غیرت، دغا بازوں کی کانا پھوسی، کتیا کی...... بھوسی، باندی کا

بڑبڑانا، بی بی کا جھنجھلانا، بجلی کی چمک، بادل کا کڑکڑانا، دو دو بالشت۔

شرابی کی بک بک، بھنگی کی جھک جھک، پوستی کی اونگھ، افیمی کی پینک، لاٹھی کی چوٹ، منہ کی پوٹ، چوروں کی ہمت، مکھیوں کی بھنبھناہٹ، چار چار پل۔

ترپا چرتر، پلپا بجیر، کلاونت کا الاپ، باشمن کا جاپ، بیکنٹھ کی کیچ، کھیر کی پیچ، برسات کی گھٹا، راجہ باسک کے سر کی جٹا، دو دو تل۔

ہواصل کے دانت، بھنگے کی آنت، جوں کے تلے کی مائی، بچھو کی آنکھ، سانپ کا پنجہ، مچھلی کے پانوں، چیونٹی کا کان، کھجائی کی ناک، پونے دو دو انگل۔

ہجنی کا خصیہ، خچر کا انڈا، گدھی کے سینگ، آدمی کی دم، زنانی کی اوہ، ہیجڑے کی تالی، مظلوم کی آہ، سوت کی ڈاہ، اڑھائی اڑھائی گز۔

کنجی کا نخرا، کٹنی کا مکر، مشاطہ کی ڈھنڈیلی، شیر خورے کے دانت، چھوکریوں کی آنکھ مچولی، موئے کا رنڈاپا، موت کی پرچھائیں، ظلمات کی اندھیری، بیس بیس بسوے۔

جونک کی پھریری، گھڑیال کی ٹھاں ٹھاں، بازار کی چپ، چیلے کا شعور، احمق کی واہ واہ، اندھے کی سرت، رزالی کا ہوت، بے حیا کی ہٹی، آٹھ آٹھ تسو۔

موسل کی دھمک، عطر کی مہک، چراغ کی جوت، گھوڑے کی تے، شتر غمزہ، طوطی کی تیہوں، پودنے کی توتی توتی، گرگٹ کا رنگ بدلنا، سات سات جریب۔

زمین کی ناف، آسمان کا شگاف، شفق کی لالی، بادل کی ٹھنک، گنبد کی آواز، جنتی باز، بانکے کی ارغ تھو، سایۂ دیوار، قہقہہ، گیارہ گیارہ لپ۔

لاکھ کی چھال، راکھ کی چھال، سمندر کی جڑ، امربیل کی جڑ، مشک کا پات، عنبر کا پات، سیپی کے پاٹ، لولو فرت۔

راس پھل، باو پھل، بھیلی کے پھل، سنگھاڑے کی گٹھلی، املی کی گٹھلی، پیاز کی کلی، ایک ایک چلو۔

جیم رس، گن رس، رس گورس، ہٹ رس، پوست طلا، پوست نقرہ، زردی کہربا، سفیدی مروارید، سرخی یاقوت، پونے تین تین چٹکی۔

عرق نعناع، عرق بابا، عرق ماما، خمیرہ فالودہ، ورق نورتن، شربت اجل، آدھی آدھی مٹھی۔
دھول جھکڑ، لات مکی، گھونسا گھانسی، گالی گلوچ، اکتا پٹی، تاتا تیری، بولی ٹھولی، ہی ہی کھی
کھی، واتنا کل کل، گوھا چھی چھی، پھٹ لعنت، پھٹے منہ، اتنے ہوں۔

ان سب دواؤں کو لے کر، رات ہو نہ دن ہو، نہ صبح ہو نہ شام ہو، نہ باسی پانی ہو نہ تازہ پانی،
اس میں بھگا کر تالی کی سل، مٹی کے بٹے سے پیسے۔ پھر مکڑی کے جالے کی صافی میں چھان کر
فرشتے کے موت میں کشمکش کے ساتویں حصے برابر گولی باندھے۔ وقت نزع کے بلغم کے دودھ سے
ایک کف پا پھانکے، کھانے پینے، سونے بیٹھنے، دیکھنے بولنے، سننے سونگھنے سے پرہیز کرے اور
جب خوب بھوک لگے تو اسی نوے ہزاروں سے زیادہ نہ کھاوے۔ حاتم کہے ایک روگ سے ستر
روگ کو پیدا کرے۔ جس کا ہزار نام ایک اللہ۔ نسخہ تمام شد۔"

(ملا رموزی)

لندھن کا عنابی دربار

اے میلاد کی غزلوں پر رونے والو!

کیا نہ سنا تم نے کہ مبلغ ایک دربار بڑی شان والا منعقد ہوا۔ بیچ شہر لندھن کے خاص واسطے رسم تاج پوشی بادشاہ کے، مگر یہ کہ یہ ہے بے خبری تمھاری اے بے خبری حد سے گزری ہوئی بہ سبب اس کے کہ نہیں ہیں تعلیم پائے ہوئے بیچ ہندستان کے مگر اوپر ایک سو کے چند۔

پس بیچ جس قوم کے ہوں لکھے پڑھے کم وہ یا بھرتی ہوں گے، بیچ فوج کے، یا ملازمت کریں گے وہ ایسے ٹھیکیداروں کی کہ بنائی ہوئی عمارتیں ان کی نہیں زندہ رہتی ہیں مگر مبلغ ایک سال، مگر یہ کہ اصل بے وقوف ہیں وہ جو بنواتے ہیں عمارتیں ایسے ٹھیکیداروں بے ہنر اور بے ایمان سے۔

پس جب سلسلہ کلام ہمارے کا پہنچا اوپر اس جگہ کے تو تشریف لائیں بیوی نمبر 2 ہماری ساتھ مہربانی بہت کے اور فرمایا کہ اے شوہر میرے دراز کرے خدا عمر اور تندرستی آپ کی اور مسٹر لائڈ جارج شاگرد قدیم آپ کے کی، کیا ہو گیا ہے آپ کو کہ اوپر ٹھیکہ داروں اس زمانہ کے کہ غصہ ہو رہے ہیں۔ آپ در آں حالانکہ جانتے ہیں آپ کہ بیچ اس زمانہ بڑا کے نہیں ہوتے۔ تعلیم یافتہ مکمل علم والے جب کہ بیچ زمانہ طالب علمی کے پڑھائے جاتے ہیں مضامین کثرت سے تا دماغ

خراب ہو جائے طالب علم ہندستانی کا، پس جو طلبہ کہ بیچ ایک وقت کے پڑھتے ہیں دس مضامین اور سولہ کتابیں تو کیا خاک باخبر اور صاحب کمال ہوں گے وہ بیچ ایک فن کے، پس جب یہ حال ہو نصاب تعلیم کا تو کیوں کر محنتی اور جفاکش ہوں نوجوان اس زمانہ ہذا کے، راستہ بتادے اللہ مسلمانوں کو اے راستہ اجمیر شریف کا اگر نہیں ہوتی دلچسپی ان کو معاملوں سیاسی سے اور ترک کرادے اللہ عادت حقہ نوشی کی مسلمانوں پنجاب کے سے اور محفوظ رکھے اللہ باشندوں چین اور ارکان جمیعۃ اقوام کو افیون اور گانجے سے تحقیق محال ہے یہ کہ پھر بادشاہوں ہیلا اسلاسی حبشہ کے، کہ تحقیق ہے یہ مقولہ حکیموں ایران کے کا واسطے ایسوں کے کہ کہا ہے۔ ع

''جو کہ شمشیر مارتا ہے سکہ ساتھ نام اس کے کے پڑھتے ہیں''

پس داد دیجیے ترجمہ اس مصرعہ کے کی مجھ کو اے شوہر میرے! پھر فرمایا کہ تحقیق جو جھگڑا کہ ساتھ شیعوں اور سنیوں لکھنؤ شریف کے ہوا ہے، غم کھائیے اوپر اس کے کہ تحقیق مسلمان رہ گئے ہیں اب بیچ دنیا کے خاص واسطے تباہی کے بہ سبب بے خبری تعلیمات مذہب اپنے کے، پس جس نے کہ دوری اختیار کی اصول مذہبی اپنے سے وہ راندا جائے گا اے بھٹکے گا وہ بھی گمراہ ہوگا وہ طرف سے اچھی اور کامیاب زندگی کے مگر اے عجب وہ گھڑی محبت کی بڑھانے والی کہ جب تشریف لائیں بیوی نمبر 2 ہماری ساتھ محبت ایسی کے کہ نثار ہوں اس پر شہر کلکتہ اور دہلی، اور باتیں کیں انھوں نے اے باتیں اوپر والی تو کہا ہم نے کہ اے بیوی نمبر 2 ہماری تحقیق قربان ہوں اوپر وفاداری تیری کے چالیس خزانے اور قربان ہوں اوپر وفاداری ہماری کے چالیس اونٹ طرابلس کے مگر اے عجیب وہ طرابلس کہ لڑے تھے کبھی واسطے حفاظت اس کی کے حضرت شیخ سنوی رحمت خدا کی اوپر ان کے مگر عجب کہ آج قابض ہے ملک اٹلی اوپر طرابلس کے بہ سبب حقہ نوشی اور باہمی عداوت مسلمانوں کی کے جو ہے بہ سبب جہالت کے، پس بیچ جس شہر کے ہوں مقدمہ باز زیادہ بھی ہوں، سڑکیں خراب اور گلیاں گندی جس شہر کی مان تو اور جان تو اے عزیز بیوی ہماری کہ نہیں منہ فراغت کا دیکھیں گے باشندے اس شہر کے، بھی جہاں طلاق لیتی ہوں عورتیں زیادہ طلاق دیتے ہوں مرد زیادہ اور شادیاں ہوتی ہوں بے مرضی معلوم کیے لڑکیوں کی، تو تحقیق آوارگی اور افلاس بڑھے گا بیچ ایسے شہروں کے، بھی باشندے جس ملک اور شہر کے بیٹھے رہتے ہوں اوپر دکانوں کے

بیکار تو قسم ہے امرت دھارا اور سوڈا واٹر کی کہ نیلام ہوگا جلد وہ شہر بہ سبب آوارگی باشندوں اپنے کی کے، بھی اسی طرح جب بڑھے شوق لوگوں کا واسطے قوالی اور گانے کے، بھی بڑھ جائے شوق خریداری زیور کا بیچ عورتوں کے اور بوڑھے ہونے لگیں لوگ بیچ عمر 40 سال کے تو مت گمان لے جا کہ راستہ کامیابی کے پائیں گے وہ کیونکہ البتہ تحقیق آیا ہے بیچ کتابوں بڑی کے یہ کہ باشندے جس ملک کے قناعت اختیار کرتے ہوں اوپر دال روٹی کے تحقیق ہیں وہ مارے ہوئے سستی اور جہالت کے، پس چاہیے راستہ بتانا ان کو طرف تعلیم کے مگر اے عجب وہ لیڈر قوم کے کہ نہیں ہے لیاقت اندر ان کے لیڈری کی، مگر یہ گزر بسر کرتے ہیں وہ اوپر لیڈری کے، گویا کہے تو کہ ہیں وہ تاجر قوم کے اور مال تجارت ان کا ہے قوم بے وقوف۔

پس امابعد، جب سلسلہ کلام کا اوپر اس جگہ کے پہنچا تو طعن وطنز کیا ہم نے اوپر ان ایڈیٹروں اخباروں اردو کے، کے جو پیشین گوئی کر رہے ہیں برسوں سے عالمگیر جنگ کی، خاص کی گئی جنگ ہسپانیہ کہ کہتے تھے وہ کہ تحقیق جنگ ہسپانیہ سے ہوگی شروع لڑائی بڑی مگر نہ ہوئی وہ موافق دلائل ہم ملا رموزی صاحب کے تحقیق منہ ان کا فق ہوگیا، پھر کہا ہم نے کہ دراز کرے اللہ بالوں سر تیرے کے کوائے بیوی نمبر 2 ہماری اور توفیق زیادہ وفاداری سے دے تجھ کو واسطے ہمارے کہ تحقیق اوپر فقط وفاداری تیری کے ہو رہی ہے شاعری ہماری، اگرچہ بہت دن گزرے کہ نہ غزل کہی اوپر ہندستان کے سرمائیکل اوڈوائر نے، بھی نہیں چھوڑتے پیچھا قادیانیوں کا مولانا ظفر علی خاں ہمیشہ ہو جیو اخبار ''زمیندار'' ان کا کہ تحقیق ذریعہ اس اخبار تذکرہ کیے گئے کے پہلا شوق سیاست کا بیچ مسلمانوں بے خبر کے، مرغ بازی سکھادے اللہ سولینی اور کبوتر بازی ہر ہٹلر کو بدلے شوق جنگی ان کے کے، بھی توفیق دے اللہ بجلی والوں کو تا مبلغ چار پنکھے بجلی کے دیں وہ واسطے دولت خانہ ہمارے کے بیچ اس زمانہ گرمی سخت کے، تا سکیں ہم لکھنا مضامین عمدہ کا موافق حق عمدگی ان کی کے، مگر بات کاٹی ہماری بیوی نمبر ایک ہماری نے اور کہا کہ اے شوہر میرے اور بیوی نمبر 2 اپنی کے ہرگز گمان مت لے جاؤ اوپر مسلمانوں کے کہ قدر پہچانیں گے وہ آپ کی اور دیں گے وہ پنکھا بجلی کا آپ کو مگر یہ کہ ساتھ قوت بازو اپنے کے لاؤ تم، تو آفرین بہت کہی ہم نے اوپر خودداری بیوی نمبر ایک اپنی کی کے اور کہا کہ تحقیق عورتیں جس گھرانے کی ہوں گی خوددار تو تحقیق محفوظ رکھے گا اللہ اس گھرانے کو فضولیوں مغربی تمدن

کی سے مگر عجیب بے وقوف وہ عورتیں کہ ہو کر کم آمدنی خرچ کرتی ہیں وہ زیادہ اوپر لباس قیمتی اپنے کے، بھی اوپر لباس قیمتی اولاد اپنی کے، بھی اوپر تفریح سینما کے، بھی اوپر کھانے لذیذ کے، بے خبر تنگدستی اور قرضداری سے، پس سن تو کان دھر باتیں حکمت کی، اے عورت اگر ہے تو عقل کی رکھنے والی کہ جو قوم کہ جاہل رکھے گی وہ عورتوں اپنی کو اور آزادی دے گی وہ قبل تعلیم کے، اسے آزادی نامعقول، تو خانہ تلاشی لے گی ایسے گھرانوں کی پولیس بغیر وارنٹ کے، کیونکہ موافق قوم حکیم بزرجمہر کے رواج دینا شادی مرضی طرفین کے مفید ہے اور دیسی لباس مفید ہے واسطے عورتوں ہندستان کی کے، بھی اختیار کرنا گھریلو صنعت کا مفید ہے، بھی ادھوری تعلیم و تربیت کا ہونا ایسا ہی ہے گویا کہے تو کہ بیچ بخار سخت کے ہذیان بک رہا ہے مریض بخار کا، بھی اسی طرح نہ فائدہ دیں گے قوم کو رسالے ادبی اردو کے کہ تحقیق بجز ہفوات واہیات کے نہیں ہوتا اصل ادب بیچ ان کے، مگر غزلیں، مہمل اور افسانے اخلاق کے جلانے والے، پس قسم ہے غزلوں رلانے والی کی کہ حوالات میں بھیجے جائیں گے وہ شوہر تمام کہ بے پروا رہتے ہیں وہ بیویوں اپنی سے بہ سبب ناراضی اپنی کے ابھی تکالیف پہنچاتے ہیں وہ بیویوں اپنی کو، بھی اسی طرح موٹر ڈرائیور بنائے جائیں گے دن حشر کے وہ شوہر جو زیادہ رہتے ہیں بیچ گھر خسر اپنے کے، محفوظ رکھے اللہ ہر ہندستانی کو خضاب لاجواب اور سسرال اپنی سے اور پاک کرے اللہ اسے رہائی دے اللہ بندشوں خلاف شرع سے عورتوں اس زمانہ ہذا کی کو، کیونکہ شریک ہونا مسلمانوں کا بیچ کانگریس کے بغیر بصیرت سیاسی کے برابر ہے نہ شریک ہونے ان کے کے، دور رکھے اللہ ہم کو اور بیوی نمبر ایک ہماری کو اجلاسوں "لے جس لے ٹو کونسلوں" کے سے اور گولیاں کونین کی کھلاتا رہے اللہ تعالیٰ خشک واعظوں اور جاہل میلاد خوانوں کو کہ تحقیق وجدان کا بخار اور مراق ہے بیچ حق قوم مسلمانوں کی کے اور شوق دے اللہ ہندو مسلمانوں، دنیا تمام کو اتحاد و اتفاق کا، بھی طاعون پھیلا دے اللہ بیچ لیڈروں کے تا کم ہو جائے مقدار لیڈروں کی کہ کثرت لیڈروں کی سبب ہے تباہی قوم کا۔

پس بعد گفتگو کے مصروف ہو گئے ہم اور بیوی نمبر 4 ہماری بیچ تصاویر دربار لندھن کے، اب کیا کیا اشارے ہمارے جھٹلاؤ گے؟

(پطرس بخاری)

اُردو کی آخری کتاب

ماں کی مُصیبت

ماں بچے کو لیے بیٹھی ہے، باپ انگوٹھا چوس رہا ہے، اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے، بچہ حسب معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے، ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کو تک رہی ہے، اور پیار سے حسب ذیل باتیں پوچھتی ہے:

(1) وہ دن کب آئے گا جب تو میٹھی میٹھی باتیں کرے گا۔

(2) بڑا کب ہو گا؟ مفصل لکھو۔

(3) دُولھا کب بنے گا، اور دولھن کب بیاہ کر لائے گا؟ اس میں شرمانے کی ضرورت نہیں۔

(4) ہم بڈھے کب ہوں گے؟

(5) تو کب کمائے گا؟

(6) آپ کب کھائے گا، اور ہمیں کب کھلائے گا، باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا کر واضح کرو۔

بچہ مسکراتا ہے، اور کلنڈر کی مختلف تاریخوں کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ماں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے جب ننھا ہونٹ نکال کر ---- رونی صورت بناتا ہے تو یہ بے چین ہو جاتی ہے۔ سامنے پنگوڑا ننگ رہا ہے، سُلانا ہو تو افیون کھلا کر اس میں لٹا دیتی ہے، رات کو اپنے ساتھ سُلاتی ہے، باپ کے ساتھ دُوسرا بچہ سوتا ہے، جاگ اُٹھتا ہے تو جھٹ چونک پڑتی ہے، اور محلّے والوں سے معافی مانگتی ہے، کچی نیند میں رونے لگتا ہے تو بچاری مما کی ماری آگ جلا کر دُودھ کو اُبال دیتی ہے۔ صبح جب بچے کی آنکھ کھلتی ہے تو آپ بھی اُٹھ بیٹھتی ہے، اس وقت تین بجے کا عمل ہوتا ہے۔ دن چڑھے مُنہ دُھلاتی ہے، آنکھوں میں کاجل لگاتی ہے، اور جی کڑا کر کے کہتی ہے ''کیا چاندسا مکھڑا نکل آیا۔ واہ۔ واہ۔''

کھانا خود پک رہا ہے

دیکھنا بیوی آپ بیٹھی کھانا پکا رہی ہے، ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے، ہر چیز قرینے سے رکھی ہے۔ دھوئے دھائے برتن دھرے ہیں، کسی میں دال ہے، کسی میں آٹا۔ پھکنی اور پانی کا لوٹا چولھے کے پاس ہے تاکہ جب تک چاہے آگ جلائے، اور جب چاہے پانی ڈال کر بُجھا دے۔ آٹا گندھ رہا ہے، چاول پک چکے ہیں نیچے اُتار کر رکھے ہیں، دال چولھے پر چڑھی ہے، غرضیکہ ہر کام ہو چکا ہے، لیکن یہ پھر بھی پاس بیٹھی ہے، میاں جب آتا ہے کھانا لا کر سامنے رکھتی ہے، پیچھے کبھی نہیں رکھتی، کھانا کھالیتا ہے تو کھانا اُٹھا لیتی ہے۔ ہر روز یوں نہ کرے تو میاں کے سامنے ہزاروں روپے کا ڈھیر لگ جائے۔ کھانا پکانے سے فارغ ہوتی ہے تو کبھی سینا لے بیٹھتی ہے کبھی چرخہ کاتنے لگتی ہے۔ کیوں نہ ہو مہاتما گاندھی کی بدولت یہ ساری باتیں سیکھی ہیں، آپ ہاتھ پاؤں دُھلائے تو ڈاکٹر سے علاج کروانا پڑتا ہے۔

دُھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے

بڑی محنت کرتا ہے، شام کو بھٹی چڑھاتا ہے، دن بھر بیکار بیٹھا رہتا ہے، کبھی بیل پر لادی لادتا ہے اور گھاٹ کا رستہ لیتا ہے۔ کبھی نالے پر دھوتا ہے، کبھی دَریا پر، تاکہ کنٹرول والے نہ پکڑ سکیں۔ جاڑا ہو تو سردی ستاتی ہے، گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے، صرف بہار کے موسم میں کام کرتا ہے، دوپہر ہونے کو آئی، اب تک پانی میں کھڑا ہے اسے ضرور سرسام ہو جائے گا، درخت کے نیچے بیل بندھا ہے، جھاڑی

کے پاس کتا بیٹھا ہے، دریا کے اُس پار گھری تو وڑ رہی ہے، دھوبی انھیں سے جی بہلاتا ہے۔

دیکھنا دھوبن روٹی لائی ہے، دھوبی کو بہانا ہاتھ آیا ہے، کتے نے بھی کان کھڑے کر دیے، اب دھوبن گانا گائے گی، دھوبی دریا سے نکلے گا، دریا کا پانی پھر نیچا ہو جائے گا۔

میاں دھوبی! یہ کتا کیوں پال رکھا ہے؟ صاحب کی کہاوت کی وجہ سے، اور پھر یہ تو تمھارا چوکیدار ہے، دیکھیے امیروں کے کپڑے میدان میں پھیلے پڑے ہیں کیا مجال کوئی پاس آجائے، جو ایک دفعہ کپڑے دے جائیں پھر واپس نہیں لے جا سکتے۔ میاں دھوبی تمھارا کام بہت اچھا ہے۔ میل کچیل سے پاک صاف کرتے ہو، ننگا پھراتے ہو۔

میں ایک میاں ہوں

میں ایک میاں ہوں، مطیع و فرماں بردار۔ اپنی بیوی روشن آرا کو اپنی زندگی کی ہر بات سے آگاہ کرنا اصول زندگی سمجھتا ہوں، اور ہمیشہ اس پر کاربند ہوں، خدا میرا انجام بخیر کرے۔

چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں، اتنے ہی روشن آرا کو بُرے لگتے ہیں۔ میرے احباب کی اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے۔ انھیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لیے باعثِ ذلت سمجھتی ہے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خدانخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں جن کا ذکر معزز مجمع میں نہ کیا جا سکے، کچھ اپنے ہنر کے طفیل، اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں، لیکن اس بات کو کیا کروں، ان کی دوستی میرے گھر کے امن میں خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لیجیے، اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں۔ گویا محکمہ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر فائز ہیں، لیکن شکل و صورت ایسی پاکیزہ پائی ہے کہ امام مسجد معلوم ہوتے ہیں۔ جُوا وہ نہیں کھیلتے، گلی ڈنڈے کا انھیں شوق نہیں، جیب کترتے ہوئے وہ کبھی نہیں پکڑے گئے، البتہ کبوتر تو ضرور پال رکھے ہیں، انھیں سے جی بہلاتے ہیں۔

ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلے کا کوئی بدمعاش جُوئے میں قید ہو جائے تو اس کی ماں کے پاس مزاج پرسی تک کو چلی جاتی ہیں، گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں، جب کوئی جیب کترا پکڑا جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ بزرگ

جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب کہتے ...... تھکی ہے ہمارے گھر میں "موئے کبوتر باز" کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر کسی چیل، کوے، گِدھ، شکرے کو دیکھنے لگ جاؤں تو روشن آرا کو فوراً خیال ہو جاتا ہے کہ بس یہ اب کبوتر باز بنے گا۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں قصیدہ شروع ہو جاتا ہے، بیچ میں میری جانب گریز۔ کبھی لمبی بحر میں، کبھی چھوٹی بحر میں۔

ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں نے مُصمّم ارادہ کرلیا کہ اس مرزا کم بخت کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دوں گا۔ آخر سب سے مقدم ہے، میاں بیوی کے باہمی اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا ہے؟ چنانچہ ہم غُصّے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے، دروازہ کھٹکھٹایا، کہنے لگے اندر آجاؤ۔ ہم نے کہا۔

ہم نہیں آتے، تم باہر آؤ — خیر آخر اندر آ گیا —— بدن پر تیل مل کر ایک کبوتر کی چونچ منہ میں لیے دھوپ میں بیٹھے تھے کہنے لگے۔

بیٹھ جاؤ —— ہم نے کہا۔ "بیٹھ گئے" —— معلوم ہوتا ہے ہمارے تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے، مرزا بولے، کیوں بھئی خیر باشد! میں نے کہا "کچھ نہیں"، کہنے لگے اس وقت کیسے آنا ہوا؟

اب میرے دل کے فقرے کھلنے شروع ہوئے، پہلے —— ارادہ کیا کہ ایک ہی دم سب کچھ کہہ ڈالو اور بلاؤ۔ پھر سوچا کہ مذاق سمجھے گا، اسی لیے کسی ڈھنگ سے بات شروع کروں، لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے کیا کہیں۔

آخر ہم نے کہا۔

"مرزا بھئی کبوتر بہت مہنگے ہوتے ہیں؟"

یہ سُنتے ہی مرزا صاحب نے چین سے لے کر امریکہ کے تمام کبوتروں کو ایک ایک کر کے گنوانا شروع کیا۔ اس کے بعد دانے کی مہنگائی کے متعلق گُل افشانی کرتے رہے، اور پھر محض مہنگائی پر تقریر کرنے لگے، اس دن تو ہم یونہی چلے آئے، لیکن ابھی کھٹ پٹ کا ارادہ دل میں باقی تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ شام کو گھر میں ہماری صلح ہو گئی ہم نے کہا چلو اب بگاڑنے سے کیا حاصل؟ چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح صفائی ہو گئی۔

لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لیے ایک نہ ایک دوست کارآمد ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے میری طبیعت میں قبولیت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے، کیونکہ ہماری اہلیہ کو ہم میں ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عادات قبیحہ کی جھلک نظر آتی ہے، یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے۔

شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے سو کر اٹھا کرتے تھے، ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کے گھر ناشتہ زبردستی صبح کے سات بجے کرا دیا جاتا ہے۔ اور اگر ہم کبھی بشری کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اٹھنے میں کوتاہی کریں تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس نکھٹو کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ ایک دن صبح صبح ہم نہا رہے تھے۔ سردی کا موسم، ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے، صابن سر پر ملتے تھے تو ناک میں گھستا تھا کہ راستے میں ہم نے خدا جانے کس پراسرار جذبے کے تحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا اور پھر گانے لگے۔

"توری چھل بل ہے نیاری۔"

اس کو ہماری انتہائی بدمذاقی سمجھا گیا، اور اس بدمذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا۔ لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک سانحہ گزرا ہے، میں نے تمام دوستوں کو ترک کر دینے کی قسم کھائی ہے۔

تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آرا نے مجھ سے میکے جانے کی اجازت مانگی، جب سے شادی ہوئی ہے روشن آرا صرف دو دفعہ میکے گئی ہے۔ اور پھر اس نے کچھ عجز و انکساری سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔

کہنے لگی۔ "تو پھر میں ڈیڑھ والی گاڑی سے چلی جاؤں۔"

میں نے کہا۔

"اور کیا ـــــ؟"

وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہو گئی، اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات چکر لگانے لگے، یعنی اب بیشک دوست آئیں، بیشک اودھم مچائیں۔ میں بیشک جب چاہوں کھاؤں بیشک جب چاہوں اٹھوں، بیشک تھیٹر جاؤں۔ میں نے کہا

''روشن آرا جلدی کرو، نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔

ساتھ اسٹیشن گیا——جب میں گاڑی میں سوار کرا چکا تو کہنے لگی۔

''خط ضرور لکھتے رہیے——''

میں نے کہا۔''ہر روز——اور تم بھی——''

''کھانا وقت پر کھالیا کیجیے، اور ہاں دُھلی ہوئی جُرابیں اور رُومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں——''

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے——اور ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے——اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، میرا بھی دل بے تاب ہونے لگا۔

اور جب گاڑی روانہ ہوئی تو میں دیر تک مبہوت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

آخر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا کتابوں کی دُکان تک آیا، اور رسالوں کے ورق اُلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ ایک اخبار خریدا، تہہ کر کے جیب میں ڈالا، اور عادت کے مُطابق گھر کا ارادہ کر لیا۔

پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں رہا۔ اب جہاں چاہوں، جاؤں۔ چاہوں تو گھنٹوں اسٹیشن پر ہی ٹہلتا رہوں——دل چاہتا تھا قلابازیاں کھاؤں۔

کہتے ہیں جب افریقہ کے وحشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصے کے لیے رکھا جاتا ہے تو گویا وہ وہاں کی شان و شوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔

کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہو رہی تھی، بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا۔ آزادی کے لہجے میں تانگے والے کو بلایا، اور کود کر تانگے میں سوار ہو گیا۔ سگریٹ سُلگایا، ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں، اور کلب کو روانہ ہو گیا۔

راستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آ گیا، تانگہ موڑ کر گھر کی طرف پلٹا۔ باہر سے نوکر کو آواز دی۔

''امجد——!''

''جی حضور——!''

"دیکھو حجام کو جاکے کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے۔"

"بہت اچھا۔"

"گیارہ بجے۔ سُن لیا نا؟ کہیں روز کی طرح چھ بجے وارد نہ ہو جائے۔"

"بہت اچھا حضور ——"

"اور گیارہ بجے سے پہلے آئے تو دھکے دے کر باہر نکال دو۔"

یہاں سے کلب پہنچے۔ آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا۔ اندر داخل ہوا تو سنسان، آدمی کا نام و نشان تک نہیں۔ سب کمرے دیکھ ڈالے۔ بلیرڈ کا کمرہ خالی، شطرنج کا کمرہ خالی، تاش کا کمرہ خالی، صرف کھانے کے کمرے میں ملازم چھریاں تیز کر رہا تھا۔

اس سے پوچھا۔

"کیوں بے، آج کوئی نہیں آیا؟"

"کہنے لگا۔ "حضور آپ تو جانتے ہی ہیں۔" اس وقت بھلا کون آتا ہے؟"

بہت مایوس ہوا، باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں، اور کچھ نہ سوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہنچا، معلوم ہوا کہ ابھی دفتر سے نہیں آئے۔ دفتر پہنچا تو دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ میں نے سب حال بیان کیا۔ کہنے لگے۔

"تم باہر کمرے میں ٹھہرو —— تھوڑا سا کام رہ گیا ہے، بس ابھی کلکتے تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ شام کا پروگرام کیا ہے؟

میں نے کہا۔

"وہ تھیٹر ——!"

کہنے لگے —— "بس بہت ٹھیک ہے، تم باہر بیٹھو۔ میں ابھی آیا۔"

باہر کے کمرے میں ایک چھوٹی سی کرسی پڑی تھی، اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا، اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کر دیا —— شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا —— اور ابھی چار بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا —— پھر سے پڑھنا شروع کیا —— سب اشتہار پڑھ ڈالے —— اور پھر سب اشتہاروں کو دوبارہ پڑھ ڈالا۔

آخر کار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلیف یا لحاظ کے جمائی لینے لگا، جمائی پر جمائی، حتّٰی کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔

اس کے بعد ٹانگیں ہلانا شروع کیا —— لیکن اس سے بھی تھک گیا —— پھر میز پر طبلے کی گتیں بجاتا رہا۔

بہت تنگ آ گیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا ''ابے یار چلتا ہے کہ مجھے انتظار میں ہی مار ڈالے گا؟ مردود کہیں کا —— سارا میرا دن ضائع کر دیا۔

وہاں سے اٹھ کر مرزا کے گھر گئے —— شام بڑے لطف میں کٹی، کھانا کلب میں کھایا —— اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لے کر تھیٹر گئے، رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے، تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ نیند نے بے ہوش کر دیا۔ صبح جب آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی، گھڑی دیکھی تو پونے گیارہ بجے تھے، ہاتھ بڑھا کر میز پر سے سگریٹ اٹھایا اور سلگا کر طشتری میں رکھ دیا۔ اور پھر اُونگھنے لگا۔

گیارہ بجے امجد کمرے میں داخل ہوا، کہنے لگا ''حضور حجام آیا ہے ——''

ہم نے کہا۔ یہیں بُلا لو۔ یہ عیش و عشرت مدت کے بعد نصیب ہوا کہ بستر میں لیٹے لیٹے حجامت بنوا لیں، اطمینان سے اُٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کے لیے تیار ہوئے، لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی، جس کی اُمید لگائے بیٹھے تھے، چلتے وقت الماری سے رومال نکالا تو خدا جانے دل میں کیا خیال آیا، کرسی پر بیٹھ گیا، اور سودائیوں کی طرح رومال تکتا رہا۔ الماری کا ایک خانہ کھولا تو سرمئی رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ نظر پڑا —— باہر نکالا، ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آ رہی تھی، بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا —— دل بھر آیا، گھر سونا معلوم ہونے لگا، بہتیرا اپنے آپ کو بہلایا لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بے تاب ہو گیا اور سچ مچ رونے لگا۔ کپڑوں کے سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے لیکن نہ معلوم کیا کیا یاد آیا کہ اور بھی بے قرار ہوتا گیا۔

آخر نہ رہا گیا —— باہر نکلا —— اور سیدھا تار گھر پہنچا، وہاں سے تار دیا کہ میں بہت اُداس ہوں تم فوراً آ جاؤ۔

تار دینے کے بعد دل کو اطمینان ہوا —— یقین تھا کہ روشن آرا جس قدر ہو سکے گا جلدی

آ جائے گی۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھ گئی، جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔ دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تاش کا معرکہ گرم ہوتا تھا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں اس لیے یہ تجویز ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلو۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی، سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے۔ ابھی سے کہہ دیا کہ مجھے میں اگر ذرا بھی خلل ہوا تو تمھاری خیر نہیں، اور پان اس طرح سے پہنچتے رہیں کہ تانتا لگ جائے۔

اب اس کے بعد کے واقعات کو کچھ مردہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا رہا، جوا بھی کھیلا گیا۔ بہت معقول طریقے سے قواعد وضوابط کے مطابق اور متانت وسنجیدگی کے ساتھ۔ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد کچھ خوش طبعی شروع ہوئی، یار لوگوں نے ایک دوسرے کے پتے دیکھنے شروع کر دیے۔ یہ حالت تھی کہ آنکھ بچی نہیں اور ایک آدھ پتہ اڑا نہیں۔ اور ساتھ ہی قہقہے پر قہقہے اڑنے لگے ـــــ تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھٹنہ ہلا ہلا کر گا رہا ہے، کوئی فرش پر بازو ٹیکے سیٹی بجا رہا ہے، کوئی تھیٹر کا ایک آدھ مزاحیہ فقرہ لاکھوں بار دہرا رہا ہے۔ لیکن تاش برابر ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھول دھپا شروع ہوا ـــــ ان خوش فعلیوں کے دوران ایک مسخرے نے ایک ایسا کھیل تجویز کر دیا جس کے آخر میں آدمی بادشاہ بن جاتا ہے۔ دوسرا وزیر، تیسرا کوتوال، اور جو سب سے ہار جاتا ہے وہ چور۔

سب نے کہا واہ واہ! ـــــ کیا بات کہی ہے ـــــ ایک بولا "پھر آج جو چور بنا اس کی شامت آ جائے گی۔

دوسرے نے کہا "اور نہیں تو کیا، بھلا ایسا ویسا کھیل ہے، سلطنتوں کے معاملے ہیں، سلطنتوں کے۔

کھیل شروع ہوا، بدقسمتی سے ہم چور بن گئے، طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں، کوئی کہنے لگا، ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے جائیے اور حلوائی کی دوکان سے مٹھائی خرید کر لائیے۔ کوئی بولا نہیں حضور سب کے پاؤں پڑیے، اور ہر ایک سے دو چانٹے کھائیے۔"

دوسرے نے کہا۔ "نہیں حضور، ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر ہمارے ساتھ ناچیے۔ آخر میں بادشاہ سلامت بولے، ہم یہ حکم دیتے ہیں کہ چور کو ایک لمبوتری نوک دار ٹوپی پہنائی جائے اور اس

کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے۔ کیا دماغ پایا ہے حضور نے، کیا سزا تجویز کی ہے، وڈاہ، وڈاہ——!"

ہم بھی مزے میں آئے تھے، ہم نے کہا" تو کیا ہوا؟ آج ہم ہیں کل کسی اور کی باری آجائے گی۔ نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا—— ہنس ہنس کر وہ بیہودہ سی ٹوپی پہنی، ایک شانِ استغنا کے ساتھ چلم اُٹھائی، اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیے اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا، اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئی، منہ سے بُرقعہ اُلٹا تو روشن آرا۔

دَم خشک ہوگیا—— بدَن پر ایک لرزہ سا طاری ہوگیا۔ زبان بند ہوگئی—— سامنے وہ روشن آرا جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا کہ "تم فوراً آجاؤ، میں بہت اُداس ہوں" اور اپنی یہ حالت کہ منہ پر سیاہی ملی ہے، سر پر وہ لبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے، اور ہاتھ میں چلم اُٹھائے کھڑے ہیں، اور مردانے کمرے سے قہقہوں کا شور برابر آرہا ہے۔

رُوح منجمد ہوگئی—— اور تمام حواس نے جواب دے دیا، روشن آرا کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی—— اور پھر کہنے لگی۔

لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی—— اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بے ہوشی کی حالت میں پہنچ رہی تھی—— اب تک آپ اتنا تو جان ہی گئے ہوں گے کہ میں بذاتِ خود شریف واقع ہوا ہوں، جہاں تک کہ میں ہوں، مجھ سے بہتر میاں بیوی دنیا پیدا نہیں کرسکتی۔ میری سسرال میں سب کی یہی رائے ہے، اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے لیکن اِن دوستوں نے مجھے رُسوا کردیا ہے، اس لیے میں نے مُصمّم ارادہ کرلیا ہے کہ اب یا تو گھر میں رہوں گا، یا کام پر جایا کروں گا۔ نہ کسی سے ملوں گا، اور نہ کسی کو اپنے گھر آنے دوں گا، سوائے ڈاکیہ یا حجّام کے، اور اُن سے بھی نہایت مختصر باتیں کیا کروں گا۔

"خط ہے؟"

"جی ہاں——!"

"دبے جاؤ، چلے جاؤ——"

"ناخن تراش دو۔"

"بھاگ جاؤ۔"

بس اس سے زیادہ گفتگو نہ کروں گا۔ آپ دیکھیے تو سہی۔

لاہور کا جغرافیہ

تمہید

تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور کو دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گذر چکا ہے، اس لیے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنے کی اب ضرورت نہیں کہ کرّے کو دائیں سے گھمایئے، حتّٰی کہ ہندستان کا ملک آپ کے سامنے آ کر ٹھہر جائے، پھر فلاں طول البلد، عرض البلد کے مقام انقلاع پر لاہور کا نام تلاش کیجیے، جہاں یہ نام کرّہ پر موقوف ہو، وہی لاہور کا محل وقوع ہے، اس تحقیقات کو مختصر مگر جامع الفاظ میں بزرگ یوں بیان کرتے ہیں کہ لاہور، لاہور ہی ہے۔ اگر اس پتہ سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔

محل وقوع

ایک دو غلطیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں، لاہور پنجاب میں واقع ہے، لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی زمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں، اور جو نصف دریا ہے وہ تو اب بہنے کے قابل نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔

ملنے کا پتہ یہ ہے کہ شہر کے قریب دوئیل بنے ہوئے ہیں، ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا رہتا ہے، بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے، یہ بتانا مشکل ہے اس لیے کہ شہر دریا کے کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر واقع ہے۔

لاہور تک پہنچنے کے لیے کئی راستے ہیں، لیکن دوان میں سے بہت مشہور ہیں، ایک پشاور سے آتا ہے، دوسرا دہلی سے، وسطی ایشیا کے حملہ آور پشاور کے راستے، اور یو پی کے حملہ آور دہلی کے راستے وارد ہوتے ہیں۔ اول الذکر اہلِ سیف کہلاتے ہیں۔ اور غزنوی یا غوری تخلص کرتے ہیں اور اس میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

حدود اربعہ

کہا جاتا ہے کسی زمانے میں لاہور کا حدود اربعہ بھی ہوا کرتا تھا لیکن طلبا کی سہولت کے لیے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف لاہور ہی لاہور واقع ہے اور روز بروز واقع تر ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا جس کا دارالخلافہ پنجاب ہوگا۔ یوں سمجھیے کہ لاہور ایک جسم ہے جس کے ہر حصے پر ورم نمودار ہو رہا ہے، لیکن ہر ورم مواد فاسد سے بھرا ہے، گویا یہ وسیع عارضہ ہے جو اس جسم کو لاحق ہے۔

آب و ہوا

لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں جو تقریباً سب غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے، میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ اس ترقی کے دور میں جب کہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ اہل لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں بلکہ ہمدردانہ غور و خوض کی مستحق ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی، اس لیے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفادِ عامہ کے پیش نظر اہلِ شہر ہوا کا بیجا استعمال نہ کریں بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ لاہور میں عام ضروریات کے لیے ہوا کی بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے، کمیٹی نے جابجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لیے لاکھوں مرکز

کھول دیے ہیں، جہاں یہ مرکبات مفت تقسیم کیے جاتے ہیں، اُمید کی جاتی ہے کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج برآمد ہوں گے۔

بہم رسائی آب و ہوا کے لیے ایک اسکیم عرصے سے کمیٹی کے زیر غور ہے، یہ اسکیم نظام سقّے کے وقت سے چلی آتی ہے، لیکن مُصیبت یہ ہے کہ نظام سقّے کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودات بعض تو تلف ہو چکے ہیں، اور جو باقی ہیں اُن کے پڑھنے میں بہت دقت پیش آرہی ہے، اس لیے ممکن ہے کہ تحقیق و تدقیق میں ابھی چند سال اور لگ جائیں۔ عارضی طور پر پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے، اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی ہوئی ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر محلے کا اپنا ایک دریا ہوگا جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہوں گی اور ہر مچھلی کے پیٹ میں ایک انگوٹھی ہوگی جو رائے دہندگی کے موقع پر ہر رائے دہندہ پہن کر آئے گا۔

نظام سقّے کے مسوّدات سے اس قدر ضرور ثابت ہوا ہے کہ پانی پہنچانے کے لیے ایک نہ ایک دن یہ گیسیں ضرور مل کر پانی بن جائیں گی۔

چنانچہ بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ ٹپکتے ہیں، اہلِ شہر کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ دیں تاکہ عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو، شہر کے لوگ اس پر بہت خوشیاں منا رہے ہیں۔

ذرائع آمد و رفت

جو سیاح لاہور تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہیں ان کو یہاں کے آمد و رفت کے ذرائع کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں تاکہ وہ یہاں کی سیاحت سے کماحقہ اثر پذیر ہو سکیں ''جو سڑک بَل کھاتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گذرتی ہے، تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جو شیر شاہ سوری نے بنوائی تھی۔ یہ آثارِ قدیمہ میں شمار ہوتی ہے اور بے حد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل گوارہ نہیں کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جُوں کی توں موجود ہیں جنھوں نے کئی سلطنتوں کے تختے اُلٹ دیے تھے، آج کل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں اُلٹتے ہیں اور عظمت رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لیے ان تختوں کے پیچھے کہیں کہیں دو ایک پہیے لگا لیتے ہیں اور سامنے دو بانس لگا کر ایک گھوڑا نانگ دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو تانگہ کہتے ہیں، شوقین لوگ اس پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں، تا کہ پھسلنے میں سہولت ہو اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جا سکے۔

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں، قصابوں کی دکانوں پر انھیں کا گوشت بکتا ہے اور زین کس کر کھایا جاتا ہے، تانگوں میں ان کے بجائے بناسپتی گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں، بناسپتی گھوڑے شکل و صورت میں دُم دار ستارے سے ملتے ہیں، کیونکہ ان گھوڑوں کی ساخت میں دُم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے۔ حرکت کے وقت اپنی دُم کو دبا لیتا ہے۔ اور اس ضبطِ نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے تا کہ سڑک کا ہر تاریخی گڑھا اور تانگے کا ہر ہچکولا اپنے نقش پر ثبت کرتا جائے اور آپ کا ہر ایک مقام لطف اندوز ہو سکے۔

قابلِ دید مقامات

لاہور میں قابلِ دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور کی ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دوہری بنائی جاتی ہیں۔ پہلے اینٹوں اور چونے سے دیواریں کھڑی کر دی جاتی ہیں، پھر اس پر اشتہاروں کا پلستر کر دیا جاتا ہے جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھ جاتا ہے۔ شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکا دیے جاتے ہیں۔ مثلاً ''اہلِ لاہور کو مژدہ'' یا ''اچھا سستا مال'' اس کے بعد اشتہاروں کی باری آتی ہے جن کے مخاطب اہلِ علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں مثلاً ''گریٹ درزی ہاؤس'' یا ''سٹوڈنٹس کے لیے نادر موقع'' یا ''کبھی ہے ہم کو غلطی خدا نخانہ کیا۔'' رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری مکمل ڈائرکٹری کی صورت اختیار کر لیتی ہے، دروازے کے اُوپر بوٹ پالش کا اشتہار دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتہ درج ہے، بائیں طرف حافظہ کی گولیوں کا بیان ہے، اس کھڑکی کے اُوپر ''انجمن خدام ملت'' کے جلسے کا پروگرام ہے۔ اس کھڑکی پر مشہور لیڈر کے خانگی حالات باوضاحت بیان کر دیے گئے ہیں۔ عقبی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مس نغمہ جان کی تصویر اور ان کے حالات بکھوا رکھے ہیں۔ یہ اشتہارات بڑی سُرعت سے بدلتے رہتے ہیں اور ہر نیا مژدہ اور

ہرنئی دریافت یا ایجاد یا انقلاب نسیم کی اشلا چشم زدن میں ہرسا کن چیز پر لیپ دی جاتی ہے، اسی لیے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لحہ بدلتی رہتی ہے، اوران کو پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو بڑی دقت پیش آتی ہے۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے کہ بعض بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے خود دیوار پر نقش کر دیے جاتے ہیں، یہ دقت بہت حد تک رفع ہوگئی ہے۔ ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ باقی نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لیے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ چار پائیوں کا اشتہار لگا تھا اور لوٹتے وقت تک وہاں اہالیانِ لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جارہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ جہاں بحرف جلی "محمد علی دنداں ساز" لکھا ہے وہ "انقلاب کا دفتر" ہے۔ جہاں بجلی، پانی، بھاپ کا بڑا ہسپتال لکھا ہے وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں، خالص گھی کی مٹھائی "امتیاز علی تاج" صاحب کا مکان ہے "کرشنا بیوٹی کریم" شالا مار باغ کو اور کھانسی کا مجرّب نسخہ جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

صنعت وحرفت

اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ سازی ہے اور سب سے بڑی انجمن سازی ہے۔ ہر رسالے کا نمبر خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کیے جاتے ہیں۔ عام نمبر میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں۔ اس سے ادب کو بہت فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اور فن تنقید ترقی کرتا ہے۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے، پریذیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں۔ اس لیے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہیں، یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں، چونکہ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں، اس لیے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کا افتتاح کرتا ہے۔ سہ پہر کو کسی سینما کی انجمن میں مس نغمہ جان کا تعارف کراتا ہے اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے، اس سے ان کا مطمحِ نظر وسیع رہتا ہے۔ تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے جو تینوں موقعوں پر کام آسکتی ہے۔ چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔

پیداوار

لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبا ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔

طلبا کی کئی قسمیں ہوتی ہیں جن میں چند مشہور قسم ہیں۔ قسم اوّل جمالی کہلاتی ہے، یہ طلبا عام طور پر درزیوں کے یہاں تیار ہوتے ہیں، بعد ازاں دھوبی اور پھر نائی کے پاس بھیجے جاتے ہیں، اور اس عمل کے بعد کسی ریستوران میں ان کی نمائش کی جاتی ہے، غروب آفتاب کے بعد ہی سینما یا سینما کے گرد و نواح میں۔

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر آتا ہے پروانہ

شمعیں کئی ہوتی ہیں، لیکن سب کی تصویر ایک البم میں جمع کر کے اپنے پاس رکھ چھوڑتے ہیں اور تعطیلات میں ایک ایک کو خط لکھتے ہیں۔

دوسری قسم جلالی طلبا کی ہے۔ ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے، اس لیے ہندستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لیے نکلتے ہیں اور جو دو تین کے گرم لنڈھاتے پھرتے ہیں۔

کالج کی خوراک انھیں راس نہیں آئی۔ اس لیے ہوسٹل میں فروکش نہیں ہوتے۔

تیسری قسم خیالی طلبہ کی ہے۔ یہ اکثر روپ، اخلاق اور آواگون اور جمہوریت پر باآواز بلند تبادلۂ خیالات کرتے پائے جاتے ہیں۔ اور آفرینش اور نفسیات غیبی کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے رہتے ہیں۔ صحت جسمانی کو ارتقا انسانی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لیے علی الصباح پانچ چھ ڈنڑ پیلتے ہیں اور شام کو ہوسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں۔ گاتے ہیں لیکن بے سرے ہوتے ہیں۔

چوتھی قسم خالی طلبا کی ہے۔ یہ طلبا کی خالص ترین قسم ہے۔ ان کا دامن کسی قسم کی آلائشوں سے تر ہونے نہیں پاتا۔ کتابیں، امتحانات، مطالعہ اور اسی قسم کے خدشے کبھی ان کی زندگی میں

داخل نہیں ہوتے۔ جس معصومیت کو لے کر وہ کالج پہونچتے ہیں اسے آخر تک ملوث نہیں ہونے دیتے اور تعلیم اور نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اسی طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے۔

پچھلے چند سالوں سے طلبا کی ایک اور قسم بھی دکھائی دینے لگی ہے لیکن ان کو اچھی طرح دیکھنے کے لیے محدب شیشے کا استعمال ضروری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت پر ملتا ہے، اور اگر چاہیں تو اپنی انا کے ساتھ زنانے ڈبے میں سفر بھی کر سکتے ہیں۔ اور ان کی وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر شرط عائد کر دی ہے کہ آئندہ صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کیے جائیں جو دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں۔

طبعی حالات: لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔

سوالات

(1) لاہور تمھیں کیوں پسند ہے؟ مفصل لکھو۔

(2) لاہور کس نے دریافت کیا اور کیوں؟ اس کے لیے سزا بھی تجویز کرو؟

(3) میونسپلٹی کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھو۔

(شوکت تھانوی)

بارِ خاطر

(حضرت جگر مرادآبادی کے نام)

گڑھی شاہو۔لاہور

15/جون1954

صدیق مکرم

ابھی مَری میں آپ کے ساتھ دو بیدار راتیں اور ڈیڑھ خواب آلود دن گزار کر لاہور پہنچا ہوں مگر تشنگی باقی ہے اور پھر آپ ہی سے مخاطب ہوں۔مَری میں توری کا شغل جاری رہا اور اس کثرت سے جاری رہا کہ رمی پر مَری کا اور مَری پر رمی کا گمان گزرتا ہے۔اگر آپ باور کریں تو عرض کروں کہ واپسی میں مری کے فراز سے پنڈی کے نشیب تک ہر فرد پر تاش کے پتوں کا شبہ ہوتا تھا۔ہر عورت جو نظر سے گزری پھول کی بیگم یا اینٹ کی ملکہ نظر آئی۔ہر مرد پر پان کے غلام یا حکم کے بادشاہ کا گماں گزرا۔غضب خدا کا دو مسلسل راتیں تاش کی گڈیاں پھینٹ پھینٹ کر بسر کردیں۔زندگی میں ایسی ایسی خدا جانے کتنی راتیں بسر کی ہیں اور ایک سے ایک کھلاڑی سے واسطہ پڑا ہے مگر آپ کے انہماک کا جواب نہیں،اس موقع پر آپ ہی کا ایک شعر آپ کو سناتا ہوں

جو آپ کے لیے آپ کی ایک مقبول دعا کی حیثیت رکھتا ہے۔

عشق بے قید تصوّر شوق بے قید نظر
مجھ کو جو کچھ چاہیے بے حد و پایاں چاہیے

بے شک جو شغل بھی اختیار کیا انتہا پر پہنچ کر اور انتہا تک پہنچا کر اختیار کیا۔ رندی اور سرمستی کا وہ زمانہ جب ہر نظر جام و سبو اور ہر نفس مے خانہ تھا ابھی کل کی بات ہے۔ رند بلانوش پڑھا ضرور تھا مگر 1926 کی ایک رات میں پُوری کے ایک مشاعرے میں دیکھ بھی لیا جب ایک اُجاڑ سی صورت کا شاعر، جیسے لیتھو پر چھپی ہوئی خیام کی تصویر، مشاعرے کے ایک گوشے سے اٹھا اور اس نے مقطع نما مطلع جھوم کر پڑھا:

نظر کو مستِ مے حسن کر حجاب اٹھا
جگر شراب نہ پی تہمت شراب اٹھا

اور میں چونک پڑا کہ کیا یہی ہیں جگر اور فوراً ہی جگر نے یہ شعر پڑھ کر تصدیق کر دی:

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ
میں اپنا جام اٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا

1926 کی وہ رات اور آج کا دن۔ تعلقات کے اٹھائیس سال اور ہم دونوں ایسے سخت جاں کہ دونوں کو تعلقات کی یہ مدت نہ مار سکی۔ اس عمر کے نہ دوست ملتے ہیں نہ دشمن۔ اس مدت میں دوستیاں دشمن بن جاتی ہیں اور اتنی طویل دشمنی بھی وفا نہیں کرتی۔ آنے کو تو بہت سے انقلاب آئے۔ ایک رند نے توبہ کی، ایک خانہ بدوش صاحب خانہ بنا۔ جس کا کوئی نہ تھا وہ کسی کا ہو گیا اس کے علاوہ اور بھی بہت سی گتھیاں سلجھیں۔ بڑے بڑے سلجھاؤ الجھے۔ ملکوں کی تقسیم ہوئی نئے نئے ممالک کرۂ ارض پر ابھرے اور بٹوارے ایسے ایسے ہوئے کہ آخر ہم بھی بٹ گئے۔ آپ اُدھر، میں اِدھر اور بیچ میں آگ اور خون کے مؤاج سمندر۔ مگر یہ تعلقات قائم رہے۔ رندی توبہ ان کو ختم نہ کر سکی۔ خانہ بدوش کی خانہ آبادی ان پر اثر انداز نہ ہوئی۔ نہ کسی الجھن نے ان کو سلجھایا نہ کسی سلجھاؤ نے ان کو الجھایا۔ درمیانی آگ اور خون کے سمندر دیکھ دیکھ کر بھی یہ تعلقات یہی کہتے رہے کہ:

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اور یہ تعلقات صرف مجھ ہی سے نہیں ہیں۔ آپ کہتے ضرور ہیں کہ آپ کو مجھ سے ایک خصوصیت ہے مگر آپ کی یہ خصوصیت اتنی عام ہے کہ:

اللہ ری چشم یار کی معجز بیانیاں
ہر اک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے

میں نے تو آپ کی اس خصوصیت کا مرکز ان کو بھی دیکھا ہے جن سے گلے ملنے کے بعد جن کو نہایت خلوص سے پہلو میں جگہ دینے کے بعد آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ:

"آپ مجھ سے یہ تقاضا نہ کیجیے گا کہ میں آپ کو آپ کا نام بھی بتاؤں۔ نام اصل چیز نہیں ہے، شخصیت اصل شے ہے۔ دماغ میں نام محفوظ نہیں تو نہ ہو مگر وہ جو ایک تعلق ہوتا ہے روح کا روح سے، جی ہاں، وہ بہر حال موجود ہے۔ فاصلہ اور وقت نام دماغ کو محو کر سکتا ہے مگر اس تعلق کو ختم نہیں کر سکتا۔"

بلکہ میں نے آپ کی اس خصوصیت کا مرکز ان ناجنسوں کو بھی دیکھا ہے جو محض ایک جذبۂ پرستاری لے کر اس وقت آ جاتے ہیں جب آپ تاش کھیل رہے ہوتے ہیں، مارے اخلاق کے آپ تمام حرف و حکایت اور تمام دیدہ و دل بن جانا چاہتے ہیں مگر اس اہتمام کے باوجود شرحِ عاشقی اس لیے نہیں ہو سکتی کہ توجہ ہوتی ہے آپ کی تاش کے پتوں کی طرف اور دل دہی کرنا چاہتے ہیں آپ مہمان کی بھی۔ آپ کی وہ کیفیت بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے کہ ہاتھ میں ری کے بارہ پتے ہیں جن کو آپ گھبرا گھبرا کر مرتب کر رہے ہیں اور باتیں ان حضرت سے بھی کرتے جاتے ہیں۔

"خلوص کا سوائے خلوص کے کوئی نام نہیں ہوتا۔ اہل خلوص کا تعارف ایک مخلص دل خود ہی کرا دیتا ہے۔"

اور وہ حضرت اپنی ہانک رہے ہیں:

"صاحب میں تو ادھر آ کر مسلسل پریشانیوں میں مبتلا ہوں۔"

آپ اپنے تیرہ پتوں میں گم ان کی بات کا جواب بھی دیتے جاتے ہیں اور اپنے کھیل کے ساتھیوں سے بھی مخاطب رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ مکالمہ کچھ اس طرح کا بن جاتا ہے:

"جی ہاں وہ پریشانیاں تو ہوتی ہی ہیں۔ صاحب گن لیجیے تیرہ پتے ہیں نا۔"

''کوئی مکان الاٹ نہیں ہوا۔ ملازمت بھی ابھی تک نہیں مل سکی۔''

''جی ہاں، یہ امتحانی دور سے گزرتے ہی ہیں۔ آپ کی چال ہے صاحب۔''

''بچوں کی تعلیم کا بھی کوئی بندوبست نہیں۔''

''جی ہاں، آپ اُدھر کھسک کر بیٹھیے پتے دکھائی دیتے ہیں۔''

''پچھلے مہینے والد صاحب کا بھی انتقال ہوگیا۔''

''جی ہاں، وہ تو ہو ہی جاتا ہے۔''

اور پھر ایک دم چونک کر،

''جی کیا فرمایا۔ والد صاحب کا انتقال۔''

اس کے بعد آپ تاش کے پتے رکھ کر واقعی تعزیت کرنا چاہتے ہیں بلکہ ایک آدھ تعزیتی جملہ بھی کہتے ہیں جس سے اس آدمی کو اپنے باپ کے مرنے پر شرمندہ ہوجانا چاہیے۔ مگر چونکہ وہ صرف یتیم نہیں بلکہ یتیم العقل بھی ہوتا ہے لہٰذا آپ فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں اور چوں کہ ہاتھ میں تاش بھی ہوتے ہیں لہٰذا آپ گڈی سے پتا گھسیٹتے ہوئے کہتے ہیں:

''آپ کے والد مرحوم— جوکر۔''

اور آپ کو جوکر مل جانے پر بجائے اُن حضرت کے آپ کے کھیل کے ساتھی یتیم بن کر رہ جاتے ہیں اور آپ ''شو'' کر کے بازی جیت لیتے ہیں۔

خیر یہ تو ایک تمثیلی منظر خواہ مخواہ بیچ میں آگیا ورنہ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ آپ کی اس خصوصیت کی یہ عمومیت مجھ کو اس لیے ناگوار نہیں ہے کہ مجھے آپ سے نہیں، خود اپنے سے غرض ہے ور مجھے جو خصوصیت ہے وہ خصوصیت کے جواب میں خصوصیت بھی نہیں چاہتی اس لیے کہ خصوصیت نہ کوئی تجارتی لین دین ہے نہ جوابی پوسٹ کارڈ۔ آپ کے پاس بیٹھ کر میں صرف اس شعر کی تفسیر بن جاتا ہوں:

تیری محفل میں ہے اک ننگ محبت بھی ترا
دیکھنا ہو کے پشیمان نہ جانے پائے

اور یہی غنیمت ہے کہ میں اس محفل سے کبھی پشیمان ہو کے نہیں اٹھا۔ ممکن ہے آپ کو اپنی اداؤں کا اندازہ

نہ ہوا اور اندازہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ نہ تو ان میں منافقت ہے نہ سیاست نہ مصلحت بلکہ یہ ادائیں آپ کی بے ساختگی بن چکی ہیں۔ میں نے یہ مناظر دانستہ اس لیے پیش کر دیے ہیں کہ:

وہ کیا دیکھ سکتے ہیں اپنی ادائیں
انہیں دیکھتے ہیں جو ہم دیکھتے ہیں

آپ کے پاندان کی یاد میں ایک تازہ پان اپنے خاص دان سے نکال کر کھا رہا ہوں اور اس وقت آپ کا وہ تصور نگاہوں کے سامنے ہے جب آپ بہت خلوص کے ساتھ میرے لیے پان بنا کر اس میں اپنا نہایت نفیس دانہ دار تمباکو ڈال کر اور گلوری بنانے کی کوشش میں سنبوسہ بنا کر بجائے مجھ کو دینے کے خود کھا جاتے ہیں اور پھر چونک کر لاحول پڑھتے ہوئے دوسرا پان بنا کر مجھ کو دیتے ہیں۔ پان سے آپ کو وہی شوق ہے جو ہر شریف آدمی کو ہونا چاہیے اور سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں اگر شعلۂ طور کا ایک ہاتھ ہے تو دوسرا ہاتھ آپ کے پان دان کا بھی ہے۔ اگر آپ اس اہتمام سے پان نہ کھاتے ہوتے تو معلوم نہیں آپ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرنے کے لیے مجھ کو کتنے دن لگ جاتے، میں نے آپ کی سرمستی کے زمانے میں بھی آپ کی خود فراموشی دیکھی ہے اور موجودہ عالم ہوش کی بے ہوشیاں بھی نظر کے سامنے ہیں۔ مگر ان دونوں حالتوں میں اپنے پان دان سے آپ کبھی غافل نہ رہے:

پاؤں اُٹھ سکتے نہیں منزلِ جاناں کے خلاف
اور اگر ہوش کی پوچھو تو مجھے ہوش نہیں

جس وقت آپ کے سامنے پان دان کھل جاتا ہے اُس وقت میری طرح آپ کا بھی یہی عالم ہوتا ہے کہ:

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے میخانے میں
علاوہ شیشے میں ہے فردوس ہے پیمانے میں

جگر صاحب، سچ تو یہ ہے کہ جو پان آپ ادھر آ کر کھاتے ہیں یا جس پان کو ہم پان سمجھ بیٹھے ہیں اس کا بھلا پان سے کیا تعلق۔ پان تو نہیں پان کا دھوکہ کھا رہے ہیں۔ کھاتے ہیں یہ پان اور تصور کرتے ہیں اس پان کا جو میسر نہیں:

اس پردۂ رنگیں پہ نظر آتا ہے جو کچھ
جیسے کہ یہ اک خواب ہے معلوم نہیں کیوں

شکر ہے کہ پان کی ایک ''غنیمت'' قسم لاہور میں ملنے لگی ہے، جس کو بیچنے والے میٹھا پان کہہ کر بیچتے ہیں اور ہم اس کو صبر کے پھل والے درخت کا پتا سمجھ کر کھا لیتے ہیں۔ اس پان کو طبیعت نے گوارا کرلیا ہے۔ مجبوری کا نام صبر ہے اور صبر نے عادت کی صورت اختیار کرلی ہے۔ لہٰذا اسی پان کی ایک گلوری کے لیے پھر ہاتھ بڑھاتا ہوں اور یہ خط ختم کرتا ہوں۔

شوکت

(سند باد جہازی)

جدید جغرافیہ پنجاب

(تیسرا باب)

پہاڑ۔دریا۔نہریں وغیرہ

پنجاب کی قدرتی تقسیم کے تذکرہ میں ہم مختصر طور پر پنجاب کے بڑے بڑے کوہستانی سلسلوں کا ذکر کر چکے ہیں۔ان میں سب سے بڑا کوہستانی سلسلہ جسے سدِ سکندری کہتے ہیں اتحادی سطح مرتفع میں پھیلا ہوا ہے۔کہتے ہیں جہاں آج کل سدِ سکندری واقع ہے وہاں زمانہ قبل از تاریخ میں ہر طرف بنجر میدان اور ریگستان پھیلے ہوئے تھے جن میں سینکڑوں میلوں تک روئیدگی کا نام ونشان نظر نہیں آتا تھا۔پھر زمین کے اندرونی طبقات میں کچھ ایسی تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ پہاڑوں کے ایک عظیم الشان سلسلہ نے اس کی جگہ لے لی۔ماہرین علم طبقات الارض کا خیال ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد یہ کوہستانی سلسلہ پھر غائب ہو جائے گا اور جہاں آج یہ پہاڑ کھڑے ہیں وہاں کفِ دست میدان کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا لیکن بعض اتحادی محقق اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ سدِ سکندری سنگ خارا کی چٹانوں کا مستحکم پہاڑ ہے جسے زمین کے اندرونی تغیرات لاکھوں برس تک اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے۔سدِ سکندری کی سب سے اونچی چوٹی

سکندر مونٹ ہے جو اس سلسلہ کوہ کے مغربی سرے پر واقع ہے۔ اس پر ہمیشہ سپید برف جمی رہتی ہے جو دور دور سے نظر آتی ہے اور بہت خوشنما معلوم ہوتی ہے۔ اس کے آس پاس اور بہت سی چھوٹی چھوٹی چوٹیاں ہیں۔ جن کے برفانی عمامے دور سے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ پنجاب کے کسان کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے ان چوٹیوں کو دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان میں یہ خیال عام ہے کہ اگر خدانخواستہ پہاڑوں پر برف نہ رہے تو پنجاب کے دیہات خشک سالی کی وجہ سے ویران ہو جائیں۔

ہر مذہب وملت کے لوگ سکندر مونٹ پر اپنا حق جتاتے ہیں۔ چنانچہ ساہوکار کہتے ہیں کہ کیلاش پربت کی طرح یہ پہاڑ بھی مقدس ہے کیونکہ یہاں مدت تک شری ساور کرنے کٹیا ڈال رکھی تھی۔ اور شری گاندھی جی مہاراج بھی اسے اشیرواد دے چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اب ملیچھوں نے اسے بھرشٹ کر دیا ہے۔

منوہر پربت

یہ چوٹی اتحادی سطح مرتفع کے حصہ میں ہندو سبھا کی ترائی کے پاس واقع ہے۔ یہ بالکل چٹیل پہاڑ ہے اور اس کے صرف بعض حصوں میں تھوڑی تھوڑی زیر درختی پائی جاتی ہے۔ اسے لاکھی پربت بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ اس کے دامن میں اگلے وقتوں کے خزانے دفن ہیں پلیے ساہوکار کہتے ہیں کہ بوہنی کے وقت منوہر پربت کا نام لیا جائے تو بنج بیوپار میں بڑا نفع ہوتا ہے۔

کوہ خضر

کسی وقت جب آسمان صاف ہو سکندر مونٹ پر نظر ڈالو۔ تمھیں اس سے کسی قدر یورپ کی طرف ہٹ کے ایک اور چوٹی نظر آئے گی جس کے برفانی عمامہ کے ساتھ ساتھ سیاہی سی دکھائی دیتی ہے۔ اس برفانی چوٹی کو کوہ خضر کہتے ہیں اور اس کے پاس جو سیاہی نظر آتی ہے وہ اصل میں جنگلات ہیں۔ اگرچہ اونچائی میں یہ سکندر مونٹ سے چھوٹی ہے مگر اس کا راستہ بہت دشوار گذار ہے اور بڑے بڑے کوہ پیما اس کا بھید نہیں پا سکے۔

مجیٹھہ پہاڑ

سد سکندری کی یہ اونچی چوٹی اکالی جنگلات کے سر پر کھڑی سنتری کی طرح پہرہ دے رہی

ہے۔ سندر بن کا مشہور جنگل اس چوٹی پر واقع ہے۔ اس پر برف بھی پڑتی ہے مگر زیادہ دیر نہیں رہتی۔ اس کی ڈھلوانوں پر کھیتی باڑی بھی خوب ہوتی ہے۔

میاں کا ٹیلا

یہ چوٹی بہت نیچی ہے۔ اس لیے اس تک پہنچنا آسان ہے۔ چنانچہ کالجوں اور اسکولوں کے کھلنڈرے کئی مرتبہ اس تک پہنچ چکے ہیں۔ پھر بھی ہر انسان کا کام نہیں کہ اس پر قدم رکھ سکے۔ کیونکہ جو لوگ یہاں تک پہنچتے ہیں وہ لوٹتے وقت راستہ بھول جاتے ہیں۔ اس پر برف کا کہیں نام ونشان نظر نہیں آتا۔ ہر طرف خشک گھاٹیاں اور خوفناک چٹانیں بڑے غرور سے سر اٹھائے کھڑی ہیں۔ جنھیں دیکھ کر انسان کو آگے بڑھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ پھر بھی جن لوگوں کو معلومات بڑھانے اور اپنے علم میں اضافہ کرنے کا شوق ہے وہ جوں توں کر کے یہاں جا ہی پہنچتے ہیں۔

کوہ چھوٹو رام

یہ پہاڑ اگرچہ سدِ سکندری سے بہت دور مشرق کی طرف ہٹ کے واقع ہے اور بظاہر اتحادی سلسلۂ کوہ سے بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتا ہے تاہم جغرافیہ کے عالموں کا خیال ہے کہ کوہ چھوٹو رام اصل میں سدِ سکندری کی ہی شاخ ہے کیونکہ نباتی اور معدنی پیداوار کے لحاظ سے یہ اتحادی سلسلۂ کوہ سے بہت ملتا جلتا ہے۔ کہتے ہیں اس چوٹی پر کھڑے ہو کر ایک کے دو نظر آتے ہیں۔

اتحادی سلسلۂ کوہ کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے بڑے پہاڑ ہیں۔ ذیل میں مختصر طور پر ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

کوہ شہاب الدین

سدِ سکندری کی مشرق کی جانب یہ عظیم الشان پہاڑ کھڑا ہے۔ اس میں گندھک کی کانیں کثرت سے ہیں اس لیے اس کی رنگت سیاہی مائل ہے۔ اس کے بعض حصوں میں تھوڑی سی زیر درختی بھی پائی جاتی ہے لیکن اکثر حصے بالکل لنڈ منڈ نظر آتے ہیں۔ پرانے زمانے کے لوگوں کا خیال تھا کہ اس پہاڑ سے کبھی لاوے کا سیلاب بہہ نکلے گا جو اتحادی سطح مرتفع کو جلا کر بھسم کر دے گا۔ لیکن نئی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اس کی اندرونی حرارت ختم ہو چکی ہے اور اب اتحادی سطح مرتفع کو اس سے کوئی خطرہ نہیں۔

کوہِ مرد وٹ

مشہور پہاڑ ہے جو اتحادی سطح مرتفع سے وادی لیگ تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس پہاڑ میں سونے کی کانیں ہیں۔ چنانچہ جو برساتی نالے اس سے بہہ نکلے ہیں ان کے ریت میں سونے کے ذرات پائے جاتے ہیں۔ اس پہاڑ کی پیداوار سے اتحادی سطح مرتفع اور وادی لیگ دونوں کے باشندے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

مظفر کوہ

یہ بھی مشہور برفانی پہاڑ ہے جس کی چوٹیاں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کسی زمانے میں سدِ سکندری سے ملا ہوا تھا۔ لیکن بعض کوہستانی ندیوں نے سدِ سکندری کو آہستہ آہستہ کاٹ کر مظفر کوہ سے الگ کر دیا۔ اگر چہ یہ پہاڑ اتحادی سطح مرتفع میں ہی واقع ہے لیکن اس میں اور سد سکندری میں کئی دریا اور وادیاں حائل ہیں اور یہ سدِ سکندری سے بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتا ہے۔

اشتراکی جوالا مکھی

آتش فشاں پہاڑوں کا مشہور سلسلہ ہے۔ کبھی اس سے برابر کئی کئی مہینے تک آگ کے شعلے بلند ہوتے رہتے ہیں اور کبھی مدت تک افسردگی سی چھائی رہتی ہے۔

کانگریسی سلسلۂ کوہ

اس کی دو بڑی شاخیں ہیں۔ ست پڑا اور بھار گو پربت۔ ان دونوں کا ذکر ہم اس کتاب کے پہلے باب میں کر چکے ہیں۔

درّے

درّہ دولتانہ

سدِ سکندری کا مشہور درہ ہے۔ جھیل دولتانہ جس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے اسی درہ میں واقع ہے۔ بہت کشادہ درہ ہے۔ اس لیے اسے اتحادی سطح مرتفع اور دوسرے علاقوں کے درمیان آمد و رفت اور رسل و رسائل کا بہت بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اس درہ سے ہر موسم میں بکثرت قافلے اخباروں کے انبار اور سینما کے فلم گزرتے نظر آتے ہیں۔ سدِ سکندری اور کوہِ شہاب الدین

کے درمیان بھی یہی درہ واسطہ بنا ہوا ہے۔ پرانے زمانے کے اکثر محققوں کا خیال تھا کہ درہ دولتانہ دراصل کوہ شہاب الدین میں واقع ہے لیکن جدید تحقیق سے اس بات کی تردید ہو گئی ہے۔ سلسلہ لیگ کی وادی اس درے کے قریب سے شروع ہوتی ہے۔

درّہ میر

یہ بھی سدِ سکندری کا مقبولِ عام درہ ہے۔ بہت سا مالِ تجارت جو وسادر کو جاتا ہے اسی درہ کے راستہ سے گزرتا ہے پنجاب کی ریاستوں کے جو کارواں جاتے ہیں ان کا راستہ بھی یہی ہے۔

درّہ جہان یا درۂ شاہنواز

سدِ سکندری کا مشہور درہ ہے جو میاں کے ٹیلے میں درہ میر کے عین بالمقابل واقع ہے۔

درّہ خنفر

ایک تنگ درہ ہے جس کے دونوں طرف پرہیبت اور سنگلاخ چٹانیں پھیلتی چلی گئی ہیں۔ یہ درہ بہت پُر پیچ ہے اور دُور سے وادی لیگ کے بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن قریب جاؤ تو وادی لیگ سے بہت دور سدِ سکندری کی چٹانوں میں گھرا ہوا نظر آتا ہے۔

اجل ڈنڈی

یہ درہ گجلطہ پہاڑ میں واقع ہے۔ اکالی جنگلات اور سندر بن کی بہت سی پیداوار اسی درہ کے راستے باہر بھیجی جاتی ہے۔ یہ درہ اونچے اونچے اور گنجان درختوں سے گھرا ہوا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے درے ہیں جن کا حال بڑی بڑی کتابوں میں لکھا ہے۔ بھارگو پربت اور ست پڑا میں بھی بہت سے چھوٹے بڑے درے ہیں جن میں زیادہ آمد و رفت تو نہیں ہوتی البتہ وہ تجارتی مقاصد کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے ہیں۔

جھیلیں

جھیل دولتانہ

یہ میٹھے پانی کی بہت بڑی جھیل ہے۔ یہ کوہ شہاب الدین اور سدِ سکندری کے درمیان واقع ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اب آہستہ آہستہ اس کا پانی کھارا ہوتا جاتا ہے۔ بظاہر اس کی سطح بالکل ساکن نظر آتی ہے اور اس کے نیلگوں پانی پر مرغابیاں اور دوسرے آبی پرندے تیرتے پھرتے ہیں

لیکن یہ جھیل بہت گہری ہے اور جھیل ولر کی طرح اس میں کشتی رانی بہت خطرناک ہے چنانچہ ہر سال اس میں بہت سی کشتیاں اور ڈونگے غرق ہو جاتے ہیں۔

دریا

دریائے ظفر علی خان

پنجاب کا سب سے بڑا دریا ہے جو ہمیشہ اپنا راستہ بدلتا رہتا ہے۔ کسی زمانے میں اس دریا کی ہولناک موجیں ایک طرف سدِ سکندری سے جا ٹکراتی تھیں اور دوسری طرف قادیان کے ٹیلوں تک جا پہنچتی تھیں اور جب اس میں طغیانی آتی تھی تو اتحادی سطح مرتفع کے باشندے الامان والحفیظ پکارتے ہوئے اپنے اپنے گھروں میں جا چھپتے تھے۔ لیکن اب اتحادی انجینئروں نے اس کے دونوں کناروں پر مضبوط بند باندھ دیا ہے اور اس پر واہ کے سیمنٹ سے ایک عظیم الشان پل تعمیر کیا ہے جسے عہدِ جدید کی انجینئری کا عظیم الشان کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ پہلے اس سے آبپاشی بالکل نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اب اس سے اتحادی سطح مرتفع کی اراضی کو سیراب کرنے کا کام لیا جا رہا ہے۔ اس میں اکثر مقامات پر خطرناک چٹانیں ہیں۔ کئی جگہ آبشار بھی ہیں اس لیے اس میں زیادہ دور تک جہاز رانی نہیں ہو سکتی۔

کسی کو یقین نہیں کہ دریائے ظفر علی خان ہمیشہ اس حالت میں رہے گا۔ کیا عجب اس میں پھر کبھی بڑے زور کی طغیانی آئے اور اس کی موجیں بند اور پُل کو بہا کر لے جائیں۔ ابھی چند سال ہوئے اس دریا میں بڑا زبردست سیلاب آیا تھا جس نے احراری کوہستان کو زیرِ آب کر دیا تھا۔ دریائے ظفر علی خان پہلے سدِ سکندری سے ٹکراتا، وادئی لیگ سے پہلو بچاتا بحیرۂ کانگریس میں ڈیلٹا بنا کے گرتا تھا اب اتحادی سطح مرتفع اور وادی لیگ کو سیراب کرتا ہوا خلیج لیگ میں جا گرتا ہے۔

دریائے ظفر علی خان میں بہت سے چھوٹے چھوٹے دریا اور ندی نالے آملتے ہیں جن میں دریائے اختر علی خان بہت مشہور ہے یہ دریا دراصل میں دریائے ظفر علی خان کی ہی ایک شاخ ہے جو کرم آباد سے کچھ دور آگے بڑھ کر دریائے ظفر علی خان سے الگ ہو جاتا ہے اور میدانی علاقے میں بڑے زور سے بہتا ہوا سکندر مونٹ کے مقام پر پھر دریائے ظفر علی خان سے آملتا ہے۔ یہ دریا

اپنے ساتھ بہت سی مٹی بہالاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سکندر مونٹ سے آگے بڑھ کر دریائے ظفر علی خان کا پانی بہت گدلا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے چھوٹے ندی نالے مٹی بہاکے لاتے ہیں اور دریائے ظفر علی خان میں شامل ہو جاتے ہیں۔ محققین کا خیال ہے کہ اگر یہ عمل اسی طرح جاری رہا تو دریائے ظفر علی خان ایک دن ایک وسیع دلدل بن کے رہ جائے گا۔ ان دونوں دریاؤں کے درمیان جو علاقہ ہے اسے دوآبہ زمیندار کہتے ہیں۔

دریائے سالک و دریائے مہر

یہ دونوں دریا پہلے دریائے ظفر علی خان کے معاون تھے۔ لیکن 1927 میں ایک زلزلہ آیا تھا جس نے ان کی گذرگاہ تبدیل کردی۔ دریائے سالک کا پاٹ زیادہ ہے اور دریائے مہر اگرچہ عرض میں اس سے کم ہے لیکن زیادہ گہرا ہے۔ اس کے علاوہ لمبائی میں بھی اس سے زیادہ ہے۔ ان دونوں دریاؤں میں نہ کہیں چٹانیں ہیں نہ آبشار، دونوں خاموشی سے اپنے مقررہ راستہ پر بہتے چلے جاتے ہیں اور ذرہ بھر ادھر ادھر نہیں ہوتے۔ دریائے سالک میں سارا سارا سال کشتیاں چلتی رہتی ہیں اور لوگ غوطے لگاتے اور موتی نکال لاتے ہیں۔ لیکن اکثر غوطہ خوروں اور شناوروں کو دریائے مہر کی طرف رخ کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی۔ یہ دونوں دریا بہتے ہوئے سکندر مونٹ کے قریب آپس میں مل جاتے ہیں اور یہ دریائے انقلاب کہلاتے ہیں۔ ان کے درمیان جو سرسبز اور زرخیز علاقہ ہے اسے دوآبہ مہر سالک کہتے ہیں۔ اکثر لوگ اس دوآبہ کو دوآبۂ انقلاب بھی کہتے ہیں۔ یہ دونوں دریا اتحادی سطح مرتفع کے شمالی حصہ سے نکلتے ہیں اور خلیج لیگ کے قریب جا گرتے ہیں۔

دریائے نورا

چشمۂ لوب نور سے جو کشمیری بازار سے شمال کی جانب واقع ہے، نکلتا ہے۔ میاں کے ٹیلے کے پاس سے گزرتا ہوا مٹی کے ساتھ ساتھ پکی روٹی، نورنامہ کلاں، قصہ شاہ بہرام اور بہت سی چھوٹی بڑی درسی کتابیں بہالاتا ہے۔ کہتے ہیں سکندریہ کا کتب خانہ اسی دریا میں غرق ہوا تھا۔ یہ دریا کچھ ایسا گہرا تو نہیں تھا لیکن کتابوں کی گھلی ہوئی سیاہی کے باعث اس کا پانی بہت تاریک نظر آتا ہے۔ اور اکثر لوگ غلطی سے اسے بہت گہرا سمجھ لیتے ہیں۔ پہلے اس میں جہاز چلا کرتے تھے لیکن اب

صرف اسکولوں کے طالب علم اور مدرس کبھی کبھی کتابوں کی تلاش میں اس کے تاریک سینہ پر کشتیاں اور ڈونگے دوڑاتے نظر آجاتے ہیں۔ اس دریا میں مچھلیاں نہیں ہوتیں۔ صرف کتابیں ملتی ہیں اس لیے بے چارے مدرس اسے اللہ کا بہت بڑا انعام اور احسان سمجھتے ہیں اور اس کے طاس کو احسان کہتے ہیں۔ بہت چھوٹا دریا ہے۔ جتنا لمبا ہے اتنا ہی چوڑا ہے پہلے خلیج لیگ میں گرتا تھا۔ اب اس خلیج سے کچھ دور شمال کی جانب صحرائے کالاہاری کے ریت میں غائب ہو جاتا ہے۔ علمائے جغرافیہ ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکے کہ اسے دریا کہنا چاہیے یا جھیل۔

دریائے کرشنا

ہندو سبھا کی ترائی سے عین شمال کی طرف آریہ سماج کی گھاٹیاں ہیں جن سے دریائے کرشنا نکلتا ہے۔ یہ دریا کچھ دور تک بھار گو پربت اور ست پڑا کے درمیان میں سے ہو کر پتھروں سے سر ٹکراتا گذرتا ہے۔ یہاں اس کا پاٹ بہت کم اور گہرائی بہت زیادہ ہے۔ اس کوہستانی علاقے سے نکل کر جب یہ میدانی علاقے میں پہنچتا ہے تو اس کا پاٹ زیادہ ہو جاتا ہے۔ یہ پنجاب کا بہت بڑا دریا ہے اور ان پانچ دریاؤں میں سے ہے جن کی وجہ سے اس صوبے کو پنجاب کہا جاتا ہے۔ یہ ہندو سبھا کی ترائی کے ساتھ ساتھ کانگریس کے کوہستانی علاقوں کو بھی سیراب کرتا ہے لیکن اس کے بالائی حصہ میں چٹانیں کثرت سے ہیں اس لیے یہاں جہاز رانی نہیں ہو سکتی۔ البتہ اس کا زیریں حصہ جہاز رانی کے لیے بہت موزوں ہے۔ دریائے کرشنا کا طاس بہت زرخیز ہے اس کے بالائی حصہ کو پرکاش اور زیریں حصہ کو پرتاب کہتے ہیں۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ دریا بہت مقدس ہے چنانچہ دور دور سے لوگ اس میں اشنان کرنے آتے ہیں اور اس کا پانی بوتلوں میں بند کر کے لے جاتے ہیں۔ اس میں بہت چھوٹے چھوٹے دریا اور ندیاں آملتی ہیں۔

ویرندر ندی اس دریا کی ایک مشہور شاخ کا نام ہے۔ یہ ندی بہت سبک خرام ہے اور سرخ و سپید سنگریزوں پر اونچے سروں پر بہتی گیت گاتی چلی جاتی ہے۔ اس کا پانی بہت شیریں اور مصفٰے ہے اور اس کے کنارے کافی دور تک سبزہ زار پھیلتا چلا گیا ہے۔ پہلے اکثر شوقین لوگ صبح و شام ویرندر ندی کے کنارے آکر اس سبزہ زار اور آبِ رواں کا لطف اٹھاتے، چھینٹے اڑاتے اور ڈبکیاں لگاتے تھے۔ لیکن اب اس کے کنارے خاردار جنگلے بنوا دیے گئے ہیں اور خاص لوگوں کے سوا کسی کو

اس کے قریب جانے کی اجازت نہیں۔ دریائے کرشنا جنوب کی طرف بہہ کر خلیج مہا سجا میں گرتا ہے۔

دریائے خورسند

یہ دریا آریہ سماج کی گھاٹیوں سے نکل کر کچھ دور دریائے کرشنا کے متوازی بہتا ہے۔ کانگری سلسلہ کوہ کے قریب پہنچ کر یہ بھارگو پربت اور دست پڑادونوں سے پہلو بچاتا ہوا دریائے پرمانند کے متوازی بہنے لگتا ہے۔ ہندوسجا کی ترائی کو زرخیز بنانے میں اس دریا کا بڑا حصہ ہے۔ سول نافرمانی کے موسم میں جب اونچے پہاڑوں پر برف پگھلتی ہے اور کوہستانی ندی نالے بہہ نکلتے ہیں تو اس دریا میں طغیانی آجاتی ہے اور اس کی موجیں کانگری کوہستان کی بلندیوں تک جا پہنچتی ہیں۔ اس کا پاٹ اچھا خاصا ہے لیکن زیادہ گہرا نہیں۔ ہندوؤں کے نزدیک اس دریا کو بھی تقدس حاصل ہے۔ اس دریا کے طاس کے بھی دو حصے ہیں۔ بالائی حصے کو آریہ گزٹ اور زیریں حصہ کو ملاپ کہتے ہیں۔ اس میں ہمیشہ جہازرانی ہوتی رہتی ہے۔ یہ دریا جنوب کی طرف بہتا ہوا خلیج مہا سجا میں جا گرتا ہے۔

دریائے پرمانند

آریہ سماج کی گھاٹیوں سے نکل کر اکالی جنگلات کے پاس سے بہتا ہوا مغرب کی طرف ہو لیتا ہے اور دریائے خورسند کے متوازی بہنے لگتا ہے۔ ہندوسجا کی ترائی میں یہ دریا کچھ اس زور سے بہتا ہے کہ آس پاس کی زمین کو زیرآب کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس عمل کی وجہ سے اس علاقے میں جا بجا وسیع دلدلیں پیدا ہو گئی ہیں جہاں مچھر بڑی کثرت سے پرورش پاتے اور ہندو فیور پھیلاتے ہیں۔ یہ بہت ہی خطرناک قسم کا بخار ہے جس نے پنجاب میں تباہی پھیلا رکھی ہے۔

دریائے پرمانند کے دونوں کناروں پر بہت دور تک چٹیل پہاڑیوں اور وحشت ناک بیابانوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ان پہاڑیوں پر جو تھوڑی بہت زراعت ہوتی ہے حقوق کی برسات میں جینہ کا پانی اسے بہا لے جاتا ہے۔ اس عمل کو آب بری یا پن کٹ (Erosion) کہتے ہیں۔ پنجاب کی زرخیزی کو پن کٹ نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ نارنگ سر اور نریندر ناگ جو مشہور گرم چشمے ہیں۔ اسی دریا کے کنارے واقع ہیں۔

کہتے ہیں زمانہ قبل تاریخ میں دریائے پرمانند کانگری سلسلہ کوہ میں سے بہتا ہوا کالے پانی

میں جا گرتا تھا۔ پھر کچھ ایسے انقلابات ہوئے کہ یہ ہندوسبھا کی ترائی میں سے بہتا ہوا خلیج سرکار کے "گورے پانی" میں جا گرنے لگا۔ اس دریا کے طاس کو ہندو کہتے ہیں۔

دریائے حبیب

اس دریا کا منبع ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔ جغرافیہ والوں کا خیال ہے کہ سد سکندری اور کانگریسی سلسلہ کوہ کے بعض نامعلوم حصوں کی تحقیق کرنے کے لیے جو مہمیں بھیجی جارہی ہیں انھیں اگر اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی تو دریائے حبیب کا منبع بھی معلوم ہو جائے گا۔ کسی زمانے میں یہ دریا مسلم لیگ کی وادی کو سیراب کرتا تھا لیکن اب اس نے اپنا راستہ بدل لیا ہے اور احراری کوہستان اور کانگریسی سلسلہ کوہ کے درمیان بہتا ہے۔ بڑا تیز دریا ہے۔ خصوصاً جب یہ سکندر مونٹ کی مہیب چٹانوں سے ٹکراتا اور آبشار بناتا ہوا بہتا ہے تو بہت خوفناک معلوم ہوتا ہے۔ یہاں اس میں جگہ جگہ گرداب پڑتے ہیں۔ اس کی موجیں کف آلود نظر آتی ہیں۔ میدانی علاقے میں بھی پہنچ کر اس کی تیزی میں فرق نہیں آتا اور یہ اپنے زور میں کنارے کے علاقے سے بہت سی مٹی بہا لاتا ہے۔ اس کے دہانے کے متعلق صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ بحیرۂ کانگرس میں یا اس کے قریب کے کسی سمندر میں گرتا ہے لیکن ابھی تک یہ بات تحقیق طلب ہے۔

دریائے ویرا

روایت ہے کہ یہ دریا شری سوامی گنیش دت جی مہاراج کی جٹا سے نکلتا ہے اور بھارت ورش کے سناتن دھری نرناری کو لابھ پہنچاتا ہے اس لیے پرانے خیال کے ہندو اس دریا کو بہت مقدس سمجھتے ہیں۔ کسی زمانے ست پڑا کے ساتھ ساتھ بہتا تھا اب بھار گو پربت کے پاس سے گزرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ریت میں سونے چاندی کے ذرات ملتے ہیں۔ ہندوؤں کے دوسرے مقدس دریاؤں کی طرح یہ بھی غیر زراعت پیشہ دریا ہے۔ یعنی اس کے کنارے زراعت کے بجائے صرف بیج بیوپار ہوتا ہے۔

دریائے مرتضیٰ

پہلے ترکی میں بہتا تھا۔ پھر افغانستان میں بہنے لگا۔ اب مستقل طور پر ہندستان آ گیا ہے۔ اس دریا اور اس کے معاون دریاؤں نے کسی زمانے میں وہ زرخیز علاقہ بنایا تھا جسے احسان کہتے

ہیں۔ اب اس دریا کا طاس شاہباز کہلاتا ہے۔ چڑی مار اس دریا کو مقدس سمجھتے ہیں۔ دریائے مرتضٰی خلیج لیک میں گرتا ہے۔

گانگرسی ندی نالے

بھار گو پربت اور ست پڑا سے بھی برسات کے موسم میں اکثر ندی نالے نکلتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی ندیوں میں نیشنل کانگرس ندی بہت مشہور ہے جو ست پڑا سے ایک زمانے میں بہ نکلی تھی۔ یہ گدلے پانی کی ایک لمبی ندی تھی جس میں بہت سی نالیوں اور موریوں کا پانی بھی آ ملتا تھا۔ بہرحال یہ صرف برساتی ندی تھی اور اب خشک پڑی ہے۔

پارس ندی بھی ست پڑا سے نکلتی ہے۔ اگرچہ یہ چھوٹی سی ندی ہے لیکن اس کا پانی بہت میٹھا اور صاف وشفاف ہوتا ہے۔

دریائے سول

جسے دریائے ابیض اور عام لوگوں کی بولی میں گورا دریا بھی کہتے ہیں۔ شمال کے ایک نا معلوم خطے سے نکلتا ہے اور جنوب کی طرف تیزی سے بہتا ہوا خلیج سرکار میں جا گرتا ہے۔ اس کی سطح بظاہر ہموار معلوم ہوتی ہے۔ پانی صاف وشفاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے گورا دریا کہتے ہیں۔ لیکن اس کے اندر بہت سی خوفناک چٹانیں ہیں پہلے تو اس کا پانی بہت سپید معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اب اس کی رنگت کسی قدر تیرگی مائل ہوتی جاتی ہے۔ سرکار نے اس کے بالائی حصہ سے ایک نہر نکالی ہے جسے جوئے ''نور'' یا ''نہرِ اپرسول'' کہتے ہیں۔ اس نہر کے پانی کی کثیر مقدار کو ذخائرِ آب میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ نورور یا نور ہیڈ بھی اصل میں اسی نہر کی فیاضی کا کرشمہ ہے۔ جس کے پانی سے پنجاب کا بہت سا علاقہ سیراب ہوتا ہے۔ جو دھیا خشک ہونے لگتے ہیں انھیں بھی ابھی ذخیرۂ آب سے پانی مہیا کیا جاتا ہے۔ یہ نہر اصل میں پانی کے لیے صرف سول کی ہی مرہونِ منت نہیں بلکہ جھیل دولتانہ سے جو سرکاری ندی نالے بہ نکلتے ہیں۔ ان کا پانی بھی اسی میں آ ملتا ہے اور سرکاری مقاصد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

دریائے سول بدیسی دھن میں بدیسی گیت گاتا ہوا بہتا ہے اور دور سے بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ اس دریا کی بہار دیکھنا ہو تو سکندر مونٹ پر کھڑے ہو کر دیکھیے۔

دریائے کالی

ہندومہا سبھا کی پہاڑیوں سے کچھ آگے ایک بہت بڑا چشمہ ہے جسے "کالی ناگ" کہتے ہیں۔ یہ دریا اسی چشمے سے نکلتا اور ہندوسبھا کی ترائی اور کانگڑی سلسلہ کوہستان سے مٹی اور سنگریزے بہالاتا ہے۔ یہ دریا نہ بہت تیز رفتار ہے، نہ زیادہ آہستہ خرام، نہ اتنا وسیع ہے کہ اور چھور معلوم نہ ہو، نہ اس کا پاٹ اتنا چھوٹا ہے کہ تھوڑے سے خرچ میں پُل بن سکے۔ نہ اتنا زیادہ گہرا ہے کہ تہ کا کچھ حال معلوم نہ ہو، نہ اتنا کم گہرا کہ جہاز بھی نہ چل سکیں۔ طغیانی کے زمانے میں آس پاس کے علاقہ کو اس طرح زیرآب نہیں کرتا کہ بند باندھنے کی ضرورت محسوس ہو اور جاڑے میں سمٹ کر اتنا چھوٹا بھی نہیں رہ جاتا کہ پایاب نظر آئے۔ غرض یہ دریا اپنی میانہ روی اور اعتدال کے لیے مشہور ہے۔ کانگڑی سلسلۂ کوہ اور ہندوسبھا کی ترائی دونوں کے باشندے اس پر اپنا حق جتاتے ہیں مگر ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ دریا کس علاقہ کے زیادہ رقبہ کو سیراب کرتا ہے۔ اس کا گیت دیسی ہے مگر گیت کی دُھن بدیسی۔ اس کا طاس جسے "تربیون" کہتے ہیں، بہت زرخیز ہے۔

دریاؤں کے سلسلہ میں ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پنجاب کے دریاؤں سے کام لینے کے لیے ان میں جگہ جگہ بند باندھے گئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ بند دریائے ظفر علی خان میں باندھے گئے ہیں۔ کیوں کہ طغیانی کے زمانہ میں یہ دریا بہت خطرناک ثابت ہوتا تھا۔ لیکن جب سے اس دریا کے بندوں میں سیمنٹ استعمال کیا گیا ہے اس سے زیادہ خطرہ نہیں رہا۔

سوالات

(1) بتاؤ کوہ شہاب الدین کی اندرونی حرارت کیوں ختم ہو چکی ہے؟

(2) سکندر مونٹ اور مظفر کوہ کا مقابلہ کرو۔

(3) بتاؤ کوہ چھوٹو رام پر کھڑے ہو کر ایک کے دو کیوں نظر آتے ہیں؟

(4) حاتم طائی کے قصے میں اگر تم نے کوہ ندا کا حال پڑھا ہے تو بتاؤ کہ کیا میاں کے ٹیلے کو کوہ ندا کہنا صحیح ہے؟

(5) بتاؤ دریائے ظفر علی خان آج کل کہاں سے نکلتا ہے اور کہاں گرتا ہے؟

(6) بتاؤ وہ کون کون سے آلات ہیں جن سے دریائے سِیہر کی گہرائی ناپی جا سکتی ہے۔ کیا تم بانس سے اس دریا کی گہرائی معلوم کر سکتے ہو؟

(7) دریائے گورا کون کون سی کتابیں بہالاتا ہے؟

(8) کیا تم نے کبھی دریبندی دیکھی ہے؟ اگر دیکھی ہے تو اس کے متعلق اپنے تجربات بیان کرو؟

(9) جِھروفیوز کہاں کہاں ہوتا ہے اور گورا پانی کسے کہتے ہیں؟

(خضر تمیمی)

استاد بوٹے خاں گلزار کا حال

جس وقت وہ صاحب کمال ادب کی گاڑی میں ایجاد کے گھوڑے کو جوت کر عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے سخن کے ہر موڑ سے ''بچ جاؤ'' ۔ ''بچ جاؤ'' کی آوازیں بلند کیں۔ عقدِ ثریا اس کے گھوڑے کا دانہ بنا جسے آبِ حیات میں بھگویا گیا۔ اب ایک ایسے استاد کا ذکر پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں جس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندستان میں پیدا ہو۔ جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ کیونکہ اس شعر کے پتلے کے گھوڑے کا بھی رونگٹا رونگٹا بیکار نہ تھا۔ اس واسطے میں لکھوں گا اور سب کچھ لکھوں گا، ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔

یہ جھنڈے خاں پرچم کے بیٹے تھے جنھوں نے تیس سال تک سنٹرل ماڈل سکول کی ڈرل ماسٹری کے اکھاڑے کو اپنی جسمانی ورزشوں کے علاوہ دماغی کاہشوں سے بھی اِندر کا اکھاڑا بنائے رکھا۔ ان دنوں ملحقہ ٹریننگ کالج میں نارمل اور ایس وی کی جماعتیں بھی ہوتی تھیں، جن کے طلبہ کو استاد پرچم مرحوم اصلاح بھی دیا کرتے تھے۔ ابتدا میں ان کی تنخواہ بہت کم تھی۔ اس لیے زبان کی

آبیاری کے لیے وہ اپنے اشعار کو کر فرزندان معنوی شاعر کے ہوتے ہیں، مشتاقان سخن میں اس طرح سے تقسیم فرماتے تھے کہ بیس تیس پرچے اپنی نیکر کی دونوں جیبوں میں بھر کر ہر شام سنٹرل ٹریننگ کالج کے گراؤنڈ میں کھڑے ہو جاتے۔ جوہر سخن کے پرکھنے والے جوق در جوق آتے اور خاطر خواہ انعام دے کر مختلف پرچے لے جاتے تھے۔ لطف یہ تھا کہ دو ماہ کے بعد پرچہ دینے کی بجائے آپ شاگردوں سے خود شعر کہلواتے اور انھیں سُن سُن کر خوش ہوتے۔

لطیفہ:۔ پرچم مرحوم سے جب اس کا سبب پوچھا گیا تو فرمانے لگے کہ یہ زبان کی ترویج کا جبری طریقہ ہے کیونکہ اوّل اوّل خریدار سخن جب ان شاہ پاروں کو مشاعرے میں پڑھتا ہے تو وہ محسوس نہیں کرتا کہ اسے قدر دانوں کے حلقے میں ایک نغز گو شاعر کی حیثیت دی جا رہی ہے۔ ایک شاعر کی ہستی مسلم ہو چکنے کے بعد اس کی امداد سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیے۔ وہ بڈھا استاد سخن اس بات کو خوب جانتا تھا کہ اپنی شہرت کو برقرار رکھنے کے لیے مبتدی جبری شعر گوئی شروع کر دے گا۔ اس میں نکتہ یہ تھا کہ جن لوگوں کو شاعر نہ ہونا ہوتا تھا وہ بھی طوعاً کرہاً اس فنِ شریف کو "جز دیست از پیغمبری" اختیار کر لیتے تھے۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے اور کیا زمانہ تھا۔ یہ سب انھی باکمالوں کا صدقہ ہے کہ گاؤں کے سو مذ رسوں میں نوّے مدرّس شاعر ہیں اور باقی دس بھی تخلص کے سوا نہیں۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

اُستاد بولے خاں گلزار کی والدہ کے جیتے جی ان کے والد نے نکاح کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ اس واقعہ سے دو ماہ بعد پیدا ہوئے تھے۔ پرچم مرحوم کو نئی دلہن سے زیادہ محبت تھی اس لیے ان کی تعلیم و تربیت میں بہت غفلت برتی گئی۔ ان کی والدہ نے چنگڑ محلے میں ایک مکان لے رکھا تھا۔ وہ عفیفہ وہیں قناعت کی چادر اوڑھے گزران کر رہی تھی اور بولے خاں بھی کبھی ٹریننگ کالج کی سڑک والی دیوار پر بیٹھ کر اپنے والد بزرگوار کے احکام اور ان کی فوری تعمیل کے منظر دور ہی سے دیکھ لیا کرتے تھے۔ ان کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ بچپن میں ان کی والدہ کہیں چکی پیسنے گئی تھی۔ یہ جھولے میں پڑے رو رہے تھے کہ اتنے میں ایک کتا آیا اور ان کے پاس سے ایک روٹی لے کر چلتا بنا۔ انھوں نے اپنی توتلی زبان میں کتے کی آمد اور روٹی کی گمشدگی کی داستان کو ایسے دلآویز طریقے

سے ادا کیا کہ ماں کو روٹی کھونے کا غم جاتا رہا اور انھوں نے بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کیا اور اپنے خاوند کے خلاف دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے پیش گوئی کی کہ اس موئے سے یہ بچہ ہزار درجے اچھا شاعر ہوگا۔ استاد مرحوم فرماتے تھے کہ یہ سب کچھ ان کی والدہ کی دعا کا اثر تھا۔

وحیدی سلمہٗ (کہ مستند نشانی بزرگوں کی ہیں) فرماتے ہیں کہ میں نے خود بوٹے خاں کی والدہ سے جب اس واقعہ کی صحت کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے یاد کرکے اس کی تصدیق کی اور کہا کہ فی الحقیقت اس وقت بوٹے خاں کی عمر برس دن سے کچھ کم تھی۔ جھنڈے خاں پرچم مرحوم اپنی ایک آواز کے ساتھ سینکڑوں گردنوں کا جھکنا دیکھنے کے عادی تھے۔ انھوں نے نکاح ثانی کرلیا۔ وحیدی صاحب لکھتے ہیں کہ نکاح ثانی سے تین ماہ پیشتر انھیں محکمہ تعلیم میں اگلا گریڈ بھی مل گیا تھا اس لیے آئندہ فراغت کے پیش نظر انھوں نے بیاہ کیا۔ اگرچہ باپ نے ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی حصہ نہ لیا تھا لیکن ان کے شاگردان تعلیمی کہ اکثر ان میں سے شاگردانِ معنوی بھی تھے۔ پر شاباش ہے کہ ان میں سے بعض ننھے بوٹے خاں کو بزرگوں کی نشانی سمجھ کر گلے کا تعویذ بنائے پھرتے تھے اور جس سے جو کچھ بن پڑتا تھا اپنے استاد زادے کی خدمت سے دریغ نہ کرتا تھا۔ ان شاگردوں میں فخر کا طرّہ دستار منشی جیون بخش اجل مرحوم کو ملا۔ جنھوں نے ہمت کی کمر باندھ کر ایک جمعۃ الوداع کو شاہی مسجد لاہور میں چندہ کرکے بوٹے خاں کے لیے ایک گھوڑا اور تانگہ خریدا۔ جس سے یہ دونوں ماں بیٹا فراغت سے گزران کرنے لگے۔ اس وقت استاد مرحوم کی عمر انیس برس کی تھی۔ آپ نے چالیس سال کی عمر تک لاہور میں کوچوانی کی۔ وردی میں امتیاز اور بقائے دوام کا تختہ لگایا۔ اور نقارۂ فخر کی اس آواز کو کوئی نہیں دبا سکتا کہ ایک مرتبہ بھی قانون شکنی کے سلسلے میں ان کا چالان نہیں ہوا۔

استاد کا معمول تھا کہ صبح چار بجے سے بارہ بجے تک اور پھر تین بجے شام سے رات کے 9 بجے تک تانگہ چلاتے تھے اور باقی وقت مشقِ سخن کی نذر کرتے تھے۔ بارہ بجے سے تین بجے تک دوست احباب کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ شاگرد غزلیں اصلاح کو دیتے تھے تو کر انھیں ایک کھاروے کی تھیلی میں بھر کر پہلو میں رکھ دیتے تھے۔ وہ بھی بناتے تھے اور ملاقاتیوں سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ ان کی محویت کا یہ عالم تھا کہ چنگڑ محلے والے مکان کی بیٹھک میں ایک تلکا لگا ہوا تھا۔

آپ کی عفیفہ ماں ہمیشہ کیٹی کے نلکے سے پانی بھرتی رہی اور استاد کو معلوم بھی نہ ہوا کہ ان کے گھر میں نلکا موجود ہے۔ ایک دن جب اندھیرے میں کہ اس گھر میں بجز شاعری کے نور کے اور کچھ نہ تھا اجل مرحوم کا پاؤں اس سے الجھا تو استاد نے کہا کہ "کیا ہوا؟" انھوں نے جواب دیا کہ "کچھ یونہی نلکے سے پاؤں نے ٹکر لی ہے۔" یہ فرمانے لگے "یہاں نلکا بھی ہے؟" انھوں نے عرض کی "حضرت اسی لیے تو آپ کو یہاں لائے ہیں کہ ہر وقت پانی ملتا رہے"۔ ان کے پاس پھٹے پرانے مسودے غزلوں کے پڑے تھے۔ ان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "میں تو اس باغ کی آبیاری میں ایسا لگا ہوں کہ ان کے نلکے کی خبر ہی نہیں۔" یہ کہہ کر چپکے ہو رہے۔ کیا محویت ہے۔ کئی برس گزر جائیں۔ واٹرٹیکس برابر ادا کرتے رہیں اور یہ پتہ نہ ہو کہ گھر میں نلکا موجود ہے۔ خیر ثمرہ اس کا یہ ہوا کہ انھوں نے دنیا کے نلکے کی طرف نہ دیکھا اور خدا نے ان کے کلام میں وہ روانی دی کہ آج پانی بھی اس کے آگے پانی بھرتا ہے۔

ایک دفعہ لاہور میں موٹر بسیں رائج ہوئیں۔ اسٹیشن سے ہائی کورٹ تک چھ پیسے کرایہ تھا۔ راستے میں جو اُترے اکنی دے۔ مشاقانِ سخن نئی چیز پر ٹوٹ پڑے۔ حتیٰ کہ اکنی میں سالم تانگے کو کوئی نہ پوچھتا تھا۔ میرے دوستو! وہ زمانہ عجب زمانہ تھا۔ صبح سویرے گھوڑے کا یہ خرچ کہ چھ پیسے کا گڑ، اڑھائی آنے کا آٹا اور تین آنے کا دانہ۔ دوسرے تیسرے دن مصالحہ۔ دوپہر کو ڈنر کے طور پر ہرا چارہ۔ شام کو پھر چھ آنے کا دانہ گویا ایک روپیہ یومیہ اکیلے گھوڑے کا خرچ اس پر خانگی اخراجات مستزاد۔ اس دوران میں ایک دفعہ استاد مرحوم پر دو وقت فاقے سے گزر گئے۔ نبض شناس ماں نے کہ بیٹے کی طبیعت سے پوری طرح واقف تھی، زبانِ طعن سے ان کی ہمت کے سمند کو تازیانہ دیا کہ "تجھے تانگہ چلانے کے سوا اور کچھ نہیں آتا"۔ یہ سن کر وہ خاموش سے ہو گئے۔ دوسرے دن ان کی والدہ کو اپنے میکے کالا شاہ کاکو جانا تھا۔ یہ راستہ اور بھیس بدل کر گاڑی کے اس ڈبے میں پہنچ گئے جس کے ایک گوشے میں اس کی ماں پڑی تھی۔ انھوں نے متانت کے ساتھ جیب سے ایک شیشی نکالی اور بلند آواز سے پکارے "صاحبان! ہمارے کارخانے کی دواؤں کی پہلی ہی خوراک اپنا اثر دکھاتی ہے۔" اس کے بعد آپ نے خوب زور شور سے مقولے پڑھنے اور شعر رٹنے شروع کر دیے۔ پھر انھوں نے ایک پڑیا نکالی۔ جس میں وہ

ایک ایک سونف پر کھانڈ لپیٹی گئی تھی۔ اس کی دو دو گولیاں آپ نے گاڑی میں مفت بانٹنا شروع کیں۔ جو آتا الغرض بہ خواہ مخواہ مرد آدمی دیکھ کر ان کی بات کا یقین کر لیتا۔ یہ انھیں گولیاں چکھاتے تھے۔ پھر ان سے پیسے کماتے تھے۔ جن دوستوں سے راز کہہ رکھا تھا انھوں نے ان کی والدہ کو خبر کی۔ اس مامتا کی ماری نے آنکھ کھولی۔ دیکھا تو فی الحقیقت ادھنوں، دھیلوں پیسوں اور کوڑیوں کے ڈھیر ان کی جیب میں کھنکنار ہے ہیں۔ اس تفریح طبع یا لیاقت ہر فنی کے اظہار کے ساتھ نکتہ یہ تھا کہ ماں بیٹے کو محض وبال دوش نہ سمجھے اور نہ کوچوانی کا پابند جانے۔ جس کوچے میں جائے گا کچھ اچھا ہی لے نکلے گا۔

نازک مزاجی۔ نقل۔ ایک دن آپ نے کسی موچی سے اپنا بوٹ جو بزرگوں کی نشانی تھی گٹھوایا۔ اس نے معمول سے زیادہ موٹے دھاگے کے ساتھ سیا۔ اتفاق سے اس وقت ان کے پاس کوئی اور جوڑا نہ تھا۔ چنانچہ مجبوراً اسی کو پہننا پڑا۔ لیکن فوراً ہی پاؤں میں درد ہونے لگ گیا۔ فرماتے تھے کہ میں نے کبھی باقاعدہ طور پر تعلیم حاصل نہیں کی۔ لیکن رینالڈ کے سارے ناول اور منظوم ہیر رانجھا کے قصے کی تمام جزئیات گویا ان کی زبان پر تھیں۔ مگر مجھے اس پر تعجب نہیں۔ تانگے چلاتے وقت گھوڑے پر فی البدیہہ منظوم غصہ اتارتے تھے تو مجھے حیرت نہیں۔ سواری کے ساتھ کرائے کا تصفیہ بھی نظم میں کرتے تھے۔ اس کا بھی خیال نہیں۔ کیونکہ جس فن کو وہ لیے بیٹھے تھے یہ سب اس کے لوازمات ہیں۔ ہاں تعجب یہ ہے کہ وہ نوشادر کا ایک استعمال بھی جانتے تھے۔ جس سے بڑے بڑے قلعی گر ان کے مرید ہوتے تھے۔ دودھ دوہنے میں ایسی صفائی اور چستی برتتے تھے کہ اکثر گوجر اس پر تعجب کیا کرتے تھے۔ بعض جولاہوں کو ان کے فن میں قابلیت خداداد سے انھوں نے ایسی ایسی اصلاحیں دی ہیں جو آج تک دل پر نقش ہیں۔ نیل کی تجارت کے اسرار وہ جانتے تھے۔ حکمت کی گتھیاں وہ سلجھاتے تھے۔ خواب کی تعبیر میں انھیں خدا نے ایک ملکہ راسخہ دیا تھا۔ فرماتے تھے کہ انسان کو دنیا بھر کے علوم سے واقفیت رکھنی چاہیے۔ وہ اس دنیا کو ایک دلچسپ چیز سمجھتے تھے۔ خود فرماتے ہیں۔

گلزار ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

آپ کی وضعداری کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ اوائل عمر میں گھوڑے اور تانگے کا شغل اختیار کیا تھا۔ پھر ہمیشہ اس مضمون کو اپنے اشعار میں باندھا کیے۔ ذرا دیکھنا۔ کس قدر گرم مطلع ارشاد فرمایا ہے ۔

گھوڑے کو کداتا ہوا وہ شوخ اگر آوے
اللہ کی قدرت کا تماشہ نظر آوے

استاد مرحوم کی عمر بتیس سال کی تھی جب آپ نے اپنی مشہور آفاق کتاب "گھوڑے کے جنسی تعلقات" تصنیف فرمائی۔ آپ نے علم نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس میں گھوڑے کی دماغی، عقلی اور جسمانی حرکات پر ایک ایسا محاکمہ کیا ہے جس کا جواب نہیں۔ لطف یہ ہے کہ اس کے جس قدر خیالات بلند ہیں اتنے ہی زبان تحریف سے بالا ہے۔

لطیفہ:۔ ایک دفعہ عجیب اتفاق ہوا۔ لاہور میں جوبلی کے جشن پر ایک مشاعرہ منعقد ہو رہا تھا جس میں یو پی تک کے قسمت آزما شریک ہو رہے تھے۔ استاد گلزار مرحوم نے بھی شاگردوں کے اصرار پر ایک غزل لکھی۔ مطلع تھا۔

نہ سرکس کا نہ منڈی کا نہ یہ بازار کا گھوڑا
لڑے گا آج وہ دو قلر یں گلزار کا گھوڑا

میاں بخش اجل فرماتے تھے کہ اس کے بعد جب وہ اپنے تانگے پر سوار ہو کر مشاعرے کو چلے تو موچی دروازے کے قریب گھوڑا بدکا اور ان کے تانگے کی کہیں ٹکر ہو گئی۔ اجل مرحوم لکھتے ہیں کہ میں نے حوان ہو کر استاد سے پوچھا کہ حضرت کیا آپ کو پہلے ہی اس کا علم تھا۔؟ تو آہستہ سے فرمایا کہ بس بیٹھے بیٹھے کبھی کچھ ہو جاتا ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ انھیں کرامات تھیں یا وہ غیب دان تھے۔ ایک حسن اتفاق تھا جو لطف طبع کے لیے لکھ دیا۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایک دفعہ مشاعرے میں غزل ہوئی جس کا مطلع تھا۔

اے گلزار اگرچہ ہم کو آپ سے کوئی بیر نہیں
لیکن کچھ آثار بُرے ہیں عشق میں اب کے خیر نہیں

گھر پہنچے تو ان کی عفیفہ بیوی اور ضعیفہ ماں دونوں برس پڑیں کہ ہم غریب آدمی ہیں دو ٹکے کی اوقات۔ موئے شاعروں کی طرح خاک پھانکنا کوئی تمھیں زیب دیتا ہے۔ اس پر بی اماں نے جھاڑو اور بیوی نے جوتوں سے اپنے حال میں مگن رہنے کی تاکید کی۔ اور وہ شرافت کا پتلا صبر و استقلال سے ان تمام مصائب کو جھیلتا رہا۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے اور کیا زمانہ تھا۔ اتفاق سے مرزا رطل بوق شیرازی جو خود صاحب دیوان اور ان کے جلیل القدر شاگردوں میں سے تھے۔ مشاعرہ کے بعد پھر ان کے گھر پر موجود تھے۔ اس واقعہ کے فوراً بعد انھوں نے اس مطلع کو پڑھا اور پوچھا کہ حضور یہ کیا؟ جو کچھ زبان سے نکلتا ہے وہ بعد میں ہو جاتا ہے۔ اس پر آنکھیں بند کر کے فرمایا کہ بس ادھر ہی کا فیضان ہے۔

آخیر میں اُستاد نے تانگہ چلانا چھوڑ دیا تھا۔ ان کے گھر کے قریب ہی چند احباب رات کے پردے میں قمار بازی کے ذریعے قسمت آزمائی کیا کرتے تھے۔ یہ بھی انھیں کے پاس رہتے۔ کسی کے جیتنے پر قصیدہ اور ہارنے پر مرثیہ لکھتے۔ ان کا مقولہ تھا کہ مردہ ہے جسے معمولی ضروریات زندگی بھی میسر نہ ہوں اور وہ ان کے لیے تگ و دو میں مصروف رہے۔

ایک روز شاہ محمد غوث کے تکیہ کے باہر رات بسر کی۔ آپ ابھی سو ہی رہے تھے کہ الاؤ بجھ گیا اور صبح ہوتے ہوتے وہ اُستاد یگانہ جس کے بعد اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادرالکلام ہندستان میں پیدا ہو نمونیہ کی وجہ سے پاس والے راکھ کے ڈھیر کی طرح خاک کا ڈھیر ہو گیا۔ افسوس اتنے شاگردوں کے ہوتے ہوئے کسی بے حیا کو اتنی توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ اس کی تعریف وہ ہی کہتا۔

یوں مریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

(کنھیالال کپور)

غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں

(دورِ جدید کے شعرا کی ایک مجلس میں مرزا غالب کا انتظار کیا جا رہا ہے اس مجلس میں تقریباً تمام جلیل القدر جدید شعرا تشریف فرما ہیں۔ مثلاً م۔ن۔ارشد، ہیرا جی، ڈاکٹر قربان الحسین خالص، میاں رفیق احمد خوگر، راجہ مہدی علی خاں، پروفیسر فیض احمد فیض، بکرماجیت ورما، عبدالحیٔ نگاہ وغیرہ وغیرہ۔ یکا یک مرزا غالب داخل ہوتے ہیں۔ ان کی شکل و صورت ایضہٖ وہی ہے جو مولانا حالی نے ''یادگارِ غالب'' میں بیان کی ہے۔ ان کے ہاتھ میں ''دیوانِ غالب'' کا ایک نسخہ ہے۔ تمام شعرا کھڑے ہو کر آداب بجالاتے ہیں)

غالب: حضرات میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے جنت میں دعوت نامہ بھیجا اور اس مجلس میں مدعو کیا۔ میری مدت سے آرزو تھی کہ دورِ جدید کے شعرا سے شرف نیاز حاصل کروں۔

ایک شاعر: یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غالب: رہنے بھی دیجیے اس بے جا تعریف کو۔ من آنم کہ من دانم۔

دوسرا شاعر: تشریف رکھیے گا۔ کہیے، جنت میں خُوب گزرتی ہے۔ آپ تو فرمایا کرتے تھے۔ ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن...

غالب: (مُسکرا کر): بھئی جنت بھی خوب جگہ ہے جب سے وہاں گیا ہوں ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکا۔

دوسرا شاعر: تعجّب! جنت میں تو آپ کو کافی فراغت ہے اور پھر ہر ایک چیز میسّر ہے۔ پینے کو شراب، انتقام لینے کو پری زاد اور اس پر فکر کوسُوں دُور کہ۔

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

باوجود اس کے آپ کچھ لکھ...

تیسرا شاعر (بات کاٹ کر): سنایئے، اقبال کا کیا حال ہے؟

غالب: وہی جو اس دنیا میں تھا۔ دن رات خدا سے لڑنا جھگڑنا۔ وہی پُرانی بحث ع
مجھے فکر جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

پہلا شاعر: میرے خیال میں کافی وقت ہو گیا ہے اب مجلس کی کاروائی شروع کرنی چاہیے۔

دوسرا شاعر: میں کُرسیِ صدارت کے لیے م۔ن۔اُرشد کا نام تجویز کرتا ہوں۔

(ارشد صاحب کرسیِ صدارت پر بیٹھنے سے پہلے حاضرینِ مجلس کا شکریہ اُدا کرتے ہیں)

م۔ن۔ارشد: میرے خیال میں ابتدا مرزا غالب کے کلام سے ہونی چاہیے۔ میں نہایت ادب سے مرزا موصوف سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنا کلام پڑھیں۔

غالب: بھئی جب ہمارے سامنے شمع لائی جائے گی تو ہم بھی کچھ پڑھ کر سنائیں گے۔

م۔ن۔ارشد: معاف کیجیے گا مرزا۔ اس مجلس میں شمع وغیرہ کسی کے سامنے نہیں جائے گی۔ شمع کی بجائے یہاں پچاس کینڈل پاور کا لیمپ ہے اس کی روشنی میں ہر ایک شاعر اپنا کلام پڑھے گا۔

غالب: بہت اچھا صاحب! تو غزل سنیے گا۔

باقی شعرا: ارشاد!

غالب: عرض کیا ہے۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

(باقی شعرا ہنستے ہیں۔ مرزا حیران ہو کر ان کی جانب دیکھتے ہیں)

اجی صاحب! یہ کیا حرکت ہے بجائے داد و تحسین۔ اس بے موقع خندہ زنی کا مطلب؟

ایک شاعر: معاف کیجیے مرزا! ہمیں یہ شعر کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔

غالب: بے معنی؟

میراجی: دیکھیے نا مرزا! آپ فرماتے ہیں ؂

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

اگر مطلب کچھ نہیں تو خط لکھنے کا فائدہ ہی کیا؟ اور اگر آپ صرف معشوق کے نام کے ہی عاشق ہیں تو تین پیسے کا خط برباد کرنا ہی کیا ضرور، سادہ کاغذ پر اس کا نام لکھ لیجیے۔

ڈاکٹر قربان حسین خالص: میرے خیال میں اگر یہ شعر اس طرح لکھا جائے تو زیادہ موزوں ہے۔

خط لکھیں گے کیونکہ چھٹی ہے ہمیں دفتر سے آج
اور چاہے بھیجنا ہم کو پڑے بیرنگ ہی
پھر بھی تم کو خط لکھیں گے ہم ضرور
چاہے مطلب کچھ نہ ہو
جس طرح سے میری اک اک نظم کا
کچھ بھی تو مطلب نہیں
خط لکھیں گے کیونکہ الفت ہے ہمیں
میرا مطلب ہے محبت ہے ہمیں
یعنی عاشق ہیں تمھارے نام کے

غالب: یہ تو اس طرح معلوم ہوتا ہے جیسے آپ میرے اس شعر کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

میراجی: جنوں! جنوں کے متعلق مرزا میں نے کچھ عرض کیا ہے اگر اجازت ہو تو کہوں۔

غالب: ہاں! ہاں! بڑے شوق سے۔

میراجی: عرض کیا ہے

جنوں ہوا، جنوں ہُوا
مگر کہاں جنوں ہُوا
ابھی ہوا یا اب ہُوا
نہیں ہوں میں یہ جانتا
مگر جدید شاعری
میں کہنے کا جو شوق تھا
تو بس یہی ہے وجہ کہ
دماغ میرا چل گیا
یہی سبب ہے جو مجھے
جنوں ہُوا، جنوں ہُوا

غالب: (ہنسی کو روکتے ہوئے): سبحان اللہ! کیا برجستہ اشعار ہیں۔

م۔ن۔ارشد: اب مرزا، غزل کا دوسرا شعر فرمایئے۔

غالب: میں اب مقطع ہی عرض کروں گا۔ کہا ہے۔

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عبدالحی نگاہ: گستاخی معاف مرزا۔ اگر اس شعر کا پہلا مصرعہ اس طرح لکھا جاتا تو ایک بات پیدا ہو جاتی۔

غالب: کس طرح؟
عبدالحی نگاہ:۔
عشق نے، ہاں ہاں تمھارے عشق نے
عشق نے، سمجھے! تمھارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا
اَب نہ اُٹھ سکتا ہوں
اور چل تو سکتا ہی نہیں
جانے کیا بکتا ہوں میں
یعنی نکما کر دیا
اتنا تمھارے عشق نے
گرتا ہوں اور اُٹھتا ہوں میں
یعنی تمھارے عشق نے
اتنا نکما کر دیا
غالب: (طنزاً) بہت خُوب، بھئی غضب کر دیا۔
غیظ احمد غیظ: اور دوسرا مصرعہ اس طرح لکھا جا سکتا تھا۔
جب تک نہ مجھ کو عشق تھا
تب تک مجھے کچھ ہوش تھا
سب کام کر سکتا تھا میں
اور دل میں میرے جوش تھا
اس وقت تھا میں آدمی
اور آدمی تھا کام کا
لیکن تمھارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا

غالب: واللہ، کمال ہی تو کر دیا بھئی۔ اب آپ لوگ اپنا اپنا کلام سنائیں۔

م۔ن۔ارشد: اب ڈاکٹر قربان حسین خالص جو جدید شاعری کے امام ہیں، اپنا کلام سنائیں گے۔

ڈاکٹر خالص: اجی ارشد صاحب! میں کیا کہوں۔ اگر میں امام ہوں تو آپ مجتہد ہیں۔ آپ جدید شاعری کی منزل ہیں اور میں سنگ میل۔ اس لیے آپ اپنا کلام پہلے پڑھیے۔

م۔ن۔ارشد: توبہ! توبہ! اتنی کسرِ نفسی! اچھا اگر آپ مُصر ہیں تو میں ہی اپنی نظم پہلے پڑھتا ہوں۔ نظم کا عنوان ہے "بدلہ"۔ عرض کیا ہے۔

آ مری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
جس کے آغوش میں یُوں ناچ رہے ہیں شعلے
جس طرح دور کسی دشت کی پہنائی میں
رقص کرتا ہو کوئی بھوت کہ جس کی آنکھیں
کرمِ شب تاب کی مانند چمک اٹھتی ہیں
ایسی تشبیہ کی لذّت سے مگر دُور ہے تُو
تُو کہ اک اجنبی انجان سی عورت ہے جسے
رقص کرنے کے سوا اور کچھ نہیں آتا
اپنے بے کار خدا کے مانند

دوپہر کو جو کبھی بیٹھے ہوئے دفتر میں
خود کشی کا مجھے یک لخت خیال آتا ہے
میں پُکار اٹھتا ہوں یہ جینا بھی ہے کیا جینا
اور چُپ چاپ دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں

آ مری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب

تاکہ میں چوم ہی لوں عارضِ گلفام ترا
اور اربابِ وطن کو یہ اشارہ کر دوں
اس طرح لیتا ہے اغیار سے بدلہ شاعر
اور شبِ عیش گزر جانے پر
بہرِ جمعِ درم و دام نکل جاتا ہے
ایک بوڑھے سے تھکے ماندے سے رہوار کے پاس
چھوڑ کر بسترِ سنجاب و سمور

(نظم سن کر سامعین پر وجد کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ میراجی یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ یہ نظم اس صدی کی بہترین نظم ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو اس میں انگیٹھی، بھوت اور دفتر تہذیب و تمدن کی مخصوص الجھنوں کے حامل ہیں۔ حاضرین ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے زیرِ لب مسکراتے ہیں)

غالب: ارشد صاحب! معاف کیجیے، آپ کی یہ نظم کم از کم میرے فہم سے تو بالاتر ہے۔

فیض احمد فیض: یہ صرف ارشد پر ہی کیا منحصر ہے۔ مشرق کی جدید شاعری ایک بڑی حد تک مبہم اور ادراک سے بالاتر ہے۔

م۔ن۔ ارشد: مثلاً میرے ایک دوست کے اس شعر کو لیجیے۔

پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو!
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

اب بتایئے، اس شعر کا کیا مطلب ہے؟

غالب (شعر کو دہرا کر): صاحب! سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ اس شعر میں سر اور پیر کے الفاظ شامل ہیں مگر باوجود ان کے اس شعر کا نہ سر ہے نہ پیر۔

م۔ن۔ ارشد: ابھی چھوڑیے اس طرف گیری کو۔ آپ اس شعر کو سمجھے ہی نہیں۔ مگر خیر اس بحث میں کیا رکھا ہے۔ کیوں نہ اب ڈاکٹر قربان حسین خالص سے درخواست کی جائے کہ اپنا کلام پڑھیں۔

ڈاکٹر خالص: میری نظم کا عنوان ہے "عشق"۔ عرض کیا ہے۔

عشق کیا ہے؟
میں نے اک عاشق سے پُوچھا
اس نے یُوں رو کر کہا
عشق اک طوفان ہے
عشق اک سیلاب ہے
عشق ہے اک زلزلہ
شعلۂ جوالہ — عشق،
عشق ہے پیغامِ موت!

غالب: بھئی کیا مذاق ہے۔ نظم پڑھیے۔ مشاعرے میں نثر کا کیا کام۔

ڈاکٹر خالص (جھنجلا کر): تو آپ کے خیال میں یہ نثر ہے؟ یہ ہے آپ کی سخن فہمی کا عالم؟ اور فرمایا تھا آپ نے ع

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

غالب: میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ یہ کس قسم کی نظم ہے، نہ ترنم، نہ قافیہ، نہ ردیف۔

ڈاکٹر خالص: مرزا صاحب! یہی تو جدید شاعری کی خصوصیت ہے۔ آپ نے اردو شاعری کو قافیہ اور ردیف کی فولادی زنجیروں میں قید کر رکھا تھا۔ ہم نے اس کے خلاف جہاد کر کے اسے آزاد کیا ہے اور اس طرح اس میں وہ اوصاف پیدا کیے ہیں جو محض خارجی خصوصیات سے کہیں زیادہ اہم ہیں میری مُراد رفعتِ تخیل، تازگی افکار اور ندرتِ فکر سے ہے۔

غالب: رفعتِ تخیل، کیا خُوب، کیا پرواز ہے۔

میں نے اک عاشق سے پُوچھا
اس نے یوں رو کر کہا

ڈاکٹر خالص (چڑ کر): عاشق رو کر نہیں کہے گا تو کیا قہقہہ لگا کر کہے گا؟ مرزا! آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ عشق اور رونے میں کتنا گہرا تعلق ہے۔

غالب: مگر آپ کو قافیہ اور ردیف ترک کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

رفیق احمد خوگر: اس کی وجہ مغربی شعراء کا تتبع نہیں بلکہ ہماری طبیعت کا فطری میلان ہے جو زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شعر و ادب میں بھی آزادی کا جویا ہے اس کے علاوہ دورِ جدید کی روح، انقلاب، کشاکش، تحقیق، تجسس، تعقل پرستی اور جد و جہد ہے۔ ماحول کی اس تبدیلی کا اثر ادب پر ہوا ہے اور میرے اس نکتے کو تھیکرے نے بھی اپنی کتاب "وینٹی فیئر" میں تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اسی لیے ہم نے محسوس کیا کہ قدیم شاعری ناقص ہونے کے علاوہ رُوح میں لطیف کیفیت پیدا نہیں کر سکتی جو مثال کے طور پر ڈاکٹر خالص کی شاعری کا جوہر ہے۔ قدیم شعرا اور جدید شعرا کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قدیم شعرا بقول مولانا آزاد حسن و عشق کی حدود سے باہر نہ نکل سکے اور ہم جن میدانوں میں گھوڑے دوڑا رہے ہیں نہ ان کی وسعت کی انتہا ہے اور نہ ان کے عجائب و لطائف کا شمار۔

غالب: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

م۔ ن۔ ارشد: خوگر صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم ایک نئی دُنیا میں رہتے ہیں۔ یہ ریڈیو، ہوائی جہاز اور دھماکے سے پھٹنے والے بموں کی دُنیا ہے۔ اس دُنیا میں رہ کر ہم اپنا وقت حسن و عشق، گل و بلبل، شیریں فرہاد کے افسانوں میں ضائع نہیں کر سکتے۔ شاعری کے لیے اور بھی موضوعِ سخن ہیں جیسا کہ ہمارے ایک شاعر نے کہا۔

آج تک سُرخ و سیہ صدیوں کے سایے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی، اجداد پہ کیا گزری ہے
یہ حسیں کھیت، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
یہ ہر اک سمت پُر اسرار کڑی دیواریں
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے

راجہ عہد علی خاں: بہت خوب ع

"یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے"

ایسے ہی مضامین میں سے ایک مضمون ''ڈاک خانہ'' ہے جو میری اس نظم جو میں ابھی آپ کے سامنے پڑھوں گا، موضوع ہے۔

غالب: ڈاک خانہ؟

راجہ عہد علی خاں: مرزا! اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ سُنیے عرض کیا ہے۔

ڈاک خانے کے اندر ہے آج اُف کتنا ہجوم
ڈالنے کو خط کھڑے ہیں کس قدر اُف آدمی
ان میں ہر اک کی تمنا ہے کہ وہ
ڈال کر جلدی سے خط یا پارسل
بھاگ کر دیکھے کہ اس کی سائیکل
ہے پڑی باہر جہاں رکھ کر اسے
ڈاک خانے میں ابھی آیا تھا وہ خط ڈالنے
جا رہے ہیں خط چہار اطراف کو
بمبئی کو، مصر کو، لندن کو، کوہ قاف کو
دیکھنا۔۔ آئی ہے اک عورت لفافہ ڈالنے
کون کہتا ہے کہ ایک عورت ہے یہ
یہ تو لڑکا ہے کسی کالج کا کہ
جس کے بال
خد و خال
اس قدر ملتے ہیں عورت سے کہ ہم
اس کو عورت کا سمجھتے ہیں بدل
اُف ہماری لغزشیں
ہے مگر کس شخص کا یہ سب قصور
کیا نظر میری نہیں کرتی ہے کام

جھٹ پٹا سا ہو گیا ہے شام کا
یا ہمارے بے تمدن کا قصور
کہ ہمارے نوجواں
ڈاک خانے میں ہیں جب آتے لفافہ ڈالنے
اس قدر دیتے ہیں وہ دھوکا ہمیں
کہ نظر آتے ہیں ہم کو عورتیں۔

(زوروں کی داد دی جاتی ہے۔ ہر طرف سے "مرحبا" "بھئی کمال کر دیا" کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ مرزا غالب کی سراسیمگی ہر لمحہ بڑھتی جا رہی ہے)

م۔ن۔ارشد: اب میں ہندوستان کے مشہور شاعر پروفیسر غیظ سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے تازہ افکار سے ہمیں نوازیں۔

پروفیسر غیظ: میں نے تو کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔

میراجی: تو پھر وہی نظم سنا دیجیے جو پچھلے دنوں ریڈیو والوں نے آپ سے لکھوائی تھی۔

پروفیسر غیظ: آپ کی مرضی۔ تو وہی سن لیجیے۔ عنوان ہے "تنہائی"۔

فون پھر آیا دلِ زار! نہیں فون نہیں
سائیکل ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا۔
ڈھل چکی رات، اُترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک چوکیدار
گُل کرو دامنِ افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سُرمۂ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔

(مشاعرے کے دوران میں اکثر مصرعے دو دو بلکہ چار چار بار پڑھوائے جاتے ہیں اور پروفیسر فریڈ بار بار مرزا غالب کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مرزا غالب مبہوت ہیں)

م۔ن۔ ارشد: حضرات! میرے خیال میں یہ کوئی عشقیہ نظم نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر نے ایک مخفی فاشسٹ جذبے کو خوب نبھایا ہے۔

رفیق احمد (سرگوشی کے انداز میں ہیرا جی سے): بکواس ہے۔

م۔ن۔ ارشد: اب ہیرا جی اپنا کلام پڑھیں گے

ہیرا جی: میری نظم کا عنوان ہے "بینگن"۔

غالب: بینگن؟

ہیرا جی: بینگن۔ اگر آپ آم کی صفت میں قصیدہ لکھ سکتے ہیں تو کیا بندہ بینگن پر نظم کہنے کا حقدار نہیں؟

غالب: معاف کیجیے گا۔ نظم پڑھیے۔

ہیرا جی: عرض کیا ہے۔

چنچل بینگن کی چھب نیاری
رنگ میں تم ہو کرشن مُراری
جان گئی ہیں سکھیاں پیاری
رادھا رانی آ ہی گئی تُو
کرشن کنہیا ڈھونڈ رہے ہیں
لیکن میں تو بھول چکا ہوں
بینگن سے یہ بات چلی تھی
بھوک لگی ہے کتنی ہائے
جی میں ہے اک بھون کے بینگن
کھاؤں لیکن رادھا پیاری
رنگ کو اس کے دیکھ کے مجھ کو

یاد آتے ہیں کرشن مُراری
اس لیے بھوکا رہتا بہتر
چونکہ میں ہوں پریم پجاری

(ہر طرف سے داد دی جاتی ہے۔ بعض شعرا یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں:
بھئی جدید شاعری میرا جی کا ہی حصہ ہے)

ن۔م۔ ارشد: اب جناب بکرماجیت ورما صاحب سے استدعا کی جاتی ہے کہ اپنا کلام سنائیں۔

بکرماجیت ورما: میں نے حسب معمول کچھ گیت لکھے ہیں۔

غالب (حیران ہو کر): شاعر اب گیت لکھ رہے ہیں؟ میرے اللہ دنیا کدھر جا رہی ہے؟

بکرماجیت ورما: مرزا! آپ کے زمانے میں گیت شاعری کی ایک باقاعدہ صنف قرار نہیں دیے گئے تھے۔ دورِ جدید کے شعرا نے انھیں ایک قابلِ عزت صنف کا درجہ دیا ہے۔

غالب: جی ہاں، ہمارے زمانے میں عورتیں، بھانڈ، میراثی یا اس قماش کے اور لوگ گیت لکھا کرتے تھے۔

بکرماجیت ورما: پہلا گیت ہے "برہن کا سندیس" عرض کیا ہے۔

اڑ جا دیس بدیس رے کاگے اڑ جا دیس بدیس
سن کر تیری کائیں کائیں

غالب: خوب۔ سن کر تیری کائیں کائیں

بکرماجیت ورما: عرض کیا ہے۔

سن کر تیری کائیں کائیں
آنکھوں میں آنسو بھر آئیں
بول یہ تیرے من کو بھائیں
مت جانا پردیس رے کاگے اڑ جا دیس بدیس

م۔ن۔ ارشد: بھئی کیا اچھوتا خیال ہے پنڈت صاحب۔ میرے خیال میں ایک گیت

آپ نے کبوتر پر بھی لکھا تھا وہ بھی مرزا کو سنا دیجیے۔

بکر ماجیت ورما: سنیے پہلا بند ہے۔

بول کبوتر بول
دیکھ کوئلیا کوک رہی ہے
من میں میرے ہوک اٹھی ہے
کیا تجھ کو بھی بھوک لگی ہے
بول غٹرغوں بول— کبوتر
بول کبوتر بول

باقی شعرا (یک زبان ہو کر): بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول کبوتر بول۔

(اس اثنا میں مرزا غالب نہایت گھبراہٹ اور سراسیمگی کی حالت میں دروازے کی طرف دیکھتے ہیں)

بکر ماجیت ورما: اب دوسرا بند سنیے۔

بول کبوتر بول
کیا میرا ساجن کہتا ہے
کیوں مجھ سے روٹھا رہتا ہے
کیوں میرے طعنے سہتا ہے
بھید یہ سارے کھول— کبوتر
بول کبوتر بول

باقی شعرا (یک زبان ہو کر): بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول کبوتر بول

(اس شور وغل کی تاب نہ لا کر مرزا غالب بھاگ کر کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں)

میر کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ

میر کی شاعری پر متعدد تنقید نگاروں نے لکھا ہے۔ لیکن شاید ان کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ پیش کرنے کا سہرا میرے ہی سر رہے گا۔ معلوم ہوتا ہے متقدمین نے فرائڈ اور میکڈوگل کی سائیکولوجی کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ شاید فرائڈ اور میکڈوگل اس وقت پیدا ہی نہیں ہوئے تھے...... اگر پیدا ہو چکے تھے تو متقدمین کے پاس اتنی استطاعت ہی کہاں تھی کہ ان ماہرین نفسیات کے نظریوں کو سمجھ سکتے۔ وجہ کچھ بھی ہو ان کی تنقید میں جو سطحی پن پایا جاتا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ وہ "نفسیات" سے بے بہرہ تھے۔

عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ میر کی شاعری پر حزن و یاس کی ایسی گھٹا چھائی ہے جو بقول فانی "نہ کھلتی ہے نہ برستی ہے"۔ اس کی وجہ اگلے وقتوں کے نقاد یہ بتاتے ہیں کہ میر کو اوائل عمر میں ناقابل برداشت آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ میری رائے میں یہ وجہ سراسر ناکافی ہے۔ آلام و مصائب سے تقریباً ہر شاعر کو دوچار ہونا پڑا ہے لیکن میر جیسا سوز کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔

میر طبعاً اور فطرتاً نوحہ گر واقع ہوئے ہیں۔ ان کے چھ دواوین میں تقریباً دو ہزار اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں رونے کا رونا رویا گیا ہے۔ آخر میر اس قدر کیوں روتے تھے؟ آپ کہہ سکتے ہیں کہ انھیں رونے میں لطف آتا تھا۔ مگر انھیں رونے میں کیوں لطف آتا تھا؟ دیکھا آپ نے۔ اس سوال کا جواب دینا اتنا آسان نہیں۔ رونے کا تجزیہ کرنے کے لیے ہمیں کسی ماہر نفسیات سے رجوع کرنا چاہیے

اور میکڈوگل۔ بہ جز ماہر نفسیات اور کون ہو سکتا ہے۔ میکڈوگل لکھتا ہے کہ جن لوگوں کو رونے میں لطف آتا ہے عموماً انھیں مالیخولیا کی شکایت ہوتی ہے۔ لیجیے صاحب معاملہ صاف ہو گیا، تو گویا میر کو مالیخولیا تھا۔ دیکھنا اب یہ ہے کہ میر اس نامراد مرض میں مبتلا کیونکر ہوئے۔ ممکن ہے انھیں یہ مرض ورثے میں ملا ہو اگرچہ ہمارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے انھیں کوئی دماغی صدمہ پہنچا ہو۔ لیکن قیاس اغلب ہے کہ مالیخولیا کی وجہ جنسی گھٹن ہے۔ میر کو سنار کے لڑکے سے لے کر عطار کے لڑکے تک تقریباً ہر لونڈے سے عشق تھا۔ مگر امید بر آنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس حالت میں اگر ان کا دماغی توازن قائم نہ رہا تو کوئی تعجب نہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میر بسیار نویس تھے۔ انھیں شعر کہنے کا مرض تھا اور جو شخص دو چار نہیں بلکہ اکٹھے چھ دواوین لکھ مارے اس کا دماغی توازن کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔ یاد رہے کہ میر نے یہ دواوین ردیف اور قافیہ کی پابندی میں لکھے۔ نظم معرا یا نظم آزاد میں نہیں۔ معلوم ہوتا ہے میر کو اس بات کا علم تھا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

دوانہ ہو گیا تو میر آخر ریختہ کہہ کر
نہ کہتا تھا میں اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

میکڈوگل کے خیال میں مالیخولیا کی علامات یہ ہیں (1) افسردگی (2) بے خوابی (3) نوحہ گری (4) خودکشی کی خواہش (5) جسم کا گھلنا۔ یہ پانچوں علامات میر میں یا یوں کہیے میر کی شاعری میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ افسردگی ہی کو لیجیے۔ میر کا مشہور شعر ہے:

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہے گویا چراغ مفلس کا

سر شام میر پر گہری افسردگی چھا جاتی ہے۔ آخر کیوں؟ شام کے وقت تو عموماً شاعر لوگ نہایت بشاش نظر آتے ہیں کیوں کہ اس وقت وہ نئی نئی شیروانیاں پہن کر کلوں میں پان دبا کر مشاعروں میں جلوہ افروز ہوتے ہیں اور پھر میر کو تو خاص طور پر خوش ہونا چاہیے تھا کہ وہ مشاعروں کے بادشاہ تھے۔ مشاعرے تو کیا وہ عالم پر چھائے ہوئے تھے۔ سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا

ظاہر ہے کہ "دل کے بجھے سے رہنے" کا سبب یہ نہیں کہ انھیں مشاعرے میں سودا سے ٹکر لینے کا ڈر تھا۔ وجہ وہی ہے جو میکڈوگل نے بتائی ہے۔ یعنی مالیخولیا!

نوحہ گری میر کی شاعری کا جزو لاینفک ہے اور میر ان لوگوں میں سے ہیں جو شبنم کی طرح نہیں بلکہ ابرِ تر کی مانند روتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کچھ عرصے کے بعد رونا میر کا روزگار ہو گیا تھا۔ فرماتے ہیں۔

روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات
اب یہی روزگار ہے اپنا

رونے کے موضوع پر میر نے لاجواب اشعار کہے ہیں اور جب ہم ان اشعار کی فنی خوبیوں کی بجائے ان کے پس منظر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ میر کو مالیخولیا نے کہیں کا نہ رکھا تھا اور بے چارے کی ساری عمر رونے میں کٹی۔ فرماتے ہیں۔

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا

اسی غزل میں ایک شعر ہے۔

یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا، دن کو جوں توں شام کیا

گو یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ وہ دن کو زیادہ روتے تھے یا شب کو۔ تاہم یہ ظاہر ہے کہ رات کے وقت بلند آواز سے روتے۔

جو اس شور سے میر روتا رہے گا   تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا

ایک اور غزل میں فرماتے ہیں۔

کس کو میرے حال سے تھی آگہی
نالۂ شب سب کو خبر کر گیا

میر کو ابر کی طرح رونے میں مزہ آتا تھا۔ اور وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ رونے کے معاملے میں انھیں ابر سے حسد بھی تھا۔ متعدد اشعار ہیں جن میں انھوں نے ابرِ تر کو چیلنج دیا ہے۔

یوں دور سے کھڑے ہو کیا معتبر ہے رونا
دامن سے باندھ دامن اے ابرِ تر ہمارا

خوب ہے اے ابر یک شب آ و باہم روئیے
پر نہ اتنا بھی کہ ڈوبے شہر، کم کم روئیے

جب رونے بیٹھتا ہوں تو کیا کسر رہے ہے
رومال دو دو دن تک جوں ابر تر رہے ہے
دن رات میری آنکھوں سے آنسو چلے گئے
برسات اب کے شہر میں سارے برس رہی

اس قدر رونے کے باوجود ان کو مرتے دم تک یہی حسرت رہی کہ وہ جی بھر کر نہیں روئے۔ ایک جگہ اس بات کا گلہ یوں کیا ہے۔

تھی مصلحت کہ رُک کر ہجراں میں جان دیجیے
دل کھول کر نہ غم میں مَیں ایک بار رویا

مالیخولیا کے مریض کو عموماً بے خوابی کی شکایت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میر کو ساری ساری رات نیند نہیں آتی تھی۔ فرماتے ہیں۔

لگتی نہیں پلک سے پلک انتظار میں
آنکھیں اگر یہی ہیں تو پھر نیند سُو چکا

جسم کا گھلنا مالیخولیا کی نمایاں علامت ہے۔ غم میں گھل گھل کر میر کا یہ حال ہو گیا تھا کہ بے چارے کی شکل تک پہچانی نہیں جاتی تھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

کیا میر ہے یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا — غم ناک جسم و خشک لب و رنگ زرد تھا

اس شعر میں ''کیا میر ہے یہی'' کا ٹکڑا قابلِ غور ہے۔ میر اتنے نحیف ہو گئے ہیں کہ اپنے آپ کو پہچان بھی نہیں سکتے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار
تیرا تو میر غم میں عجب حال ہو گیا

عموماً جن لوگوں کو مالیخولیا ہوتا ہے ان پر خودکشی کا بھوت سوار رہتا ہے۔ میر نے بھی اس خواہش کا اظہار متعدد اشعار میں کیا ہے۔ مثلاً۔

تدبیر مرے عشق کی کیا فائدہ طبیب
اب جان کے ہی ساتھ یہ آزار جائے گا

میر مرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس لیے طبیب کو نزدیک پھٹکنے نہیں دیتے۔ ایک اور شعر میں صاف صاف کہتے ہیں کہ وہ خودکشی کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

کیا کروں ناچار ہوں مرنے کو اب تیار ہوں
دل کی روز و شب کی بیزاری سے جی گھبرا گیا

ایک شعر میں ان لوگوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو مر گئے۔

جن جن کو تھا عشق کا آزار مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

ایک شعر میں موت کو طعنہ دیا ہے۔

ہو گئی شہر شہر رسوائی
اے مری موت تو بھلی آئی

یہ بات واقعی عجیب ہے کہ "جنون" اور "جوہر قابل" میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ قدرت کی یہ ستم ظریفی ہے کہ عموماً اہل کمال جسمانی لحاظ سے نامکمل اور دماغی لحاظ سے بیمار ہوتے ہیں۔ ہومر، ملٹن، سورداس اندھے تھے۔ بائرن لنگڑا، بی تھوون بہرہ، مائیکل اینجلو نیم پاگل، چارلس لیمب چھ ماہ پاگل خانے میں رہا۔ جان کیٹس اور سٹیونسن کو سپ دق تھا اور میر کو مالیخولیا۔

اب رہا یہ سوال کہ آیا میر کو واقعی مالیخولیا تھا یا اگر انھیں مالیخولیا تھا تو آیا انھیں اس بات کا علم تھا؟ ان دونوں باتوں کی تصدیق میر کے اشعار سے ہو سکتی ہے۔ مشہور روایت ہے کہ جب میر دہلی سے لکھنؤ تشریف لے گئے اور وہاں پہلی مجلس مشاعرہ میں شریک ہوئے تو لکھنوی شعرا نے آپ کا ضرورت سے زیادہ مضحکہ اڑایا۔ ظاہر ہے لکھنوی شعرا اتنے بد مذاق نہیں تھے کہ میر ایسے شاعر کا خواہ مخواہ مضحکہ اڑاتے اور انھیں یہ کہنے پر مجبور کرتے۔

کیا حال چال پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان، ہنس ہنس پکار کے

اگر لکھنوی شعرا نے ہنس ہنس پکار کے میر کا حال پوچھا تو اس کا واحد سبب یہ تھا کہ انھوں نے میر کو عالمِ دیوانگی میں دیکھا۔ انھیں ہنسی میر کی وضع قطع پر نہیں بلکہ ان کے دیوانہ پن پر آئی۔ اس روایت کے علاوہ اس دعوے کے ثبوت میں میر کے متعدد اشعار موجود ہیں۔ فرماتے ہیں۔

جب جنوں سے ہمیں توسّل تھا
اپنی زنجیر پا ہی کا غل تھا

ایک اور شعر سنیے۔

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

خرد مندی ہوئی زنجیر ورنہ
گزرتی خوب تھی دیوانہ پن میں

اور پھر وہ بے مثال شعر۔

پھر زلف ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

معلوم ہوتا ہے کہ میر کو مالیخولیا کا دورہ موسم بہار میں پڑتا تھا۔ ایک شعر میں اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی
دھوم ہے پھر بہار آنے کی

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی! مگر افسوس جن لوگوں کو اس دوانے کی فکر لازم تھی انھوں نے مجرمانہ غفلت کا ثبوت دیا۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں اگر نواب آصف الدولہ چھ ماہ کے لیے میر کو کسی سینے ٹوریم میں بھیج دیتے تو......!

سلیم اور انارکلی

کردار:۔

ہز میجسٹی اکبر

بیربل (ہز میجسٹی کا پرائیویٹ سکریٹری)

ابوالفضل ۔ وزیر اعظم

فیضی ۔ وزیر داخلہ

ٹوڈرمل ۔ وزیر زراعت

خانخاناں ۔ وزیر خارجہ

ملا دو پیازہ ۔ وزیر طنز و مزاح

پرنس سلیم

نادرہ عرف انارکلی

ہز میجسٹی مریم زمانی

سراغ علی خاں ۔ افسر اعلیٰ سی آئی ڈی

وقت:۔ 1960

معذرت:۔ اکبر، سلیم، انارکلی کی روحوں، چالیس کروڑ ہندوستانیوں اور دس کروڑ پاکستانیوں سے معذرت کے ساتھ۔

پہلا منظر: لال قلعے کی ایک جھلک

(لال قلعہ آگرہ میں ہز میجسٹی اکبر کے پرائیوٹ سکریٹری بیربل کا دفتر)

(یہ لال قلعہ وہی ہے جسے آپ نے اکثر دیکھا ہے۔ کم از کم تصاویر، اور فوٹوز میں۔ اگر آپ نے اسے نہیں دیکھا تو کوئی تشریح یا بیان آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ بہتر ہوگا آئندہ جب آپ آگرہ تشریف لے جائیں تو لال قلعے کی زیارت کریں۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو بیربل ایک کاغذ پر پارکر 51 سے کچھ لکھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ تازہ ترین لطیفے لکھ رہا ہے۔)

بیربل: ہاں یہ لطیفے ٹھیک رہے گا۔ (کاغذ سے پڑھتے ہوئے) دو گدھے سڑک پر جا رہے تھے۔ پہلے گدھے نے دوسرے سے کہا۔ "افسوس تو یہ ہے کہ نہ صرف تم گدھے ہو بلکہ تمھارا باپ بھی گدھا تھا۔" دوسرے نے جواب دیا۔ "اگر تم گدھے نہ ہوتے تو ایسی لغو بات نہ کہتے۔" (ہنستا ہے) ہاہاہا۔ کتنا مزے دار لطیفہ ہے۔ میرا خیال ہے ہز میجسٹی اکبر اسے ضرور پسند کریں گے (ایک لحظہ کے بعد) اور ہاں یہ لطیفہ کیسا رہے گا۔ "ایک دفعہ آگرے کے پاگل خانے میں ایک پاگل موج میں آ کر کہنے لگا۔ اے پاگلو! سنو، خدا نے مجھے تمھارا بادشاہ مقرر کر کے زمین پر بھیجا ہے۔ یہ سن کر ایک دوسرے پاگل نے چلا کر کہا۔ "جھوٹ بکتا ہے میں نے اسے ہرگز تمھارا بادشاہ مقرر نہیں کیا۔"

(ایک لحظہ کے لیے سوچتا ہے) اور تیسرا لطیفہ کچھ اس طرح کا ہونا چاہیے "ایک طوائف کے لڑکے نے اپنی ماں سے پوچھا! ماں میرے باپ کا کیا نام ہے؟ طوائف نے کہا..... طوائف نے کیا کہا؟ کوئی مزے دار چوٹ ہونی چاہیے۔ نہیں تو ہز میجسٹی کو خاک لطف آئے گا؟ ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ طوائف نے کہا کہ......کہ......

(ایک اردلی ٹرے میں دعوتی کارڈ رکھ کر لاتا ہے)

بیربل: (غصے سے) کیا ہے؟ سورج ابھی نکلا نہیں اور ملاقاتی پہلے آ گئے۔ کہہ دو اس وقت ملاقات نہیں ہو سکتی۔ بارہ بجے آئیں۔

اردلی: حضور مولانا ابوالفضل تشریف لائے ہیں۔

بیربل: اوہ اب نل لجل!! اچھا۔ اچھا۔ ان سے کہو کہ تشریف لا سکتے ہیں۔

(مولانا ابوالفضل بہترین شارک سکن کے سوٹ میں ملبوس، منہ میں 555 کا سگرٹ دبائے داخل ہوتے ہیں)

ابوالفضل: آداب عرض۔ پنڈت جی۔

بیربل: اداب ارج۔ آداب ارج۔ آیئے مولانا اب نل لجل...... اخاہ۔ شارک سکن کا سوٹ۔ ٹھاٹھ ہیں مولانا۔ یہ آپ سوٹ کب سے پہننے لگے؟

ابوالفضل: بات یہ ہے قبلہ کہ چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی پہن پہن کر دل اُوب گیا تھا۔ سوچا کہ ان دونوں کو چھٹی دی جائے۔ کہو کیسا لگتا ہوں اس سوٹ میں۔

بیربل: (مولانا کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے) بُرے نہیں لگتے۔ لیکن اگر بہتر درزی کا انتخاب کرتے تو......

ابوالفضل: نہیں، سلا تو اچھا ہے۔ سب پوچھ رہے ہیں کہ کس درزی سے سلایا۔ خانخاناں نے پوچھا ٹوڈرمل نے پوچھا اور ملا دوپیازے نے......

بیربل: آپ ان کا مطلب نہیں سمجھے مولانا۔ وہ اس لیے پوچھ رہے تھے کہ کہیں وہ بھی اس درزی کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔

ابوالفضل: (بیربل کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے) ہیے ٹیلرنگ ہاؤس سے سلوایا ہے۔ ظالموں نے ساٹھ روپے چارج کیے حالانکہ منیجر بیربل میرا اپنا تھا۔

بیربل: چور ہیں مولانا سب چور۔ بیربل کے سوا ہر شخص چور ہے۔

ابوالفضل: مائی گاڈنس۔ یہ کیا کہہ رہے ہو بیربل!

بیربل: گستاخی معاف۔ بالکل ٹھیک عرض کر رہا ہوں۔ اب اُس ملا دو پیازہ کو دیکھو۔ میرے لطیفے چرا کر ہزمیجسٹی پر رعب ڈالتا ہے کہ یہ اس کے اپنے لطیفے ہیں۔

ابوالفضل: لیکن وہ تو کہتا ہے کہ تم اس کے لطیفے چُراتے ہو۔

بیربل: نہیں یہ بات نہیں۔ دراصل ہم دونوں "امریکن بک آف جوکز" ایک ہی انگریزی کتاب سے لطیفے چراتے ہیں اور چونکہ ہم دونوں کے پاس وہی کتاب ہے اس لیے

غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لطیفے چراتے ہیں۔

ابوالفضل: تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ دونوں چور ہیں۔

بیربل: دریں چہ شک مولانا۔ دریں چہ شک۔

ابوالفضل: لیکن ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ تمھارے سوا سب چور ہیں۔

بیربل: ارے بھائی مولانا وہ تو شاعرانہ تعلّی تھی ورنہ دنیا میں کون چور نہیں۔

ابوالفضل: اچھا کیا لکھ رہے تھے؟ حسبِ معمول لطیفے۔

بیربل: ہاں لطیفے۔ اپنے ہز میجسٹی بھی عجیب واقع ہوئے ہیں۔ ہر روز انھیں ہزاروں چٹکلے سناتا ہوں لیکن ان کا جی نہیں بھرتا۔ ہمیشہ تان اس فقرے پر توڑتے ہیں۔ ''اچھا کوئی اور چٹکلہ''۔

ابوالفضل: ذرا دیکھ سکتا ہوں آپ کے لطیفے کیا ہیں۔

بیربل: ہاں ہاں بڑے شوق سے۔

ابوالفضل: (ایک آدھ منٹ لطیفوں کو پڑھنے کے بعد) اُف! کتنے لچر اور لغو ہیں یہ لطیفے۔

بیربل: لچر اور لغو ہیں تو کیا ہوا۔ ہز میجسٹی اکبر بھی کون سے ایم، اے آکسن یا بی اے کینٹب ہیں۔

ابوالفضل: میں کبھی سوچتا ہوں کہ ہز میجسٹی آکسفورڈ یا کیمبرج نہ سہی، اگر علی گڑھ یونی ورسٹی میں ہی چار سال لگا لیتے تو ان کا مذاق......

بیربل: وہ تو ٹھیک ہے مولانا۔ لیکن پھر ہز میجسٹی اکبر، بیربل کو ملازمت سے ضرور جواب دے دیتے۔ اس لیے اچھا ہی ہوا کہ وہ علی گڑھ نہیں گئے۔

ابوالفضل: اچھا اس وقت ہز میجسٹی ہیں کہاں؟ مجھے ان سے ایک ضروری بات کہنا ہے۔

بیربل: ہز میجسٹی تو مولانا اس وقت دیوانِ خاص میں ہیں اور ریڈیو پر لتا منگیشکر کا گانا سُن رہے ہیں۔

ابوالفضل: لتا منگیشکر کا گانا! تعجب!! تان سین کو یاد نہیں فرمایا آج؟

بیربل: بات یہ ہے کہ ہز میجسٹی تان سین کے استادی گانے سُن سُن کر تنگ آگئے ہیں۔ ہر روز

وہی سیاں کی ٹوڑی، میاں کی ملہار، وہی تانیں وہی پلٹے اور پھر لطف یہ کہ گھنٹوں گانا سنتے رہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ پرسوں کہہ رہے تھے کہ مجھے تو میاں کی ٹوڑی بھی ایسی ہی لگتی ہے جیسے میاں کی ملہار اور مجھے یہ شک گزرتا ہے کہ تان سین کو صرف ایک ہی استادی گانا آتا ہے اور وہ ہر روز اسے ایک مختلف نام دے کر ہم سب کو الّو بنا رہا ہے۔

ابوالفضل: پھر؟

بیربل: پھر کیا۔ کل ہزمیجسٹی جلال میں آگئے اور انھوں نے تان سین کو برخاست کر دیا اور کہا کہ آئندہ ہم صرف لتا منگیشکر، گیتا رائے اور طلعت محمود کے ریکارڈ سنا کریں گے۔

ابوالفضل: آہ بیچارہ تان سین۔ اتنا بڑا آرٹسٹ اور یہ حشر! اب کیا کرے گا؟

بیربل: کرے گا کیا۔ بمبئی چلا جائے گا اور پلے بیک گانے دیا کرے گا۔

ابوالفضل: لیکن بمبئی میں اسے کون پوچھے گا۔ میرا مطلب ہے کون سمجھے گا۔ استادی گانوں کا ہماری فلموں میں سکوپ (Scope) ہی کتنا ہے؟

بیربل: اگر یہ بات ہے پھر تو ضرور بھوکا مرے گا۔

ابوالفضل: آہ! اتنا بڑا آرٹسٹ اور بھوکا مرے۔

بیربل: مولانا! ہمیشہ بڑا آرٹسٹ ہی بھوکا مرتا ہے۔ غالب اور منشی پریم چند کا حشر تمھیں معلوم ہی ہے۔ خاص کر غالب۔ بیچارہ ساری عمر اسی تمنا میں جیتا رہا کہ ''رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن'' اور فاقہ مستی رنگ لائی کہ بیچارے کو گرفتار کرا دیا۔

ابوالفضل: آرٹسٹوں کا اب خدا ہی حافظ ہے۔

بیربل: شکر کرو مولانا کہ تم آرٹسٹ نہ ہوئے محض وزیرِ اعظم ہوئے، نہیں تو دن کو تارے نظر آ جاتے۔

ابوالفضل: کون کہتا ہے کہ میں آرٹسٹ نہیں ہوں۔ میری زبان دانی کا تو ہندستان کے علاوہ انگلینڈ میں بھی شہرہ ہے۔ بخدا ایسی انگریزی لکھتا ہوں کہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ پڑھے تو جھوم اُٹھے۔

بیربل: اس میں کیا شک ہے مولانا۔ انگریزی تو آپ کے گھر کی لونڈی ہے۔ لیکن بات یہ

ہے کہ کوئی شخص محض اچھی انگریزی لکھنے سے آرٹسٹ نہیں بن جاتا۔ آرٹسٹ بننے کے لیے بڑا اپنا مارنا پڑتا ہے۔ ہماری طرف دیکھو ہم یونہی آرٹسٹ.....

ابوالفضل: ارے تم آرٹسٹ۔ باتیں بناتے ہو مسخرے کہیں کے۔

بیربل: یہی تو ہمارا آرٹ ہے کہ ہم کچھ بھی نہ ہوتے ہوئے بہت کچھ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم آپ کے یا فیضی کے سامنے بالکل ہیچ ہیں۔ لیکن ہز میجسٹی سے پوچھو تو ان کی نگاہ میں ہم سے بڑا آرٹسٹ آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔

ابوالفضل: ہز میجسٹی بھی تو بالکل.....

بیربل: بس بس آگے نہ کہیے گا مولانا۔ میں ہز میجسٹی کا نمک کھاتا ہوں۔

ابوالفضل: قبلہ۔ نمک تو ہم سب کھاتے ہیں لیکن......

بیربل: لیکن ویکن رہنے دیجیے مولانا۔ ہز میجسٹی کا موڈ خراب ہے ان دنوں۔ اچھا چھوڑیے یہ قصہ۔ یہ کہیے کہ آج کل کیا لکھا جارہا ہے۔

ابوالفضل: خاص تو کچھ نہیں۔ فیضی اور میں کارل مارکس کی کتاب کیپٹیل کا فارسی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔

بیربل: کیسی کتاب ہے ''یہ کیپٹیل'' تعریف تو بہت سنی۔ بلکہ ایک آدھ بار پڑھنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن بخدا ایسی دنداں شکن عبارت ہے کہ پیش لفظ کے بعد پڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

ابوالفضل: کتاب تو واقعی دنداں شکن ہے۔ خاص کر اس کے کچھ حصے.....اچھا ہز میجسٹی کو میرا سلام پہنچا دینا۔ کہنا کہ میں ملاقات کے لیے حاضر ہوا تھا لیکن ان کی تفریح میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔

بیربل: وہ تو میں سب کہہ دوں گا لیکن آخر وہ ضروری بات کیا ہے جو آپ ہز میجسٹی سے کرنا چاہتے ہیں۔ کیا کہیں بغاوت تو نہیں ہوگئی؟

ابوالفضل: بغاوت تو نہیں۔ ہاں! لیکن ایک لحاظ سے بغاوت ہی سمجھو۔ پرنس سلیم.....

بیربل: ہائیں۔ پرنس سلیم۔ اُس نے بغاوت کردی۔ سبحان اللہ! کہاں کی اُس نے بغاوت۔ ابھی تو میرے سامنے کار میں بیٹھ کر کالج گیا ہے۔

ابوالفضل: یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ گڈ بائی۔

بیربل: گڈ بائی۔ گڈ بائی۔ واہ مولانا۔ شارک سکن کا سوٹ کیا پہنا۔ خدا حافظ کہنا بھی بھول گئے۔

(دو ایک منٹ کے بعد) اچھا وہ تیسرا لطیفہ مکمل کر لینا چاہیے۔ طوائف نے کہا۔ کہ۔ کہ۔ کہ۔ کیا کہا طوائف نے...... (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

بیربل: (چونگا اٹھاتے ہوئے) ہیلو۔ جی ہاں بیربل ہی ہوں۔ ہز میجسٹی کا پرائیوٹ سکریٹری۔ آپ کون ہیں؟ اوہ۔ ملا دو پیازہ! کہو استاد کیا حال ہے؟ کیا کہا۔ نیا لطیفہ سوجھا ہے۔ ہاں ہاں ضرور سنیں گے۔ اچھا۔ آگرے میں صرف دو مسخرے رہ گئے ہیں۔ خوب۔ خوب۔ ایک بیربل دوسرا ملا دو پیازہ۔ لیکن دراصل صرف ایک ہی مسخرہ ہے۔ کیا مطلب۔ اچھا۔ کیونکہ بیربل مسخرہ تو ہے لیکن آخر بیربل بھی کیا ہے، ہت تیرے۔ ملا دو پیازہ کی.... کیا چوٹ کی ہے۔ اچھا اس کا جواب سوچ کر دوں گا۔ اچھا.... اچھا.... گڈ بائی۔

(پھر لطیفہ مکمل کرنے کی کوشش کرتا ہے)

بیربل: کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ طوائف نے کیا کہا۔ اچھا یہ کہا۔ کہ۔ کہ تمھارا ایک....

(ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجتی ہے۔)

بیربل: اُف یہ ٹیلیفون بھی ایک مصیبت ہے۔ دم بھر چین نہیں لینے دیتا۔ (چونگا اٹھا کر) ہیلو۔ کون۔ اوہ مولانا فیضی (فیضی) گڈ مارننگ مولانا! ہز میجسٹی؟ وہ تو اس وقت غسل فرما رہے ہیں۔ ضروری بات؟ کیا ہے وہ ضروری بات؟ شہزادہ سلیم کے متعلق؟ ائل فجل بھی یہی کہہ رہے تھے۔ آخر وہ بات کیا ہے؟ مجھے نہیں بتا سکتے؟ اچھا تو پھر مجھے فون کیوں کیا تھا؟ ہاں ہز میجسٹی سے پانچ بجے ملاقات ہو سکتی ہے۔ بائی بائی

(لطیفہ مکمل کرنے کی ایک بار پھر کوشش کرتا ہے)

یہ لطیفے بھی کم بخت عجیب ہوتے ہیں۔ سوجھ جائیں تو فوراً سوجھ جائیں اور نہ سوجھیں تو مہینوں انتظار کرنا پڑے۔ اچھا تھوڑی سی کوشش اور کرتا ہوں۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی تیسری بار بجتی ہے)

جیرلی: اُف پھر کسی کا ٹیلیفون (چونگا اٹھا کر غصے سے) کون ہو تم؟ اوہ! یور میجسٹی معاف کیجیے گا حضور..... جی ہاں۔ وہ لنچ جو آپ امریکن اور روسی سفیروں کو دے رہے تھے۔ اچھا وہ ملتوی کر دیا گیا ہے۔ کیوں؟ دونوں سفیر یک لخت بیمار ہو گئے۔۔۔ تعجب! اچھا تو پھر لنچ کا انتظام نہ کروں۔ بہت اچھا۔ ہاں کل کے لطیفے بہت پسند آئے۔ تھینک یو۔ تھینک یو۔ یور میجسٹی۔

جیرلی: یہ سفیر لوگ بھی بڑے حضرت ہوتے ہیں۔ انھیں ضرور واشنگٹن اور ماسکو سے ہدایات مل گئی ہوں گی کہ دونوں ایک ہی لنچ میں شریک نہ ہوں۔ ہاں اگر ہز میجسٹی علاحدہ علاحدہ مدعو کریں تو بے شک چلے جائیں اور دونوں نے عذر پیش کیا کہ یک لخت بیمار ہو گئے ہیں۔۔۔ اونہہ۔ جیسے ہم اتنے سادہ لوح ہیں کہ ان کی باتوں میں آ جائیں گے۔۔۔ اچھا اب گھر چلنا چاہیے۔ مسز جیرلی انتظار کر رہی ہوں گی۔

دوسرا منظر: سلیم اور انارکلی

(پرنس سلیم اور انارکلی دریائے جمنا میں ایک شکارے میں بیٹھ کر سیر کر رہے ہیں۔ انارکلی نے غرارہ اور قمیص پہن رکھی ہے۔ سلیم انگریزی سوٹ میں ملبوس ہے۔ انارکلی کا سر سلیم کے شانے پر ہے۔)

سلیم: انارکلی ڈارلنگ!

انارکلی: ڈیر سلیم!

سلیم: ڈارلنگ۔

انارکلی: کہو سلیم۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔

سلیم: ڈارلنگ!

انارکلی: سلیم تم اس طرح ڈارلنگ ڈارلنگ کرتے رہے تو ضرور پاگل ہو جاؤ گے۔

سلیم: آہ ڈارلنگ!

انارکلی: خدا کے لیے کچھ ڈارلنگ کے علاوہ بھی کہو سلیم۔ تعجب ہے۔ تم نے اتنی ہندوستانی اور امریکن فلمیں دیکھیں لیکن تمھیں محبت کرنا نہ آیا۔

سلیم: محبت کر تو رہا ہوں ڈارلنگ۔

انارکلی: یہ محبت کر رہے ہو۔ بخدا اتنی بور (Bore) ہو رہی ہوں کہ جی چاہتا ہے جمنا میں چھلانگ لگا دوں۔

سلیم: خدا کے لیے ایسا نہ کرنا ڈارلنگ مجھے تیرنا بالکل نہیں آتا۔

انارکلی: تو پھر سیدھی طرح محبت کرو۔ دلیپ کمار کی طرح، راج کپور کی طرح اور نہیں تو اوم پرکاش کی طرح۔ یہ کوئی انداز ہے محبت کرنے کا۔ آدھ گھنٹے سے ڈارلنگ ڈارلنگ کی رٹ لگا رکھی ہے۔

سلیم: ڈارلنگ میں دلیپ کمار کی طرح محبت کر سکتا ہوں۔ لیکن.....

انارکلی: لیکن کیا؟

سلیم: تم شاید نہیں جانتیں کہ سکرین (Screen) پر محبت کرنے کے لیے دلیپ کمار کو پچھتر ہزار کبھی کبھی ایک لاکھ روپیہ ملتا ہے اور یہاں....

انارکلی: مغل زادے ہو کر روپے پیسے کی بات مت کرو۔ محبت روپے سے بے نیاز ہے۔

سلیم: ہے تو سہی ڈیئر انارکلی۔ لیکن بقول نظیر اکبرآبادی: پیسے بغیر آدمی چرخے کی مال ہے۔

انارکلی: پھر تم نے نظیر اکبرآبادی کا نام لیا۔ کئی بار تم سے کہا ہے کہ مجھے نظیر سے چڑ ہے۔ اس کا نام مت لیا کرو۔

سلیم: واہ ڈارلنگ۔ سیماب اکبرآبادی سے پہلے ایک وہی تو آگرے نے کام کا شاعر پیدا کیا اور اسی سے تمھیں چڑ ہے۔ ڈیئر انارکلی۔ اب تو زمانہ نظیر اکبرآبادی کا آ رہا ہے۔ چند دنوں میں دیکھو گی کہ ہر جگہ نظیر کے ہی چرچے ہیں۔ نظیر عوام کا شاعر ہے۔

انارکلی: ہو گا عوامی شاعر۔ لیکن مجھے بالکل پسند نہیں۔

سلیم: بات یہ ہے پیاری انارکلی کہ تم ذرا امیر واقع ہوئی ہو حالانکہ تمھیں غریب ہونا چاہیے تھا۔

انارکلی: اچھا ہٹاؤ اسے۔ یہ بتاؤ کہ ہم تم آخر کب تک چھپ چھپ کر ملتے رہیں گے۔

سلیم: ڈارلنگ! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ جب تک ہم دونوں نوجوان ہیں ایسا کرنا ہی پڑے گا۔ جب ہم دونوں بوڑھے ہو گئے تو پھر کھلم کھلا ملا کریں گے۔ یہ ہندستان ہے ڈارلنگ، فرانس یا امریکہ نہیں۔

انارکلی: لیکن سلیم ہم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔

سلیم: کر تو لیں لیکن ڈیڈی کو کس طرح راضی کریں۔

انارکلی: شادی تمھیں کرنا ہے یا ڈیڈی کو۔ اس میں ڈیڈی کی رضامندی کا کیا سوال ہے۔

سلیم: سوال تو ہے ڈارلنگ۔ اگر ڈیڈی نے گھر سے نکال دیا تو....

انارکلی: تو تم ہمارے گھر آ جانا۔

سلیم: اور اگر تمھاری ممی نے ہم دونوں کو گھر سے نکال دیا تو....

انارکلی: نہیں نہیں میری ممی بہت اچھی ہے۔ وہ ہمیں کبھی گھر سے نہیں نکالے گی آؤ اس عید کو شادی کر لیں۔

انارکلی: اتنی جلدی نہیں ڈارلنگ۔ ہمیں پھونک پھونک کر قدم اٹھانا پڑے گا، اگر ڈیڈی....

انارکلی: پھر وہی ڈیڈی۔ شہزادے ہو کر تم اتنے بزدل کیوں ہو سلیم۔ آخر شادی کرنا کوئی گناہ تو نہیں۔

سلیم: یہ تو تم درست کہتی ہو۔ اب ڈیڈی کو دیکھو۔ یکے بعد دیگرے کئی شادیاں کر ڈالیں لیکن ہمارا تمھارا معاملہ ذرا پیچیدہ ہے۔ بدقسمتی سے میں ولی عہد ہوں۔

انارکلی: ولی عہد ہو تو پھر کیا ہوا۔ کیا ولی عہد شادی نہیں کر سکتا۔

سلیم: کر تو سکتا ہے لیکن اسے تاج وتخت سے دستبردار ہونا پڑے گا۔

انارکلی: تو ہو جانا۔ یہ کونسی مشکل بات ہے۔ محبت کی خاطر انسان کیا نہیں کرتا۔ ایڈورڈ ہشتم نے مسز سمپسن کی خاطر برطانیہ کا تخت ٹھکرا دیا تھا اور یاد ہے یہ اس وقت کی بات ہے جب انگریزی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔

سلیم: صحیح ہے۔ لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ اب تو انگریزی سلطنت کا سورج اس

طرح غروب ہو رہا ہے کہ شاید قیامت تک طلوع نہ ہو سکے گا۔

انارکلی: بات شادی کی ہو رہی تھی۔ قصہ انگریزوں کا لے بیٹھے۔ تم بھی عجیب پروفیسر قسم کے عاشق ہو۔

سلیم: پروفیسر کون؟ یادش بخیر پروفیسر آل احمد سرور تو نہیں۔ انھوں نے چند کامیاب غزلیں کہی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں کسی سے عشق تو نہیں کیا۔

انارکلی: (چہک کر) ہاں۔ کیسے نہیں کیا۔ یاد ہے۔ ان کی تازہ غزل کا مطلع:

کبھی سر ان کے قدموں میں کبھی ہاتھ ان کے دامن پر
طبیعت ان دنوں کچھ لا اُبالی ہوتی جاتی ہے

سلیم: مکرر، مکرر، سبحان اللہ۔ یہ شعر نہیں سحر ہے۔ واللہ کیا تیور ہیں اس شعر کے۔

نارکلی: یہ آل انڈیا مشاعرہ لکھنؤ نہیں ہے سلیم، کہ تم یوں اچھل اچھل کر داد دے رہے ہو.... بات شادی کی ہو رہی ہے پروفیسر آل احمد سرور کی نہیں۔

سلیم: اُوہ شادی کرلیں گے ابھی کیا جلدی ہے۔

انارکلی: جلدی اس لیے ہے کہ میری ممی کو ہر روز میرے لیے پیغام آرہے ہیں۔

سلیم: تو یہ تمھاری ممی کی غلطی ہے۔ اُس نے ضرور اخبار میں تمھارے لیے رشتے کا اشتہار دیا ہوگا۔

انارکلی: ہاں دیا تو تھا۔

سلیم: تو یوں کرو کہ اس اشتہار کی تردید چھپوادو۔ لکھ دو کہ تمھارا ابھی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔

انارکلی: دراصل تردید چھپوانے کو جی نہیں چاہتا۔ بات یہ ہے کہ ان میں سے کچھ تو بہت بڑے لوگوں کے ہیں۔

سلیم: بڑے لوگوں کے، اچھا کون ہیں وہ بیوقوف، میرا مطلب ہے شریف آدمی؟

انارکلی: ایک تو اٹاوہ کا زمیندار ہی ہے۔ خاصا مال دار۔

سلیم: (قہقہہ لگاکر) ہاہاہا۔ زمیندار۔ ڈارلنگ کہیں اس کی باتوں میں نہ آجانا۔

انارکلی: ایک فیض آباد کے کوئی شاعر ہیں۔ عمر کچھ زیادہ ہے لیکن غزل اچھی کہتے ہیں۔

سلیم: توبہ توبہ۔ شاعر۔ معلوم ہے۔ ڈارلنگ کہ ہندستانی شاعر کی آمدنی کیا ہوتی ہے۔ پان تک تو بیچارہ ادھار لے کر کھاتا ہے۔ شاعر سے ہی شادی کرنا ہے تو کسی انگریز یا امریکی شاعر سے کرو۔ رہنے کو خوبصورت فلیٹ اور سواری کو روڈ ٹر رائیس۔

انارکلی: ایک بارہ بنکی کے ملّا ہیں۔ تین بیویاں پہلے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ بڑی بیگم میں ہی کہلواؤں گی۔

سلیم: ہاہاہا۔ ملّا۔ اس سے بہتر ہے کہ تم ملّا دو پیازہ سے شادی کرلو۔

انارکلی: لیکن وہ کہتے ہیں کہ حق مہر پچاس ہزار لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔

سلیم: صرف پچاس ہزار! انارکلی کے لیے پچاس ہزار! بخدا، ڈارلنگ میں تمھیں ساری سلطنت بطور حق مہر لکھ کر دینے کو تیار ہوں اور اس کے بعد بھی یہی کہوں گا کہ یہ بہت معمولی پیش کش ہے۔

انارکلی: واقعی سلیم؟

سلیم: تمھاری قسم ڈارلنگ۔

انارکلی: سلیم تم کتنے اچھے ہو۔

سلیم: ڈیر ڈارلنگ انارکلی۔

انارکلی: (یک لخت کھڑی ہو کر دیکھتے ہوئے) اوہ! دس بج گئے۔ میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے۔

سلیم: ابھی صرف دس ہی بجے ہیں۔

انارکلی: ٹھیک ہے لیکن ہوسٹل کی سپرنٹنڈنٹ ۱۰ بجے گیٹ بند کر دیتی ہے۔ بڑی شکی مزاج عورت ہے۔ کل بھی پوچھ رہی تھی کہ میں رات گئے تک کہاں رہتی ہوں۔

سلیم: تو تم نے کیا کہا۔

انارکلی: میں نے کہا ایک سہیلی کا برتھ ڈے تھا۔ اس کی پارٹی میں گئی تھی۔

سلیم: خوب ہمارے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ ڈیڈی پوچھنے لگے۔ شیخو! آج بہت دیر سے

لو۔لے۔ہم نے جھٹ عذر پیش کر دیا۔

انارکلی: کیا؟

سلیم: یہی کہ آج پروفیسر نے کیمسٹری کی سپیشل کلاس لی تھی۔ پریکٹیکل کرنے دیر ہوگئی۔

انارکلی: (ہنستے ہوئے) رات کے وقت پریکٹیکل! خوب بنایا ڈیڈی کو۔

سلیم: ڈیڈی سیدھے سادے آدمی ہیں جھٹ یقین کر لیتے ہیں۔ اچھا آؤ شکارے کو کنارے کی طرف لے چلیں۔ اس کے بعد میں تمہیں کار میں ہوسٹل پہنچا دوں گا۔

انارکلی: ہوسٹل نہیں۔ لڑکیاں خواہ مخواہ شک کریں گی۔ مجھے صرف ٹیکسی سٹینڈ تک پہنچا دو وہاں سے ٹیکسی کر لوں گی۔

سلیم: ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ اچھا۔ چلو۔

تیسرا منظر: خطرناک سازش
(دیوانِ خاص)

(ہز میجسٹی اکبر ریڈیو سن رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد گھنٹی بجاتے ہیں۔ اردلی داخل ہوتا ہے۔)

اکبر: انور۔ یہ طلعت محمود کا آخری ریکارڈ بج رہا ہے اس کے بعد تقریر ہوگی۔ جونہی گانا ختم ہو ریڈیو بند کر دو۔

انور: بہت اچھا۔ یور میجسٹی۔

اکبر: خدا جانے یہ ریڈیو تقریریں اتنی خشک اور غیر دلچسپ کیوں ہوتی ہیں۔ جب بھی غلطی سے ایک آدھ سن لیتا ہوں۔ سارڈیان کی گولی کا سہارا لینا پڑتا ہے.... انور کیا تم بتا سکتے ہو کہ ریڈیو تقریریں اتنی بے مزا کیوں ہوتی ہیں۔

انور: غالباً یور میجسٹی اس لیے کہ تقریریں کرنے والوں کو بہت قلیل معاوضہ دیا جاتا ہے۔

اکبر: ہُم۔ ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے (سگار سلگاتے ہوئے) اچھا یہ امریکی سگار کافی اچھے ہیں۔

کچھ اور خرید لو۔

انور: بہت اچھا یور میجسٹی۔

(ریکارڈ ختم ہوتے ہی انور ریڈیو بند کر دیتا ہے)

اکبر: ہاں۔ اب تم جا سکتے ہو۔

(انور باہر جاتا ہے)

سبحان اللہ۔ کیا گلا پایا ہے طلعت محمود نے۔ اتنا عرصہ یونہی بیکار تان سین کی سرپرستی کرتے رہے۔ اچھا آج بیربل سے کہوں گا کہ طلعت محمود سے خط و کتابت کرے۔ اگر وہ مان جائے تو اسے ملازم رکھ لیا جائے۔

(انور طشتری میں وزیٹنگ کارڈ(Visiting Card)لاتا ہے)

اکبر: کس کا وزیٹنگ کارڈ ہے۔

انور: یور میجسٹی۔ سراغ علی خاں، افسر اعلیٰ سی آئی ڈی کا۔

اکبر: اس سے کہو کہ اجازت ہے۔

(انور جاتا ہے۔ سراغ علی خاں داخل ہوتا ہے)

سراغ علی خاں: گڈ مارننگ یور میجسٹی۔

اکبر: گڈ مارننگ سراغ۔ کہو کیا خبر ہے۔

سراغ علی خاں: جناب ایک نہایت خطرناک سازش کا سراغ لگایا ہے۔

اکبر: ہُوں۔ لسانی صوبوں کا جھگڑا ہوگا۔

سراغ علی خاں: نہیں یور میجسٹی۔ اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

اکبر: تو پھر۔

سراغ علی خاں: گستاخی معاف۔ یہ شہزادہ سلیم۔

اکبر: کیا بکتے ہو۔ شہزادہ کبھی سازش کا مرتکب ہو سکتا ہے؟

سراغ علی خاں: (کانپتے ہوئے) حضور یہ فائل ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

(فائل آگے رکھ دیتا ہے)

اکبر: سراغ علی خاں تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم انگریزی نہیں جانتے۔ انگریزی کے دو چار الفاظ بول لینا اور بات ہے۔ خواہ مخواہ ہمیں چڑانے کے لیے ایسی حرکت کرتے ہو۔

سراغ علی خاں: معاف کیجیے حضور میں پھر بھول گیا تھا کہ آپ....

اکبر: آئندہ خیال رکھو نہیں تو سخت سزا دی جائے گی.... ہمیں فائل کا آسان اردو ترجمہ سنایا جائے۔

سراغ علی خاں: (فائل سے پڑھتے ہوئے) یکم جنوری کو شہزادہ سلیم اور نادرہ عرف انارکلی میٹرو ہوٹل میں رات کے ۱۱ بجے ناچ کرتے پائے گئے۔

اکبر: ہوں۔ میٹرو میں ناچ۔

سراغ علی خاں: دس جنوری کو شہزادے نے انارکلی کی معیت میں اوڈین میں فلم لیلیٰ مجنوں دیکھی۔

اکبر: ہوں۔ اوڈین میں لیلیٰ مجنوں۔

سراغ علی خاں: بیس جنوری کو شہزادہ انارکلی کے ساتھ جمنا میں ایک شکارے میں سیر کرتا ہوا دیکھا گیا۔

اکبر: ہوں۔ جمنا میں بوٹنگ (Boating)۔

سراغ علی خاں: تیس جنوری کو شہزادہ....

اکبر: بس بس آگے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ ہم معاملے کی تہ تک پہنچ گئے۔ دال میں کچھ کالا ہے۔

سراغ علی خاں: یور میجسٹی بجا فرماتے ہیں۔

اکبر: اچھا تم جا سکتے ہو۔ یہ فائل ہمارے پاس رہنے دو۔

(سراغ علی خاں جاتا ہے۔ ہز میجسٹی دو ایک منٹ محل میں ٹہلتے پھرتے ہیں پھر ٹیلی فون اٹھاتے ہیں۔)

ہیلو۔ بیربل۔ ہاں معاملہ بہت نازک ہے۔ ہاں ابھی فوراً۔ سب کام چھوڑ کر۔ لطیفے پھر لکھ لینا۔

(ٹیلیفون کرنے کے بعد پھر ٹہلنے لگتے ہیں۔ ایک آدھ منٹ کے بعد بیربل داخل ہوتا ہے۔)

بیربل: ہیلو۔ یور میجسٹی۔ ہاؤ ڈو یو ڈو (?How do you do)....اچھا ایک نیا لطیفہ سنیے۔ایک دفعہ سڑک پر دو گدھے جا رہے تھے۔

اکبر: بیربل۔تم ہر وقت گدھوں کی باتیں کرتے رہتے ہو۔کبھی انسانوں کا بھی ذکر کیا کرو۔

بیربل: گستاخی معاف۔یور میجسٹی۔گدھوں اور انسانوں میں فرق ہی کتنا رہ گیا ہے اب۔

اکبر: تم بہت شریر ہوتے جا رہے ہو۔شریر کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں۔

بیربل: ناٹی (Naughty)۔

اکبر: ہاں تم بڑے ناٹی ہو۔اچھا ہٹاؤ اسے۔ہم تم سے ایک نہایت سنجیدہ مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

بیربل: اگر مسئلہ سنجیدہ ہے تو پھر اب تل فجل یا فیضی کو بلوائیے۔خاکسار کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔

اکبر: نہیں ہم تمھاری رائے لینا چاہتے ہیں۔معلوم ہے شہزادے نے کیا کیا؟

بیربل: غالباً انگریزی کے مضمون میں فیل ہو گیا۔

اکبر: نہیں۔

بیربل: تو پھر کیمسٹری میں رہ گیا ہوگا۔ میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ اسے بی ایس سی کے مضامین نہ لینے دیجیے۔

اکبر: نہیں یہ بات نہیں۔

بیربل: تو پھر کالج میں کوئی سٹرائیک وسٹرائیک کرا دی ہوگی۔

اکبر: نہیں نہیں۔تمھارے سب اندازے غلط ہیں۔شہزادے نے عشق.....

بیربل: عشق! پھر تو مبارک ہو۔

اکبر: مبارک؟ کس بات کی مبارک؟

بیربل: اس بات کی کہ شہزادہ بالغ ہو گیا ہے۔

اکبر: کیا مطلب؟

بیربل: شہزادے عموماً اپنے بالغ ہونے کا اعلان اور اظہار اسی طرح کیا کرتے ہیں۔

اکبر: لیکن اسے ایک معمولی لونڈی سے عشق ہے۔نادرہ عرف انارکلی سے۔

بیربل: لونڈی چاہے معمولی ہو۔ہو گی غضب کی۔میں اپنے بھتیجے کو اچھی طرح جانتا ہوں۔

اکبر: بات کو مذاق میں اڑانے کی کوشش مت کرو بیربل۔ معاملہ بہت سنجیدہ ہے۔ اچھا جلدی سے بتاؤ کہ کیا کرنا چاہیے۔

بیربل: (سنجیدگی سے) میرے خیال میں تو دونوں کی شادی کر دینی چاہیے۔

اکبر: ایک لونڈی سے شادی، ناممکن۔

بیربل: تو پھر شہزادے سے کہا جائے کہ وہ انارکلی کو طلاق دے دے۔

اکبر: لاحول ولا۔ شادی سے پہلے طلاق۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

بیربل: شادی کے بعد ہو سکتا ہے تو شادی سے پہلے کیوں نہیں۔

اکبر: تم حسب معمول غیر سنجیدگی سے بات کر رہے ہو۔

بیربل: میں نے تو پہلے ہی عرض کیا تھا کہ اب ظل فضل اور فیضی کو بلوائیے۔

اکبر: تو تم گویا اپنی نااہلیت کا اعتراف کرتے ہو۔

بیربل: دراصل یور میجسٹی مجھے گناہ گاروں سے ہمیشہ ہمدردی رہی ہے۔

اکبر: کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مشکل کا کیا حل ہونا چاہیے۔

بیربل: پھر بھی آپ نے کچھ تو سوچا ہوگا۔

اکبر: مجھے ہی ہر بات سوچنا ہے تو تم تنخواہ کس بات کی لیتے ہو۔

بیربل: (بڑی سادگی سے) آپ کو لطیفے سنانے کی۔

اکبر: تم بہت نامعقول قسم کے آدمی ہو۔

بیربل: دریں چہ شک یور میجسٹی۔ دریں چہ شک۔

اکبر: اچھا ساری کیبنٹ کو مطلع کرو کہ آج شام کے پانچ بجے دیوان خاص میں، ایک خاص اجلاس ہوگا۔ سب وزرا وقتِ مقررہ پر تشریف لائیں۔

بیربل: بہت اچھا۔ تو آج لطیفے نہیں سنیں گے کیا؟

اکبر: نہیں آج لطیفے سننے کا موڈ نہیں۔

بیربل: اچھا گڈ ڈے (Good day)۔ یور میجسٹی۔

اکبر: گڈ ڈے۔

چوتھا منظر: دربارِ اکبری

دیوانِ خاص میں کیبنٹ کا خاص اجلاس

(ہز مجسٹی اکبر تخت پر اور ابوالفضل، فیضی، عبدالرحیم خانخاناں، بیربل، ٹوڈرمل، ملا دو پیازہ پُر تکلف کرسیوں پر بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں)

اکبر: یہ کیبنٹ کا ایمرجنسی اجلاس ہے۔ ہم آپ حضرات سے ایک نہایت اہم مسئلے پر تبادلۂ خیالات کرنا چاہتے ہیں۔ اجلاس کی کارروائی شروع کرنے سے پہلے ہم واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اس اجلاس کا ایجنڈا بہر حال چھ بجے تک ختم ہونا چاہیے۔

بیربل: یہ چھ بجے کی قید کس لیے؟ کیا حضور چھ بجے کی گاڑی سے دہلی جا رہے ہیں۔

اکبر: نہیں چھ بجے ریڈیو سیلون کا پروگرام شروع ہوتا ہے جسے ہم کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بخدا ایسے نئے نئے فلمی ریکارڈ سنواتے ہیں کہ طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کی طرح نہیں کہ جدھر بھی سوئی گھماؤ کرناٹک میوزک کی آواز سنائی دیتی ہے۔ خدا جانے یہ کرناٹک والے کیا گاتے ہیں اور کیوں گاتے ہیں۔

بیربل: واقعی ان دنوں ریڈیو سیلون بہترین پروگرام پیش کر رہا ہے۔ یور مجسٹی

ملا دو پیازہ: پروگرام تو بہت اچھا ہے لیکن ان کا ''بیوپار دھاگ'' سارے ریکارڈوں کا مزا کرکرا کر دیتا ہے۔

اکبر: ہمیں تم سے اختلاف ہے۔ ہمارے خیال میں تو ان کے بیوپار دھاگ کا پروگرام بھی کافی دلچسپ ہوتا ہے۔ اس خوبصورتی اور سلیقے سے مختلف چیزوں کا اشتہار دیتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ۔۔۔۔کہ

بیربل: کہ جیب میں پیسے ہوں تو ساری خرید لی جائیں۔

اکبر: بے شک۔ ہم تو اکثر وہی چیزیں خریدتے ہیں جن کا اشتہار ہم ریڈیو پر سنتے ہیں۔

ملا دو پیازہ: (شرارتاً) غالباً آپ نے بیربل کو بھی اسی لیے ملازم رکھا تھا کہ ریڈیو سیلون نے اپنے ایک اشتہار میں اس کے مسخرے پن کی تعریف کی تھی۔

بیربل: اور اپنی بات بھول ہی گئے۔ ملا۔ ریڈیو سیلون نے یہ بھی کہا تھا کہ بدحواسی دوائی کے بعد

ملا دوپیازہ ہی وہ شخص ہے جس کی شکل دیکھتے ہی ہنسی آجاتی ہے۔

ملا دوپیازہ: خیر مجھے تو دیکھ کر ہی ہنسی آجاتی ہے اور تمھارے لطیفوں پر بھی رونے کو جی چاہتا ہے۔

اکبر: تم دونوں پھر چونچیں لڑانے لگے۔ تم خواہ مخواہ کیبنٹ کا وقت ضائع کر رہے ہو۔ ہم نے شروع میں کہا تھا کہ یہ خاص اجلاس ہے اور مسئلہ زیر غور نہایت اہم ہے۔ ہم اب آپ سب کو اس مسئلے کی نوعیت سے آگاہ فرماتے ہیں۔

ابوالفضل: قطع کلام معاف۔ بندہ حضور سے ایک نہایت اہم بات علاحدگی میں عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔

فیضی: گستاخی معاف۔ بندہ ابوالفضل کی اہم بات سے بھی ایک اہم بات آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہے۔

اکبر: آپ دونوں بھائی تشریف رکھیں۔ ہم جانتے ہیں جو بات ہم تک پہنچانا چاہتے ہیں۔

ابوالفضل: فیضی۔ ہمیں سو فیصدی یقین ہے کہ آپ نہیں جانتے۔

اکبر: ہمیں دو سو فیصدی یقین ہے کہ ہم جانتے ہیں۔

بیربل: اچھا بھلا بتایئے وہ کیا بات ہے؟

اکبر: یہی کہ شہزادہ سلیم کو نادرہ عرف انارکلی سے عشق....

ملا دوپیازہ: (کرسی میں اُچھل کر) عشق! شہزادے کو!

ٹوڈرمل: کیا فرمایا۔ سلیم کو انارکلی سے۔ نہیں نہیں۔

عبدالرحیم خانخاناں: کیا میں نے ٹھیک سنا کہ شہزادے کو۔ انارکلی سے، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔

ابوالفضل: تعجب! آپ کو اس کا راز کیسے پتہ چلا۔

فیضی: یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کو....

اکبر: تعجب اس بات پر نہیں کہ ہمیں کیسے پتہ چلا۔ بلکہ اس بات پر ہے کہ آپ دونوں کو کیسے معلوم ہوا۔ سی آئی ڈی میں ضرور لیکج (Leakage) ہو رہا ہے۔ خیر اس کے متعلق انکوائری کرنا پڑے گی۔

ملا دوپیازہ: لیکن یور میجسٹی شہزادے کو.... واقعی میرا مطلب ہے سلیم کو۔

بیربل: اے عقل کے دشمن! کہہ تو رہے ہیں کہ شہزادہ سلیم کو انارکلی سے عشق ہو گیا ہے۔ تجھے یقین ہی نہیں آتا۔

اکبر: ہاں۔ بدقسمتی سے شہزادہ سلیم کو عشق ہو گیا ہے۔

بیربل: بدقسمتی سے؟ آپ تو اس لہجے میں کہہ رہے ہیں۔ گویا شہزادے کو عشق نہیں خدانخواستہ ٹائی فائیڈ (*Typhoid*) ہو گیا ہے۔

ملّا دوپیازہ: (بیربل سے) اے جاہلِ مطلق۔ عشق تو ٹائی فائیڈ سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ ٹائی فائیڈ کا کورس ہے۔ اکیس دن۔ زیادہ سے زیادہ بیالیس دن۔ اور عشق کا کورس ہے ساری عمر بلکہ یہ تو مرنے کے بعد بھی جان نہیں چھوڑتا۔

بیربل: اے ملّا ہی رہے۔ کبھی عشق کیا بھی ہے یا یونہی اناپ شناپ بک رہا ہے۔

ملّا دوپیازہ: خدا نہ کرے۔ ملّا دوپیازہ کو کسی سے عشق ہو جائے۔

بیربل: یہ دعا تو ہم بھی مانگتے ہیں۔ نہیں تو فریقِ ثانی کا خدا ہی حافظ ہے۔

اکبر: خاموش بیربل۔ ہاں تو حضرات سب سے پہلے ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ شہزادے کو انارکلی سے ہی کیوں عشق ہوا۔

بیربل: آپ کا مطلب ہے کہ اسے کالج میں پڑھنے والی باقی سب لڑکیوں سے کیوں نہیں ہوا۔ بندہ پرور۔ عشق تو ہول ٹائم جاب (whole time job) ہے ایک شخص ایک وقت میں صرف ایک لڑکی سے ہی عشق کر سکتا ہے۔

اکبر: بہرحال ہم آپ سے شہزادے کے عشق کی وجہ دریافت کرنا چاہتے ہیں۔

ملّا دوپیازہ: وجہ ظاہر ہے۔ یہ سب کو ایجوکیشن (Co-education) کا قصور ہے۔ میں نے آپ سے کئی بار عرض کی کہ کو ایجوکیشن قانوناً بند ہونی چاہیے لیکن آپ نے میری ایک نہ سنی۔

بیربل: واہ ملّا دوپیازہ صاحب واہ! مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ، اے عشق کا کو ایجوکیشن سے کیا تعلق ہے۔

ملّا دوپیازہ: تعلق کیسے نہیں۔ ورنہ شہزادے کو عشق....

بیربل: باقی بھی تو نوسو ننانوے لڑکے اسی کالج میں پڑھتے ہیں۔ انھیں عشق کیوں نہ ہوا؟

ملا دو پیازہ: ممکن ہے انھیں عشق کرنے کے لیے فرصت نہ ملی ہو۔

اکبر: ملا دو پیازہ کی کو ایجوکیشن والی بات کافی معقول ہے۔ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ کو ایجوکیشن کافی خطرناک طریقۂ تعلیم ہے۔

بیربل: جی ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔

ملا دو پیازہ: ابے جاہل۔ ابھی تو کو ایجوکیشن کی تعریف کر رہا تھا۔ اب حضور نے اسے خطرناک بتایا تو تُو نے بھی جھٹ پینترا بدل لیا۔

بیربل: مُلا ہی رہے۔ ساری عمر تھوڑی سی بھی ڈپلومیسی (Diplomacy) نہ سیکھی۔ ابے تنخواہ حضور دیتے ہیں یا کو ایجوکیشن۔

اکبر: کو ایجوکیشن کے علاوہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

ابوالفضل: میری رائے میں تو یہ سب فلموں کا قصور ہے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں دن رات عشقیہ فلمیں دیکھتے ہیں اور اُن سے گمراہ کن اثر قبول کرتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ شہزادے نے لیلیٰ مجنوں تین دفعہ دیکھی۔

بیربل: لو اور سنو۔ اب تک مُل صاحب! نوجوان "لیلیٰ مجنوں" نہیں دیکھیں گے تو کیا "بھگت پرہلاد" دیکھیں گے۔

اکبر: اگر وہ بھگت پرہلاد جیسی پاکیزہ تصویریں دیکھیں تو یقیناً ان کا اخلاق۔

بیربل: اخلاق! مجھے امیر مینائی کا ایک شعر یاد آ گیا۔

اپنا بھی وقت یاد کرو کچھ تو شیخ جی
کیا کیا مزے اڑائے ہیں عہدِ شباب میں

یاد ہے حضور۔ آج سے بیس برس پہلے، جب ہم دونوں نوجوان تھے۔ آپ مجھے فلم "شیریں فرہاد" دیکھنے کے لیے لے گئے تھے اور آپ نے فرمایا تھا کہ یہ فلم ہر نوجوان کو چار دفعہ دیکھنی چاہیے۔

اکبر: بالکل غلط۔ ہم نے یہ الفاظ ہرگز نہیں کہے۔

بیربل: تو پھر ملا دو پیازہ نے کہے ہوں گے۔

ملا دوپیازہ: جھوٹ، میں تو فلمیں دیکھتا ہی نہیں۔

بیربل: تو پھر یہ الفاظ میں نے ہی کہے ہوں گے۔

اکبر: بیربل تم اِدھر اُدھر کی باتوں میں کیبنٹ کا وقت ضائع کر رہے ہو۔ ابھی تک ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ شہزادے کے عشق کی کیا وجہ ہے۔ خیر چھوڑیے اسے۔ وجہ کچھ بھی ہو۔ یہ طے ہے کہ شہزادے کو عشق ہے۔ اب اس کے متعلق آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

بیربل: میرے خیال میں تو ذاتی معاملہ ہے اس میں کیبنٹ کو بالکل دخل نہیں دینا چاہیے۔

اکبر: یہ ذاتی معاملہ نہیں۔ شہزادہ ولی عہد ہے۔ اُسے ایک دن بادشاہ بننا ہے۔

ملا دوپیازہ: میرے خیال میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا معاشقہ ہے کہ ایک شہزادے کو ایک عام لڑکی سے عشق ہوا ہے۔

بیربل: پہلا نہیں دوسرا۔ ایڈورڈ ہشتم کو بھی تو مسز سمپسن سے عشق ہوا تھا۔

ٹوڈرمل: تو کیوں نہ اس معاملے میں برٹش کیبنٹ کے فیصلے سے استفادہ کیا جائے۔

عبدالرحیم خانخاناں: برٹش کیبنٹ کا تو فیصلہ تھا کہ ایڈورڈ برطانیہ کے تخت سے دستبردار ہو جائے یا مسز سمپسن سے شادی کرنے کا ارادہ ترک کر دے۔

فیضی: شہزادے کے سامنے بھی یہی تجویز رکھی جائے۔

بیربل: خدا کے لیے ایسا نہ کرنا فیضی صاحب۔ نہیں تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

فیضی: کیسے؟

بیربل: اگر شہزادہ تخت سے دستبردار ہو گیا۔ تو۔

فیضی: شہزادہ ایسی غلطی کبھی نہیں کرے گا۔

بیربل: اگر ایڈورڈ ہشتم ایک طلاق یافتہ عورت کے لیے برطانیہ کا تخت ٹھکرا سکتا ہے تو کیا شہزادہ ایک دوشیزہ کے لیے ہندستان کا تخت نہیں ٹھکرا سکتا۔

اکبر: بیربل ٹھیک کہتا ہے۔ نوجوان جوش میں آ کر کچھ کر سکتے ہیں.... ہاں ابوالفضل آپ نے اب تک کچھ نہیں کہا۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

ملا دوپیازہ: کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں۔ آج غالب غزل سرا نہ ہوا۔

ابوالفضل: میرے خیال میں تو پہلے یہ تحقیق کر لینا چاہیے کہ آیا سی آئی ڈی کی رپورٹ صحیح ہے۔

اکبر: تو گویا آپ کو سراغ علی خاں پر اعتماد نہیں۔

ابوالفضل: اعتماد تو ہے لیکن کئی بار سراغ علی خاں اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے واقعات اختراع بھی کر لیتا ہے۔

اکبر: آپ کا مطلب ہے کہ ہو سکتا ہے کہ شہزادے کو انارکلی سے عشق نہ ہو۔

فیضی: تو سب سے پہلے اس بات کو کنفرم (Confirm) کرنا چاہیے کہ شہزادے کو عشق ہے یا نہیں۔

اکبر: لیکن کیسے؟

ابوالفضل: میری سمجھ میں ایک تجویز آئی ہے اگر کیبنٹ اس سے اتفاق کرے۔

فیضی۔ ٹوڈرمل۔ خانخاناں: ارشاد

ابوالفضل: کل شہزادے کا جنم دن ہے۔ ہم ہر سال یہ مبارک دن بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ میرے خیال میں اس دفعہ یہ یوم سعید شاہی قلعہ لاہور میں منایا جائے۔

ٹوڈرمل: اس تجویز کا معاملہ زیر بحث سے کیا تعلق ہے۔

ابوالفضل: تعلق ابھی واضح ہو جائے گا۔ گورنر پنجاب اور اہل پنجاب کی مدت سے خواہش ہے کہ وہ اپنے محبوب شہزادے کا جنم دن لاہور میں منائیں۔ شہزادے کو بھی لاہور سے والہانہ محبت ہے۔

ٹوڈرمل: ابھی تک تو تعلق واضح نہیں ہوا۔

ابوالفضل: صبر کیجیے ابھی ہوا جاتا ہے۔ ہاں تو ہم سب کل بذریعہ سپیشل ڈونگا لاہور چلیں اور شہزادے سے کہیں کہ وہ اپنا بہترین دوست بھی ساتھ لے چلے۔ ظاہر ہے کہ اگر اسے انارکلی سے محبت ہے تو وہ اسے ضرور ہمراہ لے جائے گا۔

اکبر: ہاں پھر؟

ابوالفضل: شاہی قلعہ لاہور میں جنم دن کی تقریب پر انارکلی سے ناچ اور گانے کی فرمائش کی جائے اور جب وہ ناچ رہی ہو تو شہزادے کا ردِ عمل ملاحظہ کیا جائے۔ عشق اور مشک چھپے نہیں

رہتے۔ اگر ان دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہے تو ہمیں فوراً پتہ چل جائے گا۔

اکبر: آفریں سبحان اللہ۔ کتنی اچھی تجویز ہے۔ مرحبا۔

بیربل: واہ مولانا اب نکل فضل۔ بڑی دور کی کوڑی لائے ہیں آپ۔ واقعی بہت عجیب دماغ پایا ہے آپ نے۔ وزیراعظم جو ٹھہرے۔

اکبر: ہمیں یہ تجویز منظور ہے۔ ٹوڈرمل۔ ہم اس مہم کا انتظام آپ کے سپرد کرتے ہیں۔

ٹوڈرمل: بہتر یور میجسٹی۔

اکبر: (گھڑی دیکھتے ہوئے) چھ بجا چاہتے ہیں۔ آپ لوگ اب تشریف لے جاسکتے ہیں۔ ہم اب ریڈیو سیلون کا پروگرام سننا چاہتے ہیں۔

ابوالفضل: فیضی وغیرہ گڈ نائٹ یور میجسٹی۔

پانچواں منظر: شاہی قلعہ —— لاہور

(دیوانِ خاص میں ایک خاص جشن کا انتظام کیا گیا ہے۔ ہز میجسٹی اکبر تخت پر جلوہ افروز ہیں۔ ان کے دائیں طرف فیضی کی کرسی ہے۔ باقی وزراء کے علاوہ گورنر پنجاب، چیف منسٹر، وزرائے حکومتِ پنجاب اور لاہور کے رؤسا اور شرفا اس جشن میں شرکت کر رہے ہیں۔ شہزادہ سلیم ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے "فلم انڈیا" کا تازہ شمارہ دیکھنے میں مصروف ہیں۔ ان کے عین سامنے ایک دوسرے صوفے پر انارکلی اپنا میک اَپ درست کر رہی ہے۔ ہز میجسٹی کے سامنے مائک ہے اور وہ ایک آدھ بار کھانس چکنے کے بعد حاضرین سے خطاب فرمانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔)

خواتین و حضرات! آپ نے جس محبت اور خلوص سے ہمارا استقبال کیا۔ اس کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ ابھی ابھی گورنر پنجاب نے جو ایڈریس (Address) پڑھا اس سے ہم کافی مرعوب ہوئے۔ ہمارے خیال میں یہ پہلا ایڈریس ہے جس میں کسی دوسرے ایڈریس سے کوئی فقرہ اڑایا نہیں گیا۔ ورنہ عام طور پر ایڈریسوں میں کوئی چیز نئی نہیں ہوتی۔ گورنر پنجاب نے ایڈریس میں کئی بار اہلِ پنجاب کی زندہ دلی کا ذکر کیا ہے۔

ہم اہلِ پنجاب اور بالخصوص اہلِ لاہور کی زندہ دلی کے قائل اور قتیل ہیں۔ اہلِ لاہور نے اردو ادب کی جو خدمت کی ہے اس سے ہم بھی بے خبر نہیں لیکن خدا جانے خواتین و حضرات، یہ لاہور کی آب و ہوا کا اثر ہے یا لسی کے ان بڑے بڑے گلاسوں کا جو آپ حضرات دن رات نوش کیا کرتے ہیں کہ لاہور کا ہر آرٹسٹ اور ادیب پہلوان اور ہر پہلوان کنگ کانگ نظر آتا ہے۔ ہوائی اڈہ پر جب ہمارا تعارف مجید لاہوری سے کرایا گیا تو ہمیں شبہ ہوا کہ یہ صاحب کسی اکھاڑے سے سیدھے تشریف لا رہے ہیں۔ مصافحہ کرتے ہوئے ہمارے دستِ مبارک کو انھوں نے اس زور سے جھٹکا دیا کہ ہم بڑی مشکل سے اپنے کو سنبھال سکے۔ واللہ کیا جسم پایا ہے لاہور کے اس مزاح نگار نے۔

خواتین و حضرات! اہلِ لاہور کی مدت سے خواہش تھی کہ وہ شہزادہ سلیم کا جنم دن لاہور میں منائیں۔ ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس خاص جشن کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس موقع پر ہم چاہتے ہیں کہ آگرہ کی مشہور رقاصہ نادرہ عرف انارکلی اپنے رقص کا کمال دکھا کر آپ سب کو مسحور و محظوظ کرے۔ چنانچہ ہم حکم دیتے ہیں کہ انارکلی اپنا رقص شروع کرے۔ رقص کے بعد اگر وقت ملا تو لتا منگیشکر کے تازہ ترین ریکارڈ بھی سنوائے جائیں گے۔

انارکلی: (صوفے سے اٹھ کر آداب بجالاتی ہے) یور میجسٹی! کونسا رقص آپ پسند فرمائیں گے۔ کتھک، کتھاکلی، بھارت ناٹیم یا منی پوری؟

اکبر: ان چاروں میں سے کوئی بھی نہیں۔

انارکلی: گستاخی معاف یور میجسٹی لیکن وجہ؟

بیربل: وجہ ظاہر ہے۔ ہز میجسٹی مغل بچے ہیں۔ کوئی اُدے شنکر یا رام گوپال تھوڑے ہی ہیں کہ بھارت ناٹیم یا کتھاکلی کی باریکیوں کی داد دے سکیں۔

انارکلی: تو پھر کونسا رقص کیا جائے؟

بیربل: کوئی سیدھا سادھا پنجابی رقص ہو جائے۔

ملا دو پیازہ: حسنِ مذاق ملاحظہ ہو — پنجابی رقص!

بیربل: ملا صاحب آپ نے پنجابی رقص کبھی دیکھا ہی نہیں۔ دیکھیں گے تو دماغ چکرا جائے گا۔

ملا دوپیازہ: (حقارت سے) پنجابی رقص بھی کوئی رقص ہے بھلا!

بیربل: تم کیا جانو ملا۔ پنجابیوں کی ہر چیز میں بانکپن ہوتا ہے۔ واللہ کیا شعر فرمایا تھا ایک دفعہ ہزمیجسٹی نے پنجابیوں کے متعلق۔

سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

ملا دوپیازہ: ابے جاہل! یہ شعر ہزمیجسٹی کا نہیں۔

بیربل: تو اکبر الہ آبادی کا ہوگا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اکبر الہ آبادی ہوئے یا اکبر آبادی ہوئے۔

اکبر: خاموش حضرات! انارکلی انتظار کر رہی ہے۔

انارکلی: ہاں تو پھر پنجابی رقص ہی ٹھیک رہے گا۔

اکبر: ہاں رقص چاہے پنجابی ہو لیکن غزل جو گائی جائے اردو کی ہونی چاہیے۔

انارکلی: کس کی غزل سنیے گا آپ۔ جوش، جگر، فراق؟

اکبر: بتاؤ بھئی فیضی۔ کس کی غزل سنیں گے آپ؟

فیضی: میرے خیال میں فراق کی غزل کا زیادہ لطف رہے گا۔

بیربل: مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ جوش کا کلام تو اپنی سمجھ میں نہ آج تک آیا ہے نہ آئے گا۔

ملا دوپیازہ: یہ سب آپ کی سمجھ کا قصور ہے۔ جوش کا قصور نہیں۔

اکبر: آرڈر۔ آرڈر۔

انارکلی: اچھا تو پہلے حضرت داغ کا ایک شعر سنیے۔ اس کے بعد فراق کی غزل ملاحظہ فرمائیے گا۔

بیربل: ارشاد۔ ارشاد!

انارکلی: (ایک خوبصورت اور نفیس سا خنجر ہاتھ میں لیتے ہوئے۔ داغ کا شعر گا کر پڑھتی ہے کہ)

ہم نے ان کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا

(گانے کے دوران میں وہ ایک خاص ادا سے کنکھیوں سے سلیم کی طرف دیکھتی ہے۔ جواب میں سلیم مسکرا دیتا ہے۔)

بیربل: (داد دیتے ہوئے) خوب بہت خوب۔ اُستاد داغ نے قصاب کی دکان کا کتنا خوب صورت نقشہ پیش کیا ہے۔

سلیم: مکرر مکرر

(انارکلی شعر دہراتی ہے۔ آہستہ آہستہ ناچتی ہوئی وہ سلیم کے قریب پہنچ جاتی ہے اور خنجر اس کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ سلیم خنجر کو اٹھا کر سینے سے لگا لیتا ہے۔ ہز میجسٹی کے دائیں کان میں ابوالفضل اور بائیں کان میں فیضی کھسر پھسر کرتے ہیں۔ یک لخت انارکلی ایک چوکڑی بھر کر سلیم سے دور چلی جاتی ہے — سلیم خنجر انارکلی کی طرف پھینکتا ہے جسے وہ کمال صفائی سے دبوچ لیتی ہے حاضرین زور زور سے تالیاں پیٹتے ہیں)

انارکلی: اب فراق کی غزل ملاحظہ فرمائیے۔ مطلع ہے۔

بیربل: ارشاد۔

انارکلی: (گاتے ہوئے)۔

مطرب سے کہو آج اس انداز سے گائے
ہر دل کو لگے چوٹ سی، ہر آنکھ بھر آئے

بیربل: (رومال سے آنسو پونچھتا ہوا) "سبحان اللہ۔ یہ مطلع ہے یا ٹیر گیس (Tear Gas) سنتے ہی سب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

ملا دو پیازہ: اماں پہلے کسی محفل میں داد دینے کا انداز سیکھو۔ تمہاری جانے بلا کس پائے کا مطلع ہوا۔

انارکلی: وہ شوخی محافظ کے بپھرے ہوئے انداز!
دنیا بھی نہ رہنے دے، قیامت بھی نہ ڈھائے

سلیم: مرحبا! آفرین! جان من! شاعر نے تمھیں کو دھیان میں رکھتے ہوئے یہ شعر کہا تھا۔ واللہ کیا بات ہے فراق گورکھپوری کی۔ شعر کیا ہے تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔

انارکلی: آداب عرض۔

سلیم: پھر پڑھیے صاحب۔ پھر پڑھیے —— (انارکلی پھر وہی شعر دہراتی ہے)

انارکلی: شعر ملاحظہ فرمائیے۔

کچھ ایسی بھی گزری ہیں ترے ہجر میں راتیں
دل درد سے خالی ہو مگر نیند نہ آئے

سلیم: سبحان اللہ۔ غزل کی زبان اِسے کہتے ہیں۔ واقعی ہمارے ہجر کی راتیں تو ایسی ہی گزر رہی ہیں۔ (ابوالفضل ہز میجسٹی کے دائیں بائیں کان میں پھر کھسر پھسر کرتے ہیں۔)

انارکلی: (سلیم کی طرف کنکھیوں سے دیکھتی ہوئی)۔

برسات کی اس رات میں اے دوست تری یاد
اِک تیز چھری ہے کہ اترتی ہی چلی جائے

سلیم: مکرر۔ مکرر۔ یہ شعر نہیں بخدا نشتر ہے نشتر۔

(انارکلی دوبارہ شعر پڑھتی ہے۔ وہ خنجر کو اپنے سینے سے پیٹ کی طرف اس طرح آہستہ آہستہ سرکاتی ہے جیسے وہ واقعی اُترتا چلا جارہا ہے۔ سلیم کو شک گزرتا ہے کہ وہ خدانخواستہ خودکشی کرنے لگی ہے۔ فرطِ محبت سے بیتاب ہو کر وہ صوفے سے اٹھتا ہے اور انارکلی سے لپٹ جاتا ہے۔)

سلیم: خدارا ایسا نہ کرنا ڈارلنگ۔ ایسا نہ کرنا۔ نہیں تو سلیم کہیں کا نہ رہے گا۔

ٹوڈرمل: (خوشی سے چلا کر) مل گیا یور میجسٹی مل گیا۔

بیربل: کیا مل گیا ٹوڈرمل۔ دبا ہوا خزانہ یا ٹیلی فون کا نمبر؟

ٹوڈرمل: ثبوت! محبت کا ثبوت!

خانخاناں: اب شک کی گنجائش نہیں۔

فیضی: کنفرمڈ (Confirmed) یور میجسٹی کنفرمڈ۔

ابوالفضل: جشن فوراً برخاست ہونا چاہیے۔ یور میجسٹی۔

بیربل: مقطع تو پڑھ لینے دیجیے۔ اب بل بُل صاحب۔ مقطع۔ انارکلی کا مقطع

(اس اثنا میں سلیم اور انارکلی ایک دوسرے کے بازوؤں میں جکڑے ہوئے ایک عجیب وارفتگی کے عالم میں کھڑے رہتے ہیں جیسے وہ دیوانِ خاص میں نہ ہوں خلوت میں محبت کر رہے ہوں۔ ہز میجسٹی اکبر غصّے سے کانپنے لگتے ہیں حاضرین جو طرح طرح کی چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ڈر سے سہم جاتے ہیں۔)

اکبر: (تحکمانہ لہجے میں) انارکلی اپنی گرفت ڈھیلی کرو۔ شہزادے کو فوراً چھوڑ دو۔

انارکلی: (مسکرا کر) میں تو چھوڑ دوں یور میجسٹی لیکن وہ بھی مجھے چھوڑیں تو۔

اکبر: سلیم! فوراً اپنی نشست پر واپس جاؤ۔

(مولانا فیضی سے) مولانا فیضی! انارکلی کو اسی وقت حراست میں لے لیا جائے۔

فیضی: بہتر یور میجسٹی۔

سلیم: (جو اَب اپنی نشست پر جا چکا ہے۔ اٹھ کر) لیکن اس کا قصور ڈیڈی۔ اس نے تو بہت
اچھی غزل
سنائی ہے آپ کو۔

اکبر: خاموش۔ تم ابھی بچے ہو۔ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔

سلیم: بچہ کہاں ہوں ڈیڈی۔ آج تو میرا اکیسواں جنم دن منایا جا رہا ہے۔

اکبر: دوبارہ خاموش!

(حاضرین سے) جشن برخاست کیا جاتا ہے۔ آپ لوگ خاموشی سے تشریف لے
جاسکتے ہیں۔ ہاں۔ ہم اخبارات کے نمائندوں کو خاص تنبیہہ کرنا چاہتے ہیں کہ آج کے
واقعہ کی رپورٹ کسی اخبار میں نہ بھجوائی جائے نہیں تو سخت ترین سزا دی جائے گی۔

(حاضرین رخصت ہوتے ہیں)

سلیم: ڈیڈی میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔

اکبر: شیخو! تم ابھی امورِ سلطنت نہیں سمجھ سکتے۔

سلیم: امورِ سلطنت؟

اکبر: خاموش۔ تم ہمیں آج لنچ (Lunch) کے بعد ہمارے ڈرائنگ روم (Drawing room) میں
ملو۔ ہم تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت تم محل میں جا کر آرام کرو۔

(سلیم جاتا ہے)

اکبر: ہاں مولانا ابوالفضل۔ اب آپ کیا کہتے ہیں!

ابوالفضل: میری رائے میں کیبنٹ کا خاص اجلاس بلانا چاہیے۔

بیربل: آپ خواہ مخواہ اس معاملے کو طول دے رہے ہیں۔ اخبارات میں رپورٹ آ گئی تو بڑا سکینڈل (Scandal)....

اکبر: خاموش بیربل۔ معاملہ بہت سنگین ہے۔ مولانا ٹھیک کہتے ہیں۔ کیبنٹ کا اجلاس ہونا چاہیے۔

بیربل: یونہی سہی یور میجسٹی۔

اکبر: آج رات کے 9 بجے اسی جگہ خاص اجلاس ہوگا تب تک آپ اس معاملے پر سنجیدگی سے غور کریں۔ اب آپ گیسٹ ہاؤس (Guest House) میں تشریف لے جا سکتے ہیں۔ ابوالفضل، فیضی وغیرہ۔ خدا حافظ۔ یور میجسٹی۔

چھٹا منظر: شاہی خون

قلعہ لاہور میں ہز میجسٹی کا ڈرائنگ روم

(ہز میجسٹی کھانے کے بعد پاکستان ریڈیو کی دوسری مجلس کا پروگرام سن رہے ہیں۔ سلیم داخل ہوتا ہے۔)

سلیم: اجازت ہے ڈیڈی!

اکبر: (بے رخی سے) اجازت ہے۔

(سلیم کمرے کے اندر آتا ہے)

اکبر: (سلیم سے) ریڈیو بند کر دو اور بیٹھ جاؤ۔

(ایک آدھ منٹ دونوں خاموش رہتے ہیں)

اکبر: (کھانس کر) شیخو! ہمیں تم سے یہ امید نہ تھی۔

سلیم: (حیرانی سے) کیسی امید ڈیڈی! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

اکبر: کہ تم ایک معمولی لڑکی سے عشق کرو گے۔

سلیم: ڈیڈی! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ بخدا۔ وہ معمولی لڑکی نہیں ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ایف ایس سی کے امتحان میں وہ آگرہ یونیورسٹی میں اوّل آئی تھی۔ اس کے

علاوہ ٹینس کی چیمپئن ہے اور بریسٹ سٹروک تیرنے میں تو اس کا ریکارڈ ہے۔

اکبر: کچھ بھی ہو آخر کنیز ہے۔

سلیم: (حیرت سے) تو کیا کنیز عورت نہیں ہوتی ڈیڈی!

اکبر: ہوتی ہے لیکن ادنیٰ درجے کی۔

سلیم: تعجب ہے۔ ڈیڈی کہ آپ جمہوریت کے دور میں ادنیٰ اور اعلیٰ میں تمیز روا رکھتے ہیں۔
حالانکہ شاعرِ مشرق بہانگِ دہل اعلان فرما چکے ہیں ؎

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ

اگر آپ کو شاعرِ مشرق کے ارشاد میں شک ہے تو کم از کم آئین ہی کا خیال فرمائیے، جس کی دفعہ نمبر سات کے مطابق شاہ و سلطان و گدا اور غنی ایک ہو چکے ہیں۔

اکبر: تاہم ایک کنیز کی رگوں میں شاہی خون کی تلاش کرنا بے سود ہے۔

سلیم: شاہی خون! معاف کیجیے گا۔ شاہی خون کی تھیوری (Theory) مدت سے ایکسپلوڈ (Explode) ہو چکی ہے ڈیڈی۔ روسی ڈاکٹر کاف ڈاف گاڈاماڈاوسکی نے اپنی تازہ ترین ریسرچ سے ثابت کر دیا ہے کہ شاہی اور غیر شاہی خون میں بالکل کوئی فرق نہیں — جس کتاب میں اس نے اس دلچسپ نکتے کا انکشاف کیا ہے وہ ہمارے کالج کی لائبریری میں ہے۔ لطف یہ کہ بڑی سستی کتاب ہے۔ حجم پندرہ سو صفحے۔ قیمت صرف پندرہ آنے۔ اگر آپ چاہیں تو وہ کتاب میں آپ کے لیے لا سکتا ہوں۔ مگر افسوس آپ اِن....

اکبر: ہمیں کاف ڈاف گاڈاماڈاوسکی کا حوالہ دے کر مرعوب کرنے کی کوشش مت کرو سلیم! وہ چاہے کچھ کہے۔ ہم جانتے ہیں کہ شاہی خون آخر شاہی خون ہے اور پھر تمھیں بالآخر کسی مغل زادی یا کم از کم راجپوتنی سے شادی کرنا ہے۔ تم ایک کنیز سے محبت کر کے خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔

سلیم: معاف کیجیے ڈیڈی مجھے مغل زادیاں اور راجپوتنیاں بالکل پسند نہیں۔

اکبر: کیوں پسند نہیں؟

سلیم: گستاخی معاف۔ مغل زادیاں تو انگریزی کا ایک لفظ نہیں بول سکتیں، جب بھی ان سے بات کرو۔ یہ فرمائیے، یہ فرمائیے کی گردان دہرانے لگتی ہیں۔ اور راجپوتنیاں گز بھر لمبا گھونگھٹ نکالتی ہیں۔ پھر ہاتھوں اور پاؤں میں اتنے وزنی گہنے پہنتی ہیں کہ ان کے لیے بسا اوقات چلنا محال ہو جاتا ہے۔

اکبر: (غصے سے) تو آخر انارکلی میں کون سے لال جڑے ہیں کہ تم کسی اور کو خاطر میں نہیں لاتے۔

سلیم: کیا عرض کروں ڈیڈی کہ اُس میں مجھے کیا نظر آیا۔ بس ایک مصرع پر اکتفا کرتا ہوں۔

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک!

اکبر: شاعری مت کرو۔ انارکلی کی خوبیاں نثر میں بیان کرو۔

سلیم: تو سنیے ڈیڈی! اس میں شوخی ہے، چنچلتا ہے، بانکپن ہے۔ وہ مشرقی رقص کے علاوہ مغربی رقص بھی جانتی ہے۔ اس کا قد و قامت متناسب ہے۔ وافر چربی اس کے جسم کو چھو تک نہیں گئی اور سو خوبیوں کی ایک خوبی یہ کہ وہ مجھے پسند ہے۔

اکبر: ان سب میں سے کوئی بھی خوبی ایسی نہیں جو ہمیں ذاتی طور پر پسند ہو۔

سلیم: بجا ہے ڈیڈی لیکن جان کی امان پاؤں تو عرض کرنا چاہتا ہوں کہ شادی تو مجھے کرنا ہے نہ کہ.....

اکبر: خاموش۔ آدابِ گفتگو سے غافل ہونے کی کوشش مت کرو۔

سلیم: بیگ یور پارڈن (Beg your Pardon)

اکبر: اس انگریزی فقرے کا کیا مطلب ہے؟

سلیم: معذرت چاہتا ہوں۔

اکبر: ٹھیک ہے۔ اچھا اب ہم تمھیں اپنے آخری فیصلہ سے آگاہ فرمانا چاہتے ہیں۔ تمھیں انارکلی کو ترک کرنا ہوگا۔

سلیم: ناممکن۔

اکبر: ناممکن؟ شہزادے تم گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہو۔۔۔ عتابِ شاہی سے اگر ہمیں خدا نخواستہ غصہ آ گیا تو.....

سلیم: ڈیڈی! آپ بھول رہے ہیں کہ آپ شہنشاہ ہونے کے علاوہ ڈیڈی بھی ہیں۔

اکبر: اور تم بھول رہے ہو کہ تم شہزادے ہونے کے علاوہ شیخو بھی ہو۔

سلیم: (لاڈ سے) تو پھر اپنے پیارے شیخو کی بات مان لیجیے نا!

اکبر: ناممکن! ہم شہنشاہ پہلے ہیں، باپ بعد میں ہیں۔

سلیم: گستاخی معاف۔ ڈیڈی یہی تو آپ کی غلطی ہے۔

اکبر: غلطی؟ اب تمھیں یہ جرأت بھی ہوئی کہ تم ہماری غلطیاں نکالنے لگے۔ معلوم ہے کس سے گفتگو کر رہے ہو۔

سلیم: اپنے پیارے ڈیڈی سے۔

اکبر: بار بار ڈیڈی کہہ کر ہمیں بہکانے کی کوشش مت کرو سلیم! ہم اپنے فیصلہ میں کسی قسم کا ردّ و بدل کرنے کے لیے تیار نہیں۔

سلیم: ڈیڈی! مجھے آپ سے یہ امید نہ تھی۔

اکبر: امید! تو کیا تم ہم سے یہ توقع رکھتے ہو کہ ہم ایک معمولی کنیز کو اپنی بہو بنالیں گے۔ موری کی اینٹ کو چوبارے میں لگالیں گے اور لوگوں کو یہ کہنے کا موقع دیں گے کہ.....

غیرت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے

اونہہ ہمارا دماغ چل گیا ہے کیا۔

سلیم: دماغ تو میرا ہی چل گیا ہے ڈیڈی کہ میں شہنشاہِ ہند کو ڈیڈی سمجھ رہا ہوں۔

اکبر: خاموش! تم پہلے ہی کافی گستاخیاں کر چکے ہو۔ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ عتابِ شاہی سے ڈرو۔

بہت اچھا ڈیڈی۔ میں اب اور کچھ نہیں کہوں گا۔

ہاں۔ تم جاسکتے ہو۔ دیکھو فضول باتوں میں وقت ضائع مت کرو سنجیدگی سے اپنے یونیورسٹی کے امتحان کی تیاری کرو۔

(اٹھتے ہوئے) گڈ ڈے۔ ڈیڈی!

گڈ ڈے

(سلیم جاتا ہے۔ ہزمیجسٹی کمرے میں ایک آدھ منٹ ٹہلتے ہیں پھر صوفے پر دراز ہو جاتے ہیں اور چھت کی طرف دیکھ کر کہتے ہیں)

معمولی کنیز اور ملکۂ ہندوستان بننے کے خواب۔ ذرا منہ کیا لگایا، اپنی اوقات ہی بھول گئی۔ گستاخ لڑکی۔ اسے سخت سے سخت سزا دی جائے گی۔ سخت تر، سخت ترین، سخت سخت ترین۔

(ہزمیجسٹی اونگھنے لگتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد انھیں نیند آ جاتی ہے۔)

ساتواں منظر: چچا اور بھتیجا

(شاہی قلعہ لاہور میں بیربل کا محل)

(سلیم اور بیربل ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں)

سلیم: چچا۔ خدا کے لیے مدد کیجیے۔ عجب وقت آن پڑا ہے۔

بیربل: گھبراؤ نہیں بیٹے۔ حفیظ جالندھری کا مشہور مصرع تو تم نے سنا ہی ہوگا۔

اب عشق کیا ہے تو صبر بھی کر اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے

سلیم: عشق! چچا کاش تم نے کسی سے عشق کیا ہوتا۔

بیربل: بیٹے! میں تو عشق کرنے کو ہر وقت راضی ہوں مگر فریق ثانی نہیں مانتا۔ اصل میں فریق ثانی کا بھی قصور نہیں۔ بقول داغ ؎

ایسی صورت سے پیار کون کرے

سلیم: چچا۔ آپ کو شعر بازی سوجھ رہی ہے۔ یہاں جان پر بنی ہے۔ انارکلی تہ خانے میں نظر بند ہے اور ڈیڈی اسے سخت سے سخت سزا دینے پر تلے ہوئے ہیں اسے بچانے کی تدبیر....

بیربل: فکر نہ کرو بیٹے جب تک بیربل زندہ ہے انارکلی کا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔

سلیم: شکریہ چچا۔ لیکن اگر انارکلی کو پھانسی کی سزا دے دی گئی تو.....

بیربل: تو یقیناً سلیم خودکشی کرے گا۔

سلیم: تو چچا یہ کتنی زبردست ٹریجڈی (Tragedy) ہوگی۔

ہیرمل: اور یہ سب اس لیے کہ ہز میجسٹی نے بیٹی اور اب بل فجل کو بہت منہ لگا رکھا ہے جو اناپ شناپ مشورہ دیتے ہیں۔ ہز میجسٹی اس پر عمل....

سلیم: مجھے ان دونوں بھائیوں پر رہ رہ کر غصہ آتا ہے۔ جی چاہتا ہے دونوں کو پختونستان بھجوا دوں۔

ہیرمل: پختونستان! فرض کرو انارکلی کو پختونستان بھجوا دیا جائے۔

سلیم: خدا کے لیے ایسا مت کرنا چچا۔ پختونستان میں نہ کوئی ڈاک خانہ ہے نہ تار گھر۔ وہاں سے خط آسکتا ہے اور نہ تار اور نہ ٹیلیفون پر گفتگو ہو سکتی ہے۔

ہیرمل: کوئی بات نہیں۔ کبوتر پالے جاسکتے ہیں۔ انھیں بطور نامہ بر....

سلیم: یہاں ہاتھوں کے طوطے اڑے جا رہے ہیں۔ آپ کبوتروں کا ذکر لے بیٹھے۔ خدا کے لیے مذاق چھوڑیے اور سنجیدگی سے اس معاملہ پر غور کیجیے۔

ہیرمل: دیکھو آج شام کیبنٹ (Cabinet) کا خاص اجلاس ہو رہا ہے۔ میں ہز میجسٹی کو مشورہ دوں گا کہ انارکلی کو جلاوطن کر دیا جائے۔

سلیم: پھر؟

ہیرمل: انارکلی کی بجائے کسی اور لڑکی کو جلاوطن کر دیا جائے گا۔

سلیم: اور انارکلی!

ہیرمل: انارکلی تمھارے ساتھ آگرہ واپس جائے گی اور تم دونوں میرے گھر میں تب تک چوری چھپے رہو گے، جب تک ہز میجسٹی کا موڈ ٹھیک نہیں ہوتا۔

سلیم: اور اگر ڈیڈی کو پتہ چل گیا تو ہمارے ساتھ آپ کی بھی خیر نہیں۔

ہیرمل: ہز میجسٹی کو پتہ نہیں چلے گا۔

سلیم: لیکن انارکلی کی بجائے کوئی اور لڑکی جلاوطن ہونا کیوں پسند کرے گی۔

ہیرمل: اس کا انتظام کیا جا چکا ہے۔ دراصل وہ لڑکی جلاوطن نہیں ہو گی بلکہ ایک لمبی مدت کے بعد وطن مالوف کو لوٹے گی۔

سلیم: وہ لڑکی کون ہے؟

بیربل: وہ ایک پختون دوشیزہ ہے اور حسنِ اتفاق سے اس کا نام بھی انارکلی ہے۔ پختونستان سے وہ فلموں میں ہیروئن بننے کے لیے لاہور آئی تھی لیکن کوشش کے باوجود اسے سائیڈ ہیروئن کا رول بھی نہیں ملا۔ میں نے اسے ایک معقول رقم دے کر راضی کرلیا ہے کہ وہ اپنے گھر لوٹ جائے۔

سلیم: لیکن میری انارکلی میرے ساتھ آگرے کیسے جائے گی۔

بیربل: یہ تو بالکل معمولی سی بات ہے اور دراصل برقعے کی کرامات ہے۔

سلیم: برقعے کی کرامات۔

بیربل: نہیں سمجھے؟ میں انارکلی کو پختونستان پہنچانے کا ذمہ لوں گا۔ جب میں اس کی معیت میں لاہور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ۱ پر پہنچوں گا، وہاں تم ایک عربی شہزادے کے بھیس میں پختون انارکلی کے ساتھ میرا انتظار کر رہے ہوگے۔ دونوں انارکلیوں نے بالکل ایک ہی رنگ کے ریشمی برقعے پہن رکھے ہوں گے۔ چنانچہ تم اپنی چہیتی کو لے کر "آگرہ ایکسپریس" میں سوار ہو جاؤ گے۔ اور میں پختون انارکلی کو لے کر "پشاور میل" میں اللہ اللہ خیر سلا۔

سلیم: مرحبا۔ آفرین چچا۔ واقعی آپ کی ذہانت کا جواب نہیں۔

آٹھواں منظر: جُرم و سزا

دیوانِ خاص شاہی قلعہ لاہور میں کیبنٹ کا خاص اجلاس

اکبر: حضرات اس میں رتی بھر شک نہیں کہ انارکلی مجرم ہے کیونکہ اس نے شہزادے کو بہکانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے آپ کیا سزا تجویز کرنا چاہتے ہیں؟

ملا دو پیازہ: اسے زمین میں زندہ گاڑ دیا جائے۔

بیربل: واہ ملا صاحب واہ! چاندی لڑکی کو خاک میں ملانا چاہتے ہو تاکہ لوگ تم پر یہ پھبتی کس سکیں۔
چہ داند بوزنہ لذاتِ ادرک۔

ملا دو پیازہ: ابے چپ رہ۔ بڑا آیا حسن پرست۔ پتہ بھی ہے اس نے کتنے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

بیربل: اس کا جرم صرف اتنا ہے کہ وہ تمھارے بجائے شہزادہ سلیم سے کیوں محبت کرتی ہے۔

اکبر: خاموش بیربل۔ معاملہ بہت نازک ہے۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

خانخاناں: میرے خیال میں انارکلی کو پھانسی کی سزا ملنی چاہیے۔

بیربل: یک نہ شد دو شد۔ خانخاناں صاحب، آپ نے ملا دو پیازہ کو بھی مات کر دیا۔

(اکبر سے) یور میجسٹی میری مانیے تو جس طرح بھی ہو سکے اس معاملہ کو رفع دفع کر دیجیے۔

اکبر: وہ کیوں؟

بیربل: اگر بلٹز (Blitz) نے اس معاشقے کی تفاصیل چھاپ دیں تو خیر و عافیت معلوم ہو جائے گی اور خدانخواستہ امریکن اخبار "ڈیلی سکینڈل" (Daily Scandal) کو پتہ چل گیا تو مہینوں شہزادے کے عشق کے چرچے چار ہیں گے۔

اکبر: یہ تو ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انارکلی کو کوئی معمولی سزا دینا چاہیے۔

بیربل: بجا فرمایا آپ نے۔ مثلاً اسے آگرہ یونی ورسٹی سے لکھنؤ یونی ورسٹی میں مائی گریٹ (Migrate) کرنے کے لیے کہا جا سکتا ہے۔

فیضی: یہ تو کوئی سزا نہیں۔ شہزادہ اور انارکلی ویک اینڈ (Week-end) آگرہ یا لکھنؤ میں منا سکتے ہیں۔

ملا دو پیازہ: میرے خیال میں انارکلی کو سزا کے طور پر آل انڈیا ریڈیو کی تمام تقاریر سننے پر مجبور کیا جائے۔

اکبر: یہ بہت سنگین سزا ہو گی۔ ہمارا ذاتی تجربہ ہے کہ صابر سے صابر سامع بھی آل انڈیا ریڈیو کی تقاریر کی دوا ایک منٹ سے زیادہ تاب نہیں لا سکتا۔

بیربل: اس سزا کے متعلق کیا خیال ہے۔

اکبر: کہیے۔

بیربل: انارکلی کو وہ تمام روسی ناول پڑھنے کے لیے کہا جائے جن پر اسٹالن پرائز (Stalin Prize) مل چکا ہے۔

اکبر: یہ سزا حد سے زیادہ ظالمانہ ہو گی۔

بیربل: تو پھر صرف ایک سزا باقی رہ گئی ہے۔ یعنی انارکلی کو پختونستان بھجوا دیا جائے کیونکہ اس کے والدین وہاں سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔

اکبر: ابوالفضل! آپ کی اس تجویز کے بارے میں کیا رائے ہے۔

ابوالفضل: تجویز تو کافی معقول ہے لیکن سوال یہ ہے کہ انارکلی کے ہمراہ پختونستان کون جائے گا۔

ملا دو پیازہ: میری دانست میں بیربل اس کام کے لیے موزوں ترین شخص ہے۔

بیربل: ٹھیک ہے۔ ہر مشکل مہم کے لیے بیربل موزوں ترین شخص ہے اور تمھارا کام صرف حلوہ مانڈا اڑانا ہے۔

ملا دو پیازہ: ابے بُزدل ڈرتا کیوں ہے۔ آخر پختون تجھے کھا تو نہیں جائیں گے۔

خانخاناں: بیربل نے خود ہی پختونستان کی تجویز پیش کی اور اب وہاں جانے سے ڈر رہا ہے۔ مجھے ایک شعر یاد آ گیا۔

اکبر: ارشاد۔

خانخاناں:

کہا کابل چلے جائیں، کہا کابل چلے جاؤ
کہا افغاں کا ڈر ہے، کہا افغان تو ہوگا

اکبر: (قہقہہ لگا کر) بہت خوب! کہیے بیربل صاحب آج بُرے پھنسے۔ اب تو پختونستان جانا ہی پڑے گا۔

بیربل: حکم حاکم مرگِ مفاجات۔ اگر آپ مُصر ہیں تو میں چلا جاؤں گا۔

اکبر: چلے جاؤ گے لیکن وہاں سے واپس کیسے آؤ گے۔ اس کے متعلق بھی سوچ لو۔

ملا دو پیازہ: یور میجسٹی! اگر یہ گھامڑ واپس نہ آسکا تو کون سا غضب ہو جائے گا ہم سمجھ لیں گے کہ انارکلی کے علاوہ اس مصیبت سے بھی نجات ملی۔

بیربل: ٹھیک ہے اور ہز میجسٹی کا دل بہلانے کے لیے تیرے ایسے نظر بٹو آگرہ میں رہ جائیں گے۔

اکبر: آرڈر پلیز (Order Please) اچھا تو یہ طے ہے کہ بیربل انارکلی کو پختونستان پہنچانے کا ذمہ لیتا ہے۔ ہم بیربل سے یہ جاننا چاہیں گے کہ وہ کون سے راستے سے پختونستان جائے گا۔

بیربل: یور میجسٹی۔ یہ سب مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ راستے کی تفاصیل سن کر آپ خواہ مخواہ بور (Bore) ہوں گے۔ میرے خیال میں ریڈیو پاکستان لاہور پر "آپ کی فرمائش" پروگرام کا وقت

ہوگیا ہے آپ تخلیہ میں تازہ ترین پاکستانی نغمے سماعت فرمائیں۔

اکبر: ہمیں اس تجویز سے سو فیصد اتفاق ہے۔ اجلاس برخاست کیا جاتا ہے۔

نواں منظر: چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز

(آگرہ میں بیربل کا محل)

(سلیم اور انارکلی چائے پی رہے ہیں۔ بیربل کمرے میں داخل ہوتا ہے)

بیربل: ہیلو عربی شہزادے! کہو کیا حال ہے۔

سلیم: ہیلو انکل آپ کی دعا ہے۔

بیربل: اور ہماری مختون شہزادی تو خوش ہے نا؟

انارکلی: بہت خوش۔ اتنی خوش کہ اس کا ناچنے کو جی چاہتا ہے۔

سلیم: چچا یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ اب تو دو ہفتے ہونے کو آئے۔

بیربل: کیوں بچے تمھیں یہاں کیا تکلیف ہے۔ فلم فیر (Film fair) اور سکرین (Screen) پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ سیکنڈ شو میں فلم بھی دیکھ آتے ہو۔ اتوار کو بوٹنگ کا پروگرام رہتا ہے اور پھر شادی سے پہلے ہنی مون (Honeymoon) منانے کے کافی امکانات ہیں۔

سلیم: یہ تو آپ بجا فرماتے ہیں۔ مگر ڈیڈی۔

بیربل: ان کی کچھ نہ پوچھیے بہت پریشان ہیں۔ ہر وقت گم صم رہتے ہیں۔ ریڈیو اور دوردھ بھارتی تک کے پروگرام سننا ترک کر رکھا ہے۔ خواب میں اکثر چلاتے ہیں شیخو واپس آجاؤ۔ میں بہت اداس ہوں۔ شیخو خدا کے لیے مجھے معاف کردو۔

سلیم: ڈیڈی ایک دم سلی (Silly) ہیں۔ ممی کا کیا حال ہے؟

بیربل: شروع میں تو بیچاری کو بہت صدمہ پہنچا۔ دو ایک دن کھانا نہیں کھایا۔ ہز میجسٹی کو کھری کھری سنائیں۔ یہاں تک کہہ دیا کہ خود تو پانچ ہزار حرم میں رکھے بیٹھے ہو۔ میرے بیٹے نے ایک سے عشق کیا تو سینے پر سانپ کیوں لوٹنے لگے۔

سلیم اور انارکلی: (تالیاں بجا کر) ویل ڈن ممی ویل ڈن (Well done Mummy)۔

بیربل: مگر چوتھے دن میں نے تمھارے فرضی خود کشی کا راز انھیں بتا دیا۔ سُن کر بہت خوش ہوئیں۔ موتیوں کی مالا انعام میں دی اور کہا۔ بیربل اگر تم نہ ہوتے تو مغلیہ سلطنت کا خدا ہی حافظ تھا۔

سلیم: لیکن کیا ڈیڈی کو سچ مچ یقین ہے کہ میں نے خودکشی کر لی ہے۔

بیربل: سو فیصدی یقین۔ دراصل انھیں یقین دلایا گیا ہے اور ایسا کرنے کے لیے ایک اخبار کی خدمات حاصل کی گئیں۔

سلیم: وہ کیسے؟

بیربل: ایک دن اخبار ''ٹائمز آف دہلی'' میں یہ خبر چھپوائی گئی کہ شہزادہ سلیم نے قطب مینار سے چھلانگ لگا کر خود کشی کر لی ہے۔ نامہ نگار نے خبر دیتے ہوئے لکھا۔ خودکشی کرنے سے پندرہ منٹ پہلے شہزادے نے ایک بیان دیا۔ جس میں اس نے ہز میجسٹی کے آمرانہ رویے کی سخت مذمت کی اور کہا میں پروٹسٹ (Protest) کے طور پر خودکشی کر رہا ہوں تاکہ زمانہ مستقبل کے مغل شہزادے خوبصورت لونڈیوں سے محبت کر سکیں۔

انارکلی: لیکن اس جھوٹ کو نبھایا کس طرح گیا۔ خودکشی کے بعد شہزادے کی نعش کا کیا بنا؟

بیربل: اس معاملے میں بھی نامہ نگار آڑے آیا۔ اس نے ایک خبر دیتے ہوئے لکھا کہ جس وقت شہزادہ سلیم کی نعش کو پوسٹ مارٹم کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔ یک لخت وہ ایمبولینس کار سے اُچھل کر عرش بریں کی طرف پرواز کرنے لگی اور ساتھ ہی فضا میں یہ الفاظ سنے گئے۔ میں عاشق صادق ہوں۔ میں پوسٹ مارٹم کے لیے نہیں رک سکتا کیونکہ میں اپنی انارکلی سے جس نے پختونستان میں خودکشی کر لی تھی، جنت میں جلد سے جلد ملنا چاہتا ہوں۔

سلیم: تو کیا ڈیڈی اس بے ہودہ خبر پر ایمان لے آئے۔

بیربل: اور کرتے بھی کیا۔ ''اخبار ٹائمز آف دہلی'' میں اگر جھوٹ بھی چھپے تو اُسے سچ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس ظالم کی ساکھ ایسی ہے۔

انارکلی: یہ بات تو صحیح ہے۔ اگر وہ آپ کی وفات کی خبر چھاپ دے اور آپ زندہ ہوں پھر بھی اس خبر کو پڑھتے وقت ایک بار تو آپ کو یقین آ جائے گا۔ کہ آپ واقعی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔

سلیم: چچا۔ڈیڈی کا تازہ ترین ردعمل کیا ہے۔کیا وہ محسوس کرتے ہیں کہ انھوں نے انارکلی کے ساتھ ناانصافی کی۔

ہرمل: ناانصافی تو بہت ہلکا سا لفظ ہے۔اب تو وہ چھاتی پر دوہتڑ مار کر کہتے ہیں میں گناہ گار ہوں۔میں نے اپنے شیخو کی جان لی۔انارکلی کی جان لی۔میں قاتل ہوں۔میں پوٹاشیم سائی نائیڈ پھانک کر خودکشی کرلوں گا۔

سلیم: خدانخواستہ اگر انھوں نے سچ مچ خودکشی....

ہرمل: ایسا کوئی خطرہ نہیں۔خودکشی کرنے کے لیے چیتے کا جگر چاہیے جو ہز میجسٹی کے پاس نہیں۔

سلیم: اگر ڈیڈی واقعی اتنے پشیمان ہیں تو آپ ہمارا ان سے سمجھوتہ کیوں نہیں کرا دیتے۔

ہرمل: وقت آنے پر سب کچھ ہو جائے گا۔

سلیم: لیکن وقت کب آئے گا۔

ہرمل: آج مارچ کی کونسی تاریخ ہے۔

سلیم: پچیس۔

ہرمل: تو صرف چھ دن اور آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔

سلیم: آپ کو پورا یقین ہے کہ ڈیڈی مجھے معاف کر دیں گے اور انارکلی سے میرے شادی....

ہرمل: ہاں ہاں سو فیصدی یقین۔اب تو ہز میجسٹی قاضی کی بجائے خود نکاح خوانی کرنے کو تیار ہیں۔

انارکلی: نہ بابا۔نکاح تو قاضی ہی پڑھے گا۔ہز میجسٹی کی عربی لیاقت تو واجبی سی ہے۔

ہرمل: اچھا بھئی۔عرب کے قاضی منگوا دیں گے۔اب تو ہمارے شاہ ابن سعود سے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔

آخری منظر: اعترافِ گناہ

(ہز میجسٹی اکبر دیوانِ خاص میں محوِ خواب ہیں۔اکتیس مارچ اور یکم اپریل کی درمیانی رات کے دو بجے کا عمل ہے یک لخت ان کے پلنگ کے نزدیک زور کا دھماکا ہوتا ہے۔جیسے بم پھٹا ہو۔دراصل یہ ایک بڑا پٹاخہ ہے جسے ہرمل چلاتا ہے۔ہز میجسٹی کی آنکھ کھل جاتی ہے۔وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے سامنے ملک الموت کو

کھڑا دیکھ کر خوف سے کانپنے لگتے ہیں کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ ملک الموت کے بھیس میں یہ بیربل ہے)

اکبر: (خوف سے ہکلاتے ہوئے) ت۔ت۔تم کون ہو؟

بیربل: (بلند آواز میں) ملک الموت! عزرائیل! میں تمھاری روح قبض کرنے کے لیے آیا ہوں۔

اکبر: نہیں نہیں۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ ابھی تو مجھے جنوبی ہندوستان فتح کرنا ہے اور پھر راجستھان کا کافی حصہ ابھی تک غیور راجپوتوں کے قبضے میں ہے۔ مہارانا پرتاپ کا نام تم نے سنا ہوگا۔

بیربل: مجھے تمھاری فتوحات میں کچھ دلچسپی نہیں۔ تم سے کہیں بڑے فاتح میرا لوہا مان چکے ہیں۔ میں تمھیں تیاری کے لیے صرف پانچ منٹ دیتا ہوں۔ اس کے بعد تمھیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ اور ہاں۔ خطرے کا گھڑیال بجانے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ ملک الموت کے ہوتے ہوئے کوئی پہرے دار محل میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کرے گا۔

اکبر: رحم! ملک الموت رحم۔ ابھی میرے مرنے کے کون سے دن ہیں۔ خدا کے لیے رحم!

بیربل: (قہقہہ لگا کر) ہاہاہا۔ بے رحم اور سنگ دل ہو کر رحم کی درخواست کرتے ہو۔ تم نے خود کسی پر رحم کیا جو کوئی تم پر رحم کرے گا۔

اکبر: خدا گواہ ہے۔ میں ضرورت سے زیادہ رحم دل اور رقیق القلب ہوں۔

بیربل: رقیق القلب! کیا تم نے انارکلی پر رحم کیا؟ کیا تم نے اکلوتے بیٹے سلیم عرف شیخو پر رحم کیا؟ جب تمھیں اپنے لختِ جگر پر ترس نہیں آیا تو کس منہ سے.....

اکبر: خدا شاہد ہے میں نے سلیم کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ جو کچھ کیا اس کی بہتری کے لیے کیا۔ (ایک آواز) جھوٹ، بالکل جھوٹ ......(دوسری آواز) فریب، دھوکا، خود فریبی۔

بیربل: سنا تم نے؟ ان آوازوں کو پہچانتے ہو؟

اکبر: ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سلیم اور انارکلی کی آوازیں ہیں۔

بیربل: تم ٹھیک سمجھے۔ (بلند آواز میں) انارکلی اور سلیم کی مقدس روحو۔ چند لمحوں کے لیے دنیائے فانی میں آؤ۔

(دو ایک منٹ کے بعد دائیں طرف سے سلیم اور بائیں طرف سے انارکلی محل میں داخل ہوتی ہے۔)

بیربل: (انارکلی سے) انارکلی تم اب وہاں پہنچ چکی ہو جہاں شہنشاہ تمھیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ بلا تامل کہو تمھاری شہنشاہ کے متعلق کیا رائے ہے۔

انارکلی: میں شہنشاہ کو فرسٹ کلاس سناب (Snob) سمجھتی ہوں۔ انھوں نے مجھے بہو بنانے سے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ میں مغل زادی یا راجپوتنی نہیں تھی۔

بیربل: جو سلوک شہنشاہ نے تمھارے ساتھ کیا اس کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہو۔

انارکلی: صرف اتنا کہ اس انسانیت سوز سلوک کی اجازت نہ اسلام دیتا ہے اور نہ ''دینِ الٰہی''۔

بیربل: (سلیم سے) سلیم تمھارا اپنے ڈیڈی کے متعلق کیا خیال ہے۔

سلیم: خدا کے لیے ایسے شخص کو میرا ڈیڈی مت کہیے جس کے سینے میں دل کی بجائے پتھر کی سل ہے۔

بیربل: تو تم بھی شہنشاہ کو مجرم گردانتے ہو۔

سلیم: ہاں شہنشاہ مجرم ہے۔ کیونکہ اس نے ہم دونوں کی جان لی ہے۔ اس نے نہ صرف حسن بلکہ عشق کے مقدس جذبہ کی توہین کی ہے۔

بیربل: (اکبر سے) اب کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔

اکبر: میں اپنے گناہوں پر نادم ہوں اور تہ دل سے اپنے پیارے بیٹے شیخو اور اپنی بیٹی انارکلی سے معذرت چاہتا ہوں۔

بیربل: اگر تم واقعی پشیمان ہو تو اپنے خلوص کا عملی ثبوت دو۔ خود اپنے ہاتھ سے انارکلی کو سلیم کے سپرد کرو۔

اکبر: (انارکلی کا ہاتھ سلیم کے ہاتھ میں دیتے ہوئے) خدا کرے تمھاری محبت پھولے پھلے اور تم دونوں حشر تک خوش و خرم رہو۔

بیربل: (ملک الموت کا بھیس اتارتے ہوئے) مبارک ہو مہابلی۔ شہزادہ سلیم کی شادی خانہ آبادی۔

اکبر: (چونک کر) ارے تم ہو بیربل۔ (غصہ سے) یہ کیا حرکت ہے۔ تمھاری یہ جرأت۔

بیربل: مہابلی۔ ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ ذرا کلنڈر کی طرف دیکھیے۔ آج فرسٹ اپریل ہے۔
اکبر: تو گویا تم نے ہمیں اپریل فول بنایا۔ (قہقہہ لگا کر) بڑے ظالم ہو۔
(مریم زمانی داخل ہوتی ہے)
اکبر: آؤ آؤ بیگم بڑے اچھے وقت آئی ہو۔ آج تو اس مسخرے نے وہ اپریل فول بنایا، کہ لطف آ گیا۔
بیربل: (مریم زمانی سے) بیگم صاحبہ۔ اپنی بہو اور بیٹے سے ملیے۔ میرا مطلب ہے ہز رائل ہائی نس پرنس سلیم اور بیگم انارکلی سلیم سے۔
مریم زمانی: (سلیم کو گلے سے لگاتے ہوئے) سلیم میرے بیٹے۔ میرے شیخو۔ (انارکلی کے سر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے) جیتی رہو بیٹی۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔
اکبر: ہُم! اب ہم سمجھے کہ سلیم اور انارکلی کی خودکشی کی خبریں جھوٹی تھیں اور محض ہمیں بہکانے کے لیے تراشی گئی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ سب شرارت اس مسخرے بیربل کی ہے۔
بیربل: بجا فرمایا آپ نے مہابلی۔
اکبر: بیربل، کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ ہمیں اتنا عرصہ دھوکے میں کیوں رکھا گیا اور اس سازش کی وجہ جواز کیا ہے؟
بیربل: جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔
اکبر: بلا تامل کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔
بیربل: یور میجسٹی۔ یہ سب کچھ میں نے اس لیے کیا کہ وہ جو بدنما دھبہ آپ کے دامن پر قریب قریب چار صدیوں سے لگا آ رہا تھا اسے یکسر دھو دیا جائے تاکہ بیسویں صدی کے لوگ انصاف پرور اور عدل گستر اکبر کو روایت کی بجائے حقیقت کے آئینہ میں دیکھیں اور خود فیصلہ کریں کہ آیا اکبر جیسا عالی نسب اور عالی دماغ شہنشاہ انارکلی کو زمین میں زندہ دفنانے کا حکم صادر کر سکتا تھا۔
اکبر: مابدولت تمھارے جواب سے بہت خوش ہوئے۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ تمھارا منہ موتیوں سے بھر دیا جائے۔
بیربل: مہابلی کا بہت بہت شکریہ۔ لیکن یور میجسٹی موتی سچے ہونے چاہئیں۔

گبار کھاتر

(پنڈت اب ُل کلام آجاد سے ماجرت (معذرت) کے ساتھ) ۰

شبھیکے موہ ترم (شفیق محترم)!

انقلابات ہیں جمانے کے۔ کہاں کلا (قلعہ) احمد نگر کہاں دتّی بالکل اسیرے دامے فرنگ تھا۔ آج اسیرے کھمے (خم) چلفے (زلف) ہندی ہوں۔ ارتھات یعنی 'یعنی' بھارت ورش کے شکھشا منتری کی حیثیت سے ہندی جبان کا پرچار کر رہا ہوں۔ شکھشا منتری؟ جانے تمھاری بلا۔ بھئی وجیرے تالیم۔ ماف کیجیے گا شبھیک کہ اردو میں کھت لکھنے کے بجائے ہندی بھاشا میں پتر لکھ رہا ہوں۔ یہ تو تم نے سن ہی لیا ہوگا کہ 26 رنومبر کو دلی میں اردو کی فاتحہ پڑھی گئی اور اردو کا جنا جا اسی ویرانے میں ٹھکانے لگا دیا گیا۔ جہاں گالب مرحوم کی کبر ہے۔ بات تو کچھ عجیب سی تھی لیکن جن مجرات نے اس جناجے کو کندھا دیا، ان سب میں یہ فکیر (فقیر) پیش پیش تھا کہ اس فکیر کو اردو مرحوم سے ہمیشہ اکیدت (عقیدت) رہی۔ ہائے اردو وائے اردو! جی چاہتا ہے۔ آدت سے مجبور ہوں کہ کوئی پھڑکتا ہوا شیر (شعر) لکھوں کہ جسے پڑھ کر تمھاری روح لرج اٹھے۔ لیکن افسوس شبھیک! ہندی جبان میں کوئی وجندار شیر نہیں ملتا۔ کبیر بھگت کا ایک دوہا ہے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

ہاڑ جلے جوں لکڑی، کیس جلے جوں گھاس
جلتی چتا دیکھ کے بھئے کبیر اداس

کہو گے تو سہی کہ سادی (سعدی) حاپھ (حافظ) اور گالب (غالب) جن کے مجھے لاکھوں اش آر یاد ہیں کیا ہوئے لے دے کے کبیر بھگت کیوں؟ جانے من (جان من) ہندی جبان میں ع، غ، ظ سرے سے ہی مفکود ہیں۔ اگر ان شورا (شعرا) کے اش آر ہندی میں لکھے جائیں تو الفاج (الفاظ) اجیبو گریب شکلیں اکھتیار کر لیتے ہیں۔ مسال کے طور پر "گالب کے اڑیں گے پرجے"، "کابا کس منہ سے جاؤ گے گالب"، مئے سے گرج نشات ہے کس روسیاہ کو" صاف جاہر ہے کہ یہ اش آر ہندی میں نہیں لکھے جا سکتے۔ ہاں یاد آیا۔ ان دنوں دیوانے گالب (دیوان غالب) کا ہندی ایڈیشن تیار کر رہا ہوں۔ پڑھو گے تو دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ جاؤ گے!

بہت دنوں کے بعد کھت لکھنے کی توفیک ہوئی ہے، وجہ یہ ہے کہ بہت مسروف رہا ہوں، ہارے آج کچھ فرصت ملی، متالہ (مطالعہ) کا یہ حال ہے کہ اس کے بعد بھی جب تمھیں کھت لکھ رہا ہوں تلسی رامائن نجر کے سامنے ہے۔ سامنے کی الماری میں رکھا ہوا 'دیوانے حاپھ' میری طرف اشکبار آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، لیکن کیا کروں بھارت شکھشا منتری ہونے کی حیسیت سے مجھے یہ جیب (زیب) نہیں دیتا کہ حاپھ کا شیدائی ہوتے ہوئے بھی دیوانے حاپھ پڑھ سکوں۔ کسی ملاقاتی نے دیکھ لیا تو گجب ہو جائے گا۔ بھارت ورش کے اکھباری ہلکوں میں ہلچل مچ جائے گی۔ کہ آجاد بھارت ورش کا شکھشا منتری آجاد جو جلسوں اور اسمبلیوں میں لوگوں کو ہندی سیکھنے کی ترکیب دیتا ہے، کھد چھپ چھپ کر دیوانے حاپھ پڑھتا ہے۔

ٹھیک! سب سے کی بات ہے کل گالب کا دور تھا۔ آج تلسی داس کا ہے۔ دل پر جو گجرتی ہے سو گجرتی ہے۔ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ لیکن حالات کا تکاجا یہی ہے کہ دن رات ہندی پڑھے جاؤں اور اپنی اردو کھر اب کیے جاؤں۔ سچ کہا ہے تلسی داس نے

جرد مرال مانس تجے چندر شیت روی گھام سوہ مداد ک جو تجے، تلسی تجے نہ رام

اس شیر کے کیا مانے (معنی) ہیں یہ تو میں کھد نہیں جانتا لیکن اے ٹھیک الی گڑھ میں کوئی پنڈت تو جرور ہو گا۔ اس سے پوچھ لیجیے گا اور اگر ہو سکے تو مولانا ابل کلام کی یاد میں دو آنسو بہا دیجیے گا کہ کبھی اس کی اردو کی سارے ہندستان میں دھوم تھی۔

آپ کا:۔

پنڈت ابل کلام آجاد

(فرقت کاکوروی)

غالب کا خط

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نام

صاحب تم نے شادی کیا کی ساری دنیا کو بھلا دیا۔ اپنے جملہ حقوق اس طرح رفیقۂ حیات کے نام محفوظ کر لیے کہ دوست احباب تمھاری صورت کو ترس گئے۔ شادی سب کرتے ہیں مگر اس طرح آپے سے نہیں گزر جاتے...... اب نہ آتے ہو نہ جاتے ہو ضخیم ضخیم کتابیں لکھ کر ادیبوں کو شرماتے ہو۔ ڈبلوں کو رُلاتے ہو، موٹوں کو ہنساتے ہو، پڑھنے لکھنے میں بھی وہ آن ہے کہ پٹھانوں جیسی شان ہے۔ کیا فصاحت ہے اور کیا بلاغت۔ سچ پوچھو تو ریاضت میں عبادت اور عبادت میں ریاضت ہو۔ پچھلے ہفتے ہوش بلگرامی آئے تھے تمھاری لکھی ہوئی دو کتابیں مزدوروں پر لدوا کر لائے تھے۔ ایک میاں حکیم مومن خاں مومن کی کلیات تھی جس پر تمھارے مقدمے کی بہتات تھی، دوسری کلیات میر تقی میر کی تھی جس میں متعدد کاتبوں کی تحریر تھی۔ تم نے کلیات میر کو دباغت بخشی گویا میر کی روح کو راحت بخشی۔ لکھنے میں اتنی ریاضت کرتے ہو کہ کاتب کو تصحیح کرنے کی بھی مہلت نہیں دیتے۔ کلیات میں غلطیوں کے انبار ہیں جو پڑھنے والوں کی طبیعت پر بار ہیں۔ اب میں کاتبوں کی تعریف کروں یا تمھاری کوتاہیوں پر حرف دھروں، تم نے ایک کتاب لکھی اور دودو

کے مؤلف اور مُصنف بن بیٹھے۔ ایک تمھارا کارنامہ دوسرا اس کا غلط نامہ۔ تم نے غزل پر کتاب لکھ کر غزل کو شعرا کو عرش پر پہنچایا اور نظم نگاروں کو نیچا دکھایا۔ اور پھر غزل پر وہ طبع آزمائی کی کہ اگر غزل سُن پائے تو اپنا گریبان پھاڑ کر کسی طرف نکل جائے۔ کہو جوش ملیح آبادی کی نظر سے تمھاری کتاب گذری؟ اُن کے دل و دماغ پر اسے پڑھ کر کیا گذری؟ کلیات میر کے مقدمے میں تو وہ زور ہے کہ پاکستان سے ہندستان تک شور ہی شور ہے۔ بابائے اُردو تو مقدمہ باز تھے تم سپریم کورٹ کے جج نکلے۔ اُستاد گُور، ہے چیلے شکر ہو گئے۔ وہ جو شاعر نے کہا تھا۔ ٹھیک ہی کہا تھا:

اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند

تم نے طلسم ہوش ربا میں تنقید اور تنقید میں طلسم ہوش ربا لکھ کر تنقید نگاروں کو بجر بکر اں بنادیا اور تنقید کو ایسی رمضان شریف کی تراویح بنادیا کہ پڑھنے اور سننے والا نہ منہ سے بولے اور نہ سر سے کھیلے صرف ہاتھ باندھے تمھاری سُنتا رہے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تنقید کو چوڑا چکلا کس نے کیا تو میں کہوں گا عبادت بریلوی نے۔ عنوانات کی وحدت کو کثرت الفاظ کے جلوے دکھانا کوئی تم سے سیکھے۔

ہندستان کی تقسیم نے کیسے کیسے برگزیدہ ادیبوں کو اُکھاڑ پھینکا اور وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا بسے۔ انور حسین، آرزو، سیماب، نیاز، ارم اور میاں شاہد احمد...... پاکستان کی راہ یہاں پہنچتے ہیں۔ ظفر علی خاں یعنی صحافیوں کے علی قلی خاں پرسوں پطرس بخاری عبدالمجید سالک کے ہمراہ آئے تھے۔ جعفر علی خاں اثر اب آئے ہیں۔ ہائے کیسا کیسا جوان زندہ در گور ہوا ہے۔ وطن کی تبدیلی ولدیت کی تبدیلی سے کم نہیں ہوتی۔ میں نے مرتے مرتے نظام الدین نہیں چھوڑا دہیں اب تک ایک زمین دوز مکان میں مقیم ہوں۔ سنگ مرمر کا مقبرہ تعمیر ہونے کی خبر ہے۔ ابھی معاملہ کھٹائی میں پڑا ہے۔ قبر پختہ ہو چکی ہے۔ جگہ کا احاطہ کر دیا گیا ہے۔ مشاعرے ہوتے ہیں شعرا اپنے اپنے شعروں سے نشتر چبھوتے ہیں۔ ایک بار تبسم اور عبدالمجید سالک لاہور سے ہندستان آئے تھے اور میرے مزار پر بھی تشریف لائے تھے۔ دل چاہا کہ اُٹھ کر لپٹالوں اور حیاتِ رفتہ کو واپس بُلا لوں۔ پر اتنی توانائی کہاں سے لاؤں۔ پروفیسر احتشام حسین دلی آتے ہیں میرے مزار پر نہیں آتے۔ وہ ترقی پسند ہیں تنزل پسند کے مزار پر کیوں آنے لگے؟ وہ سیّد میں مغل، وہ نقاد میں رند شاہد باز مجھ سے اُن کو کیا دلچسپی؟ تضاد اور پھر تضاد مُتبّن۔

وقار عظیم کو ایک خط علاحدہ سپرد ڈاک کیا ہے۔ اُن کو دعا کہو۔ حکیم مومن خاں مومن پر تمھارا کئی میل لمبا مقدمہ پڑھ کر دو ایک ہفتے تکان دور کروں گا۔ پھر کلیات میر کا مقدمہ پڑھ کر اپنی تندرستی کی فکر کروں گا۔

خطۂ اعظم گڑھ کے ایک پختہ شاعر میاں شمیم کرہانی نے میرے مزار پر آ کر وہ قصیدہ خوانی کی ہے کہ اُس کا ایک شعر بیٹھا اس وقت بھی گنگنا رہا ہوں اور تنہائی میں اس کا لطف اُٹھا رہا ہوں۔ تم شعر پڑھو میں سر دُھنتا ہوں۔

کعبۂ اہل نظر مدفن غالب ہے یہی!
محو خواب اک دلِ بیدار اسی خاک میں ہے

مرزا غالب کا خط ہمایوں[1] کبیر کے نام

تن بہ تقدیر میاں ہمایوں کبیر

سُنو صاحب! دلّی میں ایک مرزا اسد خاں گذرے ہیں۔ پیدائش اُن کی اکبرآباد کی تھی اور تخلص غالب کرتے تھے۔ سسُرال والے اُنھیں مرزا نوشہ پکارتے تھے۔ احاطہ کالے صاحب میں رہتے تھے اور شعر و شاعری پر گذر بسر کرتے تھے۔ بادشہ کی مصاحبی پر اتراتے اور اس کے صلے میں قلیل تنخواہ پاتے تھے۔ صورت کے گورے مگر مقدر کے کالے تھے۔ بہادر شاہ ظفر سے ناتا جوڑا تو شاہی نے بادشاہت کا ساتھ چھوڑا۔ دربار رامپور سے لو لگائی تو والئی ریاست نے موت کی ٹھوکر کھائی۔ جس جس کو پیار کیا اُس نے عالم ارواح کا سفر اختیار کیا۔ کچھ جنت مکانی ہوئے تو کچھ خلد آشیانی۔ علی مرتضٰی شیر خدا کے غلام تھے مگر آدھے مسلمان تھے۔ سُور سے نفرت اور شراب سے رغبت فرماتے تھے۔ مغل بچہ ہونے کے ناتے پیشۂ آبا سپہ گری تھا مگر اس ننگِ اسلاف نے شاعری اور ربری اختیار کی۔ اسلاف کا پیشہ چھوڑا اور خاندانی حسب نسب کے کمخواب میں ٹاٹ کا پیوند جوڑا۔ نہ جنتی رہا نہ دوزخی۔ جب تک زندہ رہا مُفلسی کو اپنا مونس اور غمخوار بنایا اور عمر کا بیشتر حصہ قرض خواہی میں گذارا۔ جب تک دم میں دم رہا دیر و حرم سے دستبردار اور جام و مینا کا پرستار رہا۔ مرنے پر نظام الدین میں چہ سہ گز زمین کا مالک و مختار رہا۔ اور اس وقت سے اب تک اسی آستانے کا تابعدار ہوں۔

مرنے کے بعد بھی نہ ریاست کی بُو گئی
دو گز زمین پا کے زمیندار ہو گئے

میاں حالی میرے ساتھ ہیں۔ میرا قطعہ تاریخ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

کہہ کر آئے ہیں۔ گویا بڑا شیر مار کر آئے ہیں۔ میں نے شکوہ کیا کہ تم نے عقبیٰ میں میری مغفرت چاہی تھی مگر یہاں دُنیا میں مغفرت کے لالے پڑے ہیں۔ میرے مزار کو دیکھو اور آئندہ کے لیے سبق سیکھو۔ سرکاری وعدوں پر نہ جاؤ، وعدے تسلی اور دلاسے کی خاطر ہوتے ہیں۔ میری قبر پر مقبرہ کا وعدہ اُردو زبان کی بقا کے وعدے سے کم نہیں دونوں ہوا میں معلق ہیں۔ دنیا میں اُردو فارسی کا عاشق زار و پرستار تھا۔ مزار کھٹائی میں کیوں نہ پڑتا۔ اسی کو کہتے ہیں ع

مزار عاشقاں بر شاخ آہو

سُنتا ہوں کہ میرے مزار کے برابر اُردو کا مزار بھی تعمیر ہونے کی تجویز ہے۔ صرف آئندہ انتخابات کی دیر ہے۔ میاں جگر مرادآبادی آئے ہیں اور یہ خبر لائے ہیں کہ اُردو کے پرستاروں کی مردم شماری ہو رہی ہے جو گنتی کے نکلیں گے۔ سابق شاعروں اور ادیبوں کے مزاروں پر قوالوں کا عہدہ پائیں گے۔ اور نہ سمجھے جانے والے اشعار قوالی میں گائیں گے۔ ہے۔ ہے۔ مردم شناسی کا دَور ختم ہوا تو اس کی جگہ مردم شماری نے لے لی۔ اب تو سبھوں کی نگاہ اعداد و شمار پر ہے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے؟ یہی قرب قیامت کی دلیل ہے۔

میاں نہرو کو انھیں دنوں ایک خط لکھا تھا جس میں ایک تجویز اُردو سے متعلق تھی اور دوسری اس امر میں تھی کہ اگر آزادی کے بعد اُردو عالمِ ارواح کی زبان ٹھہرائی گئی ہو تو اُس کے شاعروں اور ادیبوں کو یہاں بھیجنے میں شتاب کرو۔ سو اُردو کو لکھنؤ اور دلی کی علاقائی زبان بنانا تو پیچھے رہا۔ برہمن بچہ کا قول سچا ہوتا ہے جو چیز اس کے اختیار میں نہ تھی کیونکر کرتا۔ البتہ تقریروں میں زبان سے آنسو بہاتا ہے اور اُردو دانوں کو گرماتا ہے۔ ارباب حل و عقد اس پر دانت دکھاتے ہیں اور مگر مچھ کے آنسو بہاتے ہیں۔ ایک چنا بھاڑ کیسے پھوڑے اور کس کس سے اپنا رشتہ ناتا توڑے۔

دوسری تجویز جو محکمہ خارجہ سے متعلق تھی وہ گلے گلے پانی منظور ہوئی اور وہ یوں کہ ہند اور پاکستان کے تعلقات پُرانے چلے آتے ہیں اور آزادی کے بعد تو اُردو ادیبوں اور شاعروں کی عالمِ ارواح میں برآمد سے دروازے اور کشادہ ہو گئے ہیں۔ مگر پھر بھی میرے قدر دان ہیں۔ چنانچہ میرے دیوان کی لکھائی چھپائی پر اُن کی سرکار انعام دے چکی ہے اور اس بندۂ ناچیز کو سرفراز کر چکی ہے۔ جگر مراد آبادی کو سرکاری طور پر انعام دے کر میاں نہرو نے اپنے وعدے کی تکمیل کی اور ان کی سرکار نے بھی ان کے حکم کی تعمیل کی۔

کل صبح میاں حالی اور میں سیر کو نکلا۔ تو سامنے ایک سبزہ زار کے گرد حصار دیکھا اس حصار میں قبر تھی مگر حصار کا پھاٹک بند تھا۔ حالی نے پوچھا یہ کیا؟ اندر اللہ اور باہر تالا۔ میں نے کہا میاں تمھاری عقل شعر فہمی تک محدود ہے۔ مزار فہمی شے دیگر است۔ تالا اور اللہ کی گردان کرو پھر دونوں کو ملا کر پڑھو۔ اللہ تعالیٰ نکلتا ہے یا نہیں — اِسی وضع قطع کا مزار جامع مسجد دلّی کے پاس میاں آزاد کا ہے جس میں اندر اللہ باہر تالا ہے — شہر کے اندر جنوں کی مسجد تعمیر کرنا علم دریاؤ ہے اسے تم کیا سمجھو۔ یہ قضا و قدر یا حکومت کے ارباب حل و عقد کے سمجھنے کی باتیں ہیں۔ آزاد دنیا کے سرد و گرم چشیدہ تھے بھلا اُن کا مزار زمانے کے سرد و گرم سے نہ گذرتا تو کیا ہمارا آپ کا مزار گذرتا — غبار خاطر کے مصنف سے موسم گرما کے گرد و غبار کا روحانی تعلق رہا ہے۔ اس لیے موسم گرما میں غبار اور موسم باراں میں رحمتِ پروردگار کے لیے اس کے رستے کھول دیے گئے ہیں اور ہما شما پر انھیں بند کر دیا گیا ہے۔ مرحوم کا مزار ان کی مزاج کی کسوٹی پر کس کے تعمیر ہوا ہے۔ اُس کے گرد و پیش سبزہ اس لیے لگایا گیا ہے کہ دیکھنے والے کو ہر چیز ہری دکھائی دے۔ باہر والا سبزے تک رسائی کو ترپے اور صاحب مزار چہل پہل کو ترسے۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق

اور ہاں میاں! ایک بات تم سے کہنے کی تھی۔ یگانہ اب دُنیا سے بیگانہ ہو کر یہاں آئے ہیں تا حیات وہ غالب شکن رہے عالمِ برزخ میں اس سیہ کار سے خوش اور مگن ہیں۔ ایک دن کہتے تھے کہ مزار آزادی کے بعد بنا ہے اُس میں ہیرے اور جواہرات کی لیس لگی ہے۔ اس میں کچھ اسیر ہیں اور کچھ کبیر اور اُن سب میں دو آتشہ وزیر با تدبیر میاں ہمایوں کبیر جو اپنے پستہ قد بنائے جانے پر کہتے ہیں۔ رع

شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

میاں! قضا و قدر کی میزان میں تولے اور ماشے کا فرق نہیں ہوتا۔ جس کے جسم پر وہ قط دھرتے ہیں اُس کی کمی علم و فضل کے وزن سے پوری کرتے ہیں۔ تم کو اگر آدھا قد دیا تو اس کے وزن بھر دماغ میں علم و ادب کا سرمایہ بھی تو بھر دیا۔ خود اپنے ساتھیوں پر نگاہ ڈالو اُس کے بعد دیکھو بھالو اور یہ سوچ کر شکر بجالاؤ کہ جو قد و قامت میں سہراب و رستم ہیں وہ علم و فراست میں تم سے سبک اور کم ہیں۔ تم جیسے پستہ قدوں پر قطب مینار کی بلندی قربان۔ جانوروں میں اونٹ قد و قامت میں بے مہار مگر چال ڈھال میں عقل و خرد کا تابعدار لیلیٰ کا محمل بردار مجنوں کا غم گسار پھر بھی یتیم العقلی میں منفرد روزگار، قناعت کی جیتی جاگتی تصویر اور مجنوں کا ناحق تدبیر اُسے نہ کہا جائے تو کسے کہو گے۔ ببول کے کانٹے کھانا اور ریتیلے میدانوں میں چلو بھر پانی کے سہارے ضربیں مارنا اور شکر بجالانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ تمھاری عقل و فراست کے کنگورے ہفت اقلیم کو چھوتے ہیں۔ جب میں تمھارے بارے میں سوچتا ہوں تو یہ خیال کر کے سر دُھنتا ہوں کہ کیا دریا کو کوزے میں بھرا ہے۔ تمھاری ہمایونی کے چرچے یہاں ہوتے ہیں اور ملائکہ عش عش کرتے ہیں۔

تمھاری خیریت کا طالب

اسد اللہ خاں غالب

15رفروری1961

غالب کا خط میاں علی عباس حُسینی کے نام

تاراجِ ادب کے شاہد عینی، میاں علی عباس حسینی کو غالب خستہ جاں کا سلام و دعا پہنچے!

میاں! باری تعالیٰ کے حضور میں تمھاری شب بیداری اور میری روز و شب مے خواری و سیاہ کاری مسلّم۔ پیمانۂ عدل میں تمھاری نیک اعمالیوں سے میری بداعمالیوں کا پلڑا بھاری۔ میں نے نہ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا، نہ زکوٰۃ دی، نہ فطرے کی رقم ادا کی۔ پھر کس منہ سے اپنی مغفرت کے لیے دُعا کرتا اور ریاکاری کا ایک اور بوجھ اپنے اوپر دھرتا— شراب پیتا اور کباب کھاتا تھا، دوستوں کو خط لکھتا اور شعر کہتا تھا۔ ''بس یہی روزگار تھا اپنا۔'' پھر ستم ظریفی یہ کہ اپنی ان تمام نازیبا حرکتوں پر دل ہی دل میں خجالت محسوس کرتا مگر اس کا اظہار یوں نہ کرتا کہ اپنے گناہوں سے اس

درجہ خائف تھا کہ بنائے نہیں بن پڑتا تھا۔ ہائے۔ فرخ بناری نے کیا میرے حسب حال مقطع کہا ہے۔ سنو۔ ظالم کہتا ہے۔

خجل ہے اپنے گناہوں پہ اس قدر فرّخ
کبھی غریب کو دیکھا نہیں دُعا کرتے

ان آنکھوں نے غدر کا منظر دیکھا ہے اور اس کا انجام بھی۔ تم نے دوسری جنگ عظیم کا اختتام اور سلطنت فرنگ کا آفتاب لب بام دیکھا۔ ادب نے دونوں کے اثرات قبول کیے۔ شعرو ادب کے متوالے دونوں میں مارے گئے۔ فرنگیوں نے انگریزی کا پھندا ہندیوں کے گلے میں ڈالا اور آزادیٔ وطن کے بعد اہلِ وطن نے ہندی کا جنیؤ اُردو دانوں کے گلے میں ڈالا۔ اب تمھارے ہندستان سے "یاحق" کی آوازیں آتی ہیں اور عالمِ برزخ کو آنے والی ریلیں اُردو شعرا کو ویگن بھر بھر کر عدم آباد پہنچا جاتی ہیں۔ غدر میں عبور دریائے شور کی سزا پاتے تھے یا پھانسی پر لٹکائے جاتے تھے۔ اب عبور دریائے حیات کی سزا پاتے ہیں یا ہندی کے دار پر لٹکائے جاتے ہیں۔ سُنتا ہوں اودھ کے شریف مسلمان گھرانوں تک میں اُردو کا خط پڑھنے والا عنقا ہے، اُردو داں دوا کو بھی نہیں ملتا۔

میاں! میں نے اسی مصلحت سے داڑھی نہ رکھی کہ اوّل غدر کے دَور کی پیداوار اور پھر گنہگار۔ قابلِ گرفت چیز کیوں رکھتا۔؟ غدر میں مسلمانوں کی گرفت داڑھی دیکھ کر ہوتی تھی۔ جتنی لمبی داڑھی ہوتی اُتنی لمبی سزا ملتی۔ ہر شخص داڑھی رکھتے ڈرتا تھا اور اپنے گناہوں کو دوآتشہ بناتے لرزتا تھا۔ داڑھی رکھوں تو شراب نہ چکھوں اور شراب نہ پیوں تو کیونکر جیئوں۔ میرے داڑھی تھی بھی اور نہیں بھی۔ گویا ___

"ہر چند کہیں کہ تھی نہیں تھی"

زیرو نمبر کی مشین سے مُنڈواتا تھا۔ اُسترے کو یوں قریب نہ لاتا تھا کہ ہمیشہ عاقبت پیش نظر تھی صاحب! جو لوگ داڑھیوں سے مسلح ہو کر شراب خانے جاتے ہیں اور خُم کے خُم لنڈھاتے ہیں اُن سے تو بہر حال دور رہوں۔ وہ دوزخ کے جلتے بھکتے چیلوں (2) پر لوٹیں لگائیں گے۔ مُجھ جیسے جہنم کی گرم گرم راکھ پر موسم سرما میں اپنا بستر لگائیں گے۔ یہ سارے کے سارے صرف داڑھیوں ہی کے

سہارے گرفت میں آئیں گے۔ مشیت کے قربان، ایک ہی چیز وسیلۂ جنت بھی اور جہنم بھی۔

صرف مردوں ہی پر کیا موقوف۔ جنسِ لطیف تک میں فرشتوں کو پکڑ دھکڑ کی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ عورت کا سنگار اس کے بال ہی ہیں۔ بال جو زلفِ گرہ گیر بن کر عشاق کو زہر کھلواتے ہیں اور فراق میں انگاروں پر لٹواتے ہیں۔ وہی اس کے گنہگار ہونے کی صورت میں فرشتوں کی گرفت میں آتے ہیں اگر فرشتے اُس کی زُلفیں پکڑ لیں تو ایک اچھی بھلی عورت کو قدِ آدم لٹکا لیں لاکھ جتن کرے مگر چھٹنے کا سوال نہ پیدا ہو۔

میاں! تمھارے لکھنؤ کے شیخوں نے یہ کیا اُڑا رکھی ہے کہ اثنا عشری حافظ قرآن نہیں ہوتے۔ میں کہتا ہوں سیّدوں کے ملازم تک حافظ ہوتے ہیں۔ کہاں ہیں تمھارے بھئی پر چڑھے حافظ [3]۔ ان کو نکالو۔

''اے قبلہ! وہ میں ہی تو ہوں۔ حضور کے آنے کی اطلاع سرکار (حُسینی صاحب) کو دیکر حاضر ہوتا ہوں۔''

''کہتی [4] بیٹا! میاں سے فرما دیجیے کہ کوئی بالغ صاحب دہلی سے آئے ہیں۔ جب سرکار کے کھانا کھانے کا وقت ہوتا ہے بالغ اور نابالغ (غالب) سب آجاتے ہیں۔ سرکار کو ڈبیہ میں پان لگا کر بھیج دیجیے۔ (غالب سر پر چوگوشیہ پہنے ہاتھ میں ڈنڈا لیے)

''جی ہاں! ابھی لاتا ہوں — ارے میاں حافظ — حافظ کو بھیج دو۔''

''آداب عرض کرتا ہوں سرکار! تو حضور دتّی سے آئے ہیں؟ ماشاء اللہ آج حضور پہلی بار تشریف لائے ہیں۔ ابھی حاضر ہوتا ہوں۔''

میاں! یہی تمھارے حافظ ہیں! سبحان اللہ۔ سید بھی بلا کے ذہین ہوتے ہیں۔ کالا جوتا نہیں پہنتے۔ کالے ملازم رکھتے ہیں اور وہ بھی کیسے بے داغ۔ کھانا بھی پکائیں۔ گھر کا سودا سلف بھی لائیں۔ جھاڑو برتن بھی کریں اور رات بھی ڈیوڑھی میں بسر کریں۔ میاں! تم تو حافظوں کے آقائے نامدار ہو کیونکہ سیّد ابرار اور مولیٰ علی کے پرستار ہو۔ سُنا ہے کہ ملازمت سے پنشن پاتے ہی تم نے داڑھی کا کنٹھا گلے میں ڈال لیا۔ میاں حالی ایک دن کہتے تھے کہ علی عباس حسینی تو اب ہمارے سمدھی ہو گئے ہیں کیونکہ میاں غلام السیدین کی لڑکی انھیں کے بڑے صاحبزادے میاں

مہدی عباس حسینی سے منسوب ہیں۔ خدا مبارک کرے۔ بہو بھی پڑھی لکھی۔ صاحبزادیاں بھی۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ تمھاری پڑھی لکھی اولادیں شاہجہاں پور کے گرہ بازوں کی طرح جس وقت پرواز کریں گی تو عرش سے تارے توڑیں گی۔ ایک بیٹا امریکہ میں۔ دوسرا مرکزی سرکار میں اچھے سرکاری عہدے پر ملازم۔ بڑی صاحبزادی(5) آکاش والی دلّی میں ــــ ماشاء اللہ ہشت پہل باپ ہو۔ اب سُنتا ہوں اپنے بیشتر اوقات اللہ ہُو اللہ ہُو میں گذارتے ہو ــــ نیک اعمال کرتے ہو۔ استغفار پڑھتے ہو۔ سیّد کی بخشش پر شک کرنے والا کافر ــــ دیکھو صاحب! میں اس درجہ بداعمال رہا ہوں کہ اعمال کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ میاں تمھارے اعمال کی تصدیق کرنے والے اور اُن پر مہر ثبت کرنے والے تو حوضِ کوثر پر ہوں گے، مگر میرے اعمال نامہ پر کون دستخط کرے گا؟ ع

کون سُنتا ہے فغانِ درویش
قہرِ درویش بہ جانِ درویش

میں نے تو طے کیا ہے کہ اپنے اعمال نامہ کی تصدیق آپ کرلوں گا اور ایک گناہ اپنے سراور دھرلوں گا اور کہوں گا کہ صاحب گنہگاروں کا ناظم ہوں۔ محکمہ بدی کا ہو یا نیکی کا افسر، افسر سب برابر ہیں ــــ تم نماز پڑھتے ہو۔ میں شراب پیتا ہوں۔ میرے مُنہ سے یہ کافر لگی نہیں چھوٹتی ــــ تمھارے ماتھے کا داغ میدانِ حشر میں چمکے گا تو میرے داغ ہائے عصیاں کہاں کے گئے گذرے ہیں جو جواب بن کر گنہگاروں میں نہ دمکیں۔ انعام دونوں پائیں گے۔ تم کو کھرے سکّوں میں جو کچھ ملے گا وہی کھوٹے سکّوں میں مجھے ملے گا۔ تم مقامِ علیین پاؤ گے تو میں بھی جہنم کے نچلے حصّے میں نہ بیٹھوں گا۔ مقامِ اعلیٰ ہی پاؤں گا۔ تم نے حافظ کو ملازم رکھا۔ میں نے ڈومنی کو۔ ڈومنی شوہر نہ ہونے پر شوہر دار رہی۔ تمھارے حافظ کی شادی ہونے پر اس کی عصمت برقرار رہی۔ تم سے لے کر تمھارے نوکر تک میرا حساب کتاب برابر رہا۔ تمھاری نیکیوں نے اگر میری بدی کی شناخت کرائی تو میری بدی بھی تمھاری نیکیوں کی شناخت میں کام آئی۔ ہائے عمر خیام کیا کہہ گیا ہے۔ ع

من بدکنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

میں یہی دو مصرعے پڑھ کر پروانۂ نجات حاصل کرلوں گا اور میدانِ حشر سے چل دوں گا عاقبت دونوں کی حسب حال رہے گی۔

میاں اعظم حسین (6) تمھارے حقیقی بھانجے ہوتے ہیں۔ تمھاری کتابیں دے گئے ہیں۔ میں نے اُن کتابوں کو سر آنکھوں پر رکھا اور انھیں تکیہ بنایا۔ دیہاتوں سے شہروں تک کے موجودہ معاشرے کا جائزہ لیا تو ہائے کر کے رہ گیا۔ جہاں جہاں کا تم نے نقشہ کھینچا ہے وہاں کی معاشرت کا منظر آنکھوں میں پھر گیا۔ اندازِ بیان کی دلکشی تمھارا ہی حصّہ ہے جو پڑھتا ہے تمھاری فن کاری کی داد دیتا ہے۔ میاں ایسے فنکار روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ شاید خدائے سخن میر تقی میر تمھارے ہی لیے یہ کہہ کر آئے ہیں ۔

برسوں لگی رہے ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب ہم سا کوئی صاحب، صاحب نظر ہوئے ہیں

''رفیقِ تنہائی''(7) نکالتے ڈرتا ہوں کہ اس عالم برزخ میں کیوں گھر والی سے تُو تُو مَیں مَیں ہو وہ رفیقِ تنہائی اپنے تیئں سمجھتی ہے — اور میری رفیق کتابیں ہیں۔ دلّی میں میاں عارف کے بچے منٹ منٹ کی خبریں پہنچاتے تھے اور گھر والی سے آٹھ پہر طوفان اُٹھواتے تھے۔ یہاں ملائک اِدھر کی اُدھر لگاتے ہیں اور بی جمالو بن کر الگ ہٹ جاتے ہیں۔

آج کل سُنتا ہوں کہ انیس کا مقبرہ تعمیر کرانے میں زمین کا گز بنے ہوئے ہو۔ یہ عمر ہی مقبرے بنوانے والی اور مقبروں پر حافظ مقرر کرنے والی ہوتی ہے۔ قویٰ کی کمزوری کا نزلہ ہر دَور میں مذہب پر گرا ہے۔ یہی داڑھیاں رکھواتا ہے، نمازیں پڑھواتا ہے اور آخری عمر میں سرخرو کراتا ہے۔

تمھاری دعاؤں کا طالب

اسداللہ خاں غالب

غالب کا خط بابائے اُردو مولوی عبدالحق (8) کے نام

مولوی عبدالحق! اگر کوئی مُجھ سے پوچھے کہ اُردو کا ذم ساز اور سب سے بڑا مقدمہ باز کسے کہتے ہیں؟ تو میں کہوں گا مولوی عبدالحق کو — کیسا چہ غم — کہ جسے نہ جینے کی خوشی نہ مرنے کا غم — نہ شادی نہ بیاہ، نہ منگنی نہ نکاح۔ تمھارا ادھر سے اُدھر جانا برحق مگر جاتے وقت یہ تو سوچتے اور ہوش و

حواس کی آنکھیں کھولتے کہ جس مقصد سے جارہے ہو اور بیٹھا زہر کھا رہے ہو اُس میں نفع اور نقصان کتنا ہے؟ اُردو کے حق میں بلا ہے یا فتنہ ہے۔ تم زبان کے میر کارواں رہے۔ ساری عمر اسی دُھن میں رواں دواں رہے۔ بابائے اُردو کہلائے۔ مگر تمھارے یہاں سے جانے نے یہ گُل کھلائے کہ جس انجمن کی بنیاد تم نے ڈالی تھی اور جس کی خاطر اپنی تندرستی تباہ کر ڈالی تھی۔ وہ اب خدا ترسی پر چل رہی ہے۔ سرکاری وظیفے پر پل رہی ہے۔ یہ چھتیس ہزار سالانہ کی رقم سرکار سے مقرر ہوئی ہے۔ اس چھتیس ہزار میں عملے کی تنخواہیں اور دوسرے اخراجات کی مدین شامل ہیں۔ کہیں اتنی چھوٹی رقم میں اتنے بھاری بھرکم ہاتھی بندھتے ہیں۔ یوں تھوکوں ستو سَنتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو زندہ رہنے کا قرینہ اور کیا ہوتا۔ یہی کیا کم ہے کہ تم نے جس پودے کو لگایا تھا اور جس کی خاطر اپنا سر کھپایا تھا وہ زندہ ہے۔ یہ سُن کر تم کو خوشی ہوگی کہ ایک دیوان اس سیاہ کار کا عرشی رام پوری نے ترتیب دیا ہے۔ جس میں تحقیق اور تدقیق کا حق ادا کیا ہے۔ سچ پوچھو تو عرشی نے روح خوش کر دی۔ گلہائے احسان سے میرے قلب کی جھولی بھر دی۔ فرش سے عرش کو پہنچا دیا۔ مردے کو قبر میں اُٹھا دیا۔ مگر تمھارے جانے سے اُردو زبان پر اوس پڑ گئی۔ دِقتوں میں ایک دِقت یوں بڑھ گئی کہ تقسیم نے ترقی کی ساری راہیں روک دیں۔ گویا اُردو کے جسم میں سوئیاں گھونپ دیں۔ ایمان داری سے بتاؤ کہ تمھارے جانے سے اُردو کو ترقی ہوئی یا تنزل، خار ملے یا گُل؟ زبان کے بولنے سے نئے نئے شگوفے کھلتے ہیں۔ طرح طرح کے شوشے نکلتے ہیں۔ تم جس جگہ گئے ہو، وہاں اگرچہ بڑے بڑے باکمال پیدا ہوئے یعنی ڈاکٹر اقبال پیدا ہوئے۔ مگر وہ خطہ دراصل پشتو، سندھی، پنجابی اور بنگالی کا ہے۔ وہاں اُردو کے لیے کون سا موقع بحالی کا ہے۔ خیر چھوڑو اس بحث سے منہ موڑو۔ یہ حکمرانوں کی باتیں ہیں۔ حکمت عملیوں کی گھاتیں ہیں۔ میں تمھارے ادبی مقدمات جب پڑھتا ہوں تو ایک خاص خوشی محسوس کرتا ہوں۔ ادیبوں اور شاعروں پر ایسے ایسے مقدمے چلاتے ہو کہ مرے مُردے جلاتے ہو۔ بال کی کھال نکالنا اور اچھے بھلوں کو کھنگالنا کوئی تم سے سیکھے۔ وہ مرزا غالب والی فلم تو تم نے دیکھی ہوگی۔ کیا رائی کا پہاڑ بنایا ہے۔ گویا میرے ساتھ ڈومنی کو بھی لکھنے پر چڑھایا ہے۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ اُسے شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ صبح و شام چلم بھرتی تھی۔ حُقّہ تازہ کرتی تھی۔ شکل و صورت اچھی تھی۔ نہ کسی کی ماں تھی نہ کسی کی جائی۔ شعر و سُخن سے ذوق رکھتی تھی۔ ہنسی دل لگی کرتی تھی۔ اور دوگال ہنستی

تھی — اس پر لوگوں نے ایک طوفان جوڑا اور یہ شگوفہ چھوڑا کہ میں فاسق و فاجر اُس پر عاشق ہوں۔ رات دِن اس کی یاد میں روتا ہوں۔ دین و ایمان اُس پر کھوتا ہوں۔ وہ تو کہو تمھاری بھاوج نہ ہوئیں، ورنہ ایک آفت لاتیں۔ گھر کی بیٹھک سے بھی نکالا جاتا۔ اور کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتا۔ جینا دُشوار ہو جاتا۔ میرے بارے میں صحیح انصاف تم کر سکتے ہو۔ جس نے جوانی میں ہاتھ پیر ہوتے ہوئے بھی صنفِ نازک کا بوجھ نہ سنبھالا اور اس بار برداری سے بمراحل دور رہا۔ اسی لیے تمام عمر بے قصور رہا۔ میں ایک ہی سواری میں چکنا چور تھا۔ دوہری سواری کیا اُٹھاتا اور ساری عمر اپنے کو اُٹھا بیٹھی کراتا۔ خط ختم کرتا ہوں۔ تم سلامت رہو۔

غالب

غالب کا خط وقار عظیم کے نام

جانِ غالب، وقار! میں مرنے پر سپردِ گور ہوا تو تُو بھی جیتے جی زندہ در گور ہوا۔ میں نے انتقالِ جسمانی کیا تو تُو بھلا کیسے نچلا بیٹھتا۔ تُو نے بھی انتقالِ مکانی کیا۔ تقسیم نے ناخن سے گوشت جُدا کیا۔ گویا ناروا کو روا کیا۔ کیا زبان پر کوہِ الم ٹوٹا ہے کہ نہ تو بیان کی گنجائش ہے اور نہ شکوہ شکایت کا یُوتا ہے۔ لاہور کی آب و ہوا سُنتا ہوں کہ تم کو ایسی راس آئی ہے کہ تم نے اب اُسی چوکھٹ پر دھونی رمائی ہے۔ اپنے لیے ایک عظیم الشان کوٹھی بنوائی ہے اور دن بھر کاغذ پر گھوڑے دوڑاتے ہو۔ گھوڑ دوڑ کے مزے اُڑاتے ہو۔ تمھارے مضامین تنقیدی و غیر تنقیدی پڑھتا ہوں۔ اور تمھاری جُدائی کے تصور سے گھٹتا ہوں۔ داستانوں کا اختصار تم نے کیا چھاپا ہے۔ گویا کئی سمندروں کو پیمانوں سے ناپا ہے۔ ''نقوش'' کے پرچے آتے ہیں اور دل کو لبھاتے ہیں۔ تم نے طنز و ظرافت نمبر پڑھا۔ میری تصویر پر نگاہ گئی؟ میرا کارٹون کس غضب کا بنایا ہے کہ خود کارٹون بننے والے کو بے اختیار ہنسایا ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ بڑھاپے میں یہ حال ہوگا اور عضو عضو یوں پامال ہوگا تو جوانی ہی میں مر لیتا — کاسۂ حیات کو آبِ فنا سے بھر لیتا۔ عجیب بات ہے کہ جسمانی اعتبار سے جتنے حقیر ہو اُتنے ہی عقل و فہم میں درویش کامل اور فقیر ہو۔ عبادت بریلوی کی ضخیم ضخیم کتابیں دیکھ کر دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ کاش تم اُن کی لکھی ہوئی کوئی کتاب ہوتے۔ یا جسامت میں طلسم ہوشربا کا ایک باب ہوتے۔ یہ جو دُختِ افراسیاب ہوتے چلے جاتے ہو اور لاہور کے باہر کہیں نظر نہیں آتے۔ تو

اس کا سبب کیا خراب تندرستی ہے یا کسلمندی اور سُستی ہے۔ اگر دوا دارو سے پرہیز ہے اور پہلوان بننے سے گریز ہے تو ایک طبّی نسخہ بتاتا ہوں اور اِس بات کی قسم کھاتا ہوں کہ اگر اسے پابندی سے استعمال کرو گے تو ہفتے عشرہ میں اپنی صحت بحال پاؤ گے۔ دو ہفتے ڈاکٹر عبادت بریلوی کی موٹی موٹی کتابوں کا بھپارہ لو۔ اُسی کا صبح و شام غرارہ لو۔ اگر گاما پہلوان نہ بنادوں تو غالب نہ کہنا۔ بلوان نہ بنادوں تو اپنا طالب نہ سمجھنا۔ امسال اِدھر آموں کی کثرت ہے۔ اب لے دے کے ایک ہی حسرت ہے کہ آم ٹب میں بھیگتے ہوں ادیبوں اور شاعروں کے جمگھٹے ہوں۔ قاشوں پر قاشیں کٹتی ہوں اور حسبِ مراتب بٹتی ہوں۔ ہائے اب یہ صحبتیں کہاں میسّر ہوں گی اور یہ جُدائی کی گھڑیاں کیونکر بسر ہوں گی۔ آتے ہو تو آؤ نہیں تو ملنے کی کوئی دوسری راہ بتاؤ۔ اگر مناسب سمجھو تو اپنی تصانیف بھیج دیا کرو تا کہ اِس تنہائی میں دِل بہلے اور وقت کٹنے کی کوئی صورت نکلے۔ ایک آہ بھرتا ہوں اور خط کا آخری فقرہ تمام کرتا ہوں۔

غالب

غالب کا خط جوش ملیح آبادی کے نام

شبّیر حسن خاں جوش، خوش پوش و بلا نوش — گلستانِ سخن کی بہار، مُخانۂ ادب کے سرشار! ہندستاں چھوڑ پاکستاں بسایا۔ گویا دونوں ملکوں میں نیا جادو جگایا۔ علی مرتضیٰ شیرِ خدا کے گرویدہ۔ اُس پر یہ ڈھٹائی اور یہ دیدہ کہ اہلِ بیت کی محبت میں گرفتار مگر خدا کے وجود سے انکار۔ ستم ظریفی کی انتہا کرتے ہو۔ پیروں پیغمبروں کو خفا کرتے ہو۔ جوانی میں اگر مذہب سے کھیلو گے تو بڑھاپے میں مذہب کے پاپڑ بیلو گے۔ اِس رندی کے جادہ پر کب تک چلو گے۔ مذہب سے کب تک جلو گے۔ جوانی میں جیسا قدم بڑھاؤ گے۔ بڑھاپے میں اُتنی ہی گہری گیروی پوشاک میں نظر آؤ گے۔ ہاتھ میں بڑے دانوں کی تسبیح ہوگی۔ ہر غلطی کی اِسی طور پر تصحیح ہوگی۔ جب جُبّہ و دستار کا پُلندہ بنے مذہبی تھان کے بیچ کا ڈنڈا بنے ضربیں مارتے وسطِ حلق سے کھنکارتے دکھائی پڑو گے۔ مصنوعی مذہب میں سرشار۔ رواں دواں، آج یہاں کل وہاں۔ خانقاہیں آباد کرو گے۔ اُس وقت غالب خستہ کو یاد کرو گے۔ اِس پیرِ ناتواں کی ہدایت پر ہنستے ہو۔ اُس کی ہر بات کسوٹی پر کستے ہو۔ یہ رندی اور مذہب کی ہندی کی چندی کہیں طرفہ رنگ نہ لائے۔ اور جیتے جی آفت نہ ڈھائے۔ تمھاری غیبت میں دو ایک بار جب

تمھارا ذکر آیا تو باتوں باتوں میں ایک بزرگ نے فرمایا کہ جوش ایک مذہبی پکھیرو ہے۔ اچھا بھلا کسیرو ہے۔ جس کا گودا گورا اور چھلکا کالا ہے۔ مجذوبوں جیسی باتیں بناتا ہے اور ملحد کہنے والوں پر قہقہے لگاتا ہے۔ اوپر سے کالا ہے اندر سے عاشق باری تعالیٰ ہے۔ سُنتا ہوں کہ دشمنوں نے جنرل ایوب کے کان بھرے کہ جوش فتنہ ہے، اسے پاکستان سے نکالو اور اس مصیبت کو یہاں سے ٹالو مگر وہ کب کچی گولی کھیلے تھا، وہ تو بدر و حنین کے معرکے جھیلے تھا۔ اُس نے آخر جوہر کامل کو پہچانا اور جوش کے باطن کو جانا۔ غلط فہمی دور ہوئی۔ عتاب کی آندھی کافور ہوئی۔ تمھارے باطن کی صفائی اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ایک شب جب تمھیں روپے کی ضرورت اور پیسہ ملنے کی نہ راہ نہ صورت تھی۔ تو کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ضرورت بھر روپیہ پھینک یہ جا وہ جا نظر آیا۔ (9)

تمھارے ہم مشربوں نے مجھے بتایا ہے بلکہ بڑے ہماہمی سے یہ بھی یقین دلایا ہے کہ کوئی پان کی ڈھولیاں لاتا ہے اور گھر میں جب پانوں کا کال پڑتا ہے تو مفت دے جاتا ہے۔ (10)

اُس وقت سے ڈرو جب پاکستان چھوڑ چھاڑ میرے مزار کے مجاور بن کر دھنّا دھرو گے۔ ٹخنوں سے اونچا گھٹنا ہوگا۔ اور ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا ہوگا۔ ''یا حق کچھ کہتے ہیں، بار الم سہتے ہیں'' کے نعرے بلند کرتے۔ سیٹھے نالے۔ پھیکی آہیں بھرتے نظر آؤ گے۔ اور اُسی کو زندگی کی حقیقت بتاؤ گے۔ سُنتا ہوں قویٰ مضمحل ہو چلے ہیں۔ گزرے ہوؤں کو یاد کرتے ہو۔ دل کو ناشاد کرتے ہو۔ تم دورِ حاضر کے شہنشاہِ سخن ہو۔ رندوں اور خراباتیوں کے میرِ انجمن ہو۔ زبان پر قدرت رکھتے ہو۔ ادب پر احسانِ عظیم کرتے ہو۔ شاعرِ شباب و انقلاب ہو۔ ''احسن الانتخاب (11) ہو۔'' تم رحمت کا قصیدہ پڑھ کر اگر جنت میں جاؤ گے اور قدرت کو ہنساؤ گے تو میں بھی علی مرتضیٰ شیر خدا کا دامن پکڑ کر ساقیِ کوثر سے مغفرت حاصل کرلوں گا۔ رحمتِ باری کے موتیوں سے دامن کو بھرلوں گا۔ بڑے مزے رہیں گے۔ فردوسِ بریں میں مشاعرے کریں گے۔ حُوران بہشتی پر فقرے کسیں گے۔ یہ سب دل لگی کی باتیں ہیں۔ ورنہ۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

غالب

غالب کا خط شوکت تھانوی کے نام

میاں شوکت! آنکھوں کا چین دلوں کی راحت! یہ شیطان نے تم کو کیا اُنگلی دکھائی کہ تم کو بھی پاکستان کی سمائی۔ گھر بار چھوڑا۔ نئے دیس سے ناتا جوڑا، سُنتا ہوں کہ وہاں تم نے شادی کر لی۔ اچھی بھلی سلیپر سے نئی سلیپر بدل لی۔ یہ مولویوں کا پیشہ تم داڑھی مُنڈوں نے کیسے اختیار کیا۔ اور اپنے کو دُہرا بوجھ لادنے پر تیار کیا۔ میں تو ایک ہی شادی کر کے بھر پایا تھا۔ بیوی کے سامنے میوں میوں کے سوا کچھ نہ کر پایا تھا۔ ساری زندگی ہانپتا رہا۔ نون، تیل، لکڑی کی نبضیں دیکھ دیکھ کر کانپتا رہا۔ اس کا شکوہ تم سے کروں یا سارا الزام زمانے پر دھروں؟ ہر طرف یہی کام ہو رہا ہے۔ جسے دیکھو تُخم پر تُخم بو رہا ہے۔ ریڈیو کا قاضی [12] جب دوسرا نکاح پڑھائے اور اپنے اوپر اچھی بھلی مصیبت لائے تو اُسے کون سمجھائے کہ یہ بوجھ اِنسان کو گھلا دیتا ہے۔ ہنسوں کو رُلا دیتا ہے۔ تمھارے فقروں کی آمد میں سُستی نہ پیدا ہو گی تو کیا دُہری سواری سے چُستی پیدا ہو گی؟ ریس کے گھوڑے پر جب دو دو جیکی لادو گے تو کیا ریس کرو گے کیا بھاگو گے؟ ایک ہی شادی میں اِنسان کی سانس پھول جاتی ہے کر جھول جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'سودیشی ریل' سے 'شیش محل' تک جانے والے تمھاری کتابوں میں اب تمھیں تلاش کرتے ہیں تو تم نظر نہیں آتے۔ جب تُم نئے نئے گئے تھے تو مجھے تمھارے انتقالِ مکانی کی دوسرے دن خبر لگی۔ میں نے چلتے کہا کہ "لو ایک تارا اور ٹوٹا ہنسنے ہنسانے کا سہارا چھوٹا۔ تمھارے دلنواز قہقہوں پر مُسکراتا تھا اور سکونِ خاطر پاتا تھا۔ مگر وہ سلسلہ بھی ختم ہوا۔ گویا عشرت کا دَور کالعدم ہوا۔ جب ہندستان آتے ہو تو اوپر ہی اوپر گذر جاتے ہو۔ جہاں قیام کرتے ہو وہاں سے میری قیام گاہ کتنے ڈولی ہی تو ہے۔ کیا وجہ ہے کہ تم مجھے جیتے جی اپنی جُدائی سے تڑپاتے ہو۔ اب کے بار اِدھر آؤ تو ایک ذرا مجھ کو بھی اپنی شکل دکھا جاؤ۔ ورنہ میدانِ حشر میں نفسی نفسی میں کون کس کا ساتھ دے گا۔ اب جب دِلّی کی صحبتیں یاد آتی ہیں تو دل کو تڑپاتی ہیں اور خون کے آنسو رُلاتی ہیں۔ اے یوسف مرزا! پھینکو نا۔ کب سے پتّا [13] دبائے بیٹھے ہو۔ اب دُگی ردک رکھی ہے۔ اے لیجیے — پھینکا بھی تو دہلا۔ ہاں میاں کیا دیکھتے ہو۔ لگا دو نہلے پر دہلا۔!" میرن صاحب! اب آپ کی باری ہے۔ کہیے کیا تیاری ہے؟ بن گئی ہو تو پتّے کھولو۔ چُپ کیوں ہو؟ بولو بازی ختم ہو۔ نئی بازی شروع ہو۔ کیا رُکھے بازی کر رہے ہو۔ میں دیکھتا ہوں کہ

میرن صاحب سویرے سے ایک ہی پتّا ٹاپ (14) کررہے ہیں تو ٹاپ ہی کرتے چلے جارہے ہیں۔ اے دیکھیے! سون (15) کھیلتی ہے تو ایسی کہ نہ منہ سے بولتے ہیں نہ سر سے کھیلتے ہیں۔ ارے صاحب! کہو تو غلام سر کروں۔ اور اکّا رو کے رکھوں۔ مرزا صاحب! معاف کیجیے گا۔ بولنے کی نہیں ہوتی۔"" اچھا صاحب آپ کا کہنا سر آنکھوں پر۔ اے لیجیے آپ بھی کیا یاد کریں گے کہ کسی رئیس سے پالا پڑا تھا۔ میاں شوکت! یہ ہاتھ یوں بنا۔ اور دیکھیے پوری رمی یوں بنتی ہے۔ کہو۔ ہوئی؟ اچھا تو شوکت میاں آپ کے ذمّے دو آنے اُدھار رہے۔" جی ہاں مرزا صاحب! گلے گلے پانی تک۔ اے لو۔ میر مہدی آگئے۔ ارے بھئی میر مہدی! بیٹھے تو ہو؟ اچھا ذرا رُکو۔ آخری فقرہ ختم کرلوں تو بات کروں۔

تمھاری درازیٔ عمر کا طالب

اسداللہ خاں غالب

حواشی

(1) یہ خط اس وقت لکھا گیا تھا جب ہمایوں کبیر زندہ تھے اور محکمۂ تعلیم کے وزیر تھے۔

(2) لطفوں

(3) حسینی صاحب کے قدیم وفادار ملازم کا نام ہی حافظ ہے اور جو حافظ قرآن بھی ہیں۔

(4) حسینی صاحب کی مجھلی صاحبزادی گیتی آرا جنھوں نے فلاسفی میں ایم۔اے کیا ہے۔

(5) کشور زیدی جو کشمیر یونٹ میں اسکرپٹ رائٹر ہیں۔

(6) شمیم کرہانی کے بڑے بھائی اور حضرت آرزو لکھنوی کے شاگرد۔

(7) حسینی صاحب کے افسانوی مجموعے کا نام۔

(8) یہ خط مولانا کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

(9) اب کے اگست میں جب جوش صاحب دلی آئے تو راقم الحروف سے انھوں نے دو عجیب و غریب واقعے بیان کیے۔ پہلا واقعہ یہ کہ ایک دن انھیں کسی سلسلے میں سات آٹھ سو روپوں کی اشد ضرورت تھی۔ اور دوسرے روز سویرے ہی وہ رقم داخل کرنا تھی۔ شب میں وہ متفکر تھے کہ سویرے سویرے کیوں کر انتظام ہوگا۔ اور یہ سوچتے سوچتے سو گئے۔ دو تین گھنٹے بعد کسی نے دروازے پر دستک دی تو ان کی آنکھ کھلی۔ اتفاق

سے گھر پر مردوں میں اس وقت کوئی موجود نہ تھا۔ اس لیے خود ہی دروازہ کھولنے چلے گئے۔ جب انھوں نے دروازہ کھولا تو ایک سیاہ فام انسان ایک تھیلی پھینک کر یہ کہتا ہوا کہ "لے" یہ جا وہ جا غائب ہو گیا۔

(10) دوسرا واقعہ انھوں نے یہ بتایا کہ وہ منہ اندھیرے کہیں بھی ہوں گھر سے باہر گھومنے نکل جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک دن گھر میں پان ختم ہو گئے تھے اور واپسی پر راستہ میں یہ سوچ رہے تھے کہ ناشتے کے بعد پانوں کا کیا انتظام کیا جائے گا کہ اچانک ایک سنسان جگہ پر ایک شخص تازہ پانوں کی دو ڈھولیاں ان کے سامنے ایک پلندہ کی شکل میں ڈال کر یہ بڑبڑاتا ہوا غائب ہو گیا "اب سالے کو یوں ہی مار دوں گا"۔

(11) احسن الانتخاب مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ مرحوم کی مشہور تصنیف۔

(12) ریڈیو پاکستان کا ایک فیچر جسے شوکت تھانوی لکھتے تھے۔

(13) تاش کے غالب بھی لتی تھے اور شوکت بھی رمی اور "فلش" پر جان دیتے تھے۔

(14) تاش میں رمی کھیلنے والوں کی ایک اصطلاح۔

(15) لکھنؤ کی اصطلاح میں خاموش ہو جانے کو کہتے ہیں۔

(فکر تونسوی)

آسمانی کتاب

جو پاکستان اور ہندستان کے مہاجروں اور شرناتھیوں پر ایک ساتھ اتری!

باب اول
پیدائش کے بیان میں

اور ابتدا میں خداوند خدا نے انگریز کو اور اس کی سیاست کو پیدا کیا—

اور انگریز چالاک اور سفاک تھا اور اس کے اندر سیاست تھی اور خدا کی روح اس کے ساتھ تھی۔

اور انگریز نے کہا ''جدا ہو جاؤ'' سو جدائی ہوگئی، اور خدا نے جدائی کو دیکھا کہ اچھی ہے اور خدا نے ہندو کو مسلمان سے جدا کیا اور جدائی کو پاکستان کہا۔ سو پاکستان ہو گیا۔

پھر خدا نے کہا۔ پاکستان کے اور ہندستان کے بیچ میں شرنارتھی ہووے، سو ہو گیا۔ شرنارتھی کا رنگ موافق زمہریر کے تھا اور اس کی چشم میں آگ تھی، پھر یہ آگ نور کا تقدس ہوئی۔ یہ تقدس ہر آزاد انسان کا ہووے خداوند خدا نے ایسا کہا۔

پھر خداوند خدا نے مہاجر بھی پیدا کیا کہ ایسا کرنا ملزوم تھا۔ شرنارتھی کہ جو کچھ تھا تو مہاجر بھی وہی کچھ بنا۔ اس کی چشم کہ شرنارتھی سے مناسبت خاص رکھتی تھی، آگ بنی پھر یہ آگ مانند نور کے مقدس ہوئی۔ یہ تقدس ہر آزاد کا، انسان کا ہووے، خداوند خدا نے ایسا کہا۔

پھر یوں ہوا کہ شرنارتھی کے من کا اور مہاجر کے قلب کا افتراق بڑھا اور وہ دونوں وحدت کا ثبوت بنے، پھر خداوند خدا نے حکم دیا کہ زمین میری لہولہان ہو مانند پر بوٹی کے اور خنجر ہووے، کرپان ہووے، بلم ہووے، اور ارض جل اٹھے۔ سارے مکان کہ جہاں تم رہتے ہو، سارے محلے کہ جہاں تم تبسم کرتے ہو۔ سارے میدان کہ جہاں تم تمنا بوتے ہو۔ سارے کھیت کہ جہاں شجر پھل والے، خوشے دانوں والے اور سونا اور چاندی اگاتے ہو۔ اور تم قتل ہو جاؤ اور تم انسان مت بنو کہ انسان سراپا نسیان اور مانندِ شیطان کے ہے۔ خداوند خدا کے لیے۔ سو تم وحشی بن جاؤ اور درندگی تمھارا ساتھ دیوے۔ اور عورتیں تمھاری عریانی کا بھید جانیں اور اسکا تلذذ پہچانیں اور بچے تمھارے چیخنے پر آمادہ ہوویں اور سنگینوں کی نوکیں آسمانوں پر نمایاں ہوویں کہ ان پر چھوٹے چھوٹے نزاکت سے معمور بچے ٹنگے ہوئے بھلے معلوم ہوویں۔

سو خداوند کا حکم اٹل بنا، آدم کے بیٹے شرنارتھی بنے، مہاجر بنے، کیونکہ وہ تو خدا کے بتائے ہوئے نعرے لگانا لازم کرتے تھے نفرت اور حقارت اور درندگی عام کرنا طلب کرتے تھے۔ اور ان شرنارتھیوں کے اور ان مہاجروں کے اوپر تسلط جائز ٹھہرا۔ لا الٰہ کا۔ ست سری اکال کا۔ بجرنگ بلی کا، اور پھر تسلط جائز ٹھہرا ان سرپرستوں کا جو بادشاہ کے بعد بادشاہ تھے۔ جو راجہ کے بعد راجہ تھے۔ یعنی لیڈر تھے اور محبوب اور مقبول تھے اور پاگل نہیں تھے اور وقوف کامل رکھتے تھے۔ وہ عظیم اور ارفع کارخانے رکھتے تھے اور حق رکھتے تھے بڑی وسیع ارض والی پر اور خداوند خدا کے خاص بیٹے تھے۔ سو انھوں نے آزاد انسانوں پر استحقاق فائق گردانا۔ اور استحقاق کا تسلیم کرنا آزاد انسانوں پر فرض ٹھہرا۔ کہ انگریز نے ایسا کہا تھا۔ انگریز کا قانون افترا نہیں تھا۔ وہ تو باطل کی جڑ کاٹنے والا تھا۔ اور آزاد انسان اطاعت کے تالاب میں ذلیل و خوار ہونے لگے جیسا کہ خداوند خدا کا قانون تھا اور حکم تھا اور خداوند خدا کا قانون وسیع ارض والوں کا اختیار بنا۔

تب خدا کے عظیم اور ارفع بیٹوں نے کہا، زمین کا لہو قلیل مقدار میں نہیں بہنا چاہیے کہ ایسا آزادی کے شایان میں مناسب نہیں تھا۔ سو آزادی کی شان کا فیصلہ ظہور میں آیا یعنی شرنارتھی مہاجر کے بدلے میں اور مہاجر شرنارتھی کے بدلے میں جُنباں ہوا۔

پھر آدم کے بیٹوں نے اپنے خنجروں کو دیکھا کہ لت پت تھے۔ کرپانوں کو دیکھا کہ گلنار بنی ہوئی تھیں۔ کھیتوں کو دیکھا کہ بے جان، ویران اور سنسان پڑے ہوئے تھے۔ تب وہ خبطی بننے میں مصروف ہوئے اور جنگ کرنے لگے۔ پھر یوں ہوا کہ خداوند خدا کے بیٹوں کے بندوں کی روحیں تمتمانے کی طرف مائل ہوئیں۔ وہ تو حکم ماننے والے تھے، آزاد انسان کہلانے کا یارا نہیں رکھتے تھے۔ سو پل پڑے۔ انھوں نے اپنے قلب میں تفکر کیا اور اس تفکر کے آگے ساری مدنیت ہیچ ہو گئی۔ وہ دھرم کے محافظ بنے۔ مذہب ان کا خطرے کے بیچ میں تھا اور خداوند خدا کے بیٹے شاباش دیتے پھرتے تھے اور احتساب پھیلاتے پھرتے تھے سو یوں ہو گیا کہ وہ غلام سے آزاد بنے۔ آزاد سے شیطان بنے اور شیطان سے ہندو اور مسلمان بنے۔ پھر جدل اور قتل اور غارت ان کا شیوہ ٹھہرا۔

سو خداوند خدا کے بیٹے مسرور ہوئے، کہ حکم ان کا عمل کے دوران میں تھا اور پھر جب لہو اور قتل کی آزادی ہوئی۔ فراوانی اور لاحد مکانی اور کھینچا تانی کا نام سراسیمگی ہوا، اور آگے اندھیرے کا اقتدار دکھائی دینے لگا تو خداوند خدا کے بیٹے چونکے کہ ادراک تو ان کے آگے سر بسجود تھا۔ اور آزادی کا نقارہ پھٹ نہ جائے، اس خوف سے ان کے لیے چونکنا لازم قرار ہوا اور انھوں نے حکم دیا کہ اے لوگو! تم صفتیں درندوں والی کیوں رکھتے ہو؟ شرم اور حجاب کیوں تمھاری حیات کی دلیل نہیں ہوئی؟ تمھیں جاننا چاہیے اور ماننا چاہیے کہ اب تو خداوند خدا نے ہمیں تمھاری عِنان سنبھال دی ہے، اور ملک کی آزادی میں کوئی شک باقی نہیں رہا سو تمھاری لڑائی اور تمھاری غارت گری مسموم ہے اور معتوب ٹھہرے گی۔ کیا تمھیں ہماری عِنان گیری پر اعتبار مطلق نہیں کہ مارتے ہو ہندوؤں کو اور مسلمانوں کو۔ امن سے رہنے کی سبیل بتاؤ! جاہل وحشی اور مواشی بننا ترک کرو کہ یہی دھرم کی صدا ہے، مذہب کی اذان سنو کہ ہم تم پر حکومت کرنے کی تمنا لیے بیٹھے ہیں اور تمھاری جدل ہمارے تعیش اور تفنن کے لیے رہزنی کر رہی ہے۔ حیا اور حجاب کا پردہ چاک مت کرو اور اتنا بڑا سمندر جو رو برو دیکھتے ہو تو چھلانگ لگا دو، کہ یہ

دیش ہمارا اپنا ہے، کہ یہ ملک ہمارا اپنا ہے اور آسمان پر اور زمین پر اور اس کائنات کے ذرّہ ذرّہ کی حکومت خداوند خدا نے ہمیں سونپ دی ہے کہ تمھاری حفاظت کا بوجھ ہمارے سروں کے اوپر ہے۔

تب ملک ہندستان کے اور ملک پاکستان کے بندے بڑے خجل ہوئے اور ندامت کے سبب میں سر جھکا دیئے اور سوچنے لگے کہ خداوند خدا کے بیٹے سچ کہتے ہیں سو ان کا حکم انحراف نہیں ہووےگا۔

خداوند خدا کے بیٹوں نے کہا تم ہندو والے دیش میں چلے آؤ، تم مسلمان والے ملک میں چلے آؤ۔ تمھارا بھیڑیں بننا ہی مناسب و موافق ہے۔ ہم تمھیں ہانکیں گے۔ سو بھیڑوں کا نام شرنارتھی ہوا۔ شرنارتھی کی چشم میں آگ بھڑکی ہوئی تھی تو مہاجر کی چشم بھی شعلہ تھی۔ پھر انھوں نے خدا کے بیٹوں کا حکم مانا اور اپنے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور پناہ گزین کہلائے۔

باب دوم
مقام قافلہ کے بیان میں

اور خداوند خدا نے اپنے بیٹوں کو جو کہا تھا وہی صادق ہوا، یہ رفیوجی کی پیدائش کا بیان ہے۔ جب وہ پیدا ہوئے، جس دن خدا کے بیٹوں نے میدان کے سب لوگوں کو رفیوجی بنایا۔ اس سے آگے بیان قافلہ کا آغاز ہوتا ہے۔

رفیوجی جب گھروں سے نکلے وہ پریشان تھے اور حیران تھے اور سر بہ گریبان تھے کہ ان کے سامنے ایک وسیع میدان ہُو، کا تھا اور ڈر کا اور اس ساری ہیبت کا جو عبور کرنے کے لیے کھڑا تھا مگر حکم خدا کا سب کے لیے یکساں تھا۔ وہ خدا کے بیٹوں کی نظر میں منظور ہوئے تھے تو چلنا اور نکلنا لازمی تھا اور وہ سب کچھ کرنا جس کی خاطر ان کی پیدائش ہوئی تھی۔

سو انھوں نے حسرت کی، اپنے گھروں پر جن میں ان کی روح کو دخل تھا۔ اپنی الفتوں پر کہ باعث ان کی حیات کا تھیں، اپنی یادوں پر کہ بندھی ہوئی ایک طویل حافظے اور رشتے سے تھیں اور یہ

رشتہ تار تار ہوا۔ متاع جو اکٹھا کیا تھا ان کی صدیوں کی محنتوں نے، وہ لوٹا گیا اور وہ رونے لگے اور گھبرانے لگے اور بچوں نے اپنی ماؤں سے علیحدگی اختیار کی اور ہُوزُو کو خاوند کا فراق نصیب ملا۔ ضعیف بوڑھے اپنی زبانیں گنوا بیٹھے اور ان کی لاٹھیاں شکستہ ہو ہو کر گریں۔ اور عورتیں کہ حسن میں بے مثال تھیں۔ کہ جوان اور خوبرو تھیں اور ہوس کا چارہ بن سکتی تھیں زمین کے چپے چپے پر پھیل گئیں اور عریانی انھیں پسند آئی اور پھر مشعلیں لیے ہوئے بھوت غاروں سے نکلے۔ ان کے ہاتھوں کے بلّم لہراتے تھے اور کرپانیں تابانی کرتی تھیں اور خنجر نورانی عکس بناتے تھے اور پھر یہ نورانی شکلیں زمین کے چپے چپے پر پھیل گئیں کہ جہاں نشاط کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور زمین کے چپے چپے پر عورتیں پھیل گئی تھیں، اور بچے پھیل گئے تھے، اور متاع کا مالک کوئی نہیں تھا۔ یوں حالت تھی، جب بے سروسامانی کا نغمہ روانی کے دوران میں ہوا۔

اور پھر یوں ہوا کہ خداوند خدا کے بیٹوں نے شادیانے بجائے، آزادی کے اور شادمانی کے۔ کہ حکم ان کا عمل کے بیچ میں تھا۔ تب انھوں نے کہا۔ اے لوگو! تم قافلے بناؤ رفوجیوں نے کہا۔ اے خداوند خدا کے مقدس و محبوب بیٹو! تم نے ہماری برکت چھین لی اب ہماری پاسبانی کون کرے گا۔ جواب ہوا۔ خداوند خدا تمھارے لیے فوج بھیجے گا۔ تب فوج آئی اور رفوجیوں کے قافلے چلنے پر تیار ہوئے اور یہ قافلے خوب تھے۔ صورت ان کی مثل ٹڈیوں کے تھی۔ وہ ہفتہ ہفتہ تک، مہینے مہینے تک گُرسنہ رہتے۔ تشنگی ان کا افتخار تھی۔ کپڑے لتے سے محرومی ان کو غرور دکھلاتی تھی۔ اجڑی ہوئی سڑکیں جن پر بھوتوں کا ہراس ہردم تسلط کرتا تھا جن پر وہ چلتے تھے سو وہ چلتے رہتے۔ ان کے پاس چھکڑے تھے، بیل تھے اور گدھے تھے اور گھوڑے تھے، سائیکلیں بھی تھیں اور پھر عورتیں تھیں۔ ہمشیرائیں تھیں، زوجائیں تھیں، مائیں تھیں جن کے سبب سے بھوت پیدا ہو جاتے تھے اور پھر وہ راتوں کو بیداری کرتے تھے۔ دن کو چلنے کے لیے مقرر کرتے تھے۔ وہ روتے تھے۔ آنسو اُن کی چشم کی زینت بن گئے تھے، ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے کہ وہ انھیں تسکین کی راہ دکھاتی تھیں۔

پھر یوں ہوتا کہ خداوند خدا کے بیٹوں کے خاص بندے آتے جو اُن پر دھاوا کرتے۔ بم چلاتے اور بندوقوں کو عین ان کے روبرو چھوڑتے اور لا الٰہ کی گرج سناتے اور سَت سری اکال سے

فضا کو برلرزہ کرتے۔فوج آتی جوان کے تحفظ میں گولیوں کی بوچھار کرتی اور رفیوجی پر بھوئی ہوتے اور فوج کہتی یہ سب اچھا ہے، اور رفیوجی موت کا جام پی پی کر لبیک کہتے۔عورتیں خداوند خدا کے بیٹوں کے خاص بندوں کے ساتھ فرار کا سامان کرتیں اور بچے لاشوں کے انبار کا حصہ بن جاتے اور متاع اور سونے کے زیور اور چاندی—اور لوٹ لیا جاتا وہ سب کچھ کہ ان کے پاس ہوتا اور پھر ان کے سر سے بوجھ اتر جاتا۔وہ سبک ہوتے ہی پھر چل پڑتے۔خداوند خدا کا حکم عمل کے دوران میں تھا اس لیے قافلے ایک مقام پر رکنے کو گناہ تصور کرتے۔

اور پھر قافلے گاڑیوں پر آتے جو لٹنے کے لیے بنائی گئی تھیں اور ان گاڑیوں کو ڈھانپ دیا جاتا کہ رفیوجی پیاس کے مارے نیچے میدان میں نہ اتر جائیں۔بھوک ان کو ستاتی تھی۔یہ تو ایسا ہی کرتے ہیں۔خداوند خدا کے بیٹے کہتے۔پھر اسٹیشن آتے۔پھر جنگل آتے۔پھر گاڑیاں یک بیک سکوت پا جاتیں اور آٹھ آٹھ گھنٹے اور دس دس گھنٹے رفتار کا نام نہ لیتیں۔رفیوجی گھبراتے۔غل مچاتے۔کاٹ کاٹ کھاتے۔مگر خداوند خدا نے کہا کہ یہ تو ایسا ہی کرتے ہیں— سو پھر وہی بھوت آتے۔ڈھولوں کو تھاپتے اور بلموں اور خنجروں اور بندوقوں کو اور پھر گاڑیوں کا قافلہ اپنے بچے روبرو کرتا، اپنی زوجاؤں کی عنان سنبھال دیتا، اپنا متاع اور اسباب اور وہ سب کچھ جو وہ خداوند خدا کے بیٹوں کے حکم سے ہمراہی میں نہیں لے جا رہے تھے اور عزدل کے سبب انھیں لوٹ لیا جاتا۔موت کی شراب سے نابینا کر دیا جاتا اور تاریکی پھیل جاتی اور میدان لاشوں سے بھرپور ہو جاتا اور گاڑی بھی اور لہو کا سمندر غرانے لگتا۔اور گاڑی بھی اور رفیوجی بھی۔اور یوں سب کچھ سبک ہو جاتا اور قافلہ چل پڑتا کہ خداوند خدا نے ایسا کہا تھا—

بعد ان باتوں کے یوں ہوا کہ زمین آئی جس پر علم لہراتے تھے اور نام اس کا سرحد ہوا اور سرحد رفیوجیوں کو پسند آئی کہ اسے تو خداوند خدا کے بیٹوں کا افتخار حاصل تھا۔سو علم دیکھ کے انھیں ادراک ہوا، اور خداوند خدا نے کہا یہ ہماری زمین ہے۔رفیوجیوں نے کہا کہ ہماری زمین تو پشت میں رہ گئی۔تب خدا نے اسے گستاخی پر محمول کیا اور غضب ناک ہو کر دیکھا پھر رفیوجی لوگوں نے نعرے لگائے۔جن کی قسم ایسی تھی کہ خدا کے بیٹے حیات پائیں اور اپنے آپ کو فراموش کر دیں تو خدا کے بیٹوں کی طبع شگفتہ ہوئی اور انھوں نے جان لیا کہ رفیوجی کی وفا پھل دار ہے اور خدا کے

بیٹوں نے کہا کہ دیکھو، ہم ہر رفیوجی کو جو پیدل ہیں اور گاڑیوں پر ہیں اور موٹروں پر ہیں، اور عورتیں جن کی غائب ہیں اور بچے جن کے فنا کے گھاٹ اتر چکے ہیں، اور ٹھکانا جن کا یہ زمین اور آسمان ہے، اپنے قبضہ میں رکھیں گے۔ کیونکہ ہم تمھارے درختوں سے پھل اتاریں گے کیونکہ ہم تمھارے خداوند خدا ہیں اور تمھاری حفاظت ہمارے سروں کے اوپر دھری ہوئی ہے اور تم کہ تمھاری ٹانگ قطع ہوگئی ہے اور تم کہ تمھاری چشم نکال لی گئی ہے اور تم کہ تمھارا ہاتھ شکستہ ہوگیا ہے اور ان سب کو کہ جو اَب ہمارے ہیں۔ ہم سب کی حفاظت کو اپنے سر پر لیتے ہیں، تب رفیوجیوں نے حوصلہ کیا اور نعرے لگائے اور کہا کہ ہمارا دھرم حیات پائے اور ہمارا مذہب ابد کا راز ڈھونڈے اور دشمن تہ و بالا ہووے اور پھر زمین ایک بار کانپی۔ مگر پھر خاموشی اختیار کی کہ خدا کا حکم اس پر بھی رواں تھا۔

باب سوم
خیموں کے بیان میں

یہ باب خیموں کے بیان میں ہے کہ خداوند خدا نے جن کو کھڑا کیا تھا اور شعور ایسا دے دیا تھا کہ رفیوجی بڑے فلاکت والے ہوں گے ان کے بدن شعلوں سے سوختہ ہوں گے اور ٹھکانا ان کا جستجو کرنا ہوگا۔ سو خداوند خدا کے بیٹوں نے خیمے کھڑے کیے۔ یہ بیان خیموں کے حال کا ہے۔

تو یوں ہوا کہ رفیوجیوں نے خیموں میں ڈیرا کیا۔ یہ خیمے اس پارچہ کے تھے جو خدا کے بیٹوں کی تحویل میں تھے اور ایک ایک خیمے میں رفیوجیوں کے دس دس خاندان سوئے بیٹھے اور جاگے۔ خدا کی اس دین پر شکرانہ بجالاؤ۔ ایسا خدا کے بیٹوں نے منادی کرائی۔ پھر خداوند خدا کا حکم ہوا کہ ان پارچے والے خیموں میں جاڑا آجائے گا، فلک سے بارش ہوگی۔ آفتاب اپنی حرارت تیز کرے گا لیکن تم ایثار اور عظمت اور الفت اس وطن والی سے تعلق رکھو۔ جس کی تمنا ہم رکھتے ہیں اس لیے ڈرنا مت۔ پھر رفیوجی ڈرنے لگے کہ وہ ڈر سے رہائی پانے میں ناکام ہوئے تھے۔ پھر خداوند خدا کے بیٹوں نے آٹا بھیجا۔ نخود بھیجا۔ کپڑے بھیجے کہ عریانی رفیوجیوں کے تمدن کا داغ تھی۔ پھر یوں ہوا کہ رفیوجیوں نے نخود چبائے۔ شکم ان کے درد کرتے تھے اور خدا کے بیٹوں نے

کہایہ درد، ایثار و قربانی کے باعث خلق ہوا ہے۔ مگر رفیوجیوں کا فہم خدا کے بیٹوں کی منطق سے دور ہی رہا۔ تب تو خدا کے بیٹے غضب آلود ہو گئے، مگر رفیوجی بھی غضب آلود ہونے پر آ گئے کہ انھیں پوشش کے لیے کپڑا نہیں ملتا تھا۔ آٹے میں صحراؤں کے پتھر اور کنکر اور ذروں کی آمیزش ہوتی۔ سو خداوند خدا کے بیٹوں نے غصہ کیا کہ تم ہمیں مطلق پسند نہیں آتے تو رفیوجی بڑے پریشان ہوئے، پریشانی اور سراسیمگی تو ان کی خُو ہے۔ خدا کے بیٹوں نے ایسا کہا۔

تفصیل ان خیموں کی یوں ہے کہ ایک دشت ہے بڑا طویل اور ان میں خیمے لگے ہوئے یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے چڑیلوں کے گھر اور پھر شرنارتھیوں کے رخ زرد ہیں۔ شکستہ اور دریدہ کپڑوں میں سے استخوان جھانکتے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں ٹوٹے ہوئے برتن ہیں اور آنکھوں میں اور لبوں پر انتظار ہے اور انتشار ہے، لنگر کی سیاہ روٹی کا، اور دال کا اور چاول کا اور خیموں میں ظلمت ہے اور عورتیں کہ جن کے بدن اطلس ہیں اور جو اپنے گھر سے باہر کی شکل کبھی نہیں دیکھ پائیں، عریاں ہیں اور خواب کرتی ہیں کہ خواب، عریانی کو پوشیدہ کرتا ہے۔

اور پھر خداوند خدا کے بیٹوں کے دل میں رحم جاگزین ہوا اور رفیوجیوں نے اس رحم کو عبث جانا کہ رضائیاں جو انھیں ملتی تھیں روئی ان کی باہر نکال لیتے تھے اور کپڑا اس رضائی کا ان کا ملبوس بنتا تھا اور پھر خدا نے کہا۔ اے لوگو! یعنی رفیوجیو! صبر کو اپنے کام میں لاؤ۔ سو رفیوجیوں نے صبر کو اپنے کام میں لیا۔ یعنی ننگے پڑے رہے، بھوکے مرتے رہے، چیختے چلاتے رہے۔ لیکن خدا نے کہا یہی تمھارا گھر ہے، اور تم غل مت مچاؤ۔ خداوند خدا کے بیٹے تمھاری پاسبانی کریں گے چنانچہ انھوں نے پاسبانی کی۔ غلاظت اور تعفن کہ خیموں کی مقدس روح تھی ہر جانب پھیل گئی، اور رفیوجیوں نے کہا۔ ہمیں ہیضہ سے مت مارو تو خداوند خدا کے بیٹوں نے ڈانٹا۔ کہ اے لوگو! صاف رہنا سیکھو، غسل روزانہ تمھارا شیوہ ہووے مگر شرنارتھیوں نے غسل کرنا نہ سیکھا بلکہ زیور بیچنے سیکھے، لڑکیاں فروخت کرنا مناسب سمجھا، خیمے میں مر جانے کو ترجیح کیا، اور یوں خداوند خدا کے عزیز بیٹے بیزاری میں غلطاں اور خیزاں ہوئے——"

بعد اس کے یوں ہوا کہ خداوند خدا نے خیموں میں اپنے فرشتے بھیجے کہ دال بانٹیں، کہ آٹا بانٹیں، کہ کپڑا بانٹیں، کہ رشوت کو پیدا کریں۔ سو فرشتوں نے آخری کام کیا اور پہلے تین کاموں کو

اپنے اہل نہ سمجھا اور رفیوجیوں نے کہا۔ خداوند خدا ہمارے ساتھ مذاق مت کرو اور بتاؤ ہم تمھاری کیا خدمت کریں! کہ ہماری شان میں برکت ہووے۔ مگر خداوند خدا تو فرشتے بھیج کر اپنے خواب حقیقی میں غلطاں ہوا۔ فرشتوں نے کہا۔ اے لوگو! تمھاری شکایت بے جا ہے۔ تمھیں مناسب ہے کہ ملک کا عذاب مت ثابت ہو اور خاموش رہو کہ خاموشی اور دانائی اور فراست کی نشانی تحریر ہے۔

اور یوں چھ مہینے کے دن رات گزرے۔ تب رفیوجیوں نے تفکر کیا کہ وہ جنگلی ہیں اور خدا کے فرشتوں نے بھی اس پر صاد کیا کہ واقع میں تم بالکل نکمے ہو۔ تمھارے ہاتھ پاؤں شکستہ ہیں، اور تم مانند بوجھ کے خداوند خدا پر نازل ہو۔ تمھیں مناسب ہے کہ تم ان خیموں سے باہر نکلو اور اپنی جورو کو ہمراہ اپنے لے جاؤ— اور اتنا وسیع میدان پڑا ہے جس پر خداوند خدا کی حکومت ہے اور اس میدان پر پھیل جاؤ اور یہاں سے فرار اختیار کرو کہ تم نے غلاظت کے انبار کو سارے ملک پر سوار کر دیا ہے، حجاب تمھارے اندر فوت ہو گیا ہے، مفت چنے چباتے چباتے تمھارے اعضا مفلوج ہو چکے ہیں۔

تب— فرشتوں کی یہ گفتگو خیمے والوں کے فہم سے بالا ہوئی اور وہ غل مچانے اور پریشان کرنے سے باز نہ آئے اور فرشتوں سے کہنے لگے۔ حجاب تو دراصل تمھارے اندر وفات پا گیا ہے۔ ہم تو کام کرنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ ہمیں راستہ دکھاؤ کہ ہماری چشم اندھی ہے اور فرشتوں نے رفیوجیوں کی اس گفتار پر بھی صاد کیا اور کہا کہ واقع میں تم اندھے ہو۔

اور یوں رفیوجیوں کی حیات معلّق ہوئی۔ کھانا جو انھیں ملا، تعفن سے لبریز تھا، کھانا جو انھیں ملا وہ پتھروں سے معمور تھا، کپڑا جو انھیں ملا، رسوائی اسکی دھجی سے جھانکتی تھی۔ کام جو وہ کرنا طلب کرتے تھے اس کا نشان غائب تھا۔ سو وہ کچھ نتیجہ اپنے تفکر کا برآمد نہ کر سکے اور ذلیل وخوار ہوتے رہے۔ جی ان کا پشت پر تھا جسم ان کا خیمہ میں تھا۔ کہ خداوند خدا کی جو تخلیق تھی اور تمدن کو جس پر افتخار تھا۔

تب رفیوجیوں نے زور زور سے چلا کر پکارا— خداوند خدا تمھارا خواب برحق ہے مگر ہمارا غوغا بھی ابطال نہیں ہے۔ ہم سے اپنے خیمے واپس لے لو۔ ہمیں اپنا سر پنہاں رکھنے کے لیے مکان دلوا دو۔ اور شکم بھرنے کے لیے رزق دلوا دو کہ تم نے عہد ہمارے ساتھ پاسبانی کا کیا تھا۔

سو خداوند خدا کی اور اس کے خاص بیٹوں کی نیند کھلی اور حکم ہوا کہ بکھر جاؤ۔ میری زمین کہ میری بادشاہت کہلاتی ہے اتنی وسیع ہے کہ تم غل مچا مچا کر ہماری حاصل کی ہوئی برکت میں اندیشہ ڈال رہے ہو۔ میں تمھیں اس کی سنگین سزا دوں گا تاایں کہ تم عبرت پکڑو۔

تب یوں ہوا کہ رفیوجیوں نے عبرت پکڑی، خیمے اُکھڑے اور خداوند خدا کے بیٹوں نے اپنے فرشتوں کو حکم دیا کہ ہمارے ان لوگوں کو بکھیر دو اور فرشتوں نے اس پر صاد کیا اور عمل کیا کہ فرشتے تو خداوند خدا کے فرماں بردار ازل سے تھے۔

باب چہارم
بحالی کے بیان میں

خداوند خدا کا، رفیوجیوں کا جو اس نے انجام کرنا تھا۔ اس کے بارے میں یہ بحالی کا بیان ہے۔ سو بحالی کیسے کی گئی اب اس باب میں کچھ بتائیں گے۔

اس باب کو ارفع کہا گیا کہ خداوند خدا کے تمام بیٹے اس میں آتے ہیں جن کی بادشاہت ہے، جن کی یہ ساری کائنات جڑوں کے نیچے ہے اور حکم جن کا تسلیم کرنے کے اہل ہوتا ہے اور بحالی کا معجزہ وہ سرزد کرتے ہیں اور معجزہ خداوند خدا کے بیٹوں ہی پر صادق آتا ہے کہ آدم کے ذلیل اور حقیر بیٹوں کو آتا ہی کیا ہے ماسوا رفیوجی ہونے کے سوا ایسا ہوا کہ بحالی ہوئی۔

چنانچہ رفیوجی اور ان کے بچے جن کا نصیب خیموں میں بچ جاتا تھا اور ان کی عورتیں کہ کھانستی تھیں، کہ محرقہ ہوتا تھا، کہ دِق، تنفس کرتا تھا، اور ان کے بوڑھے کہ جنبش ان کا عذاب تھی، سب خیموں سے کوچ کرایا گیا۔ کوچ سے شریانیں چلتی ہیں، دست اور پاؤ دورہ کرتے ہیں۔ ایسا خداوند خدا کے مقدس بیٹوں نے انھیں کہا۔

پھر یوں ہوا کہ خدا کے بیٹوں نے ایک محکمہ تحقیق کیا کہ ''پھر بساؤ'' اس کا اسم تعین ہوا۔ یہ محکمہ ایسا نہیں ہووےگا جیسا کہ دوسرے ہوویں، شرنارتھیوں نے ایسا تفکر کیا لیکن وہ محکمہ جیسا کہ توقع کے سامنے تھا ویسا ثبوت نہ ہوا۔ خدا کے بیٹوں نے کہا۔ اے لوگو! یہ محکمہ تمھارے واسطے ہے۔ خواص

وعوام اس کا فائدہ اٹھادیں، سو پھر فائدے کی حدیں بنیں تب رفیوجیوں کی بھی حدیں بنیں۔ کیونکہ وہ اپنی خاصیت الگ الگ رکھتے تھے۔ پھر خدا کے خاص فرشتے میدان میں اترے کہ عنان اس محکمہ کی سنبھالنا دانا لوگوں کے سوا امکان میں نہیں تھا۔ سوانھوں نے عنان سنبھالی اور قسمیں بنائیں۔ کہ قسمیں نوشتۂ تقدیر کا ثابت ہوئی تھیں کہ اس تعلق میں فرشتے مجبور و معذور و منظور تھے۔ نظر ان فرشتوں کی جگہ جگہ پڑی۔ دیہاتوں پر اور شہروں پر۔ کہ یہی وہ بڑے میدان بیچ اس کائنات کے پڑے تھے جن پر خداوند خدا نے بادشاہت کا اعلان کیا تھا، جو اس نے جاری کیا تھا۔

اور دیہات کا بیان یوں کیا ہے کہ زمین تھی جو سنسان تھی، اور ویران تھی اور خوشہ اور دانہ اگنا اس پر حرام ہو چکا تھا۔ بیچ ایک سال سے۔ اور خام اور شکستہ مکان تھے۔ کہ جانے والے جنھیں برباد کرنے کے درپے ہوئے تھے۔ تب خداوند خدا کے فرشتوں نے وہاں رفیوجیوں کو اتارا، اور کہا یہ وسیع ارض خداوند خدا کی ملکیت میں قبول ہوئی۔ سو تم اسے دیکھو، اور بعد دیکھنے کے مسرور ہووؤ۔ کہ خداوند خدا جو تمھارا، ہمارا سب کا بادشاہ ہے، اتنی خوب رُو اور طلائی شباہت اور صفت والی ارض رکھتا ہے، تب یوں ہوا کہ رفیوجیوں نے اس ارض سے آشنائی کی، تمنا کی، ایسی تمنا تو اشتراک کا عیب رکھتی ہے۔ ایسا خداوند خدا کے فرشتوں نے انھیں ڈرایا، سو رفیوجیوں نے ہاتھ باندھ لیے، پاؤں باندھ لیے اور بے گانگی کا تصور باندھا۔ پر زمین سے خوشہ بھی نہ اُگایا۔ کہ انھیں تو غصہ غالب تھا۔ وہ تو اشتراک کا عیب کرنا طلب کرتے تھے اور ایسا خدا کے حکم سے بعید تھا اور خلاف تھا اور جرم بھی تھا۔ اور ارض ہندستان کی اور پاکستان کی برداشت نہ کرے۔ یہ افتراق جو بے گانوں کا اور کافروں کا تھا۔ یوں خدا کے بیٹوں نے غصہ کیا۔

پھر خداوند خدا نے بڑے بڑے رفیوجی نکالے کہ بڑی زمینیں ان کے اختیار میں ہودیں۔ کہ جو پیچھے بھی اختیار ایسا جائز اور واجب کرتے تھے کہ ہُو اَب بھی خداوند خدا کے جسم میں روح کا مرتبہ تھے۔ سو ایسا ہوا کہ دیہات کی بڑی بڑی زمین ان میں بانٹی، جو جاگیر اپنا نام رکھتی تھی اور جاگیر دار نام رکھتے تھے۔ جو ان کے مالک خاص بنے۔ تب رفیوجی غصہ کرتے۔ وفدار سال کرتے۔ چشم میں آتش کا اثر دکھاتے۔ اور کہتے خداوند خدا! تو ہمیں کیوں فراموش کرتا ہے، اور اس عہد کو کہ پاسبانی کا کیا تھا اور ہم کو کہ ہم نے تجھے تاج دیا۔ تو خداوند خدا کا جواب ایسا ہوتا۔ کہ جاگیر

دار ہمارا اور ہم سب کا اور ہمارے سارے ملک کا کہ دیوتاؤں اور فرشتوں کا قیام یہاں ازل سے تھا احترام کا اہل ہووے۔ عزت اس کے نفس کی ہمارا فریضہ ہووے کہ اس کا علم اور رتبہ اور برکت وسیع ہے اور خطرہ بسیار پیدا کرنے والا ہے۔ سو اے لوگو! تم یوں کرو کہ شکرانہ ہمارا بجالاؤ کہ ہم نے تمھیں پھر وہی عزت بخشی جو تمھاری غلامی کا افتخار تھی اور تم ہُو تو اور یُو ڈالو زمین کو کہ سونا اگلنے والی ہووے اور محنت شاقہ کرو کہ محنت تو آزادی کا نقش پہلا ہے۔ پھل اُگاؤ بڑے شیریں کہ عظیم خدا اور اس کے فرشتے اور اس کے بیٹے اور اس کے وہ تمام حبیب جو قصرِ عظیم میں بیٹھے انتظار کرتے ہیں تعیش اور تفنن دیویں۔ تم غصہ کرتے ہو؟ کیوں کرتے ہو؟ تم تو مزارع ہو۔ محنت تمھاری خُو اور معذوری تمھارا استحقاق ہے۔ پھر روتے کیوں ہو؟ ایسا تفکر تو خدا کے قانون میں عیب ٹھہرے گا۔ اور خدا تم پر زحمتِ سخت نازل کرے گا جیسا کہ نوح کے وقت کیا تھا۔ اگر ایسا غصہ کرو گے۔

تب رفیوجیوں نے آہیں، کہ غلامی اور بیچارگی اور حسرت کی غمازی کرتی تھیں، بھریں۔ زمین روبرو تھی۔ فرشتوں کے احکام سر پر تھے۔ جاگیردار کا جلال احاطہ کیے ہوئے تھا اور بھوک اور تشنگی چیلوں کی مانند منڈلاتی پھرتی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ بادل گرجے، مینہ پڑا، اور زمین اپنی سیرابی کے عمل میں داخل ہوئی۔ اور ہل شانوں کے اوپر اٹھے، اور مواشی چلے اور پسینے چھوٹے۔ اور خوشے اُگنا آغاز ہوئے۔ تب خداوند خدا کے بیٹے غوغا مچانے لگے اور غوغا اس مرتبہ کا اُن پر مسرت والا ہوا کیونکہ رفوجی دانوں کا ڈھیر لگاتے اور جاگیردار کا کوٹھا بھر جاتا اور پھر یوں ہوا کہ وہ کوٹھا غائب ہوگیا۔ کہ بلیک مارکیٹ اس کا نام پڑا اور خدا کے فرشتوں نے اعلان نازل کیا کہ ملک میں کال کا آغاز ہوگیا ہے سو رفیوجی جو وقوف اس کال کا نہیں رکھتے تھے، پاگل ہونے پہ آئے، پریشان ہوئے، اور تفکر بسیار کرنے لگے۔ کہ کال کس باعث ہوا۔ کوئی کہتا۔ خداوند خدا سے استفسار کرنا عین موافق رہے گا۔ کہ ہل چلے، سیرابی ہوئی، محنت فریضہ ہوئی، پسینے چھوٹے، دانے ڈھیروں ڈھیر ہوئے تب کال کیوں پڑا؟— لیکن استفسار عیب تھا۔ خدا کے قانون میں ایسا کہیں نہیں لکھا تھا۔ خداوند خدا کے مقدس بیٹے تو خود سمجھتے تھے کہ کال کیوں پڑا؟ رفوجی تو نفرت کے وسیلہ میں پیدائش ہوئے۔ وہ اسباب کا علم صادق نہیں رکھتے تھے جو حقیقت میں کال کی خاطر وجود میں آئے۔

بعد اس کے یوں ہوا کہ زمین دیہات کی جاگیرداروں پر فیصل ہوئی۔ جیسا کہ خدا کے قانون میں کہا تھا اور جو رفیوجی بھی تھے، اور جو مزارع بھی رکھتے تھے۔ کہ وہ بھی رفیوجی تھے۔ رفیوجیوں کی قسمیں بیچ نکلیں، ایسا رفیوجیوں نے سوچا۔ جو جوتتے تھے۔ بوتے تھے۔ گندم کے خوشے اُگاتے تھے اور پھر تشنگی کرتے تھے اور دیکھتے رہتے تھے اور موت کے اسباب کی جانب متوجہ تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ مثل زمین کے مکانوں کی بھی قسمیں بنیں۔ کہ بڑے مکان تھے، چھوٹے مکان تھے اور بلند مکان تھے پھر پست مکان تھے اور شان والے مکان تھے پھر شکستہ اور بریدہ مکان تھے سو مکانوں کی تمام قسمیں قرار پائیں۔ تب رفیوجیوں کی قسموں نے مکانوں کی ان قسموں پر بھی صاد کیا اور عمل کیا اور خاموشی اختیار کی اور مکان جو رہائش کے اہل نہ ہووے۔ اُن میں حیا سے گزرنا لازم ٹھہرا۔ کیونکہ خداوند خدا بڑی اذیت اور تکلیف اور ابتلا میں تھا اور زر اور جواہر اس کا صرف بڑی مقدار میں ہووے گا۔ جو اس کے خزینے میں موجودگی نہیں رکھتا۔ ایسی منادی کرائی خدا کے فرشتوں نے۔ اور رفیوجیوں نے جسے ابطلا جانا۔ اور خداوند اس ابطلا کی خُو کو پہچان چکا تھا۔ اس خاطر ابطلا کا تصور عبث نکلا۔ اور غداری کہلایا۔

پھر شہروں کا بیان ہے کہ جہاں عالی شان قصر تھے، کوٹھیاں تھیں، اور کارخانے تھے اور تجارت کا زور بسیار رکھتے تھے اور جھونپڑیاں اور سوختہ مکان کہ رفیوجی چھوڑ گئے تھے، بھی نظر میں تھے۔ پھر ادھر بھی فرشتے تعین ہوئے جو بحالی کرتے تھے۔ اور رفیوجیوں کی تباہی کے اسباب جگہ جگہ سے فراہم کرتے تھے، کیونکہ تباہی تو رفیوجیوں کا مقسوم تھا اور فرشتے بیچارے مجبور تھے۔

پھر ایسا ہوا کہ ایک گروہ پیدا ہوا جو بالکل خداوند خدا کے بیٹوں کی مشابہت رکھتا تھا۔ سر اُن کا ایک سفید پارچہ سے آراستہ ہوا۔ اور وہ خدا کے بیٹوں کے حبیب کہلانے لگے اور وہ شہر کی بحالی کے ذمہ دار بنے تب شہر بحال ہونا آغاز ہوئے اور یوں ہوا کہ ایک کمیٹی ساخت ہوئی جو سفید اور سرخ پارچے والے سروں کا داؤں بنی۔ اور پھر جو مکان تھے اور جو کارخانے تھے، جو دوکانیں تھیں ان کی شطرنج بنی اور پھر انھوں نے وہ کھیل کہ رفیوجیوں کے فہم کی گرفت میں نہیں آتا تھا، کھیلا اور شدت اس کھیل میں ایسی ہوئی کہ مُہرے پر مُہرا مرا پھر اور مرا پھر اور مرا پھر نئے مُہرے آئے پھر وہ مرے۔ اور خداوند خدا کے بیٹوں کو یہ اچھا لگا کہ رفیوجیوں کا مرنا ایک قاعدہ والے سلسلہ میں ہے۔

پھر ایک لفظ اترا، خدا کے بیٹوں نے جسے "الاٹ" (Allot) کہا اور رفیوجیوں نے غلطی میں جسے "کاٹ" کہا۔ یعنی سفید پارچہ والے الاٹ کرتے تھے اور پھر کاٹ کرتے تھے اور رفیوجی اس بودہ مانند کو کہ اس الاٹ اور کاٹ کے بیچ میں آویزاں تھی، خداوند خدا کا شعبدہ تصور کرتے تھے۔ مگر خداوند خدا نے کہا۔ یہ ہرگز شعبدہ کی قسم میں نہیں ہے اسے تو بحالی کی صداقت کی ذیل میں لاؤ اور غلطی اس عمل میں مت پکارو جو ہمارے اختیار میں باعث اس وجہ کے ہے کہ ہمارے چین کی راہ مسدود ہووے۔

سو یوں ہوا اور یوں ہر شب اور ہر روز ہوتا۔ کوٹھیاں کہ عظیم احاطوں والی تھیں۔ گلستاں کہ خوبرو اور شیریں پھلوں والے تھے، کارخانے کہ پیداوار بسیار کرنے کا اختیار کرتے تھے۔ ٹرک کہ ترنم جن کا جواہر ریز ہوتا تھا، وہ تو سب عزت والے اور وقار کا شعور رکھنے والے اور سفید پارچے والے جیبوں میں بانٹے۔ کہ وہ رفیوجی بھی لازم تھے۔ مگر اعلیٰ قسم میں پھر ادنیٰ قسم رفیوجیوں کی تھی جو الاٹ کا غوغا بسیار کرتی تھی......اور خداوند خدا کے قانون کا سہارا بیشتر لیتی تھی، مقہور ہوئی اور معتوب ہوئی اور حال اُن کا یوں ہوا۔ کہ ایک شب ایک مکان میں ڈیرا کیا اور دوسری شب مع اسباب اور چیتھڑے اور گودڑوں کے بیچ سڑک پر نکال لیے گئے۔ پھر تیسری شب آئی اور دوسرے مکان کا الاٹ واجب ہوا۔ مگر یہ الاٹ محدود ہوتا اور امر اس کا یہ لازمی نہ ہوتا کہ الاٹ کو استقلال ہو۔ خداوند خدا کا قانون تو حرکت کے دوران میں تھا۔ اس باعث تنسیخ الاٹ کی فوراً ہو جاتی۔ اور رفیوجی تیسری شب بھر سڑک کا ڈیرہ دار ہوتا۔ یوں ہی ہمارے بس میں ہے خداوند خدا کے فرشتے ہر روز کہتے پھرتے، اور یوں بحالی کا سلسلہ ٹوٹنے سے محفوظ رہا۔

پھر—بعد یہ دیکھنے کے رفیوجیوں نے کہا، جو یوں صحیح ہے تو صحیح نہیں ہو، خدا کے بیٹوں نے کہا۔ کیسے صحیح نہیں ہوا؟ تو رفیوجی مائل بہ سکون ہوئے، کیوں کہ خداوند خدا کے بیٹے قید خانے رکھتے تھے۔ گارڈ اور پولیس اور فوج رکھتے تھے۔ کہ جو رفیوجیوں کو مائل بسکون کرنے میں وفاداری کامل دکھا دیتی، تمھیں ہراساں ہونا ہر حال میں لازم ہووے گا۔ خدا کے فرشتے ہر شب حکم سناتے پھرتے تھے۔

پھر ایسے ہی قرضہ کا بیان ہے، پھر روزگار کا بیان ہے کہ اعلیٰ فرقہ رفیوجیوں کا جن سے برکت حاصل کرتا تھا، اور یہ فرقہ تعداد اگرچہ قلیل رکھتا تھا مگر اثر وسیع رکھتا تھا، ان پر جو خداوند خدا کے بیٹوں کے حبیب تھے اور بادشاہت اور قانون کا حق فائق رکھتے تھے۔

تب ایسا ہوا کہ خداوند خدا کے بیٹوں نے عالم بھر میں مرتبہ پایا اور توقیر بے حد پائی۔ کہ جنھوں نے ایسی عالی شان بحالی کی تھی، اور ایسا ڈنکہ بجایا، بیچ سارے جہان کے کہ جن سے رسوخ قائم ہوا۔ قادر نے اسے قوت عطا کی اور وہ ابد تک رہوئے، اور عظمت اس کی سلطنت میں ہمیشہ دخل کرے۔ ایسا رفیوجیوں کو بتایا خداوند خدا کے فرشتوں نے اور دعا کی۔

اور رفیوجیوں نے جو یہ کہا اور اب پھر کہتے ہیں کہ وہ رسوا بسیار اور ذلیل بار بار ہوئے اور اپنا وطن ترک کیا اور بچے مروائے اور زوجائیں گم کرائیں اور اپنی الفت کہ پیدائش سے پہلے قائم رکھتے تھے، نثار کی، صلہ اس کا ملنے میں ہنوز نہیں آیا۔ سو گستاخی کرتے تھے۔ کہ خداوند خدا کے بیٹے زااس گستاخی کی دینے کا وقوف کامل رکھتے ہیں۔ ایسا قانون میں کہا ہے خداوند خدا کی اپنی خاص کتاب میں اور رفیوجیوں کی یہ آسمانی کتاب جو اتری ہے، اسے مورد جرم کا ٹھہراتے ہیں اور تشدد کی راہ گرداننتے ہیں سو رفیوجیوں پر لازم ہے کہ ایسا ہی تسلیم کریں۔ خداوند انھیں بے پایاں زحمت میں غرق کر دے گا۔ آمین۔

(یوسف ناظم)

انگریز ہندستان میں

ہم نے سنا تھا کہ کمپنیاں دوائیں، مشینیں، موٹریں، ریلیں، ہوائی جہاز اور وغیرہ وغیرہ بناتی ہیں اور بیچتی ہیں، یا ایسی کمپنیاں بھی ہوتی ہیں جو سرکس، تماشے اور مشاعرے دکھاتی یا سر میں درد پیدا کرنے والی فلمیں ڈھالتی ہیں۔ کمپنیوں کے بارے میں جب ہم نے یہ باتیں سُنی ہیں تو یقینا یہی باتیں آپ نے بھی سُنی ہوں گی۔ لیکن جب ہم نے اٹھارویں صدی کی تاریخ ہند اٹھا کر دیکھی تو ہماری عینک زدہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ آنکھوں کا اس طرح کھلا کا کھلا رہ جانا اچھا نہیں ہوتا لیکن اب یہ آنکھیں بس ایک ہی وقت بند ہوں گی۔ اٹھارویں صدی کی تاریخ ہند کے ذریعے ہمیں معلوم ہوا کہ کمپنیاں صرف دوائیں اور مشینیں بنانے یا فلمیں ڈھالنے کی نہیں ہوا کرتیں بلکہ حکومت کرنے کی بھی ہوا کرتی ہیں۔ حکومت کرنے والی کمپنیوں کے چاروں طرف سُرخاب کے پر اور پیشانی پر شرافت کی مہر لگی رہتی ہے۔ حکومت کا کاروبار کرنے والی ایسی ہی ایک کمپنی ہندستان آئی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی بڑی دریا دلی سے ہندستان پر حکومت کرتی تھی۔ اس وقت کا ہندستان آج کے ہندستان سے بہت بڑا تھا۔ یہاں تک کہ برما بھی جو بغیر استری کی جھالر کی طرح لٹکا رہتا تھا ہندستان ہی کا حصہ تھا۔ اُس پورے ہندستان پر یہی ایسٹ انڈیا کمپنی

حکمرانی کی خدمت انجام دیتی تھی۔ اس کمپنی کے مختلف کام تھے۔ مثلاً ہندستانیوں کو سدھارنا، انھیں مہذب، متین اور قاعدے قانون کا پابند بنانا۔ ہندستانی عورتوں کا زیور اپنے ہاتھوں بکوانا، ہندستانی علاقوں کی قیمتیں مقرر کرنا اور انھیں خرید کر فروخت کرنا اور پھر خریدنا، بلیک ہول بنوانا اور بہت سے ایسے کام کرنا جو عام انسانوں سے ممکن نہ ہوں۔ ان باتوں کی تفصیل ہم آپ کو ایک دم نہیں آہستہ آہستہ بتائیں گے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے سارے کام جن لوگوں نے انجام دیے انھیں گورنر اور وائسرائے کہا جاتا تھا۔ یہ سارے گورنر ایک ہی وضع کے تھے لیکن ان کے نام الگ الگ تھے۔ مثلاً کلائیو، ولزلی، وارن ہیسٹنگز وغیرہ وغیرہ۔

لارڈ کلائیو:

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

لارڈ کلائیو کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ خودکشی کا ماہر تھا۔ اس نے دو مرتبہ خودکشی کی اور دونوں مرتبہ صاف بچ گیا۔ اس کا پستوں ہی کچھ اس وضع کا بنا تھا جو اپنے مالک کو پہچانتا تھا۔

لارڈ کلائیو ایسٹ انڈیا کمپنی کا سچا سپوت تھا (پہلی اولاد ہی خاندان کے مستقبل کا ضامن ہوتی ہے) لارڈ کلائیو اتفاق سے میر جعفر کا منہ بولا والد بھی تھا۔ مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ لارڈ کلائیو فطرۃً شریف اور عادتاً نیک آدمی تھا۔ اُس کی پوری سوانح حیات ہمارے سامنے نہیں ہے لیکن اس کے بارے میں جو بھی معلومات ہمیں حاصل ہوئی ہیں وہ اس بات کی گواہ ہیں کہ اس بیچارے کی ساری زندگی دوسروں ہی کی بھلائی اور غم گساری میں کٹ گئی۔ لارڈ کلائیو خود کے لیے یا اپنی بیوی بچوں کے لیے ایک انشورنس پالیسی بھی نہیں لے سکا۔ شاعر کہتا ہے۔

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

لارڈ کلائیو بہت یاد رہے گا۔ اس کی غم خواری کی سب سے بڑی مثال لارڈ کلائیو اور میر جعفر کا یارانہ ہے۔ میر جعفر اصل میں اپنے بھٹکے ہوئے بھانجے سراج الدولہ کو سیدھے راستے پر چلانا چاہتا تھا اور یہ سب کچھ وہ اپنی بہن کی محبت کی وجہ سے کرنا چاہتا تھا۔ خود میر جعفر کی اس میں

اپنی کوئی غرض نہ تھی۔ وہ تو بڑا بے غرض آدمی تھا لیکن سراج الدولہ نے جیسا کہ نادان نوجوانوں کا وطیرہ ہے حکومت کے نشے میں اپنے شفیق ماموں کی ایک نہ مانی۔ میر جعفر کی بڑی سبکی ہوئی۔ یہ بہت بُری بات تھی بلکہ انسانیت کی توہین تھی اور کلائیو انسانیت کی توہین بالکل برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ یوں تو لارڈ کلائیو اور بہت سی باتیں برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن انسانیت کی توہین اس سے بالکل برداشت نہیں ہوتی تھی) یہ اس کی بچپن کی کمزوری تھی۔ (یہ کمزوری آخر تک دور نہیں ہوئی) کلائیو نے میر جعفر کے غم کو اپنا غم سمجھا۔ ہائے ہائے کیا ایثار تھا اور کیا بے پناہ شرافت تھی۔ ایک ہندستانی سے کسی غیر ہندستانی کی لازوال اور اٹل محبت کا یہ واقعہ آپ اپنی مثال ہے (بلکہ اپنی مثال بھی نہیں ہے) لارڈ کلائیو نے محبت کا ہاتھ (سیدھا ہاتھ) میر جعفر کی طرف بڑھایا۔ میر جعفر نے محبت کے اس ہاتھ کی طرف قدم بڑھایا۔ لارڈ موصوف ہی کی محبت اور توجہ کا نتیجہ تھا کہ پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کو معلوم ہوا کہ میر جعفر جیسے ماموؤں کا کہنا نہ سننے کا کیا نتیجہ ہوا کرتا ہے (یہ پلاسی کا میدان کہاں ہے ہمیں ٹھیک سے معلوم نہیں تھا— کلائیو نے میر جعفر کو بنگالہ کا نواب بنادیا کیوں کہ میر جعفر ہمیشہ کے لیے پلاسی کے میدان میں تو رہ نہیں سکتا تھا۔ کلائیو اس اہم کام سے فارغ ہونے کے بعد انگلستان چلا گیا۔ لیکن ہندستان کو اس کی غیر حاضری کھلنے لگی۔ اس لیے بنگال کے حالات دگرگوں ہونے سے پہلے اسے دوبارہ ہندستان آنا پڑا۔ اسے دوبارہ ہندستان آنے میں تکلیف ہوئی ہوگی لیکن کلائیو فطرتاً شریف اور عادتاً نیک تھا۔ اس لیے اس نے بڑی خوشی کے ساتھ یہ تکلیف برداشت کرلی۔ بنگال آکر کلائیو نے محسوس کیا کہ بنگالہ کا نواب بڑی بھاری انتظامی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اس لیے کلائیو نے طے کیا کہ بنگال کا سارا انتظام نواب کے سپرد ہے اور بنگال کی ساری آمدنی انگریزوں کو ملا کرے۔

ہندستانیوں نے بھی اس انتظام کو بہت پسند کیا۔ کیوں کہ ہندستانی روپیوں پیسوں کے معاملے میں دخل ہی نہیں دیا کرتے۔ اس کے بعد کلائیو پھر انگلستان چلا گیا کیوں کہ وہ تھا تو انگلستان ہی کا باشندہ لیکن اس کے جاتے ہی بنگال پر جیسے نحوست سی چھا گئی۔ صوبے کے سارے انتظامات تو نواب کے سپرد تھے صرف فوج اور خزانے پر انگریز قابض تھے۔ پھر بھی بنگال قحط کا شکار ہوگیا۔ اس میں ایسٹ انڈیا کا کوئی قصور نہ تھا۔ قحط انتظامات سے رک سکتا ہے نہ کہ فوج سے، اور

انتظامات تو جیسا کہ ہم آپ سے تین بار کہہ چکے ہیں نواب کے سپرد تھے۔ تاریخ کے حوالے سے اور واقعات کی روشنی میں قحط کا سہرا صرف نواب کے سر باندھا جاسکتا ہے۔ انگریزوں نے اس قحط کے لانے میں کوئی مدد نہیں کی۔

لارڈ کلائیو پر انگلستان کی عدالت میں مقدمہ بھی چلایا گیا لیکن اس معاملے میں تاریخ کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مقدمہ صرف رشک وحسد کی وجہ سے چلایا گیا۔ عدالت نے بہر حال لارڈ موصوف کو باعزت طریقے پر بری کر دیا۔ لارڈ کلائیو نے عدالت کا فیصلہ سُن کر ''انصاف زندہ باد'' کا نعرہ اس زور سے لگایا کہ ہندستان میں دو برس تک اس نعرے کی گونج برقرار رہی۔

لارڈ وارن ہیسٹنگز:

اک نگہ کر کے اُن نے مول لیا
بِک گئے ہم بھی آہ کیا سستے

1772 کا پُر بہار سال تھا جب وارن ہیسٹنگز بنگال کا گورنر بن کر ہندستان آیا (اے آمدنت باعثِ آبادیِ ما، یادہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے) وارن ہیسٹنگز لارڈ کلائیو سے زیادہ بلکہ بہت زیادہ محنتی اور شریف شخص تھا۔ بلکہ ہمیں تو شبہ ہوتا ہے کہ یہ شخص موروثی شریف تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے جسم کی ساری رگوں میں حتیٰ کہ رگِ حمیت میں بھی شرافت کا خون دوڑتا تھا۔ اس لیے وارن ہیسٹنگز نے کبھی اپنی فصد نہیں کھلوائی۔ فصد کھلواتا تو ساری شرافت باہر نکل پڑتی۔ وارن ہیسٹنگز نے بنگالہ کے نواب کو زیادہ تکلیف دینا گوارا نہ کیا اور کام کی زیادتی کے باوجود اس نے بنگالہ کے انتظامی امور بھی اپنے ذمے لے لیے۔ اس واقعہ سے ان لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہیے جو موقع بے موقع کام کی زیادتی کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔ اصل میں کام کرنے کی لگن ہونی چاہیے۔ اگر آدمی مکھیاں مارنا چھوڑ دے تو کام کے لیے کافی وقت اس کے پاس بچ رہے۔ وارن ہیسٹنگز نے بنگالہ کے نواب کو چھٹی دے کر ثابت کر دیا کہ کام کرنے کو جی چاہے تو آدمی سب کچھ کر سکتا ہے۔ وارن ہیسٹنگز نے نواب کو مزید سہولت یہ پہنچائی کہ ان کی پنشن بھی آدھی کر دی۔ ہمارا خیال ہے یہ اُس نے بہت اچھا کیا۔ فوج اور خزانہ تو پہلے ہی انگریزوں کے پاس تھا۔ اب انتظامات بھی انگریزوں کے ہاتھ آ گئے نواب کے پاس کرنے کو تھا کیا۔ جس کے لیے اتنی پنشن ان

کو دی جاتی، وارن ہسٹنگز کو نواب کی پنشن بالکل ہی بند کر دینی چاہیے تھی لیکن وہ آدمی موروثی طور پر شریف تھا اور موروثی طور پر جو لوگ شریف ہوا کرتے ہیں ان میں یہ بڑی کمزوری ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کی پوری پنشن بند نہیں کر سکتے۔

وارن ہسٹنگز نے انتظامی امور اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد یہ کیا کہ سارے انتظامی سر رشتوں میں انگریز عہدہ دار اور انگریز کلرک کھڑے کر دیے۔ انگریز عہدہ دار تو خیر اچھے دکھائی دیتے ہوں گے لیکن انگریز کلرک کچھ عجیب سے نظر آتے ہوں گے۔ انگریزوں کو کلرکی بالکل زیب نہیں دیتی۔ ہماری بینائی تو کچھ ایسی ہے کہ ہمیں ہر انگریز صورت شکل سے گورنر نظر آتا ہے۔ لیکن ہندستانیوں کی خاطر وارن ہسٹنگز نے گورنری کے قابل انگریزوں کو کلرک بھی بنا دیا۔ موروثی طور پر جو لوگ شریف ہوتے ہیں ان کی کمزوریاں قسم قسم کی ہوا کرتی ہیں۔

شاہ عالم کا نام ہمارے پیارے قارئین نے ضرور سنا ہوگا۔ یہ نادان شخص مرہٹوں سے مل گیا تھا۔ وارن ہسٹنگز چاہتا تو خود شاہ عالم کو کہیں بند کر دیتا لیکن اس نے صرف اس کی پنشن بند کر دی۔ شاہ عالم کی پنشن بند کر کے وارن ہسٹنگز کئی دن چھپ چھپ کر روتا رہا۔ اس زمانے میں ہارٹ اٹیک کی زیادہ سہولتیں نہیں تھیں ورنہ وارن ہسٹنگز اس غم میں اپنے آپ پر دو چار ہارٹ اٹیک بھی کروا لیتا۔

وارن ہسٹنگز محنتی، شریف اور کفایت شعار ہونے کے علاوہ بڑا اچھا تاجر بھی تھا۔ اس نے الہ آباد اور کڑے کے علاقے جو ایسٹ انڈیا کمپنی غالباً انگلستان سے اپنے ساتھ لائی تھی صرف پچاس لاکھ روپے میں نواب اودھ کو فروخت کر دیے بیوپاری طبقے کی رائے اس معاملے میں مختلف ہے۔ کچھ بیوپاریوں کی رائے ہے کہ اگر یہ علاقے کسی اور منڈی میں فروخت کیے جاتے تو دگنی ورنہ ڈیوڑھی رقم تو مل ہی جاتی۔ لیکن دوسرے چند بیوپاری حمل و نقل کی دشواریوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے وارن ہسٹنگز کی کاروباری سوجھ بوجھ کی تعریف کرتے ہیں۔ ہم بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ پچاس لاکھ معمولی رقم نہیں ہوتی اور یوں بھی وارن ہسٹنگز کا کام صرف علاقے بیچنا نہیں تھا۔ اُس غریب کے سامنے سینکڑوں مسئلے تھے اور وہ بے چارہ ان بکھیڑوں کے مارے راتوں کو سو بھی نہیں سکتا تھا۔

دُنیا میں دشمن کس کے نہیں ہوتے۔ وارن ہسٹنگز حالانکہ موروثی طور پر شریف تھا لیکن جو شخص دشمن بنتا ہے وہ لوگوں کے شجرے نہیں پڑھا کرتا۔ اس زمانے میں ایک شخص تھا نند کمار (یہ اس کا اصلی نام تھا۔ فلمی نہیں) اس شخص نے وارن ہسٹنگز کو بہت پریشان کیا۔ اس کی دیدہ دلیری ملاحظہ ہو کہ تھا تو وہ ہندستانی لیکن اس نے بنگال کے انگریز گورنر یعنی وارن ہسٹنگز پر عدالتی دعوے دائر کر دیا۔ وارن ہسٹنگز کی جگہ کوئی اور ہوتا تو نند کمار کے پرخچے اُڑا دیتا لیکن وارن ہسٹنگز نے اس معاملے میں بالکل اُلجھنا نہیں چاہا صرف دوستوں کے کہے سننے پر اس نے نند کمار پر سازش اور جعل سازی کا مقدمہ چلا دیا۔ ہمارے اس طرز بیان سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ مقدمہ فرضی تھا اور صرف انتقاماً دائر کیا گیا تھا۔ وارن ہسٹنگز کے بارے میں ایسا سوچنا بھی ظلم ہے۔ نند کمار پر تو اس سے بھی زیادہ شدید قسم کا مقدمہ چل سکتا تھا مثلاً ڈاکہ زنی۔ نقب اور قتل وغیرہ کا لیکن وارن ہسٹنگز نے ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ عدالت العالیہ نے بڑے غور و خوض کے بعد از راہ التفات اور بنظرِ کرم نند کمار کو موت کی سزا دی۔ حالانکہ نند کمار اس سے زیادہ سزا کا مستحق تھا۔ نند کمار خوش قسمت تھا کہ صرف پھانسی کی معمولی سزا پر بات ٹل گئی۔

ہسٹنگز بقول شخصے بہادر بھی تھا۔ بہادر تو سبھی انگریز ہوتے ہیں لیکن وارن ہسٹنگز ان میں ذرا زیادہ بہادر تھا اور جنگیں لڑنے سے مطلق نہیں گھبراتا تھا۔ اس نے اپنی پوری گورنری کے زمانے میں روہیلوں، مرہٹوں اور حیدر علی سے لڑائیاں لڑیں اور کسی کی جان کی پرواہ نہیں کی۔ ان لڑائیوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی کثیر دولت خرچ ہوئی (یہ ساری دولت انگلستان سے آئی تھی) وارن ہسٹنگز نے جب اپنے روپے پیسے کے گودام کو خالی پایا تو اس نے ہندستانی خواتین کی طرف توجہ کی۔ ہندستانی خواتین ازل سے زیور کی شوقین ہوتی ہیں۔ ہسٹنگز یوں بذاتِ خود خواتین سے مدد قبول کرنے کا مخالف تھا لیکن جب بیگماتِ اودھ نے خود اپنی مرضی سے زیورات وارن ہسٹنگز کی خدمت میں پیش کیے تو انگریزی تہذیب کے عین مطابق اُسے خواتین کا تحفہ قبول کرنا ہی پڑا۔ بیگماتِ اودھ کا زیور قبول کرنے کے بعد وارن ہسٹنگز کئی دنوں تک سنجیدہ اور رنجیدہ رہا۔

بنارس کے راجہ چیت سنگھ نے بھی وارن ہسٹنگز کو بہت تکلیف پہنچائی۔ ہسٹنگز کے طلب کرنے پر راجہ اسے روپیہ تو دے دیتا لیکن ٹال مٹول کے بعد۔ روپیہ دینے کا یہ طریقہ نہیں

ہوا کرتا۔ وارن ہیسٹنگز اصول اور ضابطے کا آدمی تھا۔ اُسے اپنے اصول کی خاطر بنارس جانا پڑا۔ تاہم اس نے راجہ چیت سنگھ سے زیادہ باز پرس نہیں کی۔ کیوں کہ وارن ہیسٹنگز اندرونی طور پر رحم دل آدمی تھا۔ اس نے زیادہ سختی کرنا مناسب نہیں سمجھا اور راجہ چیت سنگھ کو گدی سے اتار دیا۔ اتفاق سے ہیسٹنگز کی نظر راجہ کے بھانجے پر پڑی اور ہیسٹنگز کو یہ بھانجا اس قدر پسند آیا کہ اس نے اسے گدی پر بٹھا دیا۔ یہ بھی ہیسٹنگز کی شرافت تھی ورنہ وہ چاہتا تو کسی خوانچے والے کو یا بنارس کے کسی ٹھگ کو راجہ بنا کر رکھ دیتا۔ چیت سنگھ کے بھانجے کی گدی نشینی کی وجہ سے آج ساری دنیا میں ''صبح بنارس'' مشہور ہے۔

ہیسٹنگز کی یہی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے ہندستانی اسے بہت چاہتے تھے۔ ہندستانیوں کی اس شدید محبت کے جواب میں بے چارے ہیسٹنگز کو بڑی لمبی مدت تک ہندستان میں رہنا پڑا۔ اس کی حکومت کے تیرہ سال اس لحاظ سے یادگار سال ہیں کہ اس مدت میں ہندستانیوں نے انگریزوں پر بھروسہ کرنے کی عادت ڈال لی۔ وارن ہیسٹنگز ہی کے زمانے میں ہندستانیوں نے اپنی دولت انگلستان کو منتقل کی ورنہ یہ دولت یوں ہی ہندستان میں پڑی سڑا کرتی اور پھر کسی دن کوڑیوں کے مول بک جاتی۔

وارن ہیسٹنگز ہی کے زمانے سے ہندستانیوں نے انگریزوں کو اپنا محافظ سمجھنا شروع کیا۔ اگر یہ شریف آدمی ہندستان نہ آتا اور آ کر اس اُجاڑ ملک میں اپنی زندگی کے بیش قیمت تیرہ سال نہ گزارتا تو غریب ہندستانی پتہ نہیں کتنی نعمتوں سے محروم رہ جاتے۔

لارڈ کارنوالس:

لارڈ کارنوالس کا ذکر کرتے ہوئے ہم آپ کی خدمت میں کوئی شعر پیش نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ یہ شخص جس کا نام ہی عجیب و غریب تھا۔ کچھ یوں ہی سا آدمی تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ (حالانکہ دونوں چیزیں دیکھنے کی ہوتی ہیں) اور بیٹھے بٹھائے دفتروں کے ملازموں کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا۔ جس کی بالکل ضرورت نہ تھی۔ کارنوالس کی اس حرکت کا مہلک نتیجہ یہ ہوا کہ رشوت ستانی میں کمی ہو گئی۔ اور عوام اور ملازمین دونوں پر بہت بڑا اثر پڑا۔ بغیر سوچے سمجھے کوئی کام کیا جائے تو نتیجہ ہمیشہ خراب نکلتا ہے۔

اس کے عہد کا ایک اور اہم واقعہ یہ ہے کہ اس نے بنگال میں استمراری بندوبست نافذ کر دیا (استمراری بندوبست اگر آپ نہیں سمجھتے ہیں تو جانے دیجیے۔ ہم بھی اس کا مطلب نہیں سمجھتے) اس بندوبست کے طفیل غریب اور بے کس زمینداروں کی جان میں جان آئی۔ (جان میں جان آنا ایک قسم کا عمل ہوتا ہے جو صرف استمراری بندوبست سے پیدا ہوتا ہے) اس بندوبست کی وجہ سے بنگال میں امن واماں کی فضا قائم ہوگئی۔ کیوں کہ سرکش کاشت کار پوری طرح شریف زمینداروں کے قبضے میں آگئے تھے۔ سب لوگ چین کی بانسری بجانے لگے بلکہ بعض لوگ تو ناچنے بھی لگے۔ ایک اور کام کی بات جو کارنوالس کے زمانے میں ہوئی وہ سرنگاپٹم کی لڑائی تھی۔ انگریزوں کو یوں دیکھا جائے تو لڑائی جھگڑا بالکل پسند نہیں لیکن مجبوری بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ اس جنگ میں انگریزوں کو دل پر جبر کر کے حصہ لینا پڑا ورنہ ہندستانیوں کا بہت نقصان ہو جاتا اور ممکن ہے وہ کہیں کے نہ رہتے۔ اس اندیشے کی وجہ سے کارنوالس نے اس لڑائی میں بذات خود سپہ سالاری کے فرائض انجام دیے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اسے اس خدمت کا بھاری انعام ملتا۔ لیکن فتح پانے پر میسور کا صرف نصف علاقہ اور تین لاکھ روپے کمپنی کو ملے اور اس معمولی رقم میں سب اتحادی برابر کے حصہ دار ٹھہرائے گئے۔ اب آپ حساب کر کے دیکھیے تو کمپنی کے پاس بچا کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی نرم دلی اور بردباری کی وجہ سے ہمیشہ گھاٹے میں رہی۔ سرنگاپٹم کی لڑائی کے بعد کارنوالس کے لیے اور کوئی دل چسپ کام ہندستان میں باقی نہیں رہا۔ اس لیے وہ خوشی خوشی اپنے وطن واپس ہوگیا۔ واپس ہوتے وقت وہ اتنا خوش تھا کہ اس کا سایا اس کے جسم سے دو قدم آگے تھا۔

لارڈ ولزلی:

آئی جو ان کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقشِ ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

ولزلی سے پہلے اور کارنوالس کے بعد یعنی ایک کے آنے سے پہلے اور ایک کے جانے کے بعد۔ ان دونوں کے بیچ میں سر جان شور ہندستان کا حکمران رہا۔ شور اس کا تخلص نہیں نام تھا۔ سر جان شور کے زمانے میں انگریز ذرا آرام طلب ہو گئے تھے اور انھوں نے طے کر لیا کہ وہ ہندستان کے کسی معاملے میں دخل نہیں دیں گے۔ اصل میں ہندستانی ان بے چارے انگریزوں کو

ستاتے بھی بہت تھے اور انگریز جو یہاں صرف تجارت کرنے کی نیت سے آئے تھے ان کے روز روز کے جھگڑوں سے اکتا گئے تھے۔ کیوں کہ انگریز بھی آخر آدمی ہوتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے طے کرلیا کہ بس چُپ چاپ بیٹھے رہو۔ ان کی اس پالیسی کو تاریخ میں عدم مداخلت کی پالیسی کہا جاتا ہے۔ سرجان شور کے زمانے میں بس یہی ہوتا تھا کہ دخل مت دو۔ سرجان شور اس دخل مت دو سے عاجز آ گیا اور اپنے وطن واپس ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد ہندستانیوں کا حقیقی دوست ولزلی ہندستان تشریف لایا۔ ولزلی نے ہندستان پہنچتے ہی ہندستانیوں کے مسائل پر توجہ کی اور ہندستانی حکمرانوں کو طاقت ور بنانے کے لیے اس نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندستانی حکمران اپنے اپنے علاقے میں ایک انگریزی فوج رکھے (اس تجویز کو پیش کرتے وقت لارڈ ولزلی نے اس بات کی بالکل پرواہ نہ کی کہ اس طرح انگریزوں کو کتنی تکلیف ہوگی) لارڈ ولزلی کی یہ تجویز ہندستانی حکمرانوں کو بہت پسند آئی اور اس کے جواب میں انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ انگریزی فوج کے سارے اخراجات ہندستانی حکمران برداشت کریں گے۔ ولزلی کو ہندستانی حکمرانوں کی دل شکنی گوارا نہ تھی۔ اس لیے یہ طے ہو گیا کہ ہر ہندستانی علاقے میں اس علاقے کے خرچ پر چاہے کتنی ہی تکلیف ہو ایک انگریز فوج رہا کرے گی۔ لارڈ ولزلی نے اس انتظام کے علاوہ ہندستانی حکمرانوں کو اس بات پر بھی راضی کرلیا کہ کوئی ہندستانی حکمران اپنے کسی پڑوسی کے ساتھ دشمنی یا دوستی نہیں کرے گا۔ جس سے انگریزوں کا کوئی معاہدہ ہو۔ ہندستانی فطرتاً تنہائی پسند ہوتے ہیں۔ انھوں نے اس تجویز کا بھی خیر مقدم کیا اور کہا کہ کیا پڑی ہے کہ ہم کسی پڑوسی حکمران سے دوستی کریں۔ وہ اپنی جگہ خوش اور ہم اپنی جگہ خوش۔ ہندستانیوں نے اس طرح خود اپنی سہولت کی خاطر انگریزوں کا کہنا مان لیا۔ یہ کوئی سیاسی فعل نہیں اخلاقی فریضہ تھا۔ سب سے زیادہ اخلاق کا ثبوت نواب اودھ نے دیا۔ اس نے ولزلی کے ایک اشارے پر اپنا نصف علاقہ انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ اسی واقعہ کی بنا پر شام اودھ مشہور ہے۔

لارڈ ولزلی کے زمانے میں انگریزوں کو اور بھی بہت سے علاقے ملے اور ان سب کی حفاظت ان کے لیے دردِ سر ہو گئی اگر ایسٹ انڈیا کمپنی عجلت نہ کرتی تو وہ دن دور نہیں تھا کہ ہندستانی حکمران اپنے علاقوں کو انگریزوں کے سپرد کرنے کے بعد باہر کے علاقے بھی لالا کر انگریزوں کے

حوالے کرتے۔ لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی نے ولزلی کو فوراً انگلستان بلوالیا اور اس کی جگہ اسی پہلے والے کارنوالس کو دوبارہ ہندستان بھیجا۔ لیکن کارنوالس کمزور دل کا آدمی تھا وہ کمپنی کے اس احسان کو برداشت نہ کرسکا اور تین مہینے کے مختصر عرصے میں ہندستان ہی میں انتقال کر گیا۔

کارنوالس پہلا انگریز تھا جس نے ہندستان جیسے ملک میں مرنا قبول کیا تاہم، ہم یہ بات یاد دلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ جس وقت کارنوالس ہندستان میں مرا، ہندستان انگریزوں کے لیے ''دیارِ غیر'' نہیں ان کا اپنا ہی وطن تھا۔

انگریزوں نے شاید کارنوالس کے متعلق یہ رائے قائم کرلی تھی کہ اس شخص کی عادتیں اتنی بگڑ چکی ہیں کہ وہ سوائے ہندستان کے کہیں اور نہیں رہ سکتا۔ انگریزوں نے اپنی اس قیمتی رائے کی بنا پر اسے دوبارہ ہندستان کو برآمد کیا۔ ہندستان واپس آتے آتے کارنوالس اتنا عمر رسیدہ ہوگیا تھا کہ مزید عیش نہیں کرسکتا تھا۔ انگریزوں میں ہمیشہ سے قاعدہ ہے کہ اگر وہ کسی دوسرے ملک میں وہاں کے خرچ پر عیش نہیں کرسکتے تو مر جاتے ہیں۔ کارنوالس نے بھی یہی کیا۔ اُس کی مرضی، اس زمانے میں انگریز کی مرضی میں کون دخل دے سکتا تھا۔ (یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ لارڈ کارنوالس کا کریا کرم ہندستان میں ہوا یا اس کا تابوت ہندستان کے خرچ پر انگلستان بھیجا گیا)۔

سر جارج بارلو:

کارنوالس جب ہندستان میں مر گیا تو انگلستان والوں کو معلوم ہوا کہ ہندستان میں انگریز بھی مرسکتے ہیں، کمپنی نے چاہا وہاں سے کسی شخص کو تلاش کرکے یہاں گورنری کے لیے بھیجا جائے۔ لیکن کارنوالس کی وفات کی وہاں ایسی دھاک بیٹھی کہ ہر کسی نے ہندستان آنے سے انکار کردیا۔ اب کمپنی کسی ہوٹل کے بٹلر کو تو گورنری کے لیے نہیں بھیج سکتی تھی۔ اس لیے کمپنی نے ہندستان ہی میں مقیم افسروں کی تصویروں کا معائنہ کیا اور کمپنی کی نظر سر جارج بارلو کے فوٹو پر ٹھہر گئی۔ یہ شخص اس وقت کونسل کا سینیئر ممبر تھا اور صورت شکل سے گورنر دکھائی دیتا تھا۔ کمپنی نے اسے ہی ہندستان کا ایکٹنگ گورنر جنرل بنادیا اور سر جارج بارلو دو سال تک گورنر جنرل کی ایکٹنگ کرتا رہا لیکن اسے ایکٹنگ بالکل نہیں آتی تھی۔ ساری پکچر ستیاناس ہوکر رہ گئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی پچھتاتے پچھتاتے تھک گئی۔ سر جارج بارلو اپنے سر پر کوئی بار نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس نے ہندستانیوں کو اس

بات کا موقع دیا کہ وہ جو چاہیں کریں اور آپ جانتے ہیں کہ ہندستانی اپنے آپ کو نقصان پہنچانے کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں۔ سر جارج بارلو کے زمانے میں مرہٹوں نے دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی۔ رنجیت سنگھ نے بھی دوسری ریاستوں کے حکمرانوں کو اپنا ہم نوا بنالیا۔ کیوں کہ رنجیت سنگھ کہا کرتا تھا۔ ہموا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں۔ ٹراونکور میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ راجپوتانہ اور بندھیل کھنڈ میں پنڈاریوں نے ڈاکہ زنی کے فن میں نام پیدا کیا۔ (ہندستانی ہمیشہ کچھ نہ کچھ پیدا ہی کرتے رہتے ہیں) سر جارج بارلو نے اپنی ایکٹنگ کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس نے ہولکر اور سندھیا سے مصالحت کر لی لیکن اس سے پہلے بسین میں جو معاہدہ ہوا تھا اسے مسکرا کر بھول گیا۔ یوں بھی معاہدے اس لیے نہیں کیے جاتے کہ ان کی پابندی پر وقت ضائع کیا جائے۔ ہمیں سر جارج بارلو سے کوئی شکایت نہیں۔ اگر کمپنی ایسے دو چار بارلو اور بھیج دیتی تو شاید یہ نتیجہ ہوتا کہ انگلستان سے گورنر آنے کے بجائے ہندستان سے انگلستان کی طرف گورنر بھیجے جانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا لیکن کمپنی نے شرافت سے کام لیا اور سر جارج بارلو کو انگلستان بلوالیا اور اس کی جگہ لارڈ منٹو کو ہندستان روانہ کیا۔ یہ ۱۸۰۷ء کا واقعہ ہے نجومیوں کا کہنا ہے کہ ہر صدی کا ساتواں سال بہت اہم ہوا کرتا ہے۔ لارڈ منٹو کے ہندستان آنے کے بعد اور بھی منٹو یہاں پیدا ہوئے لیکن وہ ہندستانی تھے۔

لارڈ منٹو:

لارڈ منٹو نے ہندستان میں چار سال عیش کیا۔ اس کی نظر بڑی تیز تھی۔ جوں ہی اس نے ہندستان کی سرزمین پر قدم رکھا اسے معلوم ہو گیا کہ عدم مداخلت کی پالیسی نے انگریز جیسی مہذب اور شریف قوم کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ لیکن منٹو بڑا افسانہ نگار قسم کا آدمی تھا اس نے کمپنی کو پالیسی بدلنے کے بارے میں نہیں لکھا۔ کیوں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی شاید پالیسی بدلنے کی بجائے گورنر جنرل ہی کو بدل دیتی۔ اس نے کمپنی سے صرف اجازت مانگی کہ خاص خاص موقعوں پر ہندستانیوں کی بہبود کی خاطر ان کے معاملات میں دخل دینے کی اجازت دی جائے (لارڈ منٹو ہی کے زمانے میں یہ دستور بنا کہ عنوان الگ ہو اور عبارت الگ) کمپنی کی سرکاری پالیسی عدم مداخلت کی تھی اور عمل دخل در معقولات کا تھا۔ لارڈ منٹو نے بندھیل کھنڈ کے پنڈاریوں کو ڈاکہ زنی کے فن کی ترقی میں

حصہ لینے سے بالکل منع کر دیا۔ بندھیل کھنڈ میں سوائے ڈاکہ زنی کے اور تھا کیا۔ لارڈ منٹو کی وجہ سے یہ رونق بھی جاتی رہی۔ ٹراونکور میں چند لوگ بغاوت کی فکر میں تھے۔ منٹو نے ان لوگوں کو بھی اس فکر سے نجات دلا دی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ فکرمند رہیں۔ ہندستان میں جو کچھ بھی بے فکری ہے وہ لارڈ منٹو ہی کی ایجاد ہے۔ اس زمانے میں مدراس کے علاقے کے انگریز افسر بھی کچھ زیادہ شوقین ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کو اپنی دال روٹی کی فکر تھی۔ دال روٹی صرف محاورہ ہے ورنہ انگریز کو دال سے کیا تعلق۔ لارڈ منٹو نے ان انگریز افسروں کی بھی گوشمالی کی اور انھیں ٹھیک سے کھانا کھانا سکھایا (یعنی ایٹی کیٹ) لارڈ منٹو نے رنجیت سنگھ کو بہلا لیا اور جمنا اور ستلج کے بیچ کے علاقوں میں جتنے بھی سکھ فرمانروا تھے ان سے کہہ سن کر ان علاقوں میں بھی اپنا دخل تسلیم کروالیا۔ حد یہ ہو گئی کہ اس نے ایران اور افغانستان کی طرف بھی دوستی کا ہاتھ بڑھایا (منٹو کے ہاتھ تھے ہی لمبے) لیکن ہوا یہ کہ ان ملکوں کی طرف جو لوگ بھیجے گئے وہ ناکارہ نکلے۔ حالانکہ انگریز جیسی کارگزار قوم میں ناکارہ لوگ پیدا ہی نہیں ہوتے۔ ممکن ہے ایران اور افغانستان کے پانی میں کچھ خرابی ہو۔ لارڈ منٹو میں ان خوبیوں کے علاوہ ایک اور خوبی یہ تھی کہ وہ تلوار چلانا بھی جانتا تھا۔ جب انگلستان اور فرانس میں جنگ چھڑی تو اس نے اس معاملے میں بڑی دلچسپی لی اور جاوا کی مہم میں خود شریک ہوا۔ جب وہ جاوا کی مہم سے ہندستان کی طرف واپس ہو رہا تھا تو اسے اطلاع ملی کہ اس کی جگہ ایک اور شخص، ارل آف موئرا، عرف مارکوئیس آف ہیسٹنگز کو ہندستان کا گورنر جنرل بنا دیا گیا ہے۔ لارڈ منٹو کا چونکہ کوئی عرف نہیں تھا اس لیے وہ انگلستان واپس ہو گیا۔ لارڈ منٹو کے زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی بہت تندرست ہو گئی تھی اور دور دور تک اس کی عمدہ صحت کا شہرہ تھا یعنی چرچا تھا۔ کمپنی کے ہاضمے کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ایسا عمدہ ہاضمہ کسی اور قوم کو نہیں ملا۔ اسی لیے انگریزوں کی تہذیب میں ڈکار لینا بالکل منع ہے۔

مارکوئیس آف ہیسٹنگز:

ذرا حسرت موہانی کا یہ شعر پڑھیے ۔

کس سلیقے سے کیا ذبح کہ دامن ان کا
خونِ عشاق سے گلنار نہ ہونے پایا

ہسٹنگز نام کا ایک عدد گورنر اس سے پہلے بھی ہندستان میں گزرا تھا لیکن اس ہسٹنگز میں اور اس ہسٹنگز میں وہی فرق ہے جو بگھی کے گھوڑے اور ریس کے گھوڑے میں ہوتا ہے۔ انگریزوں میں بڑے آدمیوں کی چار قسمیں ہوا کرتی ہیں۔ سر، لارڈ، مارکوئیس اور ہٹلس (یہ ہٹلس ذرا دیر سے پیدا ہوئے) یہ شخص جو لارڈ منٹو کے بعد ہندستان آیا مارکوئیس تھا اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں یہ ارل بھی تھا۔ ارل وہی شخص ہوتا ہے جس کی قسمت میں آگے چل کر مارکوئیس ہونا لکھا ہوتا ہے۔ ارل قسم کے لوگوں کو بھی کوئی خاص تکلیف نہیں ہوا کرتی لیکن مارکوئیس ہونا زیادہ مفید ہوتا ہے۔ مارکوئیس آف ہسٹنگز کامل دس سال تک ہندستان میں گورنر جزلی کرتا رہا۔ اس مارکوئیس کو ہم ہندستانی بہت مانتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ پہلا مارکوئیس تھا جو ہندستان آیا ورنہ ہندستان کی قسمت میں مارکوئیس کہاں لکھے تھے۔ دوسرے یہ کہ یہ تھا ہی گریٹ آدمی، اس نے اپنا پسینہ اور ہندستانیوں کا خون بہا کر ہندستان میں انگریزی حکومت کی جڑیں مضبوط کر دیں ورنہ ہندستانی بالکل ترقی نہیں کر سکتے تھے۔

ہندستانیوں کی ترقی کے لیے مارکوئیس آف ہسٹنگز نے کئی جنگیں لڑیں۔ سچ پوچھا جائے تو ہندستان پہنچنے کے ساتھ ہی وہ جنگوں میں مبتلا ہو گیا۔ پہلی جنگ اُس نے نیپالیوں سے لڑی، اصل میں گورکھوں نے انگریزوں کی شرافت کو غلط نمبر کی عینک سے دیکھا اور یہ سمجھ بیٹھے کہ انگریز صرف مسخرے ہیں۔ اس غلط فہمی کی بنا پر گورکھوں نے انگریزوں کے کوئی دو سو دیہاتوں پر قبضہ کر لیا اور یوں انجان بن گئے جیسے انھوں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ دو سو دیہات تھوڑے نہیں ہوتے۔ ہسٹنگز نے پہلے تو گورکھوں سے درخواست کی کہ ان کے یہ دیہات انھیں واپس کروائے جائیں۔ لیکن گورکھے درخواستیں اور استدعائیں سننے کے عادی نہیں ہوتے اس لیے وہ ٹال گئے۔ ہسٹنگز۔ یعنی یہ مارکوئیس آف ہسٹنگز ہندستان میں جھولا جھولنے یا آم کھانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ اسے اپنے دیہات واپس چاہیے تھے۔ اس نے گورکھوں سے میدان جنگ میں ملاقات کرنا مناسب سمجھا اور نیپال پر چار طرف سے حملہ کیا۔ کیوں کہ نیپال کی چار سمتیں تھیں۔ اس چورخی حملے میں تین طرف سے حملہ کرنے والی فوجیں تو پسپا ہو گئیں کیوں کہ وہ بھیجی ہی پسپا ہونے کے لیے گئی تھیں۔ لیکن چوتھی بٹالین بہت خوبصورت ثابت ہوئی اس کا جزل تھا اکٹرلونی۔ اکٹرلونی بادام، پستے، اور چلغوزے

کھایا ہوا اور اعلیٰ درجہ کی شرابیں پیا ہوا جنرل تھا۔ اس نے جو آگے کی طرف بڑھنا شروع کیا تو بڑھتا ہی چلا گیا اور نیپال کے صدر مقام کھٹمنڈو تک پہنچ گیا۔ گورکھوں کو اس کی بہادری بہت پسند آئی اور انھوں نے اس سے صلح کر لی۔ اس کا صلح کا معمولی نتیجہ یہ ہوا کہ جمنا اور ستلج کے بیچ کے سارے ضلعے انگریزوں کو اپنے قبضے میں لینا پڑے۔ ساتھ ہی ساتھ شملہ، مسوری، اور نینی تال جیسے لاحول والے مقامات بھی انگریزوں ہی کے سر تھوپے گئے۔ انگریزوں نے مجبوراً ان مقامات کو ہل اسٹیشن بنا دیا۔ اور گرمیوں میں وہاں جا کر اپنی صحت بنانی شروع کر دی۔ نیپالیوں نے اس کے علاوہ ایک انگریز کو اپنے ہاں ریذیڈنٹ بنا کر رکھنا قبول کر لیا۔ اور اس وقت سے انگریزوں کے نہایت وفادار دوست بن گئے اور عرض کیا۔

نہیں معلوم کیا واجب ہے کیا فرض
مرے مذہب میں ہے تیری رضا فرض

نیپالیوں کو دوست بنا لینے کے بعد ہسٹنگز نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اس کی نظر پنڈاریوں پر پڑی۔ پنڈاری تعداد میں کوئی پچاس ہزار ہوں گے ان لوگوں نے بندھیل کھنڈ کے علاقے میں ڈاکہ زنی کے سماجی ادارے کھول رکھے تھے۔ وارن ہسٹنگز کو اس طرح کے علی الاعلان ڈاکے ڈالنے کا طریقہ سخت ناپسند تھا۔ یوں بھی انگریز کسی اور کو ڈاکہ ڈالتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہسٹنگز نے ان پنڈاریوں پر اپنی عمر کے چار قیمتی سال صرف کیے اور آخر میں صرف ہسٹنگز ہی زندہ بچا۔ ہسٹنگز نے مرہٹوں سے بھی جنگ لڑنے میں تکلف سے کام نہیں لیا۔ مارکویس آف ہسٹنگز نے تھوڑے ہی عرصے میں مراٹھا حکمرانوں اور راجپوتانے کے حکمرانوں کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ لوگ انگریزوں کے ساتھ اٹھیں گے، بیٹھیں گے، کھانا کھائیں گے اور کبھی کبھار پکنک وغیرہ میں بھی حصہ لیں گے۔ ان ساری باتوں کو انگریزوں نے کاغذ پر لکھا اور سب فرماں رواؤں کے دستخط لیے۔ (اس طرح آٹوگراف لینے اور آٹوگراف دینے کی رسم کا آغاز ہوا) ان کاغذوں کو صلح نامے کہا جاتا ہے۔ انگریز صلح ناموں کے ماہرین مانے جاتے ہیں انگریز ہیں ہی صلح کل آدمی، انھوں نے کبھی اپنا فائدہ نہیں دیکھا اور آنکھ بند کر کے صلح کر لی۔ ان کے اس طرزِ عمل سے ہمیشہ ان کا نقصان ہوا۔ نیپالیوں، مرہٹوں اور راجپوتوں سے صلح کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستان میں انھیں اور کئی

سال رہنا پڑا۔ ہر معاملے میں انھیں ہی مشورہ اور حکم دینا پڑا۔ مارکویس آف ہیسٹنگز چونکہ مکمل آدمی تھا اس لیے دس سال کے عرصے میں اس نے صرف ۲۰ لڑائیاں لڑیں۔ صرف ۱۲۰ قلعے فتح کیے اور صرف ۱۹ برائے نام صلح ناموں پر دستخط کیں۔ مارکویس آف ہیسٹنگز واقعی بڑا پیارا آدمی تھا۔ ہمیں تو جب بھی اس کی یاد آتی ہے ہم تقریباً رو دیتے ہیں۔

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کو دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

لارڈ ایمہرسٹ:

لارڈ ایمہرسٹ بچپن ہی سے اس بات کا عادی تھا کہ جہاں جاتا وہاں جی بھر کر رہتا، اصل میں اس کی کئی خالائیں تھیں اور یہ عام طور پر انھیں کے ہاں رہا کرتا تھا یہ شخص ہندستان میں بھی پانچ سال رہا۔ اُس زمانے میں جتنے بھی انگریز یہاں آئے بہت مصروف رہے۔ ان کا شام کا وقت بھی جو تفریح کا وقت سمجھا جاتا ہے جنگوں میں خرچ ہو جایا کرتا تھا اور یہ انگریزوں ہی کی بردباری تھی کہ جنگوں کے معاملے میں ان کی پیشانی پر کبھی کوئی بل نہیں آیا۔ لارڈ ایمہرسٹ نے یہاں آنے کے بعد مشرق کی سمت نظر دوڑائی تو اسے برما کا علاقہ نظر آیا۔ برمیوں کے رنگ میں اسے اپنے رنگ کی جھلک نظر آئی اور آپ جانتے ہیں کہ انگریز رنگ کا کتنا عاشق ہوتا ہے۔ اس نے طے کرلیا کہ برمیوں سے دوستی کرنی ہی چاہیے۔ انگریز جب کوئی بات طے کر لیتے ہیں تو اس پر بار بار سوچا نہیں کرتے (بار بار سوچنے والی قومیں دوسری ہوتی ہیں جو عمر بھر بس سوچا کرتی ہیں)۔ اس وقت انگریزوں اور برمیوں کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ بری انگریزوں کو شاید ناپسند کرتے تھے اور اپنی ناپسندیدگی کی وجہ بھی انھوں نے کسی کو نہیں بتائی تھی۔ بس اس وجہ سے انگریز اور برمیوں میں ہمیشہ کسی نہ کسی بات پر جھڑپ ہو جایا کرتی تھی اور عام طور پر بری ہی دو چار ہاتھ زیادہ چلا دیتے تھے۔ اس زمانے میں برما پر ایک بادشا کی حکومت تھی۔ اس بادشا کے دماغ میں ایک دن اچانک یہ خیال پیدا ہوا کہ بنگال پر حملہ کرنا چاہیے۔ بادشاہوں کا ازل سے یہی دستور رہا ہے یعنی حملہ کرنا ملکوں اور عورتوں پر اور پھر بادشاہوں کا یہ بھی قاعدہ رہا ہے کہ اگر ان کے دماغ میں کوئی خیال پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اس خیال کو وہ مرجھانے نہیں دیتے۔ اس بادشاہ نے بنگال پر حملے کی تیاری شروع کر دی۔

انگریزوں کو دوسروں کے حملے ہمیشہ سے ناپسند رہے ہیں۔ یہ بات انھیں بالکل پسند نہیں آئی اور یوں بھی سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے کہ اپنا لارڈ ایمہرسٹ ہندستان اس لیے نہیں آیا تھا کہ برما والا بادشاہ بنگال پر حملہ کرے اور ایمہرسٹ شیمپین پیتا بیٹھا رہے اور پھر بدقسمتی سے وہ شاعر نہیں سپاہی تھا۔ برما کے بادشاہ کی نیت دیکھ کر اس نے جنگ کا اعلان کر دیا۔ انگریزوں کی ایک فوج آسام کی طرف بھیجی گئی۔ (آسام کا نام ہی انکل سام کو آنے کی دعوت دیتا ہے) اس فوج نے اخلاقاً منی پور پر قبضہ کر لیا۔ منی پوری ناچ اسی وقت سے مشہور ہے۔ انگریزوں کی فوج کی ایک اور قسط رنگون کی طرف بھیجی گئی اور اس فوج نے بھی اسی اخلاق کا مظاہرہ کیا جس کا آسام کی طرف جانے والی فوج نے کیا تھا یعنی اخلاق و آداب کے تحت اس فوج نے رنگون پر قبضہ کر لیا۔ برمی فوج اس وقت بنگال پر حملے کی تیاری کر رہی تھی اور جنرل بندولا بنگال کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ اسے بادشاہ سلامت (یعنی برما کے بادشاہ سلامت) نے حکم دیا کہ وہ اُدھر نہ جائے بلکہ رنگون کی واپسی کا بندوبست کرے لیکن بندولا سے یہ کام نہ ہو سکا اس لیے وہ اور جنوب میں چلا گیا۔ شاید ڈابینو کی طرف اور اسی مقام پر بندوق کی ایک گولی جو یونہی چلائی گئی تھی اسے جا لگی اور چونکہ بندوق کی گولی لگنے کے بعد کوئی شخص زندہ رہنا نہیں چاہتا جنرل بندولا نے بھی اس پر عمل کیا اور فوراً وفات پا گیا۔ اس کی فوج کے سپاہی اس کی موت کا شاید انتظار ہی کر رہے تھے۔ انھوں نے چاروں طرف بھاگنا شروع کیا۔ یوں بھی فوجیوں کو حکم یہی ہے کہ جب تک جنرل یا سپہ سالار کو اپنی آنکھوں سے مرتا ہوا نہ دیکھ لیں نہ بھاگیں۔ برمی فوج کے بھاگ جانے کے بعد انگریزوں کو اس خالی علاقہ پر مجبوراً قبضہ کرنا پڑا۔

انگریزوں کے قدم ایک مرتبہ کسی سمت اٹھ جاتے ہیں تو پھر رُکتے نہیں۔ اس میں انگریزوں کا کوئی قصور نہیں ان کے قدموں کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے۔ انگریز یہاں بھی نہیں رُکے اور ڈابینو سے پردم اور پاگن کی طرف ٹہلتے چل پڑے (ٹہلنا انگریزوں کی خاصیت ہے) انگریزوں کی فوج دو ہزار تھی اور برمیوں کی اٹھارہ ہزار لیکن جنگ کے میدان میں ووٹ نہیں ڈالے جاتے، یہ جنگ کا میدان ہوتا ہے، پولنگ بوتھ نہیں۔ انگریزوں نے اٹھارہ ہزار برمیوں پر اپنے اخلاق کا سکہ بٹھا دیا۔ برما کے حکمرانوں نے یہ دیکھ کر جنگ کا جھنڈا اتار کر اندر رکھا اور اندر سے

ایک دوسرا جھنڈا نکالا جس کا رنگ سفید تھا (یوں آرٹسٹوں سے پوچھیے تو سفید کوئی رنگ نہیں ہوتا وہ بس سفید ہوتا ہے) سفید جھنڈے کو صلح کا جھنڈا کہا جاتا ہے — برمیوں کے ہاتھ میں صلح کا جھنڈا دیکھ کر انگریزوں کو بہت خوشی ہوئی۔ کیوں کہ انگریز ہوتے ہی صلح پسند لوگ ہیں۔ وہ تو صرف حالات کی وجہ سے جنگ پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اے داغ اپنی وضع ہمیشہ یہی رہی
کوئی کھنچا کھنچے کوئی ہم سے ملا ملے

انگریزوں نے برمیوں کی صلح کی دعوت قبول کر لی۔ اور بمابو کے مقام پر ان دونوں نے ایک صلح نامے پر اپنے اپنے اصلی دستخط کر دیے۔ اراکان، تناسرم اور آسام انگریزوں کے قبضے میں آئے۔ اور اسی خوشی میں برما کے حکمرانوں نے ایک ملین پونڈ بھی انگریزوں کی خدمت میں پیش کیے۔ انگریزوں کے لیے یہ رقم حقیر تھی لیکن انھوں نے اسے تحفہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ فارسی میں کہا گیا ہے کہ۔ ع

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

لارڈ ایمہرسٹ کے زمانے کا ایک واقعہ بھی اہم ہے۔ وہ یہ کہ بھرت پور کے تخت پر ایک شخص اور جن سال نے قبضہ کر لیا۔ ہم آپ کو پہلے ہی بتا چکے ہیں انگریزوں کو یہ بات دل سے ناپسند تھی کہ ان کے علاوہ کوئی اور شخص کسی تخت پر قبضہ کر لے۔ لارڈ ایمہرسٹ پیدائشی انگریز تھا اور مزاجاً اسے بھی یہ بات ناپسند ہوئی اس نے انصاف کے خاطر بھرت پور کے قلعے پر قبضہ کر لیا اور پھر شمالی ہند کا دورہ کیا۔ اس دورے میں اس نے سارے ہندستانی راجاؤں سے ملاقاتیں کیں (لارڈ ایمہرسٹ بڑا سوشیل آدمی تھا) خان راجاؤں نے بھرت پور کے واقعہ سے سبق لیا (سبق لینا کبھی بھی بُری بات نہیں سمجھی گئی) اور لارڈ موصوف سے مصافحہ کرنا مناسب سمجھا ان سب نے متفقہ طور پر مان لیا کہ انگریز شریف آدمی ہیں اور ہندستان میں ان کا اقتدار ضروری ہے۔ ہر شخص انگریز کی طرف دیکھتا تھا اور دل میں کہتا تھا۔

بزم عشاق ہے کیا جانے کدھر دیکھیں گے
دل تو دیتا ہے گواہی کہ اِدھر دیکھیں گے

لارڈ بنٹینگ:

اس شخص مذکور کا پیدائشی نام ولیم بنٹینگ تھا۔ انگلستان میں ایک دستور یہ بھی رائج ہے کہ ہر دوسرے یا زیادہ سے زیادہ تیسرے آدمی کا نام ولیم ہونا چاہیے۔ کیوں کہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ جس خاندان میں کوئی ولیم نہ ہو اس خاندان میں کوئی نہ کوئی بیماری یا کمزوری موجود رہتی ہے جو خاندانی بیماری یا موروثی کمزوری کہلاتی ہے۔ اس لیے وہاں کے لوگ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے خاندان میں کچھ نہیں تو ایک ولیم ضرور پیدا کریں۔ لارڈ ایمہرسٹ کے ہندستان سے جانے کے بعد یعنی فوراً بعد لارڈ ولیم بینٹنگ ہندستان آ گیا۔ اس شخص نے شاید کسی شریف خاندان میں جنم لیا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے زمانے میں بہت سے سماجی کام کیے حالانکہ یہ بھی چاہتا تو 28، 30 جنگیں آسانی سے لڑ سکتا تھا۔ اور 50، 60 صلح ناموں پر دستخطیں کر سکتا تھا لیکن افسوس اس کی خاندانی شرافت اس سے کبھی جدا نہیں ہوئی۔ اس نے ہندستان سے ستی جیسی رسم کو ختم کر دیا۔ عورتوں کو جینے کا حق تو پہلے ہی نہ تھا۔ لارڈ بینٹنگ کی وجہ سے مرنے کا حق بھی چھن گیا۔ لارڈ موصوف نے ہندستان سے ٹھگی کے پیشے کو بھی رخصت کر دیا۔ ٹھگی دراصل ایک مذہبی رسم تھی۔ اس رسم کو ماننے والے اپنی دیوی کو خوش کرنے کے لیے چند بیکار اور فضول قسم کے لوگوں کی بھینٹ چڑھایا کرتے تھے۔ (ہندستان میں بے کار اور فضول قسم کے لوگوں کا کبھی قحط نہیں پڑا۔) یہ لوگ تاجروں کے بھیس میں سچ مچ کے تاجروں میں مل جاتے ہیں یعنی اس طرح گھل مل جاتے جس طرح بھینس کے دودھ میں پانی مل جاتا ہے۔ یہ لوگ لمبے سفر کے فاصلے میں ان کے ساتھ رہتے ان سے خوب دوستی کرتے اور اس کے بعد ان سچ مچ کے تاجروں کو قتل کر دیتے لیکن قتل کرتے وقت وہ اپنے دوستوں کو بالکل تکلیف نہیں پہنچاتے تھے۔ یہ مقتول کا خون نہیں بہاتے تھے بلکہ ایک عدد رومال اس کے گلے کے گرد ذرا کس کر باندھ دیتے تھے اور مقتول کا دم کسی ارمان کی طرح نکل جاتا تھا۔ یہ فن ایک باپ اپنے بیٹے کو بڑی محنت اور لگن سے سکھاتا تھا اور سب ٹھگ اس فن کو مقدس اور متبرک فن سمجھ کر سیکھتے تھے۔ (فن بغیر عقیدے کے سیکھا بھی نہیں جا سکتا) کہا یہ جاتا ہے کہ ایک ٹھگ اپنی مختصر سی زندگی میں کم سے کم پانچ سو آدمیوں کے گلے میں رومال باندھ کر اپنے فن کا کامیاب مظاہرہ کرتا تھا۔ ایک ٹھگ نے تو 719 آدمیوں کو اپنے فن کا کمال دکھایا تھا۔ (یہ اس

زمانے کا ریکارڈ تھا) لیکن لارڈ بینٹنک اس فن کی قدر نہیں کر سکا۔ اس نے اس فن کو ختم کرنے کے لیے پورے سات سال صرف کیے۔ کوئی تین ہزار ٹھگوں کو لارڈ بینٹنک نے اپنے فن کا کمال دکھایا اور جب وہ ہندستان سے واپس ہوا تو رومال کا فن تقریباً دم توڑ چکا تھا۔ (اسی وقت سے ہندستان کی آبادی تیزی سے بڑھنی شروع ہوئی)۔

لارڈ بینٹنک کو فرصت ہی فرصت رہا کرتی تھی (یہی وہ مثالی فرصت کے رات دن تھے جن کا ذکر غالب نے اپنے ایک شعر میں کیا ہے) لیکن لارڈ بینٹنک نے فرصت کی یہ گھڑیاں تصور جاناں میں نہیں گزاریں (ہمارا خیال ہے تصور جاناں کی ضرورت بدنصیب لوگوں کو پڑتی ہے جن کو قرب جاناں حاصل ہوا کرتا) بینٹنک کو فرصت اصل میں اس لیے تھی کہ وہ جنگیں نہیں لڑا کرتا تھا۔ بیکار وقت میں کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیے۔ اس لیے بینٹنک نے اصلاحات کو اپنی ہابی بنا لیا۔ بینٹنک کے آنے سے پہلے ہندستان میں کوڑے لگانے کی سزا کا سسٹم تھا۔ یعنی کسی مجرم کو دس بیس یا سو پچاس کوڑے لگا دیے گئے تو انصاف کا کلیجہ ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ لیکن بینٹنک کو کوڑے لگانے کی سزا انگریزی تہذیب کے خلاف نظر آئی اور اس نے یہ سلسلہ بند ہی کر دیا۔ (انگریزوں کے سزا دینے کے طریقے کیا ہوا کرتے تھے۔ یہ ہم پھر کبھی آپ کو بتائیں گے۔ اس وقت صرف اتنا سن لیجیے کہ انگریز جو آلات سزا دینے کے لیے استعمال کرتے تھے وہ اب بھی جرمنی کے کسی میوزیم میں محفوظ ہیں) کوڑے لگانے کا سسٹم ختم ہو جانے کے بعد ہندستان سے ''چابک دستی'' جاتی رہی اور صرف ''دستی'' اور ''زبردستی'' رہ گئی۔

لارڈ بینٹنک کو سپاہی لوگ بہت بھاتے تھے۔ وہ جب بھی انھیں دیکھتا رحم کا جذبہ اس کے دل میں نوزائیدہ بچے کی طرح رونے لگتا۔ وہ کچھ اور تو نہیں کر سکتا تھا لیکن اس نے سپاہیوں کی تنخواہیں بڑھا دیں۔ اس طرح سپاہیوں کے چہروں پر بھی کچھ رونق آ گئی۔ (یہی وہ مثالی رونق تھی جس کا ذکر غالب نے اپنے ایک شعر میں کیا ہے) ایک اور کارنامہ لارڈ موصوف نے یہ انجام دیا کہ سرکاری دفتروں میں ہندستانیوں کو بھی ملازمت کا مستحق قرار دے دیا۔ چلیے چھٹی ہوگئی۔ ہندستانیوں کو جو بھی آرام نصیب تھا وہ بھی جاتا رہا۔ لارڈ بینٹنک ہی کے زمانے میں انگریزی زبان کو ہندستان میں تعلیم حاصل کرنے کی زبان کا درجہ دیا گیا۔ ورنہ اس سے پہلے یہ زبان صرف کاک

ٹبل پیتے وقت، پورک کھاتے وقت، ڈانس کرتے وقت اور شکریہ ادا کرتے وقت استعمال ہوتی تھی زیادہ سے زیادہ کچھ شریف انگریز اس زبان میں عام ہندستانیوں کو گالی دیتے تھے۔ ان باتوں کی وجہ سے پورے ہندستان میں یہ غلط فہمی پھیل گئی تھی کہ انگریزی زبان بس ایسے ہی کاموں کے لیے ہے۔ لارڈ ہیٹنگ نے اس غلط فہمی کو نہ صرف دور کیا بلکہ بہت دور کیا اور اس زبان کو فوجی میس، کینٹین اور کلب سے نکال کر اسکول اور کالج میں پہنچایا (آگے چل کر جب ہندستانیوں میں بیداری کا مرض پھیلا تو ہندستانی مزدوروں کی مانگوں میں ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ انھیں انگریزی زبان میں گالی نہ دی جائے)

لارڈ ہیٹنگ کو کورگ کا علاقہ بہت پسند آیا اور اس نے محسوس کیا کہ ایسا خوبصورت علاقہ صرف انگریزوں ہی کو زیب دے سکتا ہے۔ جب انگریزوں نے میسور کو اپنے اقتدار کا فیض پہنچایا تو اس نے کورگ کو اپنے لیے حاصل کرلیا۔ ہمارا خیال ہے اس نے بہت اچھا کیا ورنہ یہ علاقہ یونہی ضائع ہو جاتا۔

لارڈ کلائیو سے لارڈ ہیٹنگ تک پہنچنے کے بعد بھی جی چاہتا ہے کہ ذرا پیچھے کی طرف مُڑ کر دیکھا جائے اور اِدھر اُدھر بھی نظر ڈال لی جائے تا کہ حالات وواقعات کا پورا حسن نظر میں سما جائے، اس زمانے میں ہندستان کا منظر واقعی دیکھے جانے کے لائق تھا (غالب نے ان مناظر کے بارے میں اپنے ایک شعر میں یوں فرمایا ہے۔

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

ہمیں کسی نے بتایا تھا کہ غالب تاریخ کے اچھے طالب علم رہے ہیں)

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندستان میں 1600 میں قدم رنجہ فرمایا تھا (قدم رنجہ فرمانا پدھارنے کو کہتے ہیں) اور ہندستان کے اس وقت کے ذہین فرماں رواؤں کی اجازت سے اس کمپنی نے سورت، کالی کٹ اور مسولی پٹنم میں اپنے تجارتی سرکس قائم کیے تھے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ تجارت جیسی نازک اور پوشیدہ چیز کھلے میدانوں میں نہیں ہوتی۔ تجارت کے لیے مضبوط قلعوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے (شاعری میں ہوائی قلعے مفید ہوا کرتے ہیں) اپنی تجارت کو محفوظ طریقے

پرانجام دینے کے لیے ہماری مہربان ایسٹ انڈیا کمپنی نے تین بڑے قلعے بنائے۔مدراس میں سینٹ جارج فورٹ، کلکتہ میں فورٹ ولیم (غالب کے ایک شعر میں کلکتہ کا بھی ذکر آیا ہے۔)اور پانڈیچری کے قریب سینٹ ڈیوڈ فورٹ۔یہ پچ کے قلعے تھے۔کوئی اور کمپنی ہوتی تو تجارت کے نام پر صرف تجارت کرتی۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے ان کارناموں کی اِطلاع جب انگلستان پہنچی تو وہاں کے چند اور انگریزوں کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ ہم بھی ہندستان جائیں اور غریب ہندستانیوں کی مدد کریں۔(انگریز ہوتے ہی بڑے نرم دل ہیں اور ایسے نیک خیالات ان کے دل میں اکثر بلکہ بیشتر بھی آتے رہتے ہیں۔اللہ کی دین ہے)اس خیال کے آتے ہی سترھویں صدی کے آخر میں ایک اور کمپنی انگلستان سے ہندستان پہنچ گئی (اب تو آنے کے لیے اجازت کی بھی ضرورت نہیں تھی)ایسٹ انڈیا کمپنی کی ناک تیز تھی اور آنے والی کمپنی کی بینائی تیز تھی۔ایک نے خطرے کی بو سونگھی اور دوسری نے مستقبل میں دور تک دیکھا (دور تک تو ہم بھی دیکھتے ہیں۔لیکن ماضی کی طرف اپنی اپنی آنکھ ہے) نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دونوں کمپنیاں ایک ہوگئیں۔مقصد جو ایک تھا۔ یوں بھی انگریزوں میں شیعہ سنّی کا جھگڑا نہیں ہوا کرتا انگریزوں کے آنے سے پہلے ہندستان میں پرتگالی اور ولندیزی تو موجود تھے ہی لیکن اس کے باوجود ہندستان جیسا بڑا ملک خالی خالی نظر آتا تھا (ہندستانی ہمیشہ چھپ کر رہتے تھے) ملک کو خالی اور بے رونق دیکھ کر فرانسیسیوں کے دل میں بھی ہندستانیوں سے الفت کا جذبہ پیدا ہوا۔(فرانسیسی پیدائشی طور پر محبت کے بندے مانے جاتے ہیں) فرانسیسیوں نے بھی ازراہِ محبت ایک تجارتی کمپنی ہندستان کے سمت روانہ کردی (اس زمانے میں سبھی راستے ہندستان کی طرف آتے تھے) ولندیزیوں کو فرانسیسیوں کی یہ حرکت ناگوار گزری۔گزرنی ہی چاہیے تھی۔کیوں کہ ولندیز ہندستان میں سینئر تھے لیکن ایک معمولی سی جھڑپ پر بات آئی گئی ہوگئی۔ولندیزیوں اور فرانسیسیوں نے آپس میں ایک معاہدہ کرلیا۔اس معاہدے کے نتیجے میں فرانسیسی ہندستان میں سر اُٹھا کر اور سینہ پھلا کر چلنے کے مستحق قرار دیے گئے۔پھلنا پھلانے اِسے ہی کہتے ہیں۔ولندیزی فرانسیسی جھڑپ میں کچھ زیادہ مزہ نہیں آیا۔البتہ اس جھڑپ سے پہلے انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جو تبادلۂ خیال ہوا وہ کچھ پُر لطف تھا افسانے کی طرح دل چسپ اور ناول کی طرح طویل۔اس جنگ میں یہ تھا کہ یہ صرف ہندستانیوں کی بھلائی اور بہتری کی

خاطر لڑی گئی تھی۔ اصل میں بات یہ تھی کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں دونوں کو ہندستانی بہت پسند آگئے تھے اور دونوں چاہتے تھے کہ ان ہندستانیوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کریں (اپنا اپنا جذبہ ہے) انگریز تو اپنے آنے کے سو سال کے اندر ہی اندر ہندستانیوں کے اتنے مطیع اور فرمانبردار ہو گئے تھے کہ ہندستانیوں کی ابرو کے اشارے پر جان لے لیتے تھے۔ ہندستانیوں کی خدمت کرتے کرتے چونکہ وہ بہت تھک گئے تھے اس لیے ذرا پاؤں پھیلانا چاہتے تھے۔ تھک جانے پر پاؤں پھیلانے کی خواہش بالکل فطری ہوتی ہے۔ اس میں کسی بدنیتی کو دخل نہیں ہوتا۔ فرانسیسیوں نے بھی تھوڑے آرام کی خاطر اپنے پاؤں پھیلانے چاہے بس یہیں تھوڑی سی گڑبڑ ہوگئی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اس زمانے میں ہر قوم اپنا گورنر جنرل ہندستان میں رکھ سکتی تھی۔ فرانسیسی گورنر جنرل (مقیم ہندستان) ڈوپلے ذرا زیادہ تیز آدمی تھا۔ اس نے ہندستانی سپاہیوں کی مدد سے پاؤں پھیلانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں فرانسیسی پاؤں انگریزی پاؤں سے ٹکرا گئے۔ بس آگ سی لگ گئی اور ایڑی سے چوٹی تک پہنچ گئی۔ دونوں میں بُری طرح ٹھن گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ غریب انگریزوں اور بیچارے فرانسیسیوں کو اپنے وطن سے دور یعنی عالم غریب الوطنی میں جنگ لڑنی پڑی۔ اس جنگ کے لیے کرناٹک کا مقام چنا گیا اور مدت بیس سال ٹھہرائی گئی۔ یہ جنگ بیس سال تک جاری رہی یعنی اس جنگ کے دوران جو بچے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے پیدا ہوئے وہ بھی بڑے ہو کر جنگ لڑنے کے قابل ہو گئے۔ کرناٹک کی پہلی لڑائی آٹھ سال تک ہوتی رہی۔ اس جنگ کی شوٹنگ زیادہ تر پانڈیچری میں ہوئی۔ اس زمانے میں فرانسیسیوں کا ایک بحری کمانڈر لابوردوناس باہر سے آیا ہوا تھا۔ یہ شخص کئی کرتب جانتا تھا۔ اس لابوردوناس نے انگریزوں کا ستیا ناس کر دیا۔ اس نے انگریزوں سے مدراس کا علاقہ اس طرح حاصل کر لیا جیسے وہ اس کے نام کا منی آرڈر تھا۔ اور انگریز پوسٹ مین تھے۔ لیکن لابوردوناس بڑا قلندر آدمی تھا۔ اسے مدراس کی بالکل ضرورت نہ تھی اس لیے اس نے ایک لاکھ فرانسیسی سکّے کے عوض انگریزوں سے دوستی کر لی۔ بحری کمانڈر لابوردوناس کا یہ بیوپار فرانسیسی گورنر جنرل ڈوپلے کو بالکل پسند نہیں آیا (کمانڈروں اور گورنر جنرلوں کی پسندیں ہمیشہ سے الگ الگ ہوا کرتی ہیں) یہ ضروری نہیں کہ جو چیز بحری کمانڈر کو پسند آئے وہ گورنر جنرل کو بھی بھائے۔ یوں بھی گورنر جنرل خشکی پر رہا کرتے ہیں اور ان کے مزاج میں

خنکی نہیں خشکی ہوا کرتی ہے) ڈوپلے نے لابوردناس کے کیے معاہدہ کو ٹھکرایا اور دوبارہ مدراس پر قبضہ کرلیا۔ (تاریخ میں ایسے واقعات بہت ہوا کرتے ہیں ڈوپلے کو مدراس کا علاقہ اتنا پسند آیا کہ اس نے اسے لوٹ بھی لیا۔ لوٹانا نہ تو کیا کرتا)؟

اس زمانے میں کرناٹک میں ایک نواب انورالدین صاحب رہا کرتے تھے۔ نواب صاحب میں یوں تو سبھی خوبیاں تھیں لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کے مزاج میں غصہ بہت تھا۔ لیکن وہ غصہ کس کام کا جس کا قدرت ساتھ نہ دے۔ غصہ اسی شخص کو زیب دیتا ہے جو قسمت کا دھنی ہو۔ قسمت والے شخص ہی کی ہمیشہ بنی رہتی ہے ورنہ فقیر کا غصہ اپنی جھونی پروائی بات ہوتی ہے۔ نواب انورالدین کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ فرانسیسیوں کو مدراس سے نکال باہر کرنا چاہیے۔ لیکن قسمت فرانسیسیوں کے ساتھ تھی۔ ڈوپلے نے الٹا پانڈیچری کے قریب کے انگریزی قلعے سینٹ ڈیوڈ فورٹ پر حملہ کردیا لیکن یہ قلعہ انگریزوں نے فرانسیسیوں کے لیے نہیں اپنے لیے بنوایا تھا۔ انگریزوں نے اس حملے کا ایکسپریس ڈیلیوری جواب دیا اور فرانسیسی علاقہ پانڈیچری کا محاصرہ کرلیا۔ لیکن جس طرح انگریزوں نے ڈیوڈ فورٹ فرانسیسیوں کے لیے نہیں بنوایا تھا اسی طرح فرانسیسیوں نے پانڈیچری کا علاقہ انگریزوں کو تحفہ دینے کے لیے نہیں حاصل کیا۔ کچھ ہی دنوں میں انگریزوں نے یہ بات سمجھ لی اور پانڈیچری کے محاصرے سے اپنے دونوں ہاتھ اٹھالیے شاید دعا کے لیے۔

فرانسیسیوں اور انگریزوں کی یہ لڑائی کسی ہندستانی فلم کی طرح مہمل ثابت ہوئی۔ دونوں میں سے کسی کا بھی خون زیادہ نہیں بہا اور جو بھی تھا وہ سفید تھا۔ یہ لڑائی بالکل ایسی تھی جیسے کسی مے کدے میں دو مے خوار صرف یہ منوانے کے لیے آپس میں لڑ پڑیں کہ انھوں نے زیادہ نہیں پی ہے۔ 1848 کا مبارک سال دیکھ کر ان دونوں بہادر قوموں نے صلح کرلی اور اس صلح کے ہوجانے پر مدراس کا علاقہ انگریزوں کو واپس مل گیا۔ (اسی لیے کسی زمانے میں مدراس یونیورسٹی کے گریجویٹوں کو اپنی انگریزی دانی پر بہت ناز تھا۔) ڈوپلے کو صرف شہرت ملی۔ ڈوپلے مرتے وقت یہ شہرت اپنے ساتھ لے گیا۔ تیسری بات یہ ہوئی کہ دنیا والوں کو معلوم ہوگیا کہ فرانسیسی لوگوں کے خمیر میں کسی بات کی کھوٹ ہے جس کی وجہ سے وہ لوگ آپس میں مل جل کر کام نہیں کرسکتے۔ (لیم

ورک نہ ہونے کے باعث فرانسیسی فٹبال، ہاکی، کرکٹ وغیرہ کی ٹیمیں نہیں بنایا کرتے۔فرانسیسی صرف ایسے کھیلوں میں حصہ لیتے ہیں جس میں کوئی اور حصہ دار نہیں ہوتا)۔

ان دونوں قوموں میں صلح تو ہوگئی تھی لیکن یہ صلح بھی ویسی ہی تھی جیسی سسرال اور میکے والوں میں یعنی دوسمدھیانوں میں ہوا کرتی ہے۔یہ صلح تین سال سے زیادہ نہیں چلی۔تین سال تک بھی کیوں چلی کوئی نہیں بتا سکتا۔

ڈوپلے یعنی فرانسیسی گورنر جزل جس کا بار بار ذکر کر کے ہم منہ کا مزا بگاڑ چکے ہیں اس فکر میں تھا کہ کرناٹک اور حیدرآباد کے اندرونی خلفشار سے کچھ لطف اٹھائے (اندرونی خلفشار اس عمل کو جو ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے کیا جاتا ہے) ان دنوں کرناٹک میں یہ ناٹک چل رہا تھا کہ نواب انورالدین کی مخالفت چندا صاحب فرماتے تھے اور حیدرآباد اس طرح آباد تھا کہ ناصر جنگ مظفر جنگ سے جنگ فرماتے تھے (آخر دونوں جنگ تھے۔چندا صاحب اور مظفر جنگ دونوں نے ڈوپلے سے مدد مانگی) اس وقت تک ڈوپلے بھی خود کو نواب ڈوپلے کا خطاب دے چکا تھا۔) اس نے ان دونوں کی مدد کرنے میں تامل نہیں کیا کیوں کہ ڈوپلے شریف بلکہ قریب قریب شریف النفس تھا۔کرناٹک میں یہ ہوا کہ چندا صاحب نے نہ صرف انورالدین کو شکست دی بلکہ انھیں وفات بھی دی اور ان کے بیٹے محمد علی کو ترچنا پلی کی طرف بھگا دیا۔دکن میں یہ ہوا کہ مظفر جنگ کے مقابلے میں ناصر جنگ کو شکست ہوئی اور انھیں مرنا بھی پڑا۔مظفر جنگ دکن کے نظام ہوئے لیکن بعد میں خود بھی قتل ہو گئے (اس زمانے میں خود کو قتل کروالینا کچھ زیادہ مشکل کام نہ تھا)۔مظفر جنگ کے بیٹے صلابت جنگ نے خود کو فرانسیسیوں کی حفاظت میں دے دیا۔

(شفیق الرحمٰن)

تزکِ نادری

عرف سیاحت نامۂ ہند

رقم زدہ: اعلیٰ حضرت جناب نادر شاہ سابق شہنشاہ، سابق ابن شمشیر ابن شمشیر، سابق مرحوم و مغفور، وغیرہ وغیرہ؛

پیش لفظ، عرف کرنا مرتب اس تزک کا ہمارا

آج جو اتفاق سے پرانی پوستین کو جھاڑا تو متعدد اشیا کے ساتھ ہمارے خودنوشتہ اوراق کرم خوردہ بھی زمین پر گر پڑے جنھیں ہم نے وقتاً فوقتاً لکھا تھا۔ پڑھا تو حیران رہ گئے۔ سوچا کہ سیاحت ہند کے بعد معترضین نے ہم پر جو طرح طرح کی افترا پردازی کی ہے کیوں نہ اس کے جواب میں یہ اوراق پیش کیے جائیں۔ اگرچہ ہم مقامی مورخین کی لگام بندی فرما چکے تھے تاہم غیر ملکی پریس نے واویلا مچا کر جو غلط فہمی پیدا کر دی ہے اس کا ازالہ بہت ضروری ہے۔ تصویر کا یہ رخ دکھا کر کیوں نہ معترضین کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرا دیں۔ پھر ہمیشہ سے لوگوں کو گلہ بھی رہا ہے کہ تاریخ غلط پیش کی گئی ہے، تبھی تاریخ کی غیر جانب دار اور مستند کتابوں کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔

خدا گواہ ہے کہ ہم ہندستان محض حملہ کی غرض سے ہر گز نہیں گئے دراصل ہمیں اپنی دور افتادہ پھوپھی محترمہ سے ملاقات مقصود تھی۔ حملے کا خیال ہمیں راستے میں آیا۔تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرا ہم نے زبردستی ہر گز نہیں ہتھیایا۔عزیزی محمد شاہ عرف رنگیلے میاں نے بصد منت وسماجت ہمارے سامان میں یہ چیزیں بندھوادیں، اور قتل عام؟ قتل عام کس مسخرے نے کرایا تھا۔ وہ تو ایک معمولی سالانٹھی چارج تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اہل ہند نحیف ونزار ہونے کی وجہ سے اس کی تاب نہ لا سکے۔ سنا ہے ہمارے متعلق لوگوں نے طرح طرح کی کہاوتیں گھڑ لی ہیں۔ مثلاً شامتِ اعمال ماصورت نادر گرفت۔ ہمارے دل کو خصوصاً اس مثل سے سخت صدمہ پہنچا ہے۔ یعنی اگر اس نادر سے مراد ہم ہیں تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ یہ نادر کوئی اور شخص تھا۔ اگر ہمیں علم ہوتا کہ ہماری سیاحت کے بعد اس قدر غل غپاڑہ مچے گا تو واللہ کبھی ہند کا رخ نہ کرتے اور اگر دلی میں پتہ چل جاتا تو وہاں سے کبھی نہ لوٹتے۔

والیئے کابل سے ناچاقی

مدت سے ارادہ تھا کہ والئی کابل کی گوشمالی کریں، وہ لگاتار بلا کسی وجہ ہمارے خلاف زہر گل رہا تھا۔ جب ہم نے خط لکھ کر اس خواہ مخواہ پروپیگنڈہ کی وجہ پوچھی تو اور بھی زیادہ زہر اگلنے لگا، چنانچہ موسم کو مناسب پا کر حملہ آور ہوئے۔ غالباً لوگوں کو ہماری قوت کا غلط اندازہ تھا۔ ہم نے دریائے ہلمند کو جگہ جگہ سے کاٹ کر ان کے ہوش ٹھکانے لگادیئے۔

دریائے ہلمند نہایت خوشنما دریا ہے۔ فرمابردار خاں معروض ہوا کہ شاہان سلف کا رواج رہا ہے کہ حملہ کرتے وقت جو دریا راستے میں آئے تیر کر عبور کرتے تھے۔ اس کے کہنے پر غلطی سے ہم نے بھی چھلانگ لگادی اور شاہانِ سلف میں شامل ہوتے ہوتے بال بال بچے۔ کنارے کی طرف آنے کی کوشش کی، ہم پوستین کو چھوڑتے تھے لیکن پوستین ہمیں نہ چھوڑتی۔ بمشکل ہمیں باہر نکالا گیا، بڑے پشیمان ہوئے، تہیہ کیا کہ جب تک تیراکی کے ماہر نہ ہو جائیں پانی میں قدم نہ رکھیں گے۔

شہباز خاں کو خطاب کا عطیہ

مقامی باغ میں چند الو دکھائی دیے۔ یہاں کا الو ایرانی الو سے بڑا اور بہتر ہوتا ہے۔ الو کا ایک جوڑا ہمارے ساتھ ہولیا۔ شام کو ہماری قیام گاہ کے پاس بسیرا لیتا اور رات بھر ہاؤ ہو مچاتا۔ ہم نے فرمانبردار خاں سے پوچھا کہ یہ جوڑا کیا چاہتا ہے۔ وہ بولا گستاخی کرتا ہے اور ہمیں واپس

جانے کو کہتا ہے۔ ہم بے حد خفا ہوئے اور فرنبردار خاں کو پاپوش مبارک سے زدوکوب کر کے سرفراز فرمایا۔ ساتھ ہی شہباز خاں کی رائے دریافت کی۔ وہ جانثار معروض ہوا کہ فال نیک ہے۔ اُلو جیسا منحوس پرندہ بھی ہم سے بلند طالع شہنشاہ کی آمد پر خوش آمدید کہتا ہے۔ ہم اس جواب پر خوش ہوئے اور نمک حلالی کی قدر کرتے ہوئے اس کو الوشناس کے لقب سے نوازا اور ان کے ہم جنسوں میں اس کی عزت افزائی فرمائی۔

سیاحتِ ہند کا ارادہ

کابلی افواج کے ساتھ ہماری جنگ خاصی رہی۔ یہ ان تمام خصوصیات کی حامل تھی۔ جنھوں نے نادر شاہی جنگوں کو اس قلیل عرصے میں اس قدر حیرت انگیز شہرت بخشی۔ اب ماشاء اللہ نادر شاہی حکم، نادری قہر، نادری موقعے، اور نادری حکومت بچے بچے کی زبان پر ہیں والئ کابل اپنے کیے پر نادم تھا۔ اس نے وفاداری کا حلف اتنی مرتبہ اٹھایا کہ ہم نے تنگ آ کر منع فرمادیا۔

شہباز خاں الوشناس ہر روز ملک ہندستان کی خبریں سناتا کہ کابل سے میوہ جات کثیر مقدار میں ہند بھیجے جاتے ہیں اور اس کے بدلے تجار ہینگ، بھنگ، چرس و دیگر تفریحات لاتے ہیں۔ ہم نے اس ذکر میں دلچسپی لی تو الوشناس بھی چست ہوگیا۔ اس نے ہمیں پھوپھی محترمہ کی یاد دلادی جو غالباً ہند میں مقیم تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم نے اپنی پھوپھی کا محض ذکر ہی سنا تھا، نہ کبھی انھیں دیکھا تھا نہ شرف ملاقات بخشا تھا۔ گستاخ فرمانبردار خاں کا خیال تھا کہ ہماری کوئی پھوپھی تھیں ہی نہیں۔ خیر، چونکہ کابل کی مہم اندازے کے خلاف بہت جلد ختم ہوگئی۔ سوچا یہ بیکار وقت کیوں نہ سیاحت ہند میں صرف کیا جائے۔

ہمیں بتلایا گیا کہ حملہ آوروں کی سہولت کے لیے اہل ہند نے دو راستے صاف کروا رکھے ہیں۔

براہ افغانستان: خیبر ایجنسی؛ پشاور؛ لاہور؛ پانی پت۔

براہ بلوچستان: سمہ سٹہ بھٹنڈہ؛ دلی۔

ہم نے پہلا راستہ پسند فرمایا کیوں کہ بلوچستان کے راستے میں جیکب آباد پڑتا ہے جو دنیا کے گرم ترین مقاموں میں سے ہے۔

کابل سے کوچ

چار گھڑی گزرنے پر کابل سے کوچ کیا۔ عمائدین شہر فصیل تک بلکہ درۂ خیبر تک چھوڑنے آئے۔ جانے نہ دیتے تھے۔ والئی کابل مفارقت کا سوچ کر روتا تھا اور ہمارے ہمراہ سیاحت ہند میں شریک ہونے کی اجازت طلب کرتا تھا۔ لیکن ہم جانتے تھے کہ یہ رونا پیٹنا دکھاوے کا ہے، یہ لوگ بڑے کائیاں ہیں۔ ہمارے رخصت ہوتے ہی پراپیگنڈہ دوبارہ شروع کر دیں گے اور پھر ہم اہل ہند پر مہمان نوازی کا زیادہ بوجھ ڈالنا قرین مصلحت نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ اسے سمجھایا کہ جب ہم سیاحت ہند سے واپس لوٹ آئیں تب اس کا جانا زیادہ موزوں ہوگا۔ وہ پھر بھی روتا تھا۔ اسے ازراہ غریب پروری ایک ریشمی رومال آنسو پونچھنے کے لیے مرحمت فرمایا اور بڑی مشکل سے پیچھا چھڑایا۔

اس منزل سے کوچ کر کے درۂ خیبر میں پہنچے۔ نہایت پر فضا مقام ہے۔ سکندر یونانی، محمود غزنوی اور دوسرے نامی سیاح بھی اسی راستے سے گزرے تھے۔ ہم نے بھی ان کے نقش قدم پر چلنے میں بہتری سمجھی۔ اس درے میں پرند، چرند، درند، انسان بلکہ نباتات و جمادات تک نظر نہیں آتے۔ خداوند باری تعالیٰ کی کیا قدرت بیان کی جائے۔

مغل فوجدار نے پشاور سے کچھ درے آ کر سعادت آستاں بوسی حاصل کی اور مشورہ دیا کہ ہمارا واپس چلا جانا بہتر ہوگا کیوں کہ اس موسم میں سیاحت لطف نہیں دیتی۔ اس نے دو سو مہر طلائی نذر اور ایک مرصع گھوڑا بطور پیش کش گزرانا، ہم نے بھی ازراہ مروت ایک دنبہ عنایت کر کے ٹالا۔ پشاور سے آگے شیر ملا۔ پہلی دفعہ دیکھا تھا طبیعت بڑی خوش ہوئی بندگان درگاہ بھاگ گئے ہم وہیں کھڑے رہے۔ ہم کو کھڑا دیکھتا رہا۔ یہ ایک گربہ کی مثال ہوتا ہے، نہایت نفاست پسند اور بورژوا قسم کا چوپایہ ہے۔ کچھ دیر ہمیں دیکھنے کے بعد اس درجہ مرعوب ہوا کہ بھاگ نکلا۔ اگلے روز ہمیں کسی نے بتایا کہ وہ شیر نہیں تھا، کچھ اور چیز تھی۔ واللہ اعلم بالصواب!

سفر کا حال

دریائے سندھ عبور کرنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ معلوم ہوا کہ سید بایزید ابن یزید بزدانی آستاں بوسی کی سعادت کے متلاشی ہیں، جب بلایا تو دیکھا کہ فقط ایک آدمی تھا۔ ہم نے ازراہ

تلطف اسے گلے سے لگا لیا اور پیار سے بھینچا، وہ بے ہوش ہو گیا۔ اسے فوراً اٹھا کر باہر لے گئے نخلوہ سنگھایا گیا۔ مالش کی گئی۔ دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ نذریں جو پیش کرنے لایا تھا لے کر رفو چکر ہوا۔ ہم نے اہلکاروں کو اس کے پیچھے دوڑایا کہ اگر خود نہیں آتا تو نذریں تو بھجوا دے گا مگر اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔

قلعے کا فوجدار ہماری سواری کے لیے ایک عجیب وغریب چوپایہ لایا جسے ہاتھی کہتے ہیں۔ نہایت پُر شوکت فیل جسم جانور کا۔ دو دانت ہوتے ہیں جو صرف دکھانے کے لیے ہیں۔ ناک جس کو سونڈ کہا جاتا ہے زمین کو چھوتی ہے۔ ہاتھی پر چڑھ کر آدمی دوسروں کے گھروں کے اندر سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔ ہم نے سواری کا قصد کیا اور باگ ہاتھ میں لینی چاہی وہ بولا اس کی لگام نہیں ہوتی۔ ڈرائیور علیحدہ بیٹھتا ہے۔ ہم نے ایسے بے لگام جانور پر سواری سے انکار کر دیا۔

لطیفہ

سندھ کے علاقے سے وفد آیا کہ وہاں کے عمائدین بے تاب ہیں کہ ہم ان کو سرفراز فرمائیں۔ ساتھ ہی ایک مشہور خانقاہ کی گدی کی پیشکش بھی تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس ملک میں عجیب دستور ہے۔ کوئی گھاگ چند ہتھکنڈے دکھا کر بھولے بھالے انسانوں کو رام کر لیتا ہے۔ یہ شخص پیر کہلاتا ہے اور معتقدین مرید کہلاتے ہیں۔ مرید اپنی آمدنی کا ایک حصہ پیر کو باقاعدگی کے ساتھ نذر کرتے ہیں۔ پیر کوئی خاص کام نہیں کرتا سوائے اس کے کہ کبھی کبھی کاغذ کے پرزوں پر کچھ لکھ دیتا ہے جنھیں تعویذ کہتے ہیں۔ ان تعویذوں سے بوڑھوں کے ہاں اولاد ہو سکتی ہے اور اولاد کے سرپرستوں کا انتقال ہو سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ لطیفہ سن کر ہم بہت ہنسے کہ کسی نے کیا بے پر کی اڑائی ہے۔

لیکن جب الوشناس تین چار پیروں کو ہماری ملاقات کے لیے لایا تو ہمیں محسوس ہوا کہ لطیفہ دوسروں پر نہیں ہم پر ہوا ہے۔ پیروں کی زندگی کی طرح طرح کی دلچسپیاں اور ان گنت مشغلے۔ ہمارے منہ میں پانی بھر آیا۔ اپنی گزشتہ زندگی پر بڑا افسوس ہوا کہ ناحق خراب ہوتے پھرے۔ اگر پہلے سے پتہ ہوتا تو سیدھے ہند آ کر پیر بن جاتے اور مزے لوٹتے۔

ایسا سنہری موقع ملنے پر ہم نے خداوند تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور وفد کے ہمراہ چلنے کا قصد ظاہر کیا لیکن الوشناس نے رائے دی کہ سندھ کے سیاسی حالات ہمیشہ کچھ ایسے ویسے ہی رہتے

ہیں، چنانچہ اس تجویز کو التوا میں رکھا۔ اگر خدانخواستہ شہنشاہی کامیاب نہ ہی تو ضرور پہ ضرور پیر بن جائیں گے اور دل کی ساری امنگیں پوری کریں گے۔ انشاءاللہ العزیز!

اختر شماری

کل رات اختر شماری کی، دو سو پچاسی تارے گنے ہوں گے کہ نیند آ گئی باقی بشرط زندگی کل گنیں گے۔

شتر غمزے

مقامی قلعہ دار کی دعوت پر اس کے ساتھ گئے اور شتر غمزے ملاحظہ فرمائے محظوظ ہوئے۔ کیوں کہ ایران میں یہ چیز نہیں ہوتی اور اس ملک میں عام ہے۔

ایک مفید رسم

جہلم کے قریب ایک قلعدار نے ہم پر دھاوا بول دیا اور پھرتی سے قلع میں محصور ہو گیا۔ ارادہ ہوا کہ اس کو اسی طرح محصور چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں۔ لیکن الوشاس ملتمس ہوا کہ نیا ملک ہے یہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے۔ ہم نے فرمایا کہ اس طرح قدم رکھے تو دلی پہنچنے میں دیر لگے گی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ لوگ عقب سے آ کر تنگ نہ کریں۔ اس روز ہمیں نزلہ سا تھا اور قصد لڑائی بھڑائی کا ہر گز نہ تھا۔ الوشاس کے اصرار پر دو دن تک قیام کیا لیکن کچھ نہ ہوا۔ تنگ آ کر ہم نے پوچھا کہ کوئی ایسی تجویز نہیں ہو سکتی کہ یہ معاملہ یونہی رفع دفع ہو جائے۔ الوشاس چلا گیا۔ شام کو لوٹا تو اس کے ساتھ ایک ہندی سپاہی تھا۔ الوشاس کے کہنے پر ہم نے سپاہی کو پانچ سو طلائی مہریں دیں، ابھی ایک گھنٹہ نہ گزرا ہو گا کہ قلعے کے دروازے کھل گئے۔ ہم بڑے حیران ہوئے۔

ہند میں یہ ایک نہایت مفید رسم ہے۔ جب کٹھن وقت آن پڑے یا مشکل آسان نہ ہو تو متعلقہ لوگوں کو ایک رقم یا نعم البدل پیش کیا جاتا ہے۔ تحفے کی مقدار اور پیش کرنے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں لیکن مقصد ایک ہے — اسے یہاں رشوت کہتے ہیں کس قدر زود اثر اور کارآمد نسخہ ہے۔ اگر لاکھوں کے اٹکے ہوئے کام ہزار پانچ سو سے سنور جائیں تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ رشوت دینے دلانے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس عمل سے کرنسی حرکت میں رہتی ہے۔ ہم واپس ایران جا کر اس رسم کو ضرور رائج کرائیں گے۔

ہمیں بتایا گیا کہ کچھ مہریں سپاہی نے اپنے استعمال کے لیے خود رکھ لی تھیں، باقی کوتوال کو دیں جس نے اپنا حصہ رکھ کر بقیہ رقم قلعدار کے حوالے کی۔ قلعدار نے سنتریوں کو خوش کر کے دروازے کھلوا دیے۔ واقعی یہ ملک عجوبہ روزگار ہے!

گوجرانوالے میں قیام

شیخ بوٹا شجر پوری ایک ایرانی النسل درویش ہیں جو بڑے فاضل ریاضت کار، مبارک نفس متوکل اور گوشہ نشیں ہیں۔ گوجرانوالے میں ان سے مل کر معرفت اور وجدان کی باتیں ہوتی رہیں۔ فیصلہ کیا کہ سب کچھ چھوڑ کر تارک الدنیا بنا جائے۔ پھر شبہ سا ہوا کہ کہیں یہ بھی پیر نہ ہوں۔ تحقیقات کرنے پر شبہ درست نکلا۔ آپ بڑے رنگیلے پیر ہیں۔ پنجاب سے وادی کانگڑہ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں کیوں کہ وہ علاقہ زیادہ رنگین ہے۔ دیر تک ان سے خفیہ باتیں ہوتی رہیں۔ جنھیں سینہ بہ سینہ رکھنے کا ارادہ ہے۔ یہ ملاقات کیا تھی گویا تجدید عہد شباب تھی۔

ہمارا سنجیدہ ہو جانا

گلستانِ بیکانیر سے ایلچی دردولت پر حاضر ہوا۔ ملتجی ہوا کہ چیلے مشتاقان دید راہ دیکھ رہے ہیں۔ تربوزوں کا موسم بھی ہے ارادہ ہوا کہ کچھ دنوں کے لیے چلے چلیں مگر الوشناس کو حسب معمول شبہ ہوا کہ یہ کوئی چال ہے، بیکانیر لق ودق صحرا ہے جس میں نہ پانی ہے نہ روئیدگی۔ یہ لوگ ہمیں صحرا میں چھوڑ کر بھوک پیاس سے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔

آنکھوں میں خون اتر آیا اور ہر چیز سرخ نظر آنے لگی۔ فوراً ایلچی کو بلوا کر الٹا لٹکوایا، جب بکا کہ واقعی یہ چال تھی تو کھلوا کر سیدھا کیا اس حادثے نے ہمارا موڈ خراب کر دیا، سوچا کہ اہل ہند سے اچھے سلوک کی توقع کرنا حماقت ہے۔ کیوں نہ کسی بہانے اس ملک پر حملہ کر کے ان کی گوشمالی کریں۔ فرمانبردار خاں کو حکم دیا کہ حملے کی چند وجوہات سوچے، اس نے یہ فہرست پیش کی۔

1۔ ہم عوام کے مفاد کے لیے جنگی چالوں کی ایک کتاب 'رہنمائے حملہ آورانِ ہند' لکھنا چاہتے ہیں۔

2۔ ہندی گویے ترانوں کو 'نادرنا دھیم' سے شروع کر کے ہماری توہین کرتے ہیں۔

3۔ تاریخ میں اس سے پہلے ایران نے ہند پر باقاعدہ حملہ نہیں کیا۔

4۔ ہند پر حملہ ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔

5۔ یوں بھی ان دنوں ہند پر حملے کا رواج عام ہے۔

ایسے بے معنی وجوہات معروض ہونے پر ہمیں غصہ آیا۔ ایک بھی بات خدا لگتی نہ تھی۔ قصد ہوا کہ فرمانبردار خاں سے وہی پرانا سلوک کریں۔ دیکھا تو وہ کبھی کا غائب ہو چکا تھا۔ ہم نے خود ان سے بہتر وجوہات سوچنے کی دیر تک کوشش کی، جب کامیابی نہ ہوئی تو خوش ہو کر فرمانبردار خاں کو بحال فرمایا۔

شاہدرے میں آمد آمد

شاہدرہ کے قریب ایک لڑکی نظر آئی۔ اس کی ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں، چال ڈھال بہت لڑکوں کی سی تھی، نام بھی عبداللطیف گویا مردانہ تھا۔ ہم نے پیش کاروں کو حکم دیا کہ اس کے باپ سے مل کر تحقیق کریں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عبداللطیف لڑکا ہی تھا اور کسی مقامی کالج میں پڑھتا تھا خدا جانے ہم کو یہ کیسے خیال آیا کہ وہ لڑکی ہے۔

لاہور پہنچے ہی تھے کہ صوبیدار لاہور کے گوریلا دستوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ ہمارے سپاہی جدید جنگی طریقوں سے ناواقف تھے اور صوبیدار موصوف نہ صرف ہفت ہزاری تھا بلکہ گوریلا لڑائی کا ماہر تھا۔ ہم نے بھی فوراً چڑیا گھر سے سارے گوریلے نکال کر سدھائے، گھمسان کا رن پڑا۔ گوریلہ گوریلے پر ٹوٹ پڑا اور سپاہی تماشہ دیکھتے رہے۔ دشمن نے لڑائی کا رخ بدلا، صوبیدار ہمیں گھیرے میں لینے کی کوشش کرنے لگا، اور ہم اسے۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے قریب سے کئی کتراتی گزر جاتیں گرمجوشی کا یہ عالم تھا کہ گھیرے میں لینے کی کوشش میں صوبیدار فوج سمیت جہلم جا پہنچا، اور ہم فیروز پور۔ غلطی کا احساس ہوا تو لوٹے۔ الوشناس کے مشورے پر ہند کا مروجہ کارآمد نسخہ رشوت آزمایا اور شکست فاش دی۔ شکست کے بعد ہم نے اس سے ہفت ہزار بصد وقت وصول کیا۔ شام کو الوشناس کچھ اور منصب داروں کو لایا جو بالترتیب پنج ہزاری، سہ ہزاری، دو ہزاری تھے۔ کئی روز گرفتار رکھا تب کہیں دس ہزار روپے وصول ہوئے دیکھتے دیکھتے عہدیداروں کی قیمتیں گرنے لگیں، لوگ پنج صدی، پونے دوصدی، ایک سینکڑی اور پچاسی تک پہنچ

گئے۔ یہ لوگ بڑے لالچی ہیں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ کوئی ہزاری بہت چلایا کہ وہ ہزارہ کا رہنے والا ہے لیکن ہم نے اپنا اصول ترک نہیں کیا۔

لاہور سے روانگی

چاہیے تو یہ تھا کہ ان علاقوں میں چند روز رہ کر داد عیش و کامرانی دیتے مگر یہاں کی پرانی رسم ہے کہ وہ سیاح جو درۂ خیبر سے آتے ہیں انھیں سیدھے دلی جانا پڑتا ہے راستے میں کہیں نہیں ٹھہر سکتے۔

جہلم، چناب، راوی عبور کر چکے تھے۔ ستلج کو عبور کیا اور پنجاب کے پانچویں دریا کو بہت ڈھونڈا۔ خبر ملی کہ بیاس تو پہلے ہی ستلج سے مل چکا ہے، سخت مایوسی ہوئی۔ مصاحبین نے دست بستہ عرض کی کہ ملک کا دستور ہے حملہ آوروں سے اس علاقے میں ضرور لڑتے ہیں۔ اس کے لیے پانی پت، تراوڑی وغیرہ کے میدان مخصوص ہو چکے ہیں۔ ہم نے فرمایا کہ لڑیں تو تب اگر مقابلے میں کوئی فوج آئی ہو۔ معلوم ہوا کہ حملہ آوروں کو انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ اگر اہل ہند اس علاقے میں نہ لڑیں تو پھر کہیں نہیں لڑتے۔

محمد شاہ کو ہماری تشریف آوری کا علم ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ تو اس نے ایلچی کو لفافے سمیت شراب کے مٹکے میں دھکیل دیا اور بولا۔ ایں ایلچی بے معنی غرق مے ناب اولی۔ کسی ظلجی نے حافظ کا یہ مصرع صحیح کرنا چاہا۔ تو محمد شاہ نے اسے بھی مٹکے میں دھکیل دیا۔ آدمی باذوق معلوم ہوتا ہے۔

ہمیں تحفہ دینے کا نتیجہ

دلی سے ایک درباری قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا۔ تحائف سے لدا ہوا تھا اس لیے ہم نے بلا لیا۔ بولا یا شہنشاہ! سنا ہے کہ آپ تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے اس طرف تشریف لائے ہیں۔ جہاں تک آب و ہوا کا تعلق ہے اس ملک کو یہاں ختم سمجھیے، اس سے آگے سخت گرمی پڑتی ہے۔ رعایا کی التجا ہے کہ آپ دو کروڑ کی حقیر رقم بطور سفر خرچ قبول فرما کر یہاں سے مراجعت فرما جائیں۔ ہمیں رضامند پا کر وہ نابکار بغلیں بجانے لگا۔ ڈانٹا تو معلوم ہوا کہ یہاں کا رواج ہے۔ ایک تو یہاں کے رسم و رواج نے ہمیں عاجز کر دیا ہے۔ واپسی کے لیے سامان بندھوا رہے تھے کہ الوشناس نے شبہ کرا دیا کہ اہل ہند ہم پر اپنا محبوب نسخہ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ رقم ہمیں تحفتاً پیش کی جا رہی ہے۔ شام کو وہی درباری بغلیں جھانکتا ہوا پھر حاضر ہوا اور دلی چلنے کی ترغیب دینے لگا۔ عجیب ڈھلمل یقین

لوگ ہیں۔ الوشناس نے اصل وجہ بتائی جب درباری مذکور دلی میں پہنچ کر انعام کا خواہاں ہوا تو کسی نے پوچھا تک نہیں بلکہ بہادر کا خطاب کسی حریف کو مل گیا۔ اس نے جل بھن کر دھمکی دی کہ ٹھہرو! ابھی لاتا ہوں نادر شاہ کو ـــ

ہم نے سوچا کہ اب اتنی دور آ گئے ہیں تو دلی دیکھ کر جائیں گے۔ کرنال کے مقام پر محمد شاہی فوج دکھائی دی جو ہمیں دیکھتے ہی ادھر ادھر ہو گئی۔ ہم نے کہلوا کر بھیجا کہ ہماری خواہش ہے کہ اس جنگ کو تاریخ میں پانی پت کی تیسری لڑائی یا کرنال کی پہلی لڑائی کا رتبہ ملے۔ اس پیغام پر باقیماندہ فوج بھی بھاگ نکلی۔

قطب صاحب کی لاٹھ

نزولِ اقبال دلی کے باہر ہوا۔ قطب صاحب کی لاٹھ کے پاس نادر شاہی جھنڈے گاڑے گئے۔ یہ لاٹھ قطب صاحب کی تعمیر کردہ ہے لیکن اس کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا۔ پتہ نہیں قطب کا ارادہ کیا تھا۔ فرمانبردار خاں نے عرض کیا کہ غالباً قطب صاحب آسمان تک پہنچنا چاہتے تھے لیکن تجویز کو تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ بصد وقت اوپر تشریف لے گئے۔ واقعی بہت اونچا مینار ہے۔ آسمان یہاں سے بہت قریب ہے۔ ستانے کے بعد نیچے تشریف لائے۔

حملہ آوری اور برادرم محمد شاہ کی ہماری ذات سے عقیدت

صبح سے محمد شاہ اپنا لشکر لے کر سامنے آیا ہوا تھا مگر ابھی تک سعادت زیارت سے مشرف نہ ہوا تھا۔ دوپہر کو ایک ایلچی رنگین جھنڈا لہراتا آیا اور معروض ہوا کہ محمد شاہ صاحب نے دریافت کیا ہے کہ حملہ کرنے کا کس وقت ارادہ ہے۔ ہم نے پوچھا 'ابے حملہ کیسا'؟ ایلچی نے عرض کیا ـــ خداوند نعمت وہ تو عرصے سے آپ کے حملے کے منتظر ہیں، اتنے دنوں سے تیاریاں ہوتی رہی ہیں۔ اگر حملہ نہ ہوا تو سب کو سخت مایوسی ہوگی۔ کل بارش کی وجہ سے لشکر اکٹھا نہ ہو سکا اور پھر یہ رسم چلی آتی ہے کہ درۂ خیبر سے آنے والے ـــ ''بس بس! آگے ہمیں پتہ ہے'' ہم نے اسے ڈانٹا۔

مجبوراً ہم نے حملے کا حکم دے دیا لیکن لڑائی کا لطف نہ آیا۔ وہ لوگ فوراً تتر بتر ہو گئے۔ ہم شہر کے دروازے میں داخل ہوئے تو عزیزی محمد شاہ نے پھولوں کا ہار پہنایا۔ گھوڑے سے اتر کر بغلگیر ہوئے اس کے بعد دو دن محمد شاہ کا کوئی پتہ نہ چلا۔

دلی میں نازل ہو کر ہم نے اور بندگانِ درگاہ نے خوب دادِ عیش دی کہ شیوۂ سیاحاں ہے حمام گئے، الحمد اللہ کہ آج پورے ایک سال کے بعد غسل فرمایا۔ صبح سے شام تک تختِ طاؤس پر بیٹھ کر شغل خورد و نوش و خوش فعلیوں اور خوش گپیوں سے اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کرتے اور رعایا کو اپنے دیدار سے فیض یاب کرتے۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ ہمارے جیسا صاف باطن اور نیک دل بادشاہ تاریخ میں کوئی نہ ہوا ہوگا۔ سکندر نے پورس سے جو سلوک کیا اس سے کہیں بہتر سلوک ہم نے عزیزی محمد شاہ سے کیا۔ ہر چند کہ اس کی رنگین مزاجی ہمیں نہ بھائی تھی۔ اس کو مانند اپنے عزیز کے سمجھا۔ حق تو یہ ہے کہ اس نے ہماری اتنی خدمت کی کہ کیا کوئی اپنے بزرگ کا کرتا ہوگا۔

ہمیں شاہی مہمان خانے کے بہترین حصے میں ٹھہرایا گیا جو مرہٹوں کے لیے مخصوص تھا۔ عزیزی محمد شاہ نے شام کو ہمارے لیے مسواکیں، لباسِ شب خوابی، سلیپر بھیجے، چادریں اور غلاف بدلوائے۔ یہ اور بات تھی کہ ہم راستہ بھول گئے اور نہ جانے کہاں بوٹوں سمیت سیڑھیوں پر سو گئے۔ لال قلعہ باہر سے تو سیدھا سادا سا قلعہ معلوم ہوتا تھا لیکن اندر نفیس و نازک عمارتوں اور خوشنما باغوں کی بھول بھلیاں میں ہمیں گائیڈ کی ضرورت محسوس ہوا کرتی۔ ہماری آمد کی خبر پا کر (غالباً ہمیں متاثر کرنے کی غرض سے) حکومتِ ہند نے امتناعِ شراب کے احکامات جاری کر دیے تھے۔ لیکن عزیزی کی وساطت سے ہمارے سپاہیوں کے لیے پینے پلانے کا انتظام ہو ہی جاتا تھا۔

تختِ طاؤس

ایک دفعہ جب ہم متواتر دس گھنٹے تختِ طاؤس پر بیٹھے رہے تو عزیزی بولا: ''معلوم ہوتا ہے کہ تختِ طاؤس سے آپ کو از حد انس ہو گیا ہے۔ اگر آپ کا اس درجہ طویل قیام تختِ طاؤس کی وجہ سے ہے تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ آپ اسے بخوشی لیجا سکتے ہیں''۔

ایسے خلوص و محبت سے کس کا دل نہ پسیج جاتا۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ ہم جب یہاں سے عازمِ ایران ہوئے تو تختِ طاؤس ہمراہ لے جائیں گے۔ ہم انکار کر کے اس کا دل نہیں دکھانا چاہتے تھے۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے پوچھا— ''دلی کو اپنی ذاتِ بے مثال سے محروم کرنے کی تاریخ سے مطلع فرما دیا جائے تا کہ اہلِ دلی کو مطلع کر دیا جائے۔ وہ اس دن کے لیے گھڑیاں گن رہے ہیں—''

''کیوں گھڑیاں کیوں گن رہے ہیں۔ کیا وہ ہم جیسے مشفق بزرگ کو بن بلایا مہمان سمجھتے ہیں؟'' ہم نے غیظ و غضب میں فرمایا۔

''جی نہیں آپ نے غلط سمجھا۔ وہ الوداعی پارٹیوں کا انتظام کرنا چاہتے ہیں''۔۔۔۔وہ بولا۔

''ہمیں ان گلیوں کو چھوڑنے کی کوئی ایسی جلدی نہیں جن کے متعلق کوئی استاد ذوق شعر کہیں گے''۔ ہم نے فرمایا۔

''یوں ٹھہرنے کو آپ چھ ماہ، سال، دس سال ٹھہریئے بلکہ ایران کا دارالخلافہ دلی کو بنوا لیجئے''۔ عزیزی بڑی محبت سے ملتمس ہوا۔

''دیکھا جائے گا''۔۔۔۔ ہم نے بھی محبت سے فرمایا۔

وہ گلقند والا قصہ

بات کچھ بھی نہ تھی۔ مغلئی دسترخوان کی مرچیں ہمیں تیز معلوم ہوئیں تو حلوے کے مرتبان کی طرف متوجہ ہوئے۔ بمشکل کوئی پاؤ بھر حلوہ کھا سکے ہوں گے کہ فرمانبردار خان نے بڑی بدتمیزی سے مرتبان ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا۔ اس معمولی سے واقعہ پر لوگوں نے اتنا لمبا چوڑا افسانہ تراش لیا۔ ہمیں ہرگز علم نہ تھا کہ مرتبان میں حلوے کی جگہ گلقند ہے اور اگر علم ہوتا بھی تو کیا فرق پڑتا۔

ہنوز دلی دور است

اس فقرے کو ہم نے اہل دلی کا تکیہ کلام پایا۔ جب ہم خیبر میں تھے تو سنا تھا کہ ہمارے لیے ہنوز دلی دور تھی، جب لاہور پہنچے تب بھی دور رہی۔ لال قلعے میں پہنچ کر بھی لوگوں کا یہی خیال ہے کہ ہنوز دلی دور است۔ اچھا بھئی چلو دلی دور است، بس!!

محمد شاہ کا دربار

مسز محمد شاہ لال قلعے میں اس دھوم دھڑلے سے رہتی ہیں کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ سیاسی دنگے فساد میں ہمیشہ ان کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ملک کی خارجی اور اندرونی پالیسی (جب اتفاق سے ہوتی ہے) وہ خود ترتیب دیتی ہیں، یہاں تک کہ اعلیٰ حکاسوں کی پوسٹنگ وغیرہ بھی وہ خود ہی کرتی ہیں۔ وہ فارسی، عربی، سنسکرت اور مدراسی بول سکتی ہیں۔ لیکن دیگر بیگمات کا خیال ہے کہ وہ سمجھ ایک زبان بھی نہیں سکتیں (ویسے دیگر بیگمات کا ہمیشہ کچھ اور ہی خیال ہوا کرتا ہے)

درباری بیگمات بے حد ذہین ہیں، ایک برجیس جہاں بیگم نے برجس کو دیکھ کر چوڑی دار پاجامہ ایجاد کیا؛ دوسری نے شلوار کو ساری میں ضرب دے کر دو پر تقسیم کر دیا اور غرارہ دریافت کیا۔ تعجب ہے کہ یہ خیال اسے علی الصبح غرارے کرتے وقت آیا۔

صبح شام شہر کی چیدہ چیدہ خواتین حاضر ہو کر آداب بجالاتی ہیں اور شہر کی دوسری خواتین کے بارے میں تازہ ترین افواہیں سناتی ہیں۔

عزیزی محمد شاہ بھی لال قلعے ہی میں وہیں کہیں رہتا ہے۔

اس کا خیال ہے کہ وہ ہندوستان کا بادشاہ ہے لہٰذا اپنے تئیں شہنشاہ ہند کہلاتا ہے۔ رنگین خواب دیکھتا ہے، رنگین لباس پہنتا ہے، رجعت پسند ادب اور تنزل پسند شاعری کا گرویدہ ہے لیکن حرکتیں سب ترقی پسند کرتا ہے۔

کل وزیر جنگ نے بتایا کہ ملک کے کچھ حصوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے۔ عزیزی محمد شاہ خوش ہو کر بولا ـــ اب ملک کا بیشتر حصہ خود مختار ہو چکا ہے۔ جتنے صوبے اور ریاستیں خود مختار ہوں گے اتنا ہی ہمارا کام کم ہو جائے گا۔ ملک کے ریاستوں میں بٹتے ہی ان کی ریاست ہائے متحدہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

عزیزی کے تعلقات مرہٹوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ خوشگوار ہیں۔ جب مرہٹے بیکار ہوتے ہیں تو سیدھے دلی آ دھمکتے ہیں۔ پچھلے ماہ آئے تھے تو زبردہ، چنبل اور مالوہ کے علاقے لے کر ٹلے۔ خیر ہمیں کیا عزیزی جانے اور اس کا کام!

ہندی فوج کو دیکھ کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی لڑنے جاتے ہیں تو پالکیوں میں بیٹھ کر، میدان جنگ میں ڈھال ملازم اٹھاتا ہے، ہر وقت صلح کے خواہاں ہیں۔ ہر سپاہی کی وردی مختلف ہے، کرنال میں ہم سے لڑنے آئے تو جیسے عید کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہمیں زیادہ نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیے۔ انسان خاک کا پتلا ہے۔

مینا بازار اور ہم

محمد شاہ کے بزرگوں کے وقت سے رسم چلی آتی ہے کہ موسم بہار میں لال قلعے میں مینا بازار لگتا ہے جس میں طرح طرح کی دکانیں سجائی جاتی ہیں۔ دکانوں سے زیادہ بیگمات بجتی ہیں اور

مختلف اشیا بازار سے چوگنے نرخ پر خریدتی ہیں۔ اس دنوں تو ذرا سے بہانے پر مینا بازار لگ جاتا ہے۔ ہماری طبیعت حاضر تھی۔ محمد شاہ سے مینا بازار دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے ٹالنا چاہا۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم بزرگ بھی ہیں۔ وہ بولا کہ اگر آپ کو اتنا ہی شوق ہے تو دو دن سمندِ شوق کو لگام دیجیے۔ اس مینا بازار کے ختم ہوتے ہی ایک مردوں کے مینا بازار کا انتظام کرائے دیتا ہوں جس میں سب مرد ہی مرد ہوں گے۔ پوچھا کہ ہم زنانہ شو میں کیوں نہیں جا سکتے۔ بولا اس میں سوائے بادشاہ ہند کے کسی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ ہم نے فرمایا کہ کچھ دیر کے لیے ہمیں بادشاہ ہند سمجھ لیا جائے۔ آدمی عقلمند تھا مان گیا، ہمارا فرزند علی قلی خاں بائیس سال کا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو نابالغ سمجھتا ہے، اپنے ہم جنسوں کی صحبت کی بجائے عورتوں میں اٹھنے بیٹھنے کو ترجیح دیتا ہے۔ ہمارے ساتھ مینا بازار جانے پر مصر ہوا۔ دیکھا کہ ہر طرف نازنینانِ گل بدن رنگ برنگے ملبوس پہنے چہلیں کرتی ہیں۔ نہ نگاہیں نیچی ہیں، نہ دوپٹے کا خیال ہے، دیکھ کر آنکھوں میں خون اتر آیا (آج صبح بھی ایک مرتبہ خون اترا تھا) ہمارے بارے میں سب کو علم ہو چکا تھا، ہمیں گھیر لیا گیا۔ ہمارے دستخط لیے گئے، ساتھ ساتھ مناسب اشعار لکھنے کو کہا گیا، ہم سے طرح طرح کے پریشان کن سوالات پوچھے گئے۔

ارادہ ہوا کہ کچھ زنانہ سامانِ آرائش ایران لے جانے کے لیے خریدیں پھر سوچا ہمارے پہنچتے پہنچتے کہیں فیشن نہ بدل جائے۔

ایک ماہ رو نظر پڑی کہ کچھ سامان لیے جاتی ہے۔ ایک دکان کے سامنے اس نے آواز دی۔ "قلی! قلی!!" کیا دیکھتے ہیں پسر نا خلف علی قلی خدا جانے کہاں سے بھاگتا ہوا آیا اور اس کا سامان اٹھا لیا۔

"تم قلی ہو—؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں—بالکل—" علی قلی نے جواب دیا۔

اگرچہ ہم علی قلی کے اس قسم کے قلی بن جانے پر خفا تھے مگر اس کی حس مزاح پر حیرت ہوئی کیوں کہ ہمارا خاندان اس حس سے بے بہرہ ہے۔ ہم میں خود مذاق برداشت کرنے کی تاب نہیں۔ کچھ دیر بعد جب غلطی کا ازالہ ہوا تو نازنین بے حد محظوظ ہوئی اور بڑی معصومیت سے پوچھنے لگی۔ "آج شام کو آپ کیا کر رہے ہیں؟"

''کوئی خاص کام نہیں''۔علی قلی نے جواب دیا۔

''مست قلندر صاحب کے عرس پر ایک سرکس آیا ہوا ہے۔'' وہ بدستور معصومیت سے بولی۔

''میں پہلے شو کے لیے دو نشستیں بک کرالوں گا اور باہر ٹکٹ گھر کے پاس انتظار کروں گا۔ خدا حافظ! میرے ابا مجھے گھور رہے ہیں''علی قلی بھاگا۔

شام کو ہم اس کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ آئینے کے سامنے کھڑا مونچھیں تراش رہا ہے۔ باز پرس کی تو بولا عرس پر جا رہا ہوں۔ ہم نے پوچھا ٹکٹ کی قیمت کون دے گا۔ اس کے منہ سے نکل گیا، چچا محمد شاہ نے دو سیٹیں بک کرادی ہیں۔ پوچھا دوسری کس کے لیے ہے تو چپ ہو گیا۔

''نامعقول! ایسے ہجوم میں جا کر خواہ مخواہ سکینڈل کروائے گا—'' ہم نے گرج کر کہا'' کچھ ہماری پوزیشن ہی کا خیال کر—''

''ابا جان میں وعدہ کر چکا ہوں''—اس نے ایسے عدم تشدد انہ انداز سے کہا کہ ہم لوٹ آئے۔

ہندی کلچر

ہندی کلچر کی بے حد تعریفیں سنی تھی چنانچہ دیکھنے کا شوق تھا۔ (حملے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی۔ فرمانبردار خاں کو وقت پر سوجھتی نہیں) عزیزی محمد شاہ سے ذکر کیا۔ وہ بولا کلچر وغیرہ کا تو پتہ نہیں آپ نے اگر کلچر (Agriculture) سنا ہوگا وہ البتہ مشہور ہے۔ ہم مصر ہوئے تو کہنے لگا آپ سنی سنائی باتوں کا یقین نہ کیجیے۔ ویسے ہمارے ہاں چند ایک باتیں واقعی شہرۂ آفاق ہیں۔ ایک تو یہی قدیمی دواخانے جن کے اشتہار آپ چپے چپے پر دیکھتے ہیں۔ دوسرے قدیم روایات جن کے لیے بھیس بدل کر شہر میں چلنا ہوگا۔ چنانچہ ہم دونوں گئے ایک جگہ ایک شخص (جو کہ مدرس تھا) بھینسوں کے آگے بین بجا رہا تھا اور بھینسیں متوجہ نہیں تھیں۔ ایک سیاسی جلسے میں بہت سے حضرات اپنے سامنے ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ رکھے عبادت میں مشغول تھے۔ وہیں ایک شخص کہ باغیرت معلوم ہوتا تھا چلو میں پانی لیے ناک ڈبونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک جگہ دو حکام شہر ایک پرندے کو کھینچ کر سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پرندہ الو تھا، ایک نہایت ضعیف بزرگ قبر کے کنارے پاؤں لٹکائے نوجوانوں پر تنقید کر رہے تھے۔ محمد شاہ کے متعلق ہم کہہ نہیں سکتے۔ البتہ ہم از حد محظوظ ہوئے۔

علی قلی کی گستاخی اور ہمارا تحمل

آہستہ آہستہ برخوردار علی قلی اور اس لڑکی کا قصہ مشہور ہوتا جا رہا تھا۔ سوچا کہ اس معاملہ کو فوراً ختم کیا جائے چنانچہ اس کے کمرے میں گئے۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال گھنگھریالے بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بولا ''ابا جان! معاف فرمائیے دروازہ کھٹکھٹائے بغیر اندر آنا موجودہ آداب کے خلاف ہے''۔

ہمیں سخت غصہ آیا۔ نئی پود ہمیں آداب سکھائے گی، یہ لڑکا دن بہ دن بگڑتا جا رہا ہے۔

''ہم تجھے جگالی کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں— جب سے دلی آیا ہے ہر وقت منہ چلاتا رہتا ہے— کیا ہے تیرے منہ میں—؟''

''پان کھا رہا ہوں— کسی نے دیا تھا— '' وہ بولا۔

''یہ لڑکی کون ہے؟ وہی عرس والی لڑکی تو نہیں—؟ وہ تو بے حد معمولی سی ہے— '' ہم نے فرمایا۔

''ابا جان اس کی تھوڑی پر جو خوشنما تل ہے وہ نہایت بھلا معلوم ہوتا ہے۔''

''مصیبت تو یہ ہے کہ آج کل کے نوجوان خوشنما تل پر عاشق ہو کر عام لڑکی سے شادی کر بیٹھتے ہیں''۔

''ابا جان محبت بڑی چیز ہے۔'' وہ سرد آہ کھینچ کر بولا۔

''تو سپاہی ہے تجھے تلوار اور گھوڑے سے محبت کرنی چاہیے۔ ہم خود گھوڑوں کو چاہتے ہیں۔ گھوڑے جب پیار کریں تو ساریوں اور زیورات کی فرمائش نہیں کرتے''۔

''ابا جان بات دراصل یہ ہے کہ مجھے—اس سے—''

''خبردار گستاخی کرتا ہے۔ جانتا نہیں کہ تو نادر شاہ ابن شمشیر ابن شمشیر کی اولادِ ناخلف ہے''۔

''آپ کا مطلب ہے کہ دادا جان کا نام شمشیر تھا۔ شمشیر شاہ—''

''اے گستاخ! شمشیر سے مراد تلوار ہے سمجھا؟''

''سمجھ گیا—ابا جان کیا آپ مجھے چار روپے آٹھ آنے دے سکیں گے سرکس کے لیے؟''

''ایسے نالائق کو ہم اور کیا کہہ سکتے تھے؟''

ہمارا اصلاحات رائج کرنا

مصاحبِ حضوری حقہ بردار خاں معروض ہوا کہ شہنشاہوں کا رواج رہا ہے کہ رعایا کی بہبودی کے لیے حسبِ توفیق اصلاحات نافذ کرتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم بھی چند مفید اصلاحات عمل میں لائیں تاکہ اہلِ ہند ہمیں رہتی دنیا تک یاد کریں۔ ہم حیران ہوئے کیوں کہ ہمارے خیال میں ہماری ہر حرکت میں اہلِ ہند کے لیے کوئی نہ کوئی اصلاح پوشیدہ تھی۔ جب دیکھا کہ وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتا تو کافی غور و خوض کے بعد مندرجہ ذیل فہرست مرتب فرمائی:

1۔ درۂ خیبر کو ڈھا کر ہموار کرایا جائے وہاں سے دلی تک دس میل کے فاصلے پر عالیشان سرائیں تعمیر کرائی جائیں تاکہ حملہ آوروں کو کسی دقت کا سامنا نہ ہو۔ سڑک پر جگہ جگہ ''خوش آمدید'' نصب کیا جائے۔ ساتھ ہی ایک محکمہ کھولا جائے جو دوسرے ملکوں میں نشر و اشاعت کے ذریعے لوگوں کو ہند میں آنے کی ترغیب دے۔

2۔ ستلج اور جمنا کے درمیان ایک وسیع علاقہ خشک اور غیر آباد پڑا ہے۔ اس خطہ کو سیراب کرنے کے لیے عظیم الشان دریا کھدوایا جائے۔

3۔ ہند کے تاریخی مقامات ملک بھر میں بکھرے ہوئے ہیں، سیاحوں کو بڑی قباحت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاج محل آگرے میں ہے۔ غار ہائے الورا، الورا میں تو جہانگیر کا مقبرہ لاہور میں۔ ان ساری تاریخی عمارات کو منہدم کرا کے دلی میں اک مرکزی مقام پہ دوبارہ تعمیر کرایا جائے تاکہ سب کچھ بیک وقت دیکھا جا سکے۔

4۔ ہر سال درخت اکھاڑنے کا ہفتہ بڑے زور شور سے منایا جائے۔

5۔ قطب صاحب کی لاٹھ کا نام تبدیل کر کے اگلے حملہ آور کے آنے تک نادر شاہ کی لاٹھ رکھا جائے تاکہ لوگوں کو حملہ آوروں کے نام بآسانی یاد رہ سکیں اور تاریخ ہند مرتب کرنے میں آسانی ہو۔

وہ اصلاحات گنانے بیٹھیں جو ہم نے اس مختصر سے قیام میں نافذ کرائیں تو بے شمار ہیں۔ ہمیں یاد بھی نہیں رہیں، مثلاً بارہ دری کی جگہ تیرہ دری بھی تعمیر کرائی جائے۔ جنگل میں منگل ہی نہیں بدھ بھی منایا جائے وغیرہ وغیرہ۔

محبت اور شادی کے متعلق ہمارے خیالات

ہمارے خیال میں اگر محبت کو شادی سے اور شادی کو محبت سے دور رکھا جائے تو دونوں نہایت مفید چیزیں ہیں لیکن نوجوان بڑی جلد بازی سے کام لیتے ہیں، دوسروں کے تجربے سے مستفیض نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ شادی مول لے بیٹھتے ہیں۔

اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ جو لوگ شادی سے پہلے پچھتاتے تھے وہ شادی کے بعد بھی خوب پچھتاتے ہیں، ہم کبھی نہیں پچھتائے حالانکہ ہم کسی زمانے میں بڑے بانکے البیلے نوجوان مشہور تھے۔

جب ہمیں معلوم ہوا کہ برخوردار علی قلی شادی پر تلا بیٹھا ہے تو ارادہ ہوا کہ اسے من مانی کرنے دیں، کیا یاد کرے گا لیکن ان ہی دنوں ہم ایک ایسی حرکت کے مرتکب ہوئے جو ہمارے جیسے بزرگ کی شان کے شایاں ہرگز نہ تھی۔ ویسے ہم چھپ کے کسی کی باتیں سننے کے عادی نہیں ہیں۔ اس روز نہ جانے کیوں کر ہم نے یہ برداشت کیا اور اوٹ سے ان دونوں کی گفتگو سنی۔

لڑکی نے برخوردار علی قلی کی آمدنی کے متعلق پوچھا۔ علی قلی نے ہمارا حوالہ دیا کہ والد بزرگ شہنشاہ ہیں۔ وہ بولی ''شہزادوں کی تو خدا کے فضل سے یہاں کوئی کمی نہیں، ہر تیسرا نوجوان شہزادہ ہے بلکہ غیر شہزادہ ہونا زیادہ اہمیت رکھتا ہے''

''ہمارے ملک میں تیل کے چشمے ہیں'' علی قلی کا یہ کہنا تھا کہ لڑکی کی باچھیں کھل گئیں۔

''تمھارے کنبے کے متعلق امی پوچھ رہی تھیں تم مغل ہو؟''

مغل وغیرہ کا پتہ نہیں، ویسے ہم ابن شمشیر ابن شمشیر ہوتے ہیں — علی قلی بولا۔

''بہر حال ہمارے کنبے والے ایران سے تمھارے چال چلن کی تصدیق کرائیں گے''۔

''چال تو میں ابھی چل کر دکھا دیتا ہوں'' — علی قلی نے بھولپن سے کہا — ''رہ گیا چلن، شادی کے بعد ایران چلو گی تو وہاں دیکھ لینا۔''

''ایران جانا تو ذرا مشکل ہے کیوں کہ امی جان مجھے بے حد چاہتی ہیں، وہ کہتی ہیں کہ شہزادہ علی قلی ہر سال ایک ماہ کی چھٹی لے کر آجایا کرے گا۔ یا یوں ہو کہ ابا جان شہنشاہ محمد شاہ سے مل کر تمھیں کوئی ریاست الاٹ کرا دیں''۔

''تجویز تو یہ بھی اچھی ہے —'' وہ خفا بولا۔ ''لیکن اگر میں ایران چلا گیا تو تم اداس رہا کروگی''۔

''تم اس کی فکر نہ کرو۔ ہمارے ہاں کافی شہزادوں کا آنا جانا ہے''۔

علی قلی بگڑنے لگا۔ ''تم پرسوں شام کس شہزادے کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے گئی تھیں؟؟''

''وہ تو بھائی جان کے دوست ہیں۔ ان کی پالکی بالکل نئے ماڈل کی ہے، تمھارے ساتھ پیدل چلنا پڑتا ہے۔ شام کا لباس خراب ہو جاتا ہے''۔

ہم بقیہ گفتگو سنے بغیر تشریف لے آئے۔

علی قلی کا علاج

ہمیں یقین ہو چکا تھا کہ یہ لڑکی بہت زیادہ ماڈرن خیالات کی ہے، بے چارے علی قلی کو بھی کا ناچ نچائے گی کہ زن مرید بن کر رہ جائے گا۔ ہم نے برخوردار خاں وطلسوف سے ذکر کیا، اس نے بڑے پتے کی بات کہی، یہی کہ وہ دونوں محض فلرٹ کر رہے ہیں، سنجیدہ کوئی بھی نہیں ہے۔ علی قلی لڑکی سے ہمیشہ شام کو ملتا ہے اور شام کو اس کے سانس میں سے رنگین کی بو ہوتی ہے جسے وہ الائچی یا پان سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک روز اس کی پوستین سے پوست کی کافی مقدار برآمد ہوئی۔

ہمارا تجربہ ہے کہ غروب آفتاب کے قندیلوں کی جھلملاتی روشنی میں سب لڑکیاں حسین معلوم ہوتی ہیں، خصوصاً چند گھونٹ بادۂ رنگین چڑھا لینے کے بعد۔

ہم نے درویش کامل شیخ بوتا شجر پوری کا نسخہ نکالا جو انھوں نے محبت اتارنے کے سلسلے میں بتایا تھا۔ اسے علی قلی پر آزمایا اور تیر بہدف پایا۔ شام ہوتے ہی علی قلی کو کہیں باہر کام پر بھیج دیا جاتا، ملنا جلنا چھڑوا دیا گیا۔ لڑکی لگاتار علی الصبح اسے دکھائی گئی، سورج کی روشنی میں جب علی قلی نے لڑکی کی اصلی شکل بغیر میک اپ کے دیکھی تو بہت سے رازہائے پنہاں آشکار ہوئے۔ چند ہی دنوں میں ایسا بدلا کہ لڑکی سے کوسوں دور بھاگنے لگا۔ ولی کا رخ ہی نہ کرتا تھا بلکہ ایک روز معروض ہوا کہ میں تارک الدنیا بننا چاہتا ہوں، ہم نے اسے منع کر دیا۔

شیخ بوتا شجر پوری کے بقیہ نسخے بھی استعمال کریں گے، انشاءاللہ تعالیٰ۔

ہند کے بادشاہ گر

ہند کے دو بادشاہ گر سید برادرز (حسین علی خاں اور پتہ نہیں کیا علی خاں) تقریباً ہر روز پریس کانفرنس منعقد کرتے اور انواع و اقسام کے بیان دیتے۔ چونکہ پریس ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس لیے ملک کی سیاست پر پورا قابو تھا۔ دونوں بھائی اکثر دورے پر رہتے تھے۔ اس لیے ہماری خدمت میں حاضر نہ ہو سکے۔ ایک روز ہم نے بازار میں ایک بورڈ دیکھا جس پر ''اصلی شہنشاہی بادشاہ گران مملکتِ ہند'' لکھا تھا۔ اوقات ملاقات اور مشورے کی فیس بھی درج تھی۔ ہم نے انھیں اپنے دیدار سے سرفراز فرمایا اور انھیں بلا کا چست و چالاک و چار سو بیس پایا۔ کاش کے ہم ایسے سمارٹ لوگوں کو اپنے ساتھ لے جا سکتے۔ محمد شاہ سے کہا کہ ہمیں ایک جوڑی بادشاہ گر درکار ہیں۔ وہ ملتمس ہوا کہ ''انھیں کے دم سے تو دلی میں رونق ہے۔ لہٰذا انھیں چھوڑ جائیے گدا گر البتہ حاضر ہیں''۔

''وہ تو ہم ملتان سے خود لے سکتے ہیں—'' ہم نے فرمایا۔

ایک رفیق دیرینہ سے ملاقات

چاندنی چوک سے گزر رہے تھے کہ شور غل سنائی دیا۔ دیکھتے ہیں کہ بہت بڑا جلوس آرہا ہے، آگے آگے ہاروں سے لدا ہوا ایک شخص ہے کہ شکل اس کی زمانہ ساز خاں سے ملتی ہے، یہ زمانہ ساز خاں ہی تھا۔ ہمیں پہچان گیا۔ معانقہ کیا۔ معلوم ہوا کہ ملک کے بڑے لیڈروں میں سے ہے۔ خدا کی شان کہ یہی زمانہ ساز خاں کبھی زمانے کی ٹھوکریں کھاتا اور بھیڑوں کی اون تراشتا، آج اس شان و شوکت سے نکلتا ہے کہ شہنشاہ دیکھیں تو رشک کریں۔ شام کو ہم نے اسے مدعو کر کے اس کی عزت افزائی فرمائی اور اس حیرت انگیز ترقی کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگا کہ اس کی زندگی قربانیوں کا مرقع رہی ہے، ملک اور قوم کی خدمت کر کے اس رتبے کو پہنچا ہے۔ شراب کا دور چلا تو بہت جلد آؤٹ ہو گیا۔ ہمارے دوبارہ استفسار کرنے پر اصلی بھید کھلا۔ اس نے اقبال کیا کہ ایران سے یہاں آ کر بکریوں کی اون تراشنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ پھر پوسٹر چسپاں کرنے پر ملازم ہو گیا۔ ایک روز شومیِ قسمت سے کوئی پوسٹر لگاتا ہوا گرفتار کر لیا گیا۔ صاحب پوسٹر سے جیل میں تعارف ہوا۔ رہائی کے بعد انھوں نے ایک سیاسی جلسے میں بلایا۔ اسٹیج کے قریب دھواں دھار تقریر سننے میں ہمہ تن گوش تھا۔ (جو خاک سمجھ میں نہیں آرہی تھی) کہ لاٹھی چارج کی مہیب صدا کانوں

میں پڑی۔ گھڑی بھر میں افراتفری مچ گئی، چنانچہ مخالف سمت میں جست لگائی اور اتفاقاً اسٹیج پر اپنے تئیں کھڑا پایا۔ گرفتاری شروع ہوئی تو غلطی سے لیڈروں کے ساتھ دھر لیا گیا۔ جیل میں سیاسی قیدیوں والا سلوک ہوا جو کہ نہایت تسلی بخش تھا، رہائی ہوئی تو پبلک نے جھنڈوں، بینڈ باجوں، نعروں اور آتشبازی سے استقبال کیا۔ شہر بھر میں جلوس نکلا۔ گھر پہنچا تو بالکل جی نہ لگتا تھا، اگلے ہفتے سیاسی جلسے میں دانستہ طور پر اسٹیج کے قریب رہا۔ لاٹھی چارج ہوتے ہی فوراً لیڈروں میں گھس گیا تاکہ گرفتاری کے وقت آسانی سے دستیاب ہو سکے۔ بڑے گھر میں قیام و طعام کا انتظام گھر سے لاکھ درجے بہتر تھا چنانچہ تقریباً ہر ماہ یہی تماشا ہوتا؛ پبلک بھی اسے بار بار دیکھ کر نوٹس لینے لگی، اسے بھی محسوس ہونے لگا کہ آہستہ آہستہ وہ کچھ لیڈر سا بنتا جا رہا ہے۔ اب اس نے سنجیدگی سے کام شروع کیا، کتابوں سے تقریریں نقل کرنے لگا۔ آئینے کے سامنے مشق شروع کر دی، خدا نے دن پھیرے اور وہ لیڈروں میں شمار ہونے لگا۔

ہم نے یہ سنا تو رشک و حسد کے جذبات محسوس فرمائے۔ پھر سوچا کہ موجودہ پوزیشن بھی کوئی خاص بری نہیں ہے زمانہ ساز خاں معروض ہوا کہ "برخوردار علی قلی خاں کچھ کچھ پر وقاری سا معلوم ہوتا ہے، کیوں نہ اس کو اسی لائن میں ڈال دیں"۔ ہم نے فرمایا کہ علی قلی خاں روپے پیسے والا ہے۔ یہ تو جب چاہے لیڈر بن سکتا ہے۔ وہ ملتمس ہوا کہ یہ بھی درست ہے لیکن فی زمانہ لیڈری افضل ترین پیشہ ہے۔ ہم نے بات کاٹی اور فرمایا کہ نہیں لیڈری نمبر دو ہے اور پیری سریدی نمبر ایک۔

ہمارا مقامی سیاست میں حصہ لینا

ان دنوں الیکشن زوروں پر تھی۔ الوشناس معروض ہوا کہ ہم دلی میں اس قدر مقبول ہو چکے ہیں کہ کسی ٹکٹ پر کھڑے ہو جائیں انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔ بادشاہ گروں سے مشورہ لینا بیکار تھا کیوں کہ الیکشن کے معاملے میں وہ بالکل یوں ہی تھے۔ ایک ایک ٹکٹ پر لاتعداد امیدواروں کو نامزد کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات امیدواروں کی تعداد رائے دہندگان سے زیادہ ہو جاتی۔ لطف یہ تھا کہ ہمارے مقابلے میں محمد شاہ بھی تھا۔ فرمانبردار خاں نے حسب معمول نہایت مایوس کن خبریں سنائیں۔ جب ہم نے اس کو برا بھلا کہا تو وہ بھی مان گیا کہ واقعی ہم شہر میں بے حد ہر دل عزیز ہیں اور الیکشن میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ یہ شخص آہستہ آہستہ ہمارے مزاج سے واقف ہوتا جا رہا ہے۔

سات امیدواروں سے دو کو زرِ کثیر تحفتاً دے کر بٹھایا گیا، تیسرے کو ڈرا دھمکا کر علیٰحدہ کیا، چوتھے کو سفیر بنا کر باہر بھجوانا پڑا، دو کمال درجہ ضدی نکلے، ایک کو زدوکوب کرایا تو مانا، دوسرے نے مشکوک حالات میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ رائے شماری شروع ہوئی حقہ بردار خاں نے شہر بھر کی دعوت کی، لوگوں کو تحفے اور زرِ نقد دیا، رائے دینے کو طرح طرح سے خوش کیا۔ اتنی خاطر تواضع کے بعد بھی کوئی بدتمیز نہ مانتا تو اسے ڈنڈے کے زور سے منوایا جاتا کہ ہم سچ مچ ہر دلعزیز ہیں۔ ہم جیت تو گئے لیکن اخراجات کی تفصیل دیکھی تو از حد پشیماں ہوئے، افسوس بھی ہوا کہ ناحق ذرا سی خوش وقتی کی خاطر اتنا روپیہ اور وقت برباد کیا۔ معلوم ہوا کہ ہند میں ہر صاحب دولت کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے کہ الیکشن لڑے۔ سیاسی معاملات میں یہ لوگ سنجیدہ بالکل نہیں ہوتے۔ نتیجے سے زیادہ وقتی ہنگامے کی پروا کرتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں۔

ملک ملک کا رواج ہے صاحب۔

دلی میں سٹیل ہونے کا ارادہ

الوشناس نے مشورہ دیا کہ دنیا میں یوں مارے مارے پھرنے کی بجائے کیوں نہ ہم ایک اچھی سی مملکت میں باقاعدہ سٹیل ہو جائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اب تک ہماری حیثیت مانند ایک رفیوجی کے رہی ہے۔ ہم نے عزیزی محمد شاہ سے ذکر کیا اور رہائش کے لیے لال قلعہ الاٹ کروانے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ بولا لال قلعے میں تو ہم رہتے ہیں آپ قطب صاحب کی لاٹھ الاٹ کرا لیجیے یا شاہی مسجد۔

ہم نے انکار فرمایا اور اپنے مہاجر ہونے کی اہمیت جتائی، وہ بولا ہم لوگ بھی تو مہاجر ہیں۔ ہمارے آباواجداد وسط ایشیاء سے آئے تھے۔ ہم نے بہتیرا سمجھایا کہ وہ مقامی مہاجر ہیں اور ہم نووارد ہیں جنھیں اب تک نہیں بسایا گیا۔ اس نے گستاخانہ کہا یوں تو حضرت آدم بھی مہاجر تھے کہ بہشت چھوڑ کر آئے تھے۔

ہمیں سخت غصہ آیا لیکن فوراً اتر گیا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے۔ ہند میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد وہ پہلے جیسا غصہ ہی نہیں آتا لیکن محمد شاہ کو اس گستاخی کی سزا اسی شام کو مل گئی۔ الوشناس بھاگا بھاگا آیا، بولا محمد شاہ خزانے میں ہے اور زرد جواہرات ادھر ادھر چھپا رہا ہے۔ ہم فوراً موقع پر پہنچے،

ہمارے دیکھتے دیکھتے اس نے ایک وزنی سی چیز اپنی پگڑی میں چھپالی۔ ہند کے رواج کے مطابق ہم نے ازراہِ مروت فرمایا کہ آج سے محمد شاہ اور ہم بھائی بھائی ہیں لہٰذا ہم نے دونوں اپنی پگڑیاں بدلیں گے۔

یہ محض اتفاق تھا کہ اس کی پگڑی سے کوہِ نور ہیرا برآمد ہوا۔

ہندی وزراء سے شکر رنجی

الوشناس اور محمد شاہ کے وزراء کی ناچاقی کی وجہ دو کروڑ کی وہ رقم تھی جو شاہی ایلچی ہمارے لیے کرنال میں لے کر آیا تھا۔ وزراء کا اصرار تھا کہ رقم ادا ہو چکی ہے۔ الوشناس انکار کرتا تھا اور یہ بھی کہتا تھا کہ رقم دو کروڑ نہیں ڈھائی کروڑ تھی۔ ایلچی اسی کشمکش میں اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ ہم نے محمد شاہ سے فرمایا کہ روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے لہٰذا شاہی خزانے سے رقم چکا دی جائے۔ رقم ادا کر دی گئی لیکن شکر رنجی نہ گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ اپنے وزیروں سے ڈرتا ہے، بولا اہلِ دربار کی التجا ہے کہ اس مرتبہ آپ سے رسید لکھوائی جائے۔ ہم مان گئے۔ ڈھائی کروڑ کی رسید تیار کی گئی۔ ہم نے دستخط شروع کیے۔ ابھی چوتھی مرتبہ ہی ابن شمشیر لکھا ہوگا کہ وہ گھبرا گئے اور کہنے لگے کہ کاغذ چھوٹا ہے۔ دستخط مختصر ہونے چاہئیں۔ عزیزی محمد شاہ کے دستخط تو بے حد مختصر ہیں اس نے شکستہ حروف میں محض ''ایم۔ ایس رنگیلا'' لکھا۔

اب کمبخت محرر کہیں سے آمرا۔ معروض ہوا کہ محاسبِ اعلیٰ کے اعتراض سے بچنے کے لیے رسید پر ایک آنے کا ٹکٹ چسپاں کیا جائے۔ ٹکٹ لگایا تو معلوم ہوا کہ یہ غلط ٹکٹ تھا، محکمہ مال کا ٹکٹ ہونا چاہیے۔ پھر کسی نے کہا کہ ایک آنے کا نہیں دو آنے کا ٹکٹ لگے گا۔ مجبوراً اپنی جیب سے دو آنے دیے۔ اس دفتری کارروائی سے طبیعت بدمزہ سی ہوگئی اور ساڑھے چار کروڑ کا لطف نہ آیا۔

''ایسے لاجواب وزیر تم نے کہاں سے حاصل کیے؟'' ہم نے پوچھا۔

''وزیرستان سے!'' وہ بولا۔

''اور یہ وزیر آباد کیا ہے؟''!

''یہ یونہی ہے''۔

ایک باکمال بزرگ

قطب الدین خاں جاگیر دار کی شادی پر گئے، دولھا کی عجب درگت بنی۔ عورتیں پہلے تو اسے برا بھلا کہتی رہیں، پھر زدوکوب کرنے لگیں اور وہ تھا کہ چپ چاپ بیٹھا تھا۔ سوچا کہ اُن بن ہو گئی ہے لیکن معلوم ہوا کہ شادی کی رسمیں ادا ہو رہی ہیں۔ لاحول پڑھی۔

نکاح سے قبل ہم نے دولھا سے دریافت کیا کہ اس کی آخری خواہش کیا ہے تاکہ پوری کروادی جائے۔ وہیں ایک لنگوٹی پوش بزرگ کو دیکھا کہ لمبا سا عصا ہاتھ میں لیے خاموش بیٹھے ہیں، کسی کو علم نہ تھا کہ یہ رہتے کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں لیکن کہیں شادی ہوئی تو ضرور آتے ہیں۔ نکاح شروع ہوا تو ذرا قریب آ گئے، جب دولھا نے ''قبول کیا'' کہا تو بزرگ نے ڈنڈا اچھال کر ''پھنس گیا'' کا نعرہ لگایا اور غائب ہو گئے۔ ہر شادی میں وہ اسی طرح کرتے ہیں۔

تعجب ہے کہ ہند میں ایسے ایسے باکمال بزرگ بھی موجود ہیں۔

مینا بازاروں کی بھرمار

اب تو مینا بازار ہر ہفتے ہوتا، ملک کے مختلف حصوں سے خواتین آرائشی سامان خریدنے کے بہانے آتیں، اپنی دختران وغیرہ کو بھی ساتھ لاتیں۔ نہ جانے کسی نے اڑادی تھی یا تو خدا نخواستہ ہم ایک اور شادی کریں گے یا برخوردار علی قلی خاں منگنی کرائے گا۔ ہم خواتین سے دور ہی رہتے۔ برخوردار علی قلی خاں کو بھی دور دور رکھتے، ہم شادی برائے شادی کے ہرگز قائل نہیں ہیں۔

خواتین سے دور رہنے کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ ان کے قریب رہ کر ہمیں دیدے مٹکانے، ہاتھ نچانے اور انگلی سے ناک چھو کر بات کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ دوران گفتگو میں ہمارے منہ سے غیر شعوری طور پر اُف اُوئی، توبہ، ہائے نگوڑا وغیرہ جیسے کلمات بھی نکل جاتے جس سے بعد میں سخت پشیمانی ہوتی۔ ہم زیورات، کپڑوں اور ساس، بہو کے قضیوں میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے۔ ذرا ذرا سی باتوں پر جھنجھلا اٹھتے، بات بات پر لڑنے کو تیار ہو جاتے۔ چنانچہ جب کسی خاتون نے مینا بازار میں ہم سے حملہ آوری کی وجہ پوچھی تو ہم نے پہلے تو بھرے بازار میں اسے کوسے دیے کہ اگر ہم نہ آتے تو کوئی اور آ جاتا۔ پھر فائل منگا کر وہ تمام کانفیڈنشل خطوط دکھائے جو ہندی امرا نے

وقتاً فوقتاً ہمیں لکھے تھے اور ہمیں حملہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ (ہماری حملہ آوری کی ایک یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے جو فرمانبردار خاں کو یاد نہ رہی)۔

جنوبی ہند سے وفد

جنوبی ہند سے وفد برائے نادر یار جنگ بہادر آیا۔ ہم بہادر ضرور ہیں، جنگ کا بھی شوق ہے لیکن یار وغیرہ کسی کے نہیں ہیں۔ انھیں گلہ تھا کہ خیبر سے آنے والے حملہ آور دلی تک آتے ہیں اور وہیں کے ہو رہتے ہیں۔ جنوب کو بھولے سے بھی نہیں نوازتے۔ ہم چونکہ سٹیل ہونے کے اہم مسئلے پر غور فرمارہے تھے اس لیے معذوری ظاہر کی انھوں نے التجا کی کہ شبیہ مبارک کی ایک تصویر ہی عنایت فرمائی جائے تاکہ کیلنڈروں، جنتریوں میں چھپوا سکیں۔ ہندی بادشاہ تصویر اترواتے وقت ہاتھ میں ایک پھول پکڑ کر سونگھتے ہیں۔ ہم نے جدت پیدا کی اور دونوں ہاتھوں میں دو پھول پکڑ کر سونگھے۔

ایک ترقی یافتہ خاتون

ہمارا اور محمد شاہ کے دربار کی ایک ترقی یافتہ خاتون کا قصہ بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے، یہ بیان بالکل بے بنیاد ہے کہ ہمیں اس سے لگاؤ تھا۔ دراصل ہمیں تمبا کو، شراب، محبت و دیگر منشیات سے بچپن سے نفرت رہی ہے — خاتونِ موصوف کو گانے بجانے کا شوق تھا اور ہمیں گانے بجانے سے شغف ہو چلا تھا — دربار میں اس نے ''نے تاب وصلِ دارم نے طاقت جدائی'' والی رباعی کچھ ایسے انداز سے گائی کہ یار لوگوں کو شبہ ہوا اور افواہیں اڑانے لگے۔ شروع شروع میں تو ہمارا خیال اس کی جانب رہا لیکن پھر الو شناس کے سمجھانے پر سنبھل گئے۔ اس نے بتایا کہ بالائی طبقے میں لڑکیوں کا ایک مدرسۂ فکر ایسا بھی ہے جو چہلیں تو کرتی ہیں نوجوانوں سے اور شادی کرتی ہیں بوڑھے امیروں سے خواہ ان کی پہلی بیویوں کی تعداد کتنی ہی ہو۔ کبھی کبھار بوڑھے کے پروگرام میں شریک ہو گئیں لیکن زیادہ وقت کزنوں کے ساتھ گزارا۔

ایسا کرنے میں وہ اپنے آپ کو اس لیے حق بجانب سمجھتی ہیں کہ نوجوانوں کے پاس روپیہ نہیں ہے اور بوڑھوں کے پاس ہے اور باقی چیزیں آنی جانی ہیں۔

ایک روز ہم چڑ گئے اس نے ایک غزل گائی جس کے شروع کے بول تھے۔

ساٹھویں سال میں قدم آیا　　زلفِ مشکیں میں پیچ و خم آیا
آمد آمد ہوئی جوانی کی　　غمزہ و ناز و دل ستانی کی

یہاں ساٹھ برس کی عمر میں اکثر لوگ سٹھیا جاتے ہیں، ہم ساٹھ کے نہ تھے مگر سمجھ گئے کہ وار ہم پر ہوا ہے، دیر تک آئینے کے سامنے کھڑے رہے لیکن قطعی رائے قائم نہ کر سکے۔ فرمانبردار خاں سے اپنی شکل وصورت کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے حسبِ معمول نہایت گستاخ اور مایوس کن جملے کہے۔ طیش میں آ کر اسے درّے لگوانے کا قصد کیا پھر خیال آیا کہ فرمانبردار خاں تو پہلے سے ہی درّانی ہے، چنانچہ اسے معاف کیا اور الو شناس کو بلایا۔ وہ نمک خوار دست بدستہ معروض ہوا کہ روئے پرنور پر وہ پر ہیبت جلال طاری ہے کہ نگاہیں اوپر نہیں اٹھتیں لہٰذا شکل وصورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس فقرے سے بھی ہماری تسلی نہ ہوئی۔

پھر ہمیں معلوم ہوا کہ سارے معاملے میں مسز محمد شاہ کا ہاتھ ہے۔ محمد شاہ خود ترقی پسند ہے لہٰذا خاتون موصوف میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لیتا رہا ہے، عورتوں کا حسد مشہور ہے، مسز محمد شاہ ہمیں اس عمر میں بے وقوف بنانا چاہتی ہیں کہ ہم اس طرار حسینہ کو اپنے ہمراہ ایران لے جائیں۔ ہم بھانپ گئے اور اس سے دور دور رہنے لگے۔ خاتون مذکور ہماری بے اعتنائی سے چراغ پا ہو گئی اور ایک جلسے میں ہمارے رجعت پسند ہونے کا اعلان کر کے ہم سے مکمل بائیکاٹ کر دیا۔

خیر رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت!

جامعۂ فرقانی

آج صبح ملا فرقان اللہ بن برہان اللہ کہ مقامی جامعہ فرقانی کا صدر ہے آستان بوسی کے لیے حاضر ہوا اور ملتمس ہوا کہ جامعہ ہم کو ایک اعزازی سند دے کہ عزت افزائی (اپنی) کرنا چاہتا ہے۔

جامعہ میں پورا کورس چھ برس کا ہے۔ بعض فارغ البال اور نیک نفس والدین کے بچے یہ کورس بارہ سال میں کرتے ہیں۔ ان طلبا کو خلیفہ کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی بچہ کورس کے اختتام سے پہلے بھاگ جائے تو اس کو صرف علامہ کی سند ملتی ہے، کورس پورا کر لے تو علامتہ الدہر کہلاتا

ہے۔ دوسری سند میں مثلاً ابوالبرکات، ابوالفعال، ابوالفضیلت، عموماً سرکاری حکاموں، جامعہ کے دوستوں اور ہمارے جیسے سیاحوں، تاجروں اور حملہ آوروں کے لیے وقف ہیں۔ عزیزی محمد شاہ دومرتبہ ابوالبرکات ہے اور تین مرتبہ ابوالفضیلت۔

جامعہ ہر سال چار سو علامتہ الدہر بناتا ہے، جو عموماً بیس پچیس روپے ماہوار کے منشی یا کسی تاجر کے منیم بن جاتے ہیں۔ منشی بننے کے کوئی چار پانچ مہینے کے بعد ان کے والدین کو شادی کی (اپنے ہونہار فرزند کی، اپنی نہیں) فکر پڑ جاتی ہے، شادی کرتے وقت شکل وصورت کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جاتی۔ (کیوں کہ اس ملک میں شکل وصورت نہیں ہوتی) صرف روپے پیسے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ عجیب تماشا ہے کہ شادی میں لڑکے دولہن کے علاوہ زرکثیر کی بھی توقع رکھتے ہیں، یہ بھی چاہتے ہیں کہ سسرال والے انھیں اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے سمندر پار بھیج دیں تاکہ وہ خوب داد عیش دے سکیں۔ ہمارے خیال میں یہ انتہا درجے کی کم ہمتی ہے تبھی اس ملک میں بیچاری لڑکیوں کی وہ آؤ بھگت نہیں ہوتی جو لڑکوں کی ہوتی ہے۔

جامعہ میں ہماری تقریر

اعزازی سند کے سلسلے میں ہمیں خواہ مخواہ تقریر کرنی پڑی حالانکہ نہ ہمیں پہلے سے خبردار کیا گیا تھا اور نہ ہم تیار تھے پہلے ملا فرقان اللہ بن برہان اللہ نے ہماری ذات کا تعارف یوں کرایا۔

''حضرات! کیسا روز سعید جامعہ کی زندگی میں آیا ہے کہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ صاحب کی ذات والاصفات کا نزول ہوا ہے، شاہ صاحب کا تعارف محتاج بیان نہیں۔ آپ نے جس سلسلے میں دلی تشریف لانے کی زحمت گوارا کی ہے وہ اب واضح ہو چکا ہے۔ سنا ہے کہ جناب خان صاحب بین الاقوامی سطح پر ایرانی اور ہندستانی روپے کی قیمت چکانے آئے ہیں۔ آپ کی علیت شبیہ مبارک سے ظاہر ہے۔ آغا صاحب پہلوی زبان کے ہر پہلو سے ماہر ہیں، شہنشاہی سے پہلے آپ کا شغل — خیر جانے دیجیے — ان کی تقریر کو خاموشی سے سنا جائے کیوں کہ آپ شہنشاہ ہیں اور آپ کو اپنی پھوپھی صاحبہ مدظلہا سے بھی ملاقات مقصود تھی جو اتفاق سے اس ملک میں مقیم نہیں ہیں۔ لیکن ہماری شامتِ اعمال — معاف کیجیے — اچھا تو حضرات مولانا نادر شاہ صاحب —''

ہم کو اس بدتمیز ملا پر سخت غصہ آیا کہ ہمارے تئیں کبھی آغا کہا ہے تو کبھی مولانا ایک بات پر قائم نہیں رہتا۔ یہ شخص دانستہ طور پر ہمارا تمسخر اڑاتا ہے۔ اچھا اسے سمجھیں گے۔ ہم تالیوں کے شور میں اٹھے اور فرمایا:

''پیارے اطفال، معلمین حضرات و پرنسپل ملا الیف اللہ! آپ نے ہم کو یہاں مدعو کر کے جامعہ کی جو عزت افزائی کی ہے اس کے لیے ہم آپ سب کو ممنون ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ آپ کو یہ موقعے روز روز کہاں میسر ہوتے ہیں کہ ہم شہنشاہ آپ کو اپنی خوش کلامی سے مستفیض کرے۔ اول تو ہمیں آپ حضرات کی زبوں صحت پر تعجب ہوتا ہے، رونا بھی آتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ یہاں کوئی دو ہزار کی تعداد میں بیٹھے ہیں۔ بخدا ہمیں ڈیڑھ سو کے قریب لگ رہے ہیں۔ پرسوں دربار میں کوئی کاریگر بیس گز ڈھاکے کی ململ ایک انگوٹھی میں سے گزار رہا تھا۔ دوسری طرف سے کپڑے کو جھٹکے سے کھینچا گیا تو کاریگر خود بھی انگوٹھی میں سے گزر گیا۔ اس قدر دھان پان انسان ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھے، یہ آپ کی غذا کا قصور ہے یا آب و ہوا کا۔ آپ کے چہروں پر کچھ ایسا جمود اور بے حسی ہر وقت رہتی ہے جیسے آپ ہر چیز سے مطمئن ہیں۔ آپ جی کیا رہے ہیں زندگی پر احسان کر رہے ہیں۔ آپ کے قبرستانوں میں کتبے تک غلط ہیں (ہم نے بلیک بورڈ پر لکھنا شروع کیا) مثلاً

شیخ خدا بخش مرحوم

فلاں سنہ میں پیدا ہوئے

ساٹھ برس کی عمر میں انتقال فرما گئے۔

یہ غلط ہے اس کی جگہ یوں ہونا چاہیے:

شیخ خدا بخش مرحوم

فلاں سنہ میں پیدا ہوئے

پچیس سال کی عمر میں انتقال فرمایا

ساٹھ برس کی عمر میں دفن ہوئے۔

حضرات و اطفال! ہم ایران سے بڑی بڑی اُمیدیں لے کر چلے تھے۔ خیال تھا کہ دشمن کی بوٹی بوٹی اڑا دیں گے، کابل میں آئے تو سوچا انھیں زدوکوب کریں گے، خیبر پہنچے تو ارادہ ہوا کہ ان

سے کشتی لڑیں گے۔لیکن یہاں کی آب و ہوا کو اس درجہ سکون پرور اور باشندوں کو اس حد تک با اخلاق، وضعدار، نحیف و نزار پایا کہ دن بھر قیلولہ کرنے اور یار لوگوں سے گپیں اُڑانے کا شغل اختیار کر لیا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا کا اثر نہایت صلح جویانہ ہے۔ یہ خون کو بھی ٹھنڈا کرتی ہے۔اب ہم سوچتے ہیں کہ دشمن نے ہمارا کیا بگاڑا ہے۔مفت کی لڑائی بھڑائی سے آخر فائدہ؟ سنا ہے کہ جنوبی اور مشرقی ہند کی آب و ہوا اور بھی گئی گزری ہے لیکن ہم اور آگے نہیں جائیں گے۔ہم آپ کو مبارک باد دیتے ہیں، آپ کی روایات پر آپ کی قومی روایات بے حد شاندار ہیں، آپ نے کسی اجنبی کو مایوس نہیں کیا۔کئی سو سال سے آپ کا شغل بیرونی لوگوں سے حکومت کروانا ہے اور تو اور آپ نے خاندانِ غلاماں سے بھی حکومت کروائی ہے اور وسعت قلب کا ثبوت دیا ہے۔آپ کو ایک دوسرے کی نقل کرنے میں خاص مہارت حاصل ہے۔یعنی آپ بھیڑ چال چلتے ہیں۔(یہاں ہم سٹیج سے نیچے اترے اور بھیڑ چال چل کر دکھائی)

آپ کے ادب و موسیقی کے چرچے ہم نے پہاڑ کے اس پار سُنے تھے۔آپ کے ہاں تقریباً ہر شخص شعر کہتا ہے اور تخلص کرتا ہے۔یہ آب و ہوا اور یہ صحت جیسی کہ آپ کی ہے شعر و شاعری کے لیے نہایت سازگار ہے۔آپ کی موسیقی کے کیا کہنے، پچھلے ہفتے لال قلعے میں چار پانچ آدمیوں کو قوالی گاتے سُنا، وہ لوگ خوب سر دھنتے اور وجد میں آ کر تالیاں بجاتے۔ یہ لوگ بے حد دانا ہیں، گاتے وقت ایک کان پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں۔ غالباً دوسرے کان سے جسے کھلا چھوڑتے ہیں ضرور بہرے ہو جاتے ہوں گے۔ پھر ایک شخص کو دیکھا کہ گانے کے بہانے طرح طرح سے ہمارا منہ چڑاتا تھا۔ ہماری طرف عجیب و غریب اشارے کرتا تھا۔ہمیں غیض و غضب آیا ہی چاہتا تھا کہ ہمیں بتایا گیا کہ پکے راگ گاتا ہے۔سُنا ہے کہ آپ کے ہاں ہر وقت کا راگ جُدا جُدا ہوتا ہے۔آپ کی موسیقی کا مطالعہ فرما کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہاں صبح صبح ہر شخص بیزار ہوتا ہے۔غالباً راتوں کو آپ زیادہ نشہ کر جاتے ہیں کئی مرتبہ یہ ہوا کہ علی الصبح مسرور اٹھے لیکن وقت کے راگ نے غمگین کر دیا۔ رات کو عبادت کا قصد کر رہے تھے کہ وقت کے راگ سے متاثر ہو کر رنگ رلیاں شروع کر دیں۔

حضرات! جب ہم پشاور سے آگے آئے تو ہمیں بتایا گیا کہ سکندر یونانی کے زمانے میں یہاں بہت بڑا جنگل تھا۔مبارک ہو کہ آپ نے بیشتر جنگلات کو صاف کر دیا ہے۔آپ کے

نزدیک درخت کا صحیح مقصد اس کو کاٹ ڈالنا ہے۔ہم نے گاؤں میں بچوں کو چھوٹی چھوٹی کلہاڑیاں لیے تقریباً درخت کاٹتے دیکھا ہے—"

ہماری تقریر جو کہ بے ربط تھی مُلا فرقان اللہ کی گستاخی کا صحیح جواب تھی۔ہم دیر تک بولتے رہے،ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے اور کیا کچھ کہا،اچانک چند بدتمیز طلبا کی جمائیوں اور خراٹوں نے ہمیں چونکا دیا اور ہم بیٹھ گئے۔

سوالات اور جوابات

ملا فرقان نے اٹھ کر ہمارا شکریہ ادا کیا اور حاضرین سے مخاطب ہو کر بولا "نادر شاہ سے سوال پوچھے جائیں تو آپ ان کا مناسب جواب دیں گے—"

کچھ دیر خاموشی رہی۔پھر ایک کونے میں کھسر پھسر ہونے لگی "کیا آپ ملوکیت پسند ہیں؟" پوچھا گیا۔

"ہم طوائف الملوکیت پسند ہیں—" ہم نے جواب دیا۔

"تو گویا آپ شہنشاہ پسند ہوئے—" کسی اور نے پوچھا۔

"شہنشاہ پسند؟" ہم نے مسکرا کر کہا۔"ہم خود شہنشاہ ہیں"۔

"کیا آپ کے خیال میں شہنشاہی بیکاری چیز نہیں— خصوصاً جب ہم سب کے سب ایک جیسے ہیں۔" ایک برخوردار بولے"ہاں!" ہم نے فرمایا"جسمانی لحاظ سے تو نیک جیسے ہیں لیکن اوپر والی منزل میں (ہم نے اپنے سر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا)۔فرق ہوتا ہے"۔

"صاف صاف بتایئے قبلہ آپ دائیں جانب ہیں یا بائیں جانب—"

یہ سوال ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ہم نے اسی طرح مسکراتے ہوئے (مقرر کو ہمیشہ مسکراتے رہنا چاہیے) جواب دیا"ہم شہباز خاں الوشناس کی بائیں جانب ہیں اور ملا فرقان اللہ کی دائیں جانب—"

"کیا آپ ایران سے آئے ہیں—؟"

ایسے آسان سوال پر ہم بڑے خوش ہوئے۔"ہاں ہاں برخوردار! کیا تم ہندستان میں رہتے ہو؟"

"شہنشاہی سے پہلے آپ کا ذریعہ معاش کیا تھا—؟" ایک طرف سے آواز آئی۔

اگرچہ ہم نے کافی صبر وتحمل دکھایا تھا لیکن اس سوال نے ہمیں تیخ پا کر دیا۔ ہماری آنکھوں میں خون اترنا شروع ہوا، میز پر ہمارا مکہ اتنے زور سے پڑا کہ میز ٹوٹ گئی۔ منہ کا جھاگ ملا فرقان اللہ پر گرا جس نے جست لگائی اور دوسری میز پر چڑھ گیا۔ ہٹربونگ سی مچ گئی۔ لوگ اپنی پگڑیاں چھوڑ چھوڑ بھاگنے لگے۔

نوازنا ملا فرقان اللہ کو

ہمیں یقین ہو گیا کہ ہونہ ہو یہ سب اسی ملا کی شرارت ہے، پہلے ہمیں خفا کر کے ایسی جلی بھنی تقریر کروانا پھر سوال پوچھنے کا شوشہ جان بوجھ کر چھوڑنا۔ اگلے روز ہم نے اس کی مالی حالت کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں۔ پتہ چلا کہ ملائی کا ڈھونگ ہے۔ خوب عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ چنانچہ ہم نے عزیزی محمد شاہ سے کہا کہ اس کی خدمات کے صلے میں اسے ایک ہاتھی انعام میں دیا جائے۔ کچھ عرصے کے بعد آدمی بھیج کر پتہ کرایا تو معلوم ہوا کہ شاہی ہاتھی کہ خورد ونوش پر نصف سے زائد اثاثہ نیلام ہو چکا ہے۔ ہم نے دوبارہ دربار میں بلوا کر عزت افزائی کے بہانے ایک اور ہاتھی (جو سفید تھا) مرحمت فرمایا۔ ہفتے عشرے کے انتظار کے بعد خبر ملی کہ ملا فرقان اللہ نے خودکشی کر لی اور کیفر کردار کو پہنچا۔ ہمارے ساتھ کوئی جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔

اہل ہند کو گستاخیوں کا صلہ

ہم نے وہ تقریر کیا کی مصیبت ہی مول لے لی۔ دنیا میں سچ بولنا بھی جرم ہے۔ ذرا سی تنقید بھی ان لوگوں سے برداشت نہیں ہوتی احتجاج ہو رہے ہیں، جلوس نکل رہے ہیں، پوسٹر لگ رہے ہیں۔ آج تو اہل ہند کی گستاخی حد سے بڑھ گئی۔ گزشتہ چند راتیں عزیزی محمد شاہ کی دعوتوں میں جاگ کر گزارنا پڑیں چنانچہ طبیعت کچھ گراں ہو گئی شاہی حکیم معائنہ کرنے آئے، اتنے میں نہ جانے کس احمق نے شہر میں یہ افواہ اڑا دی کہ نعوذ باللہ ہم اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے اس خبر کو نہ صرف سچ مان لیا بلکہ اسی سلسلے میں جامع مسجد کے پاس فقرا کو جلیبیاں تقسیم کی گئیں۔ اس کی شہادت یوں ہوئی کہ شہباز خاں انوشاس کو جو اس وقت جامع مسجد کے قریب سے گزر رہا تھا، فقیر سمجھ کر کچھ جلیبیاں دی گئیں جنھیں وہ بارگاہ دولت میں لے کر حاضر ہوا، ہم نے ان کو چکھا اور نہایت لذیذ پا کر اسے دوبارہ جامع مسجد کی طرف بھیجا۔

ہم دو ہزار ایرانی سپاہی لال قلعے میں رکھا کرتے تا کہ بوقت ضرورت کام آسکیں، مفسدوں نے ان کے متعلق یہ مشہور کر دیا کہ ہم انھیں ہر شام مقفل کر دیتے ہیں کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں۔ ان سپاہیوں کو قلعے کے اندر چھیڑا گیا، ہمارے کچھ سپاہی چاندنی چوک سے گزر رہے تھے۔ ان پر آوازیں کسے گئے اور ٹماٹر شلجم وغیرہ پھینکے گئے۔ ایسی کئی واردات کی اطلاع ہمیں ملی۔ ہم اسپ نمرود (یہ خطاب ہمارا دیا ہوا تھا) پر سوار ہو کر شہر میں گئے تا کہ رعایا کو شرف دیدار بخش کر ان کی غلط فہمی دور کرادیں۔ اب یہ مشہور ہو گیا کہ اصلی نادر شاہ تو بہشت کو سدھار چکے ہیں، یہ کوئی اور شخص ہے جو بہروپ بھرے ہوئے ہے۔ ہم تخت طاؤس پر بیٹھے تھے کہ دور سے "نادر شاہ مردا باد" کے نعرے سنائی دیے، اسی وقت غیض وغضب میں تخت سے چھلانگ لگا کر اپنے دو ہزار سپاہیوں کو کھولا اور تلوار کھینچ کر حکم دیا کہ تلوار کے دستوں سے لاٹھی چارج کرو۔ یہ تھا وہ 'قتل عام'— ہم چاہتے تو باقاعدہ تلواریں استعمال کرا سکتے تھے۔ گرمی سخت تھی۔ ہم قمیص اتار کر موتی مسجد میں حوض کے کنارے ننگی تلوار ہاتھ میں لیے بیٹھے رہے!

قتل عام

چنانچہ صاحب قتل عام شروع ہوا، ہمارے سپاہیوں نے فقط اہل شہر کو زدوکوب کیا تھا اس کے باوجود لاتعداد لوگوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اگلے روز ایک بزرگ آنکھوں میں آنسو بھرے آئے اور دردناک لہجے میں گویا ہوئے— کسے زمانے کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی—

یہ شعر ہم نے پہلے سن رکھا تھا، چنانچہ ہم نے مسکرا کر دوسرا مصرعہ— مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی— سنا کے ظاہر کر دیا کہ ہمیں پرانی فرسودہ شاعری زیادہ متاثر نہیں کر سکتی۔ ہمیں شاعری کی جدید قدروں کا قدردان پا کر انھوں نے جیب سے کاغذ کا پرزہ نکال کر ایک آزاد نظم پڑھی جو ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی، سوائے ایک مصرعے کے جس میں ہمیں تلوار میان میں ڈالنے کو کہا گیا تھا رات بھر جاگتے رہے تھے، گرمی زیادہ تھی، ہمارا دل پسیج اٹھا۔ بغلگیر ہونے کی نیت سے آگے بڑھے کہ بزرگ جلدی سے آداب بجا کر چپت ہوئے۔ خیر اب تلوار میان میں ڈالنے کی کوشش جو کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ ہمارے ہاتھ میں تو شہباز خاں کی تلوار تھی، ہماری تلوار تو پہلے ہی میان میں تھی۔ گویا کہ سارا قتلِ عام ہی غلط ہوا تھا۔ ہم نے فوراً منادی کرادی کہ پہلا قتل عام غلط ہوا ہے

بلکہ ہوا ہی نہیں کیوں کہ تلوار تو میان سے ذرا نہیں نکلی۔ چنانچہ اس مرتبہ دوسرا صحیح قتلِ عام شروع ہوا جو کافی کامیاب رہا۔ دراصل فریقین کو کافی ریہرسل مل چکی تھی۔ پہلے ارادہ تھا کہ اس کے بعد ایک مختصر سا قتل خاص بھی کرائیں جو امرا کے لیے ہو۔ پھر سوچا اہلِ دلی اس قسم کے تماشوں کے عادی ہو چکے ہیں، تیمور کا قتل عام تین دن رات تک ہوتا رہا تھا بھلا ہمیں یہ کب خاطر میں لائیں گے۔

شام کو وہی بزرگ آئے، ایک اور آزاد نظم سنائی (جو ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی) اور معانی کے خواستگار ہوئے ہم بھی مسجد میں اکیلے بیٹھے بیٹھے تھک چکے تھے، مسکرا کر معاف فرمایا اور از راہ تلطف انھیں بغلگیری سے سرفراز فرمایا' وہ فوراً بے ہوش ہوگئے۔ جب ہوش میں آئے تو پسلیوں میں درد کی شکایت کرتے تھے۔ پتہ نہیں کیوں' شاید ہماری بغلگیری کا نتیجہ ہو۔ آئندہ محتاط رہیں گے انشاءاللہ۔ باری تعالیٰ کارساز ہے۔

ہم پر کمبل ڈالوانے کی کوشش

شام کو دریائے جمنا کے کنارے مچھلی پکڑنے کی نیت سے بیٹھے تھے، مچھلیاں تھیں کہ جلال شاہی سے قریب نہ پھٹکتی تھیں۔ اندھیرا ہو چلا تھا، اچانک ہم نے اپنے اوپر کمبل کا دباؤ محسوس فرمایا، سوچا کہ کوئی ہمارا پرستار ہے جو خنکی کا خیال کرتے ہوئے گرم کپڑا لایا ہے، چنانچہ خاموش بیٹھے رہے لیکن ہمیں بالکل ڈھانپ دیا گیا، ہمارا دم گھٹنے لگا، گستاخ آوازیں سنیں تو معلوم ہوا کہ کوئی شرارت ہے، ہڑبڑا کر اٹھے دونوں لفنگوں کو پکڑ کر بغلوں میں دبایا ہی تھا کہ انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہہ کر سعادت دارین پائی۔ نیا ملک ہے، خبردار رہنا چاہیے۔

واپسی کا قصہ

ایک کباڑیئے کی دکان پر پوستین دیکھی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے (فرمانبردار خاں کی آنکھوں میں) ہم کبھی پوستین کو دیکھتے تھے اور کبھی اپنے چوڑی دار پاجامے اور جالی دار کرتے کو، تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ پوستین ہماری ہی تھی، اس قدر رنگ ہو چکی تھی کہ کوشش کرنے کے باوجود پہن نہ سکے۔ پہلے سے ہمارا وزن کافی بڑھ گیا تھا۔ دن بھر طرح طرح کے خیالات دل میں آتے رہے۔ دلی کے قیام نے ہمیں کتنا تبدیل کر دیا ہے۔ ہم موٹے ہو گئے ہیں، رات کو خراٹے لیتے ہیں، صبح کی چاء اور تمباکو نوشی کے بغیر بستر سے نہیں اٹھتے۔ قیلولے کی عادت قبیحہ ہمیں شام

تک بیزار رکھتی ہے، ہماری رنگت سنولاتی جارہی ہے۔ اگرچہ ہندی شاعری میں سانولا، سنوریا، کالیاوغیرہ کو پسند کیا گیا، تاہم یہ پسندیدگی تسلی بخش نہیں کیوں کہ ہندی شاعری ہے تو عورت کی زبانی لیکن شاعر سارے مرد ہیں اور پھر ہم نے جنوبی ہند کے باشندوں کو بھی دیکھ لیا تھا جن کے آباد اجداد کبھی اچھے بھلے ہوں گے۔ ادھر ملک میں عجب دھاچوکڑی مچی ہوئی ہے۔ ہماری تقریر اور قتل عام سے پبلک دشمن بن گئی ہے ہرروز کہیں بھوک ہڑتال ہو رہی ہے تو کہیں ستیہ گرہ۔ کمبل ڈالنے کے حادثے نے ہمارا موڈ قطعی طور پر خراب کر دیا ہے۔ چنانچہ سٹیل ہونے کے خیال پر لعنت بھیجی اور کوچ کا مصمم ارادہ کر لیا۔

ہمارا دلّی سے تشریف لے جانے کا حال

خدا کے فضل سے زادِراہ کافی تھا کہ راستے میں اخراجات بھی کافی ہوتے ہیں۔ ہم نے ازراہِ مروّت محمد شاہ کو اجازت دے دی کہ اگر اس کی نظر میں کوئی ایسی چیز ہو جس کو ہم بطور تحفہ لے جا سکتے ہوں اور غلطی سے یاد نہ رہی ہو تو بے شک ساتھ باندھ دے۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ لال قلعہ اب خالی خالی معلوم ہو رہا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ لال قلعہ ہمیں بھی خالی خالی معلوم ہو رہا تھا۔

اسپ نمرود پر سوار ہو کر درودیوار پر حسرت کی نظر ڈال ہی رہے تھے کہ عین چوراہے میں گھوڑے سے نیچے آرہے۔ اس بے ایمان گھوڑے کو ہم نے زیادہ منہ چڑھا لیا ہے۔ تعزیری طور پر اہلِ ہند کو واپس دے دیا اور عزیزی محمد شاہ مسلمہٗ سے فرمایا کہ اس انسان ناشناس کو خطاب سے محروم کر کے تانگے میں جتوایا جائے۔

کابل میں والیٔ کابل سے نجات

والیٔ کابل ہماری خدمت میں ملتمس ہوا کہ آپ ہند سے ہمارے لیے جو تحفے لائے ہیں وہ دیتے جائیں ورنہ مروت سے بعید ہوگا۔ ہم نے سمجھایا کہ یہ ہزار اونٹوں پر لدے ہوئے تحائف جو وہ دیکھ رہا ہے ہمارے پیارے عزیز محمد شاہ کی نشانیاں ہیں جن سے ہم مرتے دم تک جدا نہیں ہو سکتے۔ البتہ کچھ پوستینیں، دنبے یا گلقند درکار ہو تو وہ دے سکتے ہیں۔ والیٔ کابل راضی نہ ہوتا تھا۔ عجب ہونق آدمی ہے، دنیاوی دولت کی ہوس اس کو بہت ہے۔ بہتیرا سمجھایا کہ آدمی کو خدا سے لَو لگانی

چاہیے، دنیا آنی جانی ہے۔ شیخ بوٹا شجر پوری کی مثال پیش کی کہ دنیا داری سے مستثنیٰ ہو کر تارک الدنیا بنے ہوئے ہیں۔ اس پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ گستاخانہ بولا۔ آپ خود تارک الدنیا کیوں نہیں ہو جاتے۔ بہت کہا کہ ہمارے حالات مختلف ہیں۔ وقت آنے پر تارک الدنیا بھی بن کر دکھائیں گے۔ جب نہ مانا تو ہم نے ٹالنے کو فرمایا تو خود سیاحت پر کیوں نہیں جاتا۔ آدمی سیانا تھا جان گیا کہ پچھلے چالیس پچاس سال کی دولت تو ہم سمیٹ چکے ہیں اب وہ ہند گیا تو کرکری ہو گی۔ کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ آخر از راہ پرورش اس کو پانچ شتر تازی، چھ اسپ باسی، دو سو مقامی مینڈھے دو نبے، دو من گلقند، لال قلعے کا کچھ بوسیدہ فرنیچر، نقرئی پنجرے میں ایک ہندی کوا دے کر سرفراز کیا اور اس حریص لیموں نچوڑ سے رہائی پائی۔

ہمارا خلد میں نزول

جس بات کا ڈر سے خدشہ تھا آج وہی ہو کر رہی۔ چند نابکاروں نے تنہا پا کر گھیر لیا اور ہمارا کام تمام کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، ہند سے ایران واپس پہنچ کر ہم اس نئی سیاحت پر سوئے عراق نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ہمیں اپنی ناگہاں جوانا مرگ پر بے حد قلق ہے کیوں کہ اس میں مشیت ایزدی ہرگز نہ تھی۔ اگر ہم فرمانبردار خاں کا کہا مان لیتے اور اتنی رات گئے تنہا باہر نہ نکلتے تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ خیر اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ـــ ع

عزیز و اب اللہ ہی اللہ ہے

دیکھیے آنجہانی بنتے ہیں یا خلد آشیانی یا کچھ اور، ہمارے متعلق یہاں طرح طرح کی مایوس کن افواہیں اڑ رہی ہیں۔

سفرنامہ جہاز بادسندھی

بسم اللہ، دیباچۂ فسانہ نغمہ زنی عندلیب خانہ، رنگین ترانہ، راست براست بلا کم و کاست، یعنی تذکرۂ جہاز بادسندھی عفی عنہٗ۔

اے صاحبو! خدا آپ کا بھلا کرے۔ مدت مدید و عرصہ بعید کا ذکر ہے کہ ایک سہ پہر کو ایک نوجوان نحیف و نزار (کہ جسے نوجوان سمجھنا زی خوش فہمی تھی) کافی ہاؤس کے دروازے پر زندگی سے بالکل بیزار کھڑا تھا۔ نام اس دراز قد کا جہاز باد تھا۔ تخلص سندھی اور لقب خوردہ۔ حلیہ اس کا فاقہ زدہ تھا اور سر کے بال ماڈرن خواتین کے بالوں سے بھی لمبے تھے۔ ناک پر ایک شکستہ عینک زندگی کے دن تو ڑ رہی تھی۔ شیو (Shave) اس نے ہفتے بھر سے نہیں کروایا تھا۔ بغل میں اس کے کاغذوں کا ایک پلندہ تھا۔ پوشاک اس کی ایسی تھی کہ گمان تک نہ ہوتا کہ اس نے پوشاک کو پہن رکھا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ پوشاک ہے جو اسے پہنے ہوئے ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ نوجوان انٹلکچوئل (Intellectual) طبقے سے متعلق تھا!

اس نے اپنی سائیکل سنبھالی، ملازم کو اگلے روز بخشش دینے کا وعدہ کیا اور مال روڈ پر ہوا ہو گیا۔ چوک کے سپاہیوں کو پیچھے چھوڑتا کہیں کا کہیں جا پہنچا۔ ایک عالی شان محل کے سامنے اُسے کچھ عجیب سی فیلنگ (Feeling) ہوئی جیسے خیالات کی روانی میں دفعتہً الجھن پیدا ہو گئی ہو، چونک کر

دیکھا تو پچھلے پہیے میں پنکچر ہو چکا تھا۔ اتوار کا دن تھا اور دکانیں بند تھیں۔ یہاں تک کہ وہ حضرات جو ایک پمپ اور پنکچر لگانے کا ذرا سا سامان لے کر سائیکل درکس کھول لیتے ہیں اور پروپرائٹر کہلاتے ہیں، غائب غلا ہو چکے تھے۔

اتنے میں محل کے دروازے سے ایک شخص ہاتھ میں کارآمد شے تھامے نمودار ہوا۔ اسے دیکھ کر جہاز باد کی عینک مُسرّت سے چمک اٹھی۔ اس نے بڑھ کر پمپ مانگا۔ اس شخص نے دے دیا۔ جہاز باد نے اسے کھینچا، مروڑا، کھولنے کی کوشش کی لیکن ناکامیاب رہا، تس پر وہ مردِ توانا زیرِ مُونچھ مسکرایا۔ (کہ اس کا چہرہ ایک جوڑی سیاہ گھنی اور عُمدہ مُونچھوں سے مُزیّن تھا) اور بولا:

''اے مَردِ ناداں! مزید کوشش عبث ہے کیونکہ یہ پمپ نہیں ڈنڈا ہے۔''

جہاز باد نے سائیکل ایک طرف رکھ دی اور محل کی جانب متوجہ ہوا۔ دروازے پر بورڈ پڑھا تو عینک کے شیشے صاف کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لکھا تھا: ''جہاز باد سندھی کلاں''

ذرا قریب گیا تو مُرغانِ نواسنج کی زمزمہ پَردازی دل کو لبھانے لگی، ہزار دطوطی کی صدا آنے لگی، انواع واقسام کی خوشبوؤں سے دماغ طبلۂ عطار بن گیا۔ ذرا سی دیر میں یہ طبلہ بجنے لگا۔ ریڈیو پر نغمۂ دلربا اور رباب کی آوازِ خوش کانوں میں آئی۔ طعمۂ لذیذ کی خوشبو آتی تھی۔ بادۂ خوشگوار کی صُراحی قلقل کی صدا سناتی تھی۔ دیکھا کہ احباب بزلہ سنج اور خاتونانِ ذی مرتبہ رنگ رلیاں مناتی ہیں، ہمجولیاں قہقہے لگاتی ہیں۔

جہاز باد سوچنے لگا کہ صرف خورد اور کلاں کا فرق ہے، مگر کوئی مجھ سا بے نصیب، بدطالع، بدبخت ہے، کوئی صاحبِ تاج وتخت ہے۔ اس مکان کے مکین پر بڑی عنایت ہے اور مجھ گنہ گار پر یہ عتاب۔ یہ کسی شاہِ فلک بارگاہ کا ایوانِ سپہر توآمان ہے یا روضۂ رضوان ہے، کہیں حور ہے تو کہیں غلمان ہے۔

ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسی مردِ قوی مُونچھ نے آکر پیغام دیا ہے کہ صاحبِ مکان نے فرمایا ہے کہ ہمارا سلام بولو۔ جہاز باد خورد نے کہا: ''وعلیکم السلام'' اور روانگی کا قصد کیا۔ مگر وہ مردِ قوی ہیکل کہنے لگا کہ صاحبِ خانہ یاد فرماتے ہیں۔ جہاز باد سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو صاحبِ مکان کوئی ماہرِ نفسیات ہے جس نے اتنی دُور سے میرا تجزیۂ نفسی کر کے خیالات بھانپ لیے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس مُونچھ مُچھندر نے ہاتھ پکڑا اور اندر لے

گیا جہاں شاندار دعوت منعقد تھی۔ حیرت ہوئی کہ یا الٰہی اتنی خوبرو اور گل بدن حسینانِ پری وش و شوخ و شنگ رشکِ گل رخانِ فرنگ کیونکر ایک مقام پر جمع ہیں؟

جہازِ بادِ سندھی کلاں بڑے تپاک سے ملا اور گویا ہوا۔

"اے معزز اجنبی حضرت ادیکھنے میں تو آپ الکحلی کل معلوم ہوتے ہیں"۔

جہازِ بادِ خورد نے اثبات میں سر ہلایا۔ جہازِ بادِ کلاں کی باچھیں کھل گئیں۔ "الحمدللہ ــــ یہ خاکسار بھی کبھی الکحلی کل تھا۔ یہ سب شہزادیاں اور شہزادے ایسے ہیں جو الکحلی کل ہیں، ہونے والے ہیں یا کبھی تھے۔ آپ ان سے ملیے۔"

سب خوب بغل گیر ہو ہو کر ملے۔ اگرچہ جہازِ بادِ خورد گدگدی سے بہت ڈرتا تھا۔ وہ عید کے روز چھپتا پھرتا، تاہم ایک موہوم سی امید پر اس نے بغل گیر ہونا شروع کیا لیکن جب شہزادیوں کا نمبر آیا اور اس نے سرخ لباس والی حسین شہزادی سے بغل گیر ہونے کی کوشش کی تو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ وہ فوراً دو قدم پیچھے ہٹ کر بولی "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی"۔

جب دونوں جہازِ بادوں نے ایک دوسرے کا نام سنا تو کمال درجہ محظوظ بھی ہوئے اور محظوظ بھی۔

جہازِ بادِ کلاں نے خورد کو ایک چھوٹا پیگ دینا چاہا تو وہ معذرت خواہی کرتے ہوئے گویا ہوا "یا پیر و مرشد ابھی سورج نظر آتا ہے۔ غروبِ آفتاب سے پہلے وسکی (Whisky) سے گریز کرنا چاہیے البتہ بیئر (Beer) وقت کی چیز ہے"

جہازِ بادِ کلاں یہ تقریر سن کر دم بخود رہ گیا عش عش کرنا چاہتا تھا لیکن شہزادیوں کی طرف دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا اور بولا۔

"اے بامذاق انسان! بیئر کا گلاس نوشِ جان فرما!! اور بار بار دروازے کی طرف مت دیکھ، تیری سائیکل ہم نے مرمت کے لیے بھیج دی ہے"۔

ہوالشافی کہہ کر وہ جام جہازِ بادِ خورد نے پیا اور دوسرا اُنڈیلنے لگا۔ جہازِ بادِ کلاں نے اس کی جانب شفقت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اے نوجوانِ سلیقہ شعار! ہم خوش ہوئے۔ لیکن یہ مت بھولیو کہ یہ خدائے ذوالجلال کے ہاتھ میں ہے کہ ایک گدائے بے نوا کو چشمِ زدن میں صاحبِ دولت و جاہ کرے اور قارون سے

مالدار کو ذرا سے اشارے سے تہہ خاک و تباہ کر دے۔ تُو ضرور حیران ہوگا کہ یہ نعمتیں ہمیں کیونکر میسر آئیں یہ فرماں بردار بہرے جنھیں سنائی بھی دیتا ہے، یہ افرنگی بیئر جو غلط شدہ غم صحیح کرتی ہے۔ یہ پُر رونق محفلیں، یہ سب کچھ ہمیں یُونہی نہیں ملا۔ ہم"...

"واحد متکلم صیغہ استعمال کیجیے" ایک طرف سے آواز آئی۔

"معاف کیجیے! تو اس کے لیے مجھے کیا کیا مصیبتیں اٹھانی پڑیں، اس کا ذکر میں ابھی سناؤں گا"۔

محفل میں یک لخت کھلبلی سی مچ گئی۔ کوئی گھڑی دیکھنے لگا، کسی کو ضروری کام یاد آ گیا، کسی نے کہا ابا جان انتظار کر رہے ہیں۔ کوئی بولا یہ کہانی اتنی مرتبہ سنی ہے کہ زبانی یاد ہو چکی ہے۔ جب سب جا چکے تو جہاز باد کلاں نے خورد کے لیے چوتھا گلاس اُنڈیلا۔ کباب سامنے رکھے اور یوں کلام کیا۔

جہاز باد سندھی کا پہلا سفر

خشتِ اوّل چُوں نہد معمار کج

تا ثریا مے رود معمار کج

"اے میرے معزز ہم نام! تُو نے ان شہزادیوں کی مینا چشمی دیکھی، حیرت ہے کہ تجھے کوئی ضروری کام یاد نہ آیا۔ یہ بیئر بکسفی معلوم ہوتی ہے۔ نئی بوتل کھول اور خدا کی قدرت کا تماشہ دیکھ"۔

"اے میرے محترم ہم نام! اِدھر اُدھر کی باتوں سے پرہیز فرما اور اپنا سفر بیان کر"

"یہ اُن دنوں کا ذکر ہے" کلاں گویا ہوا "کہ جب یہ خاکسار نیا نیا جوان ہوا تھا۔ ان دنوں سے۔ باد سندھی کہلاتا تھا۔ بعد میں سے جے۔ بی سندھی ہو گیا۔ اس علاقے میں کئی اور سے جے۔ بی سندھی بھی تھے چنانچہ کلاں کا اضافہ کیا۔ ناچیز کو فنونِ لطیفہ، فنونِ لطیفہ شناسی، فنونِ حرب و ضرب، فنونِ جمع و تفریق میں خاصی شُد بُد تھی۔ موسیقی میں وہ مہارت تھی کہ شُدھ سارنگ، شُدھ کلیان، شُدھ کر دھوج سب بخوبی گا سکتا تھا۔ لیکن طبیعت میں اس بلا کی سادگی تھی کہ ایک بھیڑیے کو السیشن (Alsatian) کتا سمجھ کر پکڑ لایا اور کئی دنوں تک ساتھ ساتھ لیے پھرا۔ جب غلطی کا احساس ہوا تو ایک بھیڑ کے

ہمراہ اسے رُخصت کیا۔ سیب کے درخت کو تبھی پہچان سکتا اگر اس میں سیب لگے ہوں۔ ورنہ پھلوں یا پھولوں کے بغیر پودے اور درخت میرے لیے یکساں تھے۔ نصیبِ دوستاں علیل ہوا۔ تو طبیب نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر دیا۔ حقیر نے گلے میں باندھ لیا اور شفا پائی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ تعویذ نہ تھا، نسخہ تھا۔ ایک مرتبہ سُرمہ ملنے پر حکیم جی سے دریافت کیا کہ اسے کھانا کھانے سے پہلے استعمال کروں یا بعد میں۔ لغت میں قیلولے کے معنے دیکھے تو ہکّا بکّا رہ گیا۔ برسوں دوپہر کے کھانے کے بعد سویا کیا لیکن کبھی احساس تک نہ ہُوا کہ ایسی معمولی حرکت کے نتائج قیلولے کی شکل میں برآمد ہوتے ہیں کہ قاف جس کا حلق میں فلک شگاف گونج پیدا کرتا ہے جب فارغ التعلیم ہوا یعنی تعلیم نے مجھ سے فراغت پائی تو چند جاں نثاروں نے سیاست کی طرف رغبت دلائی۔ فدوی نے رجُوع کیا اور رات دُونی دن چوگنی ترقی نصیب ہُوئی۔ میری آتشیں تحریروں نے کئی جگہ لاٹھی چارج کرایا۔ متعدد مقامات پر ہُوتا چلا، کئی اخبارات ضبط ہوگئے۔ اس حیرت انگیز مقبولیت کی وجہ میرے دو جگری دوست تھے جو بے حد معمولی صلے کے عوض یہ سب کچھ لکھ دیا کرتے۔ فلکِ کج رفتار کو میری شہرت ایک آنکھ نہ بھائی اور دفعتاً میری تحریریں تمام ہوئیں۔ چند ہی مہینوں میں خود غرض دُنیا مجھے بھول گئی، محض میرے دوستوں کی وجہ سے"...

"تو کیا آپ کے وہ دوست داعیِ اجل کو لبیک کہہ اٹھے؟"

"نہیں! اُن میں سے ایک تو ضلع دار بن گیا اور دوسرا مجسٹریٹ درجہ سُوئم۔ کچھ دنوں کے لیے تو دنیا اندھیر معلوم ہوئی۔ پھر شاعری شوق چرایا۔ محروم تخلّص کیا۔ غزل میں ترنّم کا یہ عالم تھا کہ ہر شعر کی دُرت لے پر بھی تین تالہ بج سکتا تھا اور دلپت لے پر بھی۔ غزل کے لیے طبیعت غیر حاضر ہوئی تو آزاد نظم بڑی آزادی سے کہہ لیا کرتا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ محل سرا کے باہر جو ہیچمدان کے نام کا بورڈ لگا ہوا تھا وہ کسی ضرورت مند نے چُرا لیا۔ دروازہ نئے بورڈ سے مرصّع کیا گیا۔ مجھے بغرض تبدیلیِ آب وہوا خانیوال جانا پڑا۔ واپس لوٹا تو خطوط کا ایک پلندہ منتظر پایا۔ یہ سب تعزیت نامے تھے۔ حیران تھا کہ کس نے کس کی جانِ آفریں کس کے سُپرد کی، جو بورڈ دیکھتا ہوں تو کاتب نے غلطی سے محروم کو مرحُوم لکھ دیا تھا۔ اسی روز بورڈ بدلا۔ لیکن شہر بھر میں رُسوا ہو چکا تھا۔ سندھی تخلّص کرنے سے بھی کوئی فرق نہ پڑا۔ شاعری ترک کرنا پڑی۔ پھر سوچا کہ اے مردِ باہمّت شاعری گئی تو کیا

ہوااور بہت سے مفید مشغلے ہیں۔ اس ملک میں انسان کی اوسط عمر بیس بائیس سال ہے تو یہ کبھی کی گزار چکا۔ اب اپنے آپ کو مرحوم ہی سمجھ اور پیری مُریدی کی طرف رجوع کر! ایک دفعہ نام چمک اٹھا تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس ناچیز نے اس سلسلے میں بڑا مطالعہ کیا۔ بہاولپور اور سندھ کے تکیوں میں بیشتر وقت گزارا۔ قابل فقیروں سے ٹریننگ حاصل کی۔ بھنگ سے بصیرت افروز ہوا۔ لیکن قسمت میں لکھا تھا کہ کسی ایک لائن کو سٹک نہ کر سکا۔ ایک دن اتفاق سے آلڈس ہکسلے، ورجینا وولف، برٹرنڈ رسل کی کتابیں ایک کباڑیئے کے ہاں اتنی سستی مل گئیں کہ خریدنا پڑیں۔ چونکہ خرید چکا تھا اس لیے ورق گردانی پر مجبور ہو گیا۔ اچھا بھلا بیٹھا تھا، اچانک بشارت ہوئی کہ تو اَنٹلکچوئل ہے۔ اگرچہ یہ دُرِّ بے بہا خاکسار نے ورثے میں پایا تھا تاہم خاندانی اَنٹلکچوئل کہلاتے شرم آتی تھی۔ چنانچہ میں نے کافی ہاؤس جانا شروع کر دیا۔ پوشاک، غذا، ورزش اور حلیے سے لاپرواہوتا چلا گیا۔ سب سے الگ تھلگ رہنے لگا۔ پڑوسیوں سے بات کرنا تو ایک طرف ان کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھتا۔ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے میری زندگی ایک انقلاب سے آشنا ہوئی۔ ایک چاندنی رات کو جب میں کافی ہاؤس سے لوٹا تو ایک پرندہ بالکل میرے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ یہ واہمہ نہ تھا، تشویش ہوئی، کیونکہ مقامی پرندے بڑے سُست اور ڈرپوک تھے، اندھیرا ہو چکنے کے بعد کبھی نظر نہ آتے۔ دل میں یہ شُبہ یقین پا گیا کہ ہو نہ ہو یہ پرندہ ھُما تھا۔ اس مژدۂ جانفزا سے روح کو سُرور حاصل ہوا اور طبیعت کو کمال درجہ سکون۔ یوں معلوم ہونے لگا جیسے سب کچھ ساکن ہے زندگی میں تسلی بخش راحت ہے دنیا میں امن ہے — اور میں اَنٹلکچوئل ہوں!

اچانک ایک سائنس دان دوست نے بڑی بُری خبر سنائی کہ میں ساکن ہرگز نہیں ہوں ہر چوبیس گھنٹے کے بعد زمین کی گردش کی وجہ سے تین سو ساٹھ ڈگری گھوم جاتا ہوں۔ فضاؤں میں کئی سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑا جا رہا ہوں۔ سورج کے گرد ہر سال بیس کروڑ میل کی مسافت طے کرتا ہوں اور کہکشاں کی جانب ڈیڑھ سو میل فی سکنڈ کی رفتار سے جھٹکا جا رہا ہوں۔ اِدھر کی گردش، اُدھر کی گردش۔ اِس طرف، اُس طرف۔ ہر طرف رواں دواں۔ میرے کانوں میں تیز ہوا سے شُوں شُوں ہونے لگی۔ چکر پر چکر آنے لگا۔ فوراً ٹھیکہ دیسی شراب پر پہنچا (جہاں ہندستانی شرفا بیٹھ کر پی سکتے ہیں) جب باہر نکلا تو دُنیا تاریک تھی۔ دروازے پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں؟ اتنے

میں شاہراہ پر ڈھول کی آواز سنائی دی۔ ساتھ گھنٹی بج رہی تھی۔ دونوں کی ہم آہنگی اس قدر خوش الحان معلوم ہوئی کہ مُردہ جسم میں جان پڑ گئی۔ میں لاشعوری طور پر پیچھے ہولیا۔ جب چونکا تو اپنے آپ کو اکھاڑے میں پایا۔ غیر اَعلکچوئل ہجوم کو دیکھ کر بہت گھبرایا۔ پہلوانوں نے طرح طرح کے پٹھے ساتھ بٹھائے ہوئے تھے وہاں اپنے ماموں جان کو بھی دیکھا (کہ خطاب جس نے پہلوان السندھ کا پایا تھا) وہ ایک ہاتھ ہوا میں اٹھائے ایک ٹانگ پر ناچتا ہوا اکھاڑے کا طواف کررہا تھا۔ اس کا پٹھا پیچھے پیچھے تھا۔ غالبًا میں نے اپنے عم محترم کا ذکر نہیں کیا کہ گھر اس کا ایک بیسویں صدی کی امریکن طرز کی محل سرائے تھی جس کا نقشہ ملکِ فرنگ کے ایک ذی فہم زیرک کاریگر نے تیار کیا تھا، اس کے دروازے پر بیک وقت تین چار موٹریں (کہ اہلِ فرنگ کی صناعی وجادوگری کا حیرت انگیز ثبوت ہیں) کھڑی جھومتی تھیں۔ وہ احتشام، وہ دبدبہ، وہ طمطراق تھا کہ اَعلکچوئل جب سامنے سے گزرتے تو منہ دوسری طرف پھیر لیتے۔ ویسے یہ مردِ طرّار، ناپ تول کا پورا تھا فنِ ترازُو وطرازی میں اس کا دور دور تک شہرہ تھا۔ اس کے دروازے پر محتاجوں اور ضرورت مندوں کا ہمیشہ اژدھام رہتا کیونکہ آٹے اور چینی کا راشن اس کے اختیار میں تھا۔

کشتیاں ختم ہوئیں تو ماموں جان کی نظر اس طرف پڑی۔ اس نے گردن سے آدھُو چا۔ زور سے دھپ لگا کر بولا

"سنا بے گیدی! یہاں کہاں پھر رہا ہے کہ مقام تیرا کافی ہاؤس اور مریل نوجوانوں کی محفل ہے ایسی جگہ آتے ہوئے اپنے تئیں شرم محسوس نہیں کرتا؟"

یہ کہہ کر وہ تو پہلوانوں کے غول کے ساتھ سُوئے ڈیپو روانہ ہوا اور اس فقیر کو کمالِ خفت اٹھانی پڑی۔ سوچنے لگا کہ یہی مردک کبھی تانگے کے گھوڑے کی طرح لاغر تھا۔ خدا کی شان کہ ڈپُو ملتے ہی اس قدر توانا ہو گیا کہ فیل بھی دیکھے تو بغیر پانی مانگے شرم سے ڈوب مرے، اور اس پر ایسی گفتگو۔ واللہ یہی جی چاہتا تھا کہ سڑک پر دراز ہو جاؤں اور اپنے آپ کو جان بحق تسلیم کروالوں۔ یکا یک ایک صدائے روح پرور سنائی دی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خوش پوشاک نوجوان (جو فقط ایک لنگوٹے سے مُرصّع تھا) ڈھول پر رقصاں ہے۔ بس پہ اس خاکسار کے پاپوشوں کو حرکت ہوئی۔ یہ حرکت آہستہ آہستہ تمام جسم میں حلول کر گئی۔ یہاں تک کہ ضبط نہ رہا اور یہ حقیر اس قلندر

خوش لباس کے پیچھے ہولیا۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ ڈھول والے کی کمر پر ایک بورڈ ہے۔ چشم زدن میں چشمہ (جو ماموں جان کے دھپ سے اتر گیا تھا) جیب سے نکالا۔ آہ سرد بھری جس سے شیشوں پر چند قطرے نمودار ہوئے۔ قمیص سے عینک صاف کر کے ناک پر رکھی تو آنکھوں کو وہ تقویت پہنچی کہ بیان جس کا احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ بعد از مطالعہ انکشاف ہوا کہ وہ ریڈیم ٹانک پلز کا اشتہار تھا۔

عمِ محترم کا وہ طعنہ جو اس ناچیز کی صحت پر کھلم کھلا حملہ تھا، تیر کی طرح پیوست ہو چکا تھا۔ قصد انتقام کا یہ نیاز مند کر چکا تھا۔

ایک دن ماموں جان نے اپنی دکان پر کسی کو چینی دینے سے معذرت چاہی۔ کیونکہ حقیقتاً اتنی چینی بچ رہی تھی جو اس کے احباب کے لیے درکار تھی۔ اس نے اپنی شیریں بیانی سے خوش کرنا چاہا۔ لیکن وہ شخص کہ شرارت کرنے پر تلا بیٹھا تھا کاغذ کا ایک پرزہ دکھا کر دکان کی تلاشی لینے کا متلاشی ہوا۔ عین اس وقت جب وہ مُفسد دکان کے اندر گیا عمِ محترم اپنی بیوک میں بیٹھ کر محل سرا پہنچا اور خواجہ سرا سے رخصتِ سفر بندھوا کر سرحد کا قصد کیا لیکن سب انتظامات پہلے سے مکمل ہو چکے تھے ماموں جان کو روک لیا گیا اور سرکاری مہمان خانے میں (کہ اس ملک میں جیل کہلاتا ہے) قیام وطعام کا بندوبست دو روز تک رہا۔ اتنی دیر میں بلند مرتبہ اور عالی مقام حضرات کی سفارشیں پہنچ چکی تھیں چنانچہ جب اسے قاضی صاحب کے سامنے لایا گیا تو انھوں نے فقط پہلوان السندھ کا خطاب واپس لے کر چھوڑ دیا۔

ماموں جان کو اس صدمہ نے نڈھال کر دیا۔ کیونکہ اسے پہلوانی اور سیاست بے حد عزیز تھے۔ اس کی زندگی کا مقصد صرف یہ دو چیزیں تھیں۔ میں نے بہترا سمجھایا کہ پہلوان السندھ کوئی ایسا بڑا خطاب نہیں جس کے لیے جان ہلکان کر لی جائے۔ آپ پہلوان الھند بن سکتے ہیں جیسا کہ فاضلِ اجل علامہ اقبال فرما گئے ہیں ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

میرا ماموں اس پر پھڑک اٹھا اور کہنے لگا

''واہ واہ۔ مگر برخوردار اس کا اگلا مصرعہ کیا ہے۔ وہ غالباً میرے حق میں زیادہ مفید ہوگا''۔

"دوسرا مصرعہ اے محترم! عشق کے امتحانوں کے متعلق ہے"۔

"واہ، تو عشق کے امتحان بھی ہوتے ہیں۔ کون سی یونیورسٹی لیتی ہے"؟

میں نے اس مردِ جاہل سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا، حق تو یہ ہے کہ گو یہ شخص عم اس ناخلف نی کا تھا۔ بزرگوں کا ادب، پاسِ حکمِ خداوندی ہے مگر جہالت اس کے چہرے پر ہُمن کی طرح یوں برستی تھی کہ اس ناچیز کو اس کے ساتھ چلنے میں شرم محسوس ہوتی۔

"عشق کے امتحانوں کے متعلق کیا فرما گئے ہیں علامہ؟" اس نے اصرار کیا۔

"یہ دوسرا مصرعہ اے عمِ محترم آپ جیسے پیرِ فرتوتوں کے لیے نہیں، مجھ جیسے نوجوانوں کے لیے ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ پہلے مصرعے کا ہی اپنے اوپر انطباق کریں۔" میں نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

"مجھے ستاروں سے قطعاً دلچسپی نہیں" (وہ آہِ سرد کھینچ کر بولا) "مگر دوسری چیز عشق بالکل میری لائن میں ہے اور برخوردار تو گستاخ ہوتا جا رہا ہے۔"

اس نے اپنی انگلی کا ٹھینگا بنا کر میرے سر کے مختصر سے گنج پر مارا۔ نہایت مترنم آواز نکلی جو کانوں کو تو بھلی معلوم ہوئی۔ لیکن خودداری نے لعن و ملامت شروع کر دی۔ یہی خیال آتا تھا کہ ملک چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں۔ پلیٹ فارم ٹکٹ خرید کر سٹیشن پہنچا۔ معلوم ہوا کہ صبح سے پہلے کوئی گاڑی نہیں جاتی۔ پھر سوچا کہ اے مردِ مجہول! کیوں اپنے ماموں سے ڈرتا پھرتا ہے۔ طاقتور بن اور اس کا مقابلہ کر۔ اس دن سے میں نے کافی ہاؤس جانا ترک کر دیا اور ساری کتابیں ایک بھٹیارن کے حوالے کیں کہ وہ بقدرِ ضرورت استعمال میں لا دے اور ریڈیم ٹانک پلو کھانے اور مگدر گھمانے میں زندگی بسر کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ڈنڈ پیلنے کے بعد تین گولیاں کھاتا، لنچ تک بیٹھکیں نکالنا، لنچ پر چار گولیاں، پھر ڈنڈ اور مگدر۔ رات کو پانچ گولیاں۔ ہفتہ گزرا ہوگا، یقین جانیے بدن سے شعاعیں نکلنے لگیں۔ اندھیری سے اندھیری رات میں بغیر روشنی کے چل پھر سکتا۔ طاقت کا ایک سمندر تھا کہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ آٹھویں دن خواہش ہوئی کہ شیر ببر پر سواری کی جائے۔ لنگوٹا کس کر چڑیا گھر پہنچا۔ مگر شیروں کو پنجروں میں دھاڑتے دیکھ کر اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔ اس کے بعد خیال ہوا کہ کیوں نہ عمِ محترم کی خبر لی جائے چناں چہ اسی لنگوٹ میں ماموں کی محل سرا پر پہنچا۔ نوکر چاکر ڈر کر بھاگ گئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ماموں بسترِ استراحت پر بصدِ خضوع و خشوع

دُعا مانگ رہا ہے کہ اے باری تعالیٰ! میرے اس نابکار بھانجے کو توفیق دے کہ کافی ہاؤس جانا ترک کردے اور اپنی روزی خود کمانے لگے۔ مجھے بھی یہی توفیق دے۔ ہم سب کو یہی توفیق دے۔ میں اب بالکل سیدھا ہو گیا ہوں۔ تیری شان ہے کہ جس ڈیوڑھی پر ریکارڈ اور کیڈی لک جھومتی تھیں وہاں اب گدھا تک نظر نہیں آتا۔ خداوند تعالیٰ کہیں مجھے کسی انٹلکچوئل کی بددُعا تو نہیں لگی۔"

"بس بس اے مردِ بد بخت! اٹھ، میں نے تیرے فیلِ تن ہونے کا راز پالیا ہے اور خبردار جو کسی انٹلکچوئل کو بُرا بھلا کہا ہے تو، خبردار، جو کسی کو بھی بُرا بھلا کہا ہے تو، کیا ہم سب ایک جیسے نہیں، سب برابر نہیں؟ میں برابر ہوں برنارڈ شا کے، برنارڈ شا برابر ہے کنفیوشس کے، کنفیوشس مساوی ہے ابن بطوطہ کے"۔

"اے عزیز از جان بھانجے! آج سے مجھے اپنا ساتھی سمجھ۔ تیرے حق میں جو دُعا کی تھی وہ میں واپس لیتا ہوں" اس نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا

دفعتہً مجھے محسوس ہوا کہ صحت کے ساتھ ساتھ میرے عقیدے بھی بدل چکے ہیں۔ مجھے انٹلکچوئل بنا دُوبھر دکھائی دینے لگا کہ اس طبقے میں رہنا بڑا مشکل ہے۔ انھیں لوگ سمجھتے نہیں، ہر وقت مذاق اڑاتے ہیں۔ سارا جیب خرچ طبیبوں کی جیب میں چلا جاتا ہے کیونکہ صحت اس طبقے کی نہایت خستہ ہوتی ہے۔ ملازمت کے لیے انٹرویو میں جاؤ تو آسان سے سوالوں کے مشکل جواب سن کر ممبروں کو احساس کمتری ہو جاتا ہے اور وہ خواہ مخواہ فیل کر دیتے ہیں۔ ویسے پبلک حلیہ دیکھ کر ہی ڈر جاتی ہے۔ الغرض ان لوگوں کو سوائے ہوا پھانکنے کے اور کچھ میسر نہیں آتا اور ہوا میں غذائیت نہیں۔ سچ پوچھو تو ارادہ اس خاکسار نے اس روز بدلا جب عید گاہ میں دو بزرگوں کو بغل گیر ہوتے دیکھا۔ دونوں بھینگے تھے مگر بلا کے انٹلکچوئل تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، ہاتھ پھیلائے، مسکرائے، زیرِ لب کلمات خوشگوار لائے اور ایک دوسرے کے برابر سے نکل گئے۔ جب غلطی کا احساس ہوا تو نعرے بلند ہوئے

"کہاں چلے گئے؟ — میں تو یہاں ہوں اور تم؟.... یہ رہا"

مُڑے اور بغل گیر ہونے کے قصد سے واپس لوٹے۔ لیکن اس مرتبہ پھر نشانہ خطا ہو گیا، تیسری مرتبہ بغل گیری پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

رات کو اس نیاز مند نے ایک خواب دیکھا کہ اپنے ایک انٹلکچوئل استاد سے بغل گیر ہوتے وقت جو کمر پر ہاتھ پھیرتا ہوں تو چونک پڑا۔ اُن کی دُم غائب تھی۔ جاگا تو عبث شرمندہ ہوا۔ اسی دن سے میں نے اس انٹلکچوئل بننے بلکہ "Pseudointallectual" بننے سے کنارہ کشی کی۔ بھئی" تُو سن نہیں رہا ہے اونگھ رہا ہے"۔

"نہیں تو" جہاز باد خورد دفعتہً جاگا۔

"اچھا بتا میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"جہاز باد حرزی، رہانہ بہادرندی، نہاز بادنندی"

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ بئیر کا اثر ہے"

"ہرگز نہیں! یہ سفر ہی بہت لمبا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پیدل طے کیا گیا تھا اور یا ہمدم! وہ پرندہ کونسا تھا جو آپ کے سَرِ مبارک کے اوپر سے گزرا؟"

"اے ہمدم! نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پرندہ وہ اُوم تھا کیونکہ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ وہ اس حقیر کے سر پر سے گزرا۔"

کرنا تمام پہلا سفر جہاز بادسندھی کلاں کا، رُخصت ہونا جہاز بادسندھی خورد کا، ساتھ وعدہ آنے کے اگلے روز، بغرض سماعت سفرِ دُوم۔

اگلے روز جب محفل منعقد ہوئی تو اس میں صرف دو حضرات شامل تھے۔ خورد اور کلاں۔ ہر چند کہ استادِ کلاں نے شہزادے شہزادیوں کا بے صبری سے انتظار کیا، بارہا ٹیلی فون کیا، لیکن مایوسی ہوئی۔ ناچار چاء منگوائی۔ خورد چاء دیکھ کر نہایت غمگین ہوا اور یہ مصرعہ زبان پر لایا ع

چاء را کن چاء درپیش

لیکن کلاں نے اس کی بات سُنی اَن سُنی کر دی اور بولا۔

جہاز بادسندھی کا دوسرا سفر

حسینوں سے فقط صاحب سلامت دُور کی اچھی
نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی

اے عزیز از جان ہم نام! ایک دن چوک میں مَیں نے ایک شخص کو ہجوم کے سامنے تقریر کرتے سنا — وہ کہہ رہا تھا کہ — "سب لوگ برابر ہیں، سب مرد برابر ہیں، سب عورتیں برابر ہیں، سب بچے ایک سے ہیں۔ لہذا سب کو برابر حقوق ملنے چاہئیں۔ زندگی آسان ہو سکتی ہے۔ بس میں سفر کیجیے، ساڑھے چار آنے میں سیکنڈ شو دیکھیے، اندھیرا ہو جانے پر اندر جایئے اور روشنی ہونے سے پہلے باہر نکل آیئے۔ میونسپلٹی نے کہیں کہیں ریڈیو نصب کیے ہیں اور ان پر موسیقی (جو اسّی فیصد فلمی ریکارڈوں پر مشتمل ہے) اور خبریں سُنی جا سکتی ہیں۔ بک اسٹال پر کھڑے ہو کر ذرا سی دیر میں تازہ رسائل اور نئی کتب کا جائزہ لیا جا سکتا ہے ایک لمبے سے اُوور کورٹ سے سردیاں نکل سکتی ہیں اور دو رنگین بُس شرٹوں سے گرمیاں، ذرا سی خوشامد سے بآسانی محبت کی جا سکتی ہے لیکن یہ مت بھولیے کہ سب لڑکے ایک جیسے ہیں اور سب لڑکیاں ایک سی ہیں۔ مثال کے طور پر روس میں"...

وہ رُوس کا ذکر زبان پر لایا تو مجھے شُبہ سا ہوا۔ اگرچہ معلومات اس احقر کی روس کے بارے میں نہایت محدود ہیں تاہم بحث کرنی ہو تو گھنٹوں بول سکتا ہے۔ اے ہمنام خورد! تیرا رُوس کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"اے ہمنام کلاں! معلومات تو میری بھی ایسی ویسی ہیں، اگرچہ میں نے گراؤ مارکس کی لکھی ہوئی مشہور و معروف کتاب "سرمایہ داری" پڑھی ہے"۔

"نہیں، یہ کتاب کارل مارکس نے لکھی ہے"۔

"تو وہ بھی تو مارکس برادرز میں سے ہوگا — مارکس برادرز کو ماشاءاللہ کون نہیں جانتا"۔

"خیر، تو میں تقریر سنتا رہا۔ اس نوجوان کے بعد ایک شہزادی نے تقریر شروع کر دی — خاکسار نے تقریر سے زیادہ شہزادی میں دلچسپی لی۔ معلوم ہوا کہ اس پارٹی میں چند شہزادیاں بھی ہیں۔ ان میں سے دو تین شہزادیاں تو واللہ خوب تھیں۔ ناچیز نے چشم و دل کو ان کی دید سے تر و تازہ پایا اور اپنے تئیں اس ٹولی میں شامل ہونے پر آمادہ پایا۔

لیکن پتہ چلا کہ شامل ہونا آسان نہیں۔ کافی چھان بین کے بعد یہ لوگ اپنے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ بڑی کوشش کے بعد میں نے ان کے سرپرست کا کھوج نکالا۔ کسی نے بتایا کہ ان کے بچے سبزی ہائے تازہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ طبیبوں کا اصرار ہے کہ سبزیاں بچوں کی بہبودی

کے لیے از حد اشد ہیں۔ اُدھر بچے ہیں کہ نباتات، جمادات اور معدنیات سب کچھ کھا جاتے ہیں لیکن سبزیوں کو چھوتے تک نہیں۔ میں نے ان حضرت سے مل کر اس مہم کا بیڑا اُٹھایا۔ چند گاجریں تکیوں کے نیچے رکھ دیں۔ کچھ ٹماٹر بالائے طاق رکھے۔ شلجم کتابوں کے نیچے چھپا دیے۔ بچوں کو جب یہ چیزیں فرداً فرداً ملیں تو سمجھے کہ انھوں نے چُرائی ہیں۔ خُوب سیر ہو کر کھائیں۔ ان کے ابا نہایت خُوش ہوئے اور گلہ اپنے پیارے کتے کا کرنے لگے جو علیل تھا مگر دوائی پینے سے احتراز کرتا۔ میں پہلے تو دوائی اس سگِ نابکار کے دہن میں اُنڈیلنا چاہی۔ جب اس نے متواتر ناراضمندی کا اظہار کیا تو شیشی فرش پر پٹخ دی۔ بس پھر اس سگِ ناعاقبت اندیش نے زبان سے ساری دوائی چاٹ لی اور کیفرِ کردار کو پہنچا۔ وہ کمال درجہ مہربان ہوئے اور بولے

''اے مردِ عاقل! تُو دولتِ نفسیات سے مالا مال معلوم ہوتا ہے۔ بتا کیا مانگتا ہے''؟

میں نے آرزو بیان کی کہ کاش کہ مستقل طور پر آپ کی صحبت سے ذوق حاصل ہوتا۔ الحمدللہ کہ اس مردِ گرامی نے مجھے اپنی جماعت میں شریک فرمایا۔

ایک ایک دن عیش و کامرانی میں گزرتا۔ ہم سب ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک سگریٹ کا ڈبہ کھولتا سب اس پر ٹوٹ پڑتے۔ اسی طرح ایک دوسرے کے کپڑے، چیزیں، روپیہ استعمال کرتے۔ ویسے ہم لباس اچھا پہنتے تھے لیکن جب کام پر جانا ہوتا تو نہایت سادہ اور کُھردرا سا لباس ہوتا۔ ایک خاص قسم کے سستے کپڑے کا بنا ہوا، سر پر ایک عجیب سی ٹوپی ہوتی، واسکٹ اور چپلیوں کا استعمال بھی ضروری تھا۔ ہمارا کام آسان تھا۔ کتابیں اور کتابچے تقسیم کرنا، پوسٹر لگانا، خاص خاص جلسوں میں تقریر کرنا، جہاں کوئی کھیل تماشہ ہو، بہت سے لوگ جمع ہوں وہاں شور و غل مچا کر رنگ میں بھنگ ڈال دینا۔ اس کے لیے ہمیں معاوضہ ملتا تھا، ہمیں اپنی ٹولی کے ممبروں کے علاوہ ہر شخص سے للّٰہی بغض تھا مگر یہ خاکسار محض شہزادیوں کے لیے شریک ہوا تھا اس لیے زیادہ نہ سیکھ سکا اور ویسے کا ویسا رہا۔ آگ خشک و تر کو یکساں جلاتی ہے شہزادیوں کے قُرب نے خرمنِ صبر و شکیب پر کچھ اچھا اثر نہیں کیا۔ یہ فقیر اُن میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ شہزادیوں نے سردیوں میں تو خوب تبلیغ کی گرمیاں آئیں تو تیز دھوپ سے ان کی رنگت سنولانے لگی، ہر جگہ پنکھوں اور برف کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔ موٹر بھی کئی بار پنکچر ہوئی اور پیدل چلنا پڑا۔ شہزادیوں کو

شکایت تھی کہ باشندوں کی تعداد کتنی زیادہ ہے۔ادھر ہم کتنے تھوڑے ہیں۔لوگ اُن پڑھ ہیں سمجھتے نہیں بلکہ اب تو ہم سے چڑنے لگے ہیں۔ بھلا اور شہزادیاں ہماری طرح خدمت کرنے کیوں نہیں نکلتیں،اس طرح تو کچھ بھی نہ ہوگا۔

پھر ایک روز ہم نے سنا کہ ایک شہزادی نے خان بہادر قلندر بیگ سے شادی کر لی ہے۔ حالانکہ خان بہادر موصوف کی گزشتہ سے پیوستہ سب بیویاں صحیح سلامت تھیں۔دوسری نے ایک راے بہادر کو چُنا،جو سب کی راے میں کافی بزرگ تھے جن کی بیوی کے متعلق افواہیں اڑ رہی تھیں کہ سورگ باش ہو چکی ہیں یا ہونے والی ہیں۔یہ تازہ شگوفہ جو پھولا تو یہ ناچیز ساری چوکڑی یک دَم بھولا لیکن پھر سوچا کہ شہزادیوں پر بھروسہ کرنا دلیلِ حماقت ہے۔ان کی استقامت کا دَم بھرنا عین جہالت ہے۔یکا یک تیسری شہزادی نے ایک دولت مند زمیندار سے عقد کیا جس نے فوراً دو مربعے بیچ کر ایک پیکارڈ خریدی۔الغرض خزاں سے پہلے ساری شہزادیاں ٹھکانے لگیں۔ان میں سے ایک بے وفا کو میں نے یہ لکھ کر بھیجا ع

جو کیا تھا وعدہ نکاح کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جواب آیا۔

بہت دنوں کے تقابل نے تیرے پیدا کیا
وہ اک نکاح جو بظاہر نکاح سے کم ہے

ہم طرح طرح کی آزادیاں چاہتے تھے،سوچنے کی آزادی،جو جی میں آئے کر گزرنے کی آزادی۔ایک آزادی نے اس خاکسار کو کمال ذلیل وخوار کیا۔ہُوا یُوں کہ ایک روز میں نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ سرِ بازار اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہا ہے۔سب دیکھتے ہیں اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔مجھ سے رہا نہ گیا۔قریب جا کر نصیحت شروع کی ہی تھی کہ نوجوان نے تر چھا وار کر کے ایک میرے پاؤں پر بھی جڑ دی،دو مہینے ہسپتال میں پڑا رہا۔قصور میرا تھا نہ اس کا— میں نے آزادیٔ گفتار دکھائی تھی اور اس نے آزادیٔ کردار!

خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ایک عجیب خواب اس ناشُدنی کو نظر آیا۔ایک رات سویا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جیسے گھوڑے پر سوار ہوں اور گھوڑا جنگل میں سے گزر رہا ہے۔یکا یک آہ سنائی دی۔

حیران ہوکر اِدھر اُدھر دیکھا۔ تو وہاں کوئی نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد آہ نمبر دو سنی دوسری بار حیران ہوا۔

''میں نے بھری ہے''۔ گھوڑے نے بڑی سلیس اردو میں کہا۔ ''اور میں کیوں نہ بھروں، میں بھی تو جاندار ہوں۔ مُنہ میں زبان رکھتا ہوں۔ تم انسانوں کے لیے تو حقوق مانگتے ہو، جانوروں نے کونسا گناہ کیا ہے؟ ڈارون کی تھیوری کے مطابق ہم سب ارتقا کی مختلف منزلوں پر ہیں۔ ہمارا ماخذ ایک ہے لہذا ہم سب ایک دوسرے کے کزن ہیں۔ اے میرے کزن! میں تھک گیا ہوں۔ اب تم گھوڑے بنو اور میں سواری کروں گا''۔

چارو نا چار اس حقیر کو گھوڑا بننا پڑا۔ باری باری ہم نے سواری کی۔ جنگل سے باہر نکل کر خیال آیا کہ اگر دونوں ساتھ ساتھ پیدل چلتے تو بہتر تھا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے اپنے کزن سے دریافت کیا کہ اگر وہ انسان بننا چاہے تو کسی ماہر نفسیات سے مل کر آٹو سجیشن (Auto-suggestion) کا انتظام کرایا جائے لیکن وہ نہ مانا۔ بولا: ان دنوں تانگے کے گھوڑوں کو چھوڑ کر بقیہ گھوڑوں کی پوزیشن انسانوں کی پوزیشن سے بدرجہا بہتر ہے۔

صبح جاگا تو بڑا پریشان ہوا۔ اس گفتگو کا یہ اثر ہوا کہ تانگے میں بیٹھنے سے احتراز کرنے لگا اور کوئی سواری میسر نہ تھی۔ نقل و حرکت محال ہوگئی۔ سائیکل چلا چلا کر بُرا حال ہوا تو عقیدے بدلنے پڑے۔ ادھر شہزادے بھی تتر بتر ہو گئے۔ کچھ رجواڑوں میں جا بسے، ایک دو ایکٹر بن گئے۔ باقی کے ریڈیو میں ملازم ہو گئے ایک رہ گیا تھا اسے ہر وقت وہم رہنے لگا کہ ؏

شاید کہ پولیس خفیہ باشد

وہ بھی سنا کہ نائب تحصیلدار بن گیا۔ اس کے ساتھ میرا دوسرا سفر تمام ہوا۔ عزیزالقدر! ''ایسی نگاہوں سے الماریوں کی طرف مت دیکھ کہ موم بھی پتھر بن جاؤ۔ مجھے احساس ہے کہ سُورج غروب ہو چکا ہے۔ آج دیسی شراب منگائی ہے کہ چلّو میں اُلّو کرتی ہے''

اگلے روز جب خاتونِ شب نے چادرِ سیاہ میں رُخِ انور چھپایا اور شاہِ خاور نے اورنگ سپہر پر جلوہ فرمایا — (یعنی صبح ہوئی) — تو دونوں جہاز بادوں کو آرام کرسیوں پر سوتا پایا کہ ساتھ ان کے چند خرگوش بھی خوابیدہ تھے۔ آنکھ کھلنے پر غنچۂ صبح کھلکھلایا، مُرغانِ خوش الحان کی ترانہ سنجی سے کانوں نے لطفِ مزید پایا۔ جہاز باد کلاں شرمایا اور زبان پر یہ کلمے لایا۔

''اے مردِ نیک طینت! بادہ دیسی نہایت تیز نکلا۔ اب تک حالت خستہ ہے آج اچھی طرح اس شعر کے معنی سمجھ میں آئے ہیں۔

جو آج پی ہو تو ساقی حرام شے پی ہو
یہ کل کی پی ہوئی مے کا خمار باقی ہے

یہ بتا کہ تیرے عزیز واقربا تیرا انتظار تو نہ کرتے ہوں گے، شاید تھانے میں پوچھنے گئے ہوں''۔

''میں خدا کے فضل وکرم اور آپ کی دعا سے نا کتخدا ہوں''— خورد نے شرما کر کہا۔

''تو ملا ہاتھ، میں بھی نا خدا —— یعنی نا کتخدا ہوں، تو پھر سناؤں تیسرا سفر''؟

''ذرا صبر فرمایئے، سمندِ کلام کو زیر لگام لایئے''

اتنے میں ملازم نے مژدۂ جانفزا سنایا کہ چھوٹا حاضری کو تیار ہے۔ چاء پی کر کلاں ضبط نہ کر سکا اور یوں گویا ہوا۔

جہاز باد سندھی کا تیسرا سفر

دل سے شوقِ رُخِ نکو نہ گیا
تانکنا جھانکنا کبھو نہ گیا

اے مردِ مُخلص! میں موسم گرما گزار نے ملتان کے مرغزاروں میں گیا۔ وہ سرزمین جو رنگین مزاجوں کے لیے عشرت افزا گلشن اور درویشوں کے لیے دلکشا خلوت کدہ ہے۔ جب کچھ عرصہ خوش وقت ہو کر واپس لوٹا تو ایک نیا نام سننے میں آیا جس سے کان قطعی طور پر نا آشنا تھے —— نام تھا ترقی پسندی!

معلوم ہوا کہ میری غیر حاضری میں ایسی خوشگوار ہوا چلی کہ بچہ بچہ ترقی پسند ہو گیا، شاعری ترقی پسند ہوئی، ادب ترقی پسند بنا، سارا ملک ترقی پسندی کے گُن گا رہا تھا۔ یہ غلام بہت خوش ہوا۔ ترقی کون نہیں چاہتا۔ بہت سے احباب جو ملازم تھے، ترقی کے لیے مدتوں سے کوشاں تھے یہاں تک کہ کئی مرتبہ بیش قیمت تحفے تحائف بھی دے چکے تھے۔

نوجوان تو اس تحریک کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ ترقی پسندی کو اپنے نام کے ساتھ بطور ڈگری استعمال کرنے لگے۔ تعارف کراتے وقت ذکر کیا جاتا کہ فلاں ترقی پسند ہے یا نہیں۔

ادھر ترقی پسند ادب کا ریکٹ (Racket) بڑے زوروں پر تھا۔ یہاں تک کہ پبلشرز اور ایڈیٹروں نے حد بندی مقرر کر دی اور ترقی پسند رسالوں اخباروں میں صرف ترقی پسند چیزیں ہی چھپ سکتیں۔

اس فدوی نے بڑے شوق سے اس نئے ادب کا مطالعہ کیا اور اسے بے حد عام فہم پایا۔ ہر کتاب دوسری کتاب سے ملتی تھی۔ تمام افسانے ایک جیسے تھے، ساری غزلیں ایک سی تھیں۔ تھوڑے سے مطالعے کے بعد اتنی خود اعتمادی آگئی کہ افسانے کا آغاز پڑھ کر انجام بتا سکتا تھا۔ غزل کا مطلع سن کر پیشین گوئی کر سکتا کہ بقیہ اشعار میں کیا ہوگا۔ لوگ بڑی سُرعت سے ادیب اور شاعر بن رہے تھے۔ جن حضرات کو میں سڑکوں پر سارا دن گھومتے یا کافی ہاؤس میں گپیں ہانکتے دیکھا کرتا، اب اس نئی دُنیائے ادب میں نام پیدا کر چکے تھے۔

یہ حقیر شاعری تو کر چکا تھا لہٰذا ادیب بننے کا شوق چرایا۔ چنانچہ اسی دُھن سے ساز ملا کر اسی لَے میں الاپنا شروع کر دیا۔ میری چیزوں پر ترقی پسند حلقوں میں تو کافی واہ واہ ہوئی لیکن کچھ لوگ خواہ مخواہ لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئے۔ معلوم ہوا کہ ان دنوں دو مختلف کیمپ بن گئے ہیں جو ایک دوسرے کے سامنے مورچہ باندھے منتظر رہتے ہیں۔ میں کچھ حیران ہوا اور ایک بہت بڑے ترقی پسند سے ملا۔ پوچھا کہ کیا یہ ضروری ہے کہ لکھنے کے لیے کسی ایک کیمپ میں رہا جائے؟

اس نے بتایا کہ ''یہ بے حد ضروری ہے۔''

میں نے کہا: ''لیکن ان دونوں کیمپوں میں ہر وقت تُو تُو میں میں ہوتی رہتی ہے یہ مجھے پسند نہیں۔ کیا کوئی غیر جانبدار رہ کر نہیں لکھ سکتا''؟

وہ بولا۔ ''اگر آپ غیر جانبدار رہنا چاہتے ہیں تو لکھنا چھوڑ دیجیے''۔

چنانچہ یہ حقیر نقاد بن گیا۔ اس میں بھی ایک راز مُضمر تھا جو ابھی بتاؤں گا۔ ترقی پسندی کا فلسفہ کچھ مشکل نہ تھا۔ اپنے جیسے لوگوں کی سدا تعریفیں کرنا، جو لوگ لکھنے لکھانے کے علاوہ روزی کمانے کے لیے محنت کرتے ہیں انھیں ادب کا دشمن قرار دینا۔

افسانہ، مقالہ، غزل — سب کے لیے سانچے موجود تھے چنانچہ ترقی پسندی کا لیبل لگانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ صرف ان مسائل پر قلم اٹھایا جائے جن پر اس تحریک کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

تنقید کرتے وقت نہ میں پلاٹ کو جانچتا نہ مصنف کے پیغام کو، نہ پیغام کی افادیت کو، ہر چیز میں وہی جانے پہچانے موضوع، وہی مقررہ ترکیبیں اور الفاظ ڈھونڈتا، اگر یہ مل جاتے تو ترقی پسند کا ٹھپہ لگا دیتا ورنہ مصنف کو گمراہ کر دینے والا، سرمایہ دار، تنزل پسند اور نہ جانے کیا کیا کہتا"۔

"آپ نے فرمایا تھا کہ نقاد بننے کی وجہ تسمیہ بیان کریں گے"۔ خورد نے بات کاٹی۔

"ہاں — تو بات دراصل یہ تھی کہ اس عفی عنہ کو چند افسانہ نگار اور شاعر شہزادیاں پسند تھیں۔ ان میں سے دو ایک کو تو میں یونیورسٹی سے جانتا تھا اور کئی سال سے لگاتار ان پر فریفتہ تھا لیکن انھوں نے میرا اتنا سا نوٹس بھی نہیں لیا۔ لکھتی وکھتی یہ ایسا ہی تھیں میں نے سوچا کہ اگر ان کی تعریف کرنے لگوں تو شاید ملتفت ہو جائیں۔ موقعہ بھی تھا۔ چنانچہ میں نے ان کی تخلیقات کو سراہنا شروع کیا۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے اپنے ٹھوس مضامین میں ان کی تعریفیں کرتا۔ لیکن تعجب ہوا کہ یہ مدح سرائی رائیگاں گئی۔ کسی سے پتہ کرایا تو معلوم ہوا کہ شہزادیوں نے ایک لفظ بھی نہیں پڑھا تھا۔ مجھے شبہ ہوا۔ اِدھر اُدھر پوچھنے پر انکشاف ہوا کہ انھوں نے کیا کسی نے بھی نہیں پڑھا۔ ایسے مضامین یہاں کوئی نہیں پڑھتا کیونکہ انھیں خشک اور ثقیل سمجھا جاتا ہے۔ ویسے بھی نقادوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے"۔

"ان کیمپوں کا کیا بنا؟"

"بتاتا ہوں، بن — یوں تو ہر تحریک کچھ عرصہ کے لیے مقبول ہو جاتی ہے لیکن اس نام سے خوامخواہ خوش فہمی ہوتی تھی کہ اب ہر چیز میں ترقی ہوگی، حالات سدھر جائیں گے، انسان ترقی کرے گا، دنیا بہتر بن جائے گی — لیکن آہستہ آہستہ مایوسی چھانے لگی۔ ادب بالکل جرنلزم بن کر رہ گیا۔ آج کوئی بات ہوئی، اسی ہفتے اس پر نظم لکھ دی گئی یا افسانہ، اور اگلے مہینے کتاب۔ لوگوں کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اس تحریک کا پیراہن نرا کاغذی تھا۔ اس تحریک کا مقصد تخریب تھا۔ تعمیر مفقود تھی۔ یہ ہیرو نہیں تھے۔ پبلک اب تک غلط گھوڑوں پر Betting کرتی رہی تھی۔ ان کی زندگی عمل سے خالی تھی۔ ان کا نظریۂ حیات مریضانہ اور قنوطی تھا۔ یہ چاہتے تھے کہ ہر پڑھنے والے کو مالیخولیا ہو جائے۔ ادب کسی خاص طبقے کی میراث نہ ہوا ہے، نہ ہوگا چنانچہ لوگ اس وقتی ہنگامے سے تنگ آ گئے اور ادب سے ایسے بدگمان ہوئے کہ انھوں نے فلمی رسالے پڑھنے شروع

کردیے۔ فلمی رسالے تو فراری ادب میں بھی شامل نہیں۔۔۔ ساتھ ہی ایک عجیب وغریب ادب نے جنم لیا۔ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے متعدد حضرات نے تاریخی اور مذہبی ناول لکھنے شروع کردیے جو ہاتھوں ہاتھ بکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ بور ہو رہے ہیں"۔

"جی نہیں، بور تو نہیں ہو رہا"۔ خورد جمائی لے کر بولا" فراری ادب پر مجھے ایک چشم دید واقعہ یاد آ گیا۔ طے ہوا کہ ہمارے ضلعے کے جیل میں قیدیوں کو اخلاقی کتابیں پڑھائی جائیں۔ داروغۂ جیل اتفاق سے رجعت پسند تھا، سب کتابیں فراری ادب پر لے آیا، نتیجہ یہ نکلا کہ دو مہینوں کے اندر اندر سارے قیدی فرار ہو گئے۔"

"خیر تو یہ کمترین بدستور ترقی پسند رہا محض ایک ماہ پارہ کے عشق کی وجہ سے۔ اس بُتِ طناز کو میں نے مینا بازار میں دیکھا۔ میں اپنے دو سپنیل کتے لیے جا رہا تھا کہ خیال آیا کہ ذرا مینا بازار کا نظارہ کرلوں۔ ایک سٹال پر کچھ خریدنا چاہا لیکن دونوں ہاتھوں کو گھرا پایا۔ ایک حسینۂ پُرتمکین کو قریب پاکر کتوں کی زنجیریں اس کے ہاتھ میں تھما دیں۔ جب خرید سے فراغت ہوئی تو حسینۂ مذکور سے کتے طلب کیے۔ اس نے کمالِ بھولپن سے کہا۔

"ایک کتا تو بلی کے پیچھے بھاگ گیا"۔

انگشت بدنداں سخت پریشان ہوا اور سوال کیا کہ کیوں کر بھاگ گیا؟

"یوں بھاگ گیا"۔ اس نے دوسرا کتا بھگاتے ہوئے کہا۔

کتے تو دونوں مل گئے۔ لیکن ادا یہ اس کی اس درجہ بھائی کہ بجز عاشق ہونے کے اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اختر شماری شروع کردی۔ اس علاقے میں جتنے اختر حسن، اختر حسین، حسن اختر، محمد اختر تھے سب گن ڈالے مگر افاقہ نہ ہوا۔

آخر اپنی کزن کی مدد چاہی، وہ خالہ جائی بلائیں لے کر بولی

"میں آج ہی اسے کلب میں بلاؤں گی"

چنانچہ شام کو وہ ماہ جبیں کلب میں آئی، اس ٹھسے سے کہ بھاری فرشی غرارہ پہنے، عطر لگائے، زیور بیش بہا عجب بہار دکھاتا تھا۔ گلے میں جگنی، چمپا کلی، موتیوں کی مالا، دھگدھگی، کانوں میں پتے بالیاں، ہاتھوں میں حسین بند، الماس کے کڑے، پاؤں میں سونے کے چھڑے، ناک میں ہیرے

کی تھی، انگلیوں میں جواہرات کی انگوٹھیاں، سر پہ چھپکا، اس فقیر نے دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا۔

جان پڑ جاتی ہے زیور میں پہننے سے ترے
کہیں اُڑ جائے نہ جگنی تری جگنو ہو کر

لیکن میری کزن نے بڑے زور سے ہشت کر کے چُپ کرا دیا اور اس سے گویا ہوئی کہ کلب میں بلانے کا تو فقط بہانہ تھا، اصل میں تمھیں ایک پیغام سنانا تھا۔ میرا کزن جوانِ زیبا خرام خُو بر و گلگوں دیکھتے ہی آپ پر شیفتہ و دوالہ ہوا۔ عشق کا بول بالا ہُوا۔ وہ بزار جان سے تمھارے گُل رخسار کا عندلیب شیدا ہے۔ آہِ سرد اور دل میں درد سے عشق کا مرض پیدا ہے۔ ماشاءاللہ عجیب دفریب نوجوان ہے، عجب آن بان ہے، لاکھوں جوانوں میں انتخاب ہے، حسن و خوبی میں اپنا آپ جواب ہے۔ تم دونوں کی خوب نبھے گی، گہری چھنے گی۔ وہ بھی کم سن تم بھی جوان، وہ بھی نازک بدن تم بھی دھان پان۔ وہ مُو جادو آفرینی، تم سرو چمن زاہد نازنیں"......

"اُفوہ، اتنی لمبی چوڑی تمہید کی کیا ضرورت تھی"... حسینہ نے بات کاٹی۔ "والدین میری شادی کا تہیہ کر چکے ہیں تبھی مجھے پارٹیوں اور کلب وغیرہ میں جانے کی اجازت اتنی آسانی سے مل جاتی ہے۔ کئی اخباروں میں اشتہار بھی دیے گئے ہیں۔ غالباً اگلے مہینے میرا سوئمبر رچایا جائے گا۔ اگر آپ کے کزن کو اتنا ہی ذوق و شوق ہے تو سوئمبر میں شرکت کرے۔"

حسینہ کی یہ تقریر اس حقیر کو نہایت ترقی پسند معلوم ہوئی اور اس نیاز مند نے اس کے ساتھ رُمبا (Rumba) ناچنا چاہا۔ زیوروں سے ایسی عجیب عجیب آوازیں آنے لگیں کہ ارادہ ترک کر دیا۔ پھر سامبا (Samba) ناچنے کی کوشش کی مگر ایک دوسرے کے ملبوسات آپس میں اُلجھ کر رہ گئے۔ چنانچہ رقص کی حسرت ہی رہی۔

سوئمبر قریب آیا تو میری کزن نے اخبار میں چھپا ہُوا اشتہار دکھایا جو ضرورتِ رشتہ کے عام اشتہاروں سے ملتا جلتا تھا مگر ترقی پسندی کی عینک لگا کر پڑھا تو عبارت کا مفہوم کچھ یوں سمجھ میں آیا:۔

اشتہار برائے پبلک

ہر خاص و عام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو صبح چھ بجے سے شہزادی ولیمہ جہاں کے سوئمبر کا ٹورنامنٹ شروع ہوگا اور مناسب اور معقول امیدواروں کو شہزادی پر عاشق ہونے کی اجازت ہوگی۔ بشرطیکہ وہ مندرجہ ذیل شرائط پر پورے اترتے ہوں:۔

1۔ کنوار پنے کا سرٹیفکیٹ جس پر صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر کے دستخط ہوں اور امیدوار کے والد کی سالانہ آمدنی اور جائداد کی تفصیل درج ہو۔

2۔ تندرستی کا سرٹیفکیٹ جس پر سول سرجن صاحب بہادر کی تصدیق ہو۔

3۔ دو معزز آدمیوں کے نام اور پتے جو امیدوار کے چال چلن کی ضمانت دیں اور اس کے رشتہ داروں میں سے نہ ہوں۔

4۔ سرکاری خزانے میں پانچ روپیہ جمع کرانے کی رسید۔

5۔ طلسماتی چیزیں مثلاً زمینداروں اور خان بہادروں کی سفارشیں ممنوع ہیں۔

6۔ امیدوار ایک ہفتہ کا راشن، بستر اور وفادار ملازم ہمراہ لائیں۔

7۔ مہاجر کو ترجیح دی جائے گی۔

8۔ کامیاب امیدوار کو شہزادی ولیمہ کے علاوہ جائداد کا تہائی حصہ بطور انعام ملے گا۔

نوٹ:۔ "سب کو خبردار کیا جاتا ہے کہ خوانخواہ عاشق ہونے کی ہرگز اجازت نہیں ہے اس قسم کا امیدوار ایسی سزا کا مستحق ہوگا جو پچاس روپے جرمانہ اور تین ماہ کی قید تک ہو سکتی ہے"۔

اس ناچیز نے اس شاندار ترقی پسند سپرٹ پر اظہار مسرت کیا اور دعا مانگی کہ دنیا کی ہر شہزادی کی شادی اسی طرح ہوا کرے۔ فوراً کاغذات مکمل کر کے گھوڑا منگایا، سیڑھی لگا کر سوار ہوا اور سوئے ٹورنامنٹ روانہ ہوا۔ مقابلہ نہایت شاندار رہا۔ طرح طرح کے امتحان لیے گئے۔ آئی کیو (I.Q) بھی ٹسٹ کیا گیا۔ جو زیادہ ذہین تھے۔ انھیں نکال دیا گیا۔ اتفاق سے ایک حبشی بھی کہیں سے آن ٹپکا اسے سزا دی گئی اور فہرست سے خارج کرتے وقت اس کے منہ پر سفیدی مل کر شہر میں پھرایا گیا تاکہ سب کو عبرت ہو۔

چند رجعت پسندوں نے آتے ہی پہلا سوال یہ کیا کہ جائداد کا کونسا حصہ ملے گا، شمالی یا جنوبی؟ جواب ملنے پر وہ راتوں رات فرار ہو گئے کیونکہ وہ علاقہ نہری نہ تھا وہاں ٹیوب ویل لگانے کی ضرورت تھی۔

خاکسار یہی فائنل جیت کر فائنل تک جا پہنچا۔ اتنے میں نہ جانے شہزادی کے ماموں کا لڑکا کہاں سے آمرا۔ یہ مردک کہ بے حد نحیف و نزار تھا، ایک بہت بڑی جائداد کا تنہا وارث تھا (اور صحت اس کے باپ کی گرتی جا رہی تھی)۔ اس مردود کے مقابلے میں یہ ناچیز قدرے مفلس تھا۔ مفلس عاشق کہلاتے ویسے بھی شرم محسوس ہوتی ہے مگر یہ سچ ہے کہ۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے

آدمی کا وقار کھوتی ہے

اس کمبخت کے آجانے سے ٹورنامنٹ کا رنگ ہی بدل دیا گیا۔ نہایت سرمایہ دارانہ سوالات پوچھے گئے۔ اُدھر شہزادی کی امّاں نے برادرزادے کے لیے رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ سب کے سب رجعت پسند ثابت ہوئے اور فیصلہ اس ملعون کے حق میں کیا گیا۔

ٹورنامنٹ کے نتیجے کی خبر دہشت ناک سنتے ہی موم جامۂ صبر چاک ہوا۔ ماتمی لباس پہنے اس حال میں تھا کہ نہ سر پر جوتا تھا نہ پاؤں میں پگڑی۔ لیکن شہزادی کے والد نے اس حقیر کو خلافِ توقع مبارک باد دی اور کہا کہ لڑکی کو اس کی والدہ نے بے حد بگاڑ رکھا ہے۔ شاید تُو نے بیگم کو نہیں دیکھا جو دراصل ——بے غم—— ہے۔ لڑکی بھی چند سال کے بعد ویسی ہی لحیم وشحیم بن جائے گی۔ اگر چہ مجھے مٹاپا مرغوب نہیں لیکن وائے نادانی کیا بتاؤں کہ ع

میں اسیرِ دامِ فربہی رہا ہوں

اے نوجوان! تُو گھاٹے میں نہیں رہا (اس کے بعد ترنم سے بولے)

تم بھی بیاہ کرو تو جانو

ہم دکھیوں کی فریادوں کو

اس بیان سے اس نیاز مند کی تسلّی تو نہ ہوئی لیکن یہ یقین ہو گیا کہ شہزادیاں اس ملک کی ہرگز ترقی پسند نہیں ہیں"۔

"ایک بات پوچھوں یا پیرومُرشدا!" خورد نے ڈرتے ڈرتے کہا

"دو پُوچھ۔"

"اب دو ہی پوچھوں گا۔ یہ بتایئے کہ کبھی آپ کو کسی سے سچ مُچ محبت ہوئی؟"

"ہاں ہوئی تھی۔ یہ شہزادی فارغ التحصیل بلکہ فارغ البطلع ہو چکی تھی۔ ہم دونوں جرنلزم کی کلاس میں ملتے، ہائیکورٹ کے پاس جو باغیچہ ہے، وہاں اکثر جایا کرتے، وہاں میں نے اسے کورٹ کرنا شروع کیا۔ اس کے رُخِ روشن پر ایک خال ہوتا۔ یہ خال کبھی تو پیشانی پر ہوتا، کبھی رخسار پر تو کبھو ٹھوڑی پر اور کسی روز سرے سے غائب ہوتا۔ میں حیرت سے یہ شعر زبان پر لایا۔

مصحفِ رُخ پہ ترے خال نگہبان ہوا
یہ غلام حبشی حافظِ قرآن ہوا

تبسم پہ اس نے فوراً مطلع کیا کہ خال وہ مصنوعی تھا اور سُرمے سے محض زیبائش کی خاطر بنایا جاتا ہے۔ میں نے جھٹ سرخ ہونٹوں کی تعریف کی۔

لال ہیں آپ ہی لب سُرخی پاں دور رہے
نازکی کہتی ہے یہ بارِ گراں دور رہے

اس پر شہزادی نے عجب تمسخر سے فرمایا کہ یہ پان دھان کی سرخی نہیں میکس فیکٹر کی بڑھیا لپ سٹک (Lipstick) ہے۔ اگر چہ اس فقیر کو علم تھا کہ لپ سٹک کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ سٹک (Stick) نہیں کرتی تاہم موضوع بدلنا پڑا اور پامسٹری (Palmistry) کا ذکر چھیڑا۔ وہ بولی

"میں جانتی ہوں۔ آپ اس حیلے سے میری خوشامد کرنا چاہتے ہیں"۔
میں نے چوڑیوں کی طرف دیکھ کر کہا "کیا میں انھیں چھو سکتا ہوں"؟
وہ بولی "آپ اسی بہانے سے میرا ہاتھ تھامنا چاہتے ہیں"۔

اس صاف گوئی پر یہ درویش باغ باغ ہو گیا۔ ماشاء اللہ کیا ترقی پسند محبوبہ تھی۔ بے حد مسرت کا سامنا ہوا۔ سوچا کہ جب انجام مقررہ ہے تو فرار بزدلی میں شامل ہے۔

بیاہ کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

چنانچہ میں نے اُسے شادی کے لیے کہہ دیا۔
بولی "آپ خراٹے تو نہیں لیتے"؟
میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اس پر وہ بولی "تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جایئے اور میرے والدین کو منا لیجیے۔"

یہ جواب بھی ترقی پسند تھا اور اس فدوی کو پسند آیا۔ میں سیدھا اس کے والدین کے پاس پہنچا اور سوال کیا۔ انھوں نے پہلے تو اس کمترین کا شجرۂ نسب حضرت آدم تک دریافت کیا۔ پھر جملہ متعلقین کے متعلق طرح طرح کے سوالات پوچھتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا گویا تہمت لگا رہے ہیں۔ پھر بولے

"اگر تم دونوں میں سے خدانخواستہ کسی کا انتقال ہو گیا تو لڑکی کے لیے کیا انتظام ہوگا؟ کوئی ذاتی ملکیت یا بیمے کی پالیسی ہے"؟

پھر مہر کا قضیہ شروع ہوا، جیسے نیلامی ہو رہی ہو۔ میں نے عرض کیا کہ میرا ارادہ ٹھیک ہے اور انشاء اللہ مہر کی ادائیگی تک نوبت ہی نہ پہنچے گی۔ آخر آپ اتنے لمبے چوڑے مہر کے لیے مصر کیوں ہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یقین ہے کہ یہ شادی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی"۔

وہ بولے "اگر مہر تھوڑا لکھا گیا تو دنیا کے سامنے ہماری ناک کٹ جائے گی"۔

خیر حقیر یہ مان گیا۔

وہ چاہتے تھے کہ پرانی رُسومات ساری ادا کی جائیں۔ میں معروض ہوا کہ ہجوم اکٹھا کر کے غل مچانا ایام جہالت کی رسم ہے۔ جب پبلسٹی (Publicity) کا یہی ایک طریقہ تھا کہ لوگوں کو بلا کر دکھا دیا جاتا تھا کہ واقعی شادی ہوئی ہے تاکہ وہ سب بعد میں گواہ رہیں۔ اب تو فوراً اخبار میں تصویر آجاتی ہے اور پھر شور و غل سے یہ احقر بہت گھبراتا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ آتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں سچ مچ کچھ کر بیٹھا ہوں لیکن وہ بدستور مُصر رہے۔

آخر یہ تجویز پیش کی کہ شادی دو حصوں میں ہو۔ پہلے آپ مجھے فارغ کر دیں پھر مہینوں بلکہ سال بھر تک روشنیاں جلا کر خُوب ڈھول بجائیں اور دعوت پر سارے ایشیا کو (معہ ایشیائے کوچک کے) مدعو کر لیں۔

وہ کمال درجہ رجعت پسند نکلے کہ نہ مانے۔

اسی طرح وقت گزرتا گیا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ شہزادی کو دوبارہ بغور تو دیکھو۔ دیکھا تو حلیہ بدل چکا تھا۔ بھوؤیں اکھیڑنا، بال ترشوانا، ناخن پالنا ـــ ان خوبیوں کا مجھے پہلے علم نہ تھا۔ جُوتوں اور

میک اپ سے کسی روز بے حد لبی معلوم ہوتی۔ گھر میں سادہ کپڑوں میں دیکھا تو چھوٹی اور موٹی دکھائی دیتی۔ رنگ و روغن کی وجہ سے اصلی شکل دیکھنا محال تھا چنانچہ عشق و عاشقی کو بالائے انگیٹھی رکھا اور ان رجعت پسندوں کو ان کے حال پر چھوڑا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ کچھ تنزل پسند ایک ترقی پسند کو سر بازار پھول مار رہے تھے اور وہ خاموش کھڑا برداشت کر رہا تھا۔ میں کچھ دیر تو کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر ایک اچھا سا پتھر اٹھا کر کھینچ مارا، وہ بلبلا اٹھا اور بولا۔

''اے مردِ سخن فہم! یہ سب تو بے سمجھ ہیں، نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں۔ تُو تو ترقی پسند ہے تجھ سے ہرگز یہ امید نہ تھی''۔

اس واقعے کے بعد الجھن سی پیدا ہوگئی۔ کیسے ترقی پسند اور کہاں کی ترقی پسندی؟ لوگ جہاں تھے وہیں کے وہیں ہیں۔ کوئی کسی رُخ بھی ترقی نہیں کر رہا۔ ویسے میرے اور ترقی پسندی کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ ہی رہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو زیادہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی، شاید مجھے شہزادیوں کی وجہ سے کچھ چڑ سی ہوگئی تھی''۔

''اس کے بعد کیا ہوا''؟

''اس کے بعد یہ ہوا کہ تنقید نگاری کی بدولت مجھے پگڑیاں اُچھالنے میں خاصی مہارت ہوگئی۔ اُدھر فلمی پرچوں کی مانگ بڑھتی جارہی تھی۔ چنانچہ یہ فقیر فلمی نقاد بن گیا اور فلمی ستاروں کے متعلق تازہ ترین افواہیں بہم پہنچانے لگا۔ کروڑوں پڑھنے والے میری رنگین تحریروں کا بڑی بے صبری سے انتظار کیا کرتے۔ فلمساز اور اداکار مجھ سے ڈرنے لگے۔ کئی حسیناؤں سے اسی بہانے دوستی ہوگئی۔ ترقی پسند اور رجعت پسند دونوں مجھ پر رشک کرنے لگے''۔

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر خاک ہوا، وصول ہوا''۔ کلاک نے جھلا کر کہا

''ابھی کتنا سفر باقی ہے''؟

''تُو بڑا بے صبر ہے۔ اچھا لے، سفر یہیں ختم ہوا۔ یونہی طبیعت بدمزہ کردی۔ اگلی مرتبہ جب فرصت ہو تب آئیو۔''

سر شام جہاز باد خوردآن دھمکا اور بولا

"صبح جو کچھ ہوا۔ اس کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔ سزا کے طور پر تیسرا سفر دوبارہ سننے کو تیار ہوں"۔

جہاز بادکلاں مسکرا کر بولا "ہم معاف کرتے ہیں اور چوتھا سفر پہلی مرتبہ سناتے ہیں"۔

جہاز باد سندگی کا چوتھا سفر

فصلِ بہار آئی پیو صوفیو شراب

بس ہو چکی نماز مُصلّا اٹھایئے

اے رفیقِ دیرینہ! ایک رات کا ذکر ہے کہ میں نے کتے کو مارنے کے لیے ایک وزنی سی کتاب اٹھائی۔ کتا دور جا چکا تھا لہذا ورق گردانی کرنے لگا اور پڑھتے پڑھتے سو گیا۔ علی الصبح جو اٹھا تو اپنے آپ کو پرولتاری پایا۔ سوچا کہ شاید مشیتِ ایزدی اسی میں ہے کہ پرولتاری ہوں اور نام پاؤں"۔

"اے ہمدم طوطی گفتار! لفظ پرولتاری سے آپ کی کیا مراد ہے"؟

"یہ ایک انگریزی لفظ کا نعم البدل ہے اردو میں۔ ڈکشنری دیکھیے، بہت کچھ معلوم ہوگا۔ پرولتاری بننا آسان کام نہیں۔ بڑی ہمت چاہیے۔ دن رات بھاری بھاری کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے، لیکچروں میں جانا پڑتا ہے، پریکٹیکل الگ ہوتے ہیں۔ بہت جلد فدوی نے یہ کورس مکمل کر لیا۔ زندگی میں کئی تبدیلیاں آگئیں۔ اٹھنا بیٹھنا صرف پرولتاریوں میں ہوتا۔ بڑی طویل بحثیں ہوا کرتیں۔ پرولتاری ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ہمیں مذہب، جنس اور دیگر اہم مسائل پر جدید ترین نظریوں کا اظہار کرنے کی پوری آزادی تھی۔ ہماری انوکھی اور بصیرت افروز باتیں سن کر عوام چونک پڑتے۔ ہر مذہب کو ہم تضیعِ اوقات سمجھتے۔ انسانی رویے کے عالمگیر قوانین ہمارے لیے مہمل اور لغو تھے۔ ہر انسان، ہر اصول، ہر بیان کو ہم نہ صرف شبہ کی نظر سے دیکھتے بلکہ منٹوں میں دھجیاں اُڑا دیتے۔ عجب دن تھے وہ بھی —! کیا دبدبہ تھا۔ سڑک پر پرولتاری چلتا تو لوگ اِدھر اُدھر ہٹ کر راستہ دیتے۔ جھک جھک کر سلام کرتے۔ کیا مجال کوئی ہم سے بحث کر سکے،

چند ہی فقروں کے بعد وہ یوں خاموش ہو جاتا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ بڑے سے بڑے ہجوم میں محض چند پرولتاریوں کی آمد قیامت برپا کر سکتی تھی۔

"بھاگ چلو یارو! پرولتاری آ گئے" کا نعرہ لگا کر وہ ایسے بھاگتے کہ ٹوپیاں اور چھاتے چھوڑ جاتے۔

جہاں ہم نے مقامی پبلک کو آگے لگا رکھا تھا وہاں مقامی لڑکیاں تھیں کہ سیدھے منہ بات نہ کرتی تھیں۔ وہ ہم سے بدگمان تھیں۔ ہم مذہب، دوستی، ایمان، فلسفۂ عشق کے پرخچے ضرور اڑاتے تھے لیکن یہ سب دکھاوے کے لیے تھا۔ کبھی کبھی ہمارے دل بھی محبت کی آگ سے سلگنے لگتے۔ ضرورت پڑنے پر ہم خدا کا واسطہ دیا کرتے۔ مصیبت پڑتی تو دعائیں مانگتے۔ رہ گئی جنس، سو اس کے متعلق ہمارا تجربہ اتنا ہی تھا جتنا غیر پرولتاریوں کا۔ لیکن ہماری معلومات کا ماخذ فرائڈ، ڈی ایچ لارنس اور دیگر حضرات کی کتابیں تھیں۔ خیالات ان کے تھے بیان ہمارا تھا۔ اگرچہ ہم نے ان مصنفین کا حوالہ کبھی نہیں دیا اور ہاں میں بتانا بھول گیا کہ پرولتاری ایک انقلاب بھی چاہتے تھے"۔

"کیسا انقلاب"؟

"کبھی ایک عالمگیر انقلاب تو کبھی ملکی یا غیر ملکی انقلاب۔ بعض اوقات ہم مقامی انقلاب پر ہی قناعت کر جاتے۔ بس انقلاب ہو، کہیں، کسی قسم کا، کسی سائز کا۔۔۔ چنانچہ ہم بار بار پبلک کو انقلاب کے لیے اکساتے۔ ہم چاہتے تھے کہ ہنگامے بپا ہوں اور افراتفری مچے، دنگے فساد ہوں تاکہ لوگوں پر ہماری اہمیت واضح ہو جائے لیکن مجھے غصہ تھا تو اس پر کہ یہی لڑکیاں جو ہم سے ملنا اپنی ہتک سمجھتیں، کلب میں وہ دھما چوکڑی مچاتیں کہ خدا کی پناہ۔ ایک خاص طبقے سے خوب چُہلیں کرتیں۔ یہ حضرات بھی عجیب تھے۔ ویسے اچھے بھلے تھے لیکن اپنے آپ کو بے حد غمزدہ اور بدنصیب سمجھتے۔ اس کی وجہ اپنی بے جوڑ شادی بتاتے۔ حالانکہ ہر ایک ماشاءاللہ چھ چھ بچوں کا باپ تھا۔ ان کی ایک ہی رٹ تھی کہ ان کی ازدواجی زندگی نہایت غمناک ہے اور وہ بیوی سے تقریباً تقریباً علاحدہ ہو چکے ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں انھیں کسی نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس بہانے وہ ہر لڑکی سے فلرٹ کرتے۔ چونکہ ان کے پاس کاریں تھیں اس لیے یہ بورژوا تھے"۔

''اس ناچیز کے چچا جان جو تھانیدار ہیں، کار رکھتے ہیں، کیا وہ بھی بورژوا ہیں''۔ خورد نے پوچھا؟

''ضرور ہوں گے۔— تو یہ شادی شدہ بورژوا حضرات دن بھر کاروں میں لڑکیوں کو لیے لیے پھرتے لطف یہ ہے کہ ان میں سے کوئی پینتالیس برس سے کم نہ تھا۔ پتہ نہیں، انھیں اس میں کیا ملتا تھا''؟

''غالباً انھیں سنہ تیس اکتیس کے پُرانے ماڈل پسند نہیں تھے اور نئے سٹریم لائینڈ ماڈل درحقیقت دیدہ زیب ہوتے ہیں''۔ خورد نے مؤدبانہ عرض کیا

''مگر یہ نئے ماڈل ان کا خُوب مذاق اڑاتے۔ ملتے ہی سوال ہوتا کہ آپ کی ننھی بچی کا اب کیا حال ہے؟ آپ کے لڑکے کا بخار اترا؟ بیوی کا کوئی خط آیا؟ بڑی لڑکی کی شادی کب ہو رہی ہے؟ دیکھیے ہمیں ضرور بلایئے، مگر یہ بورژوا تھے کہ''......

''ویسے بورژوا ہوتا کیا ہے''؟

''بورژوا وہ ہے''— کلاں نے چہرے کے اظہار اور ہاتھوں کی جُنبش سے بتانے کی کوشش کی ''جو— جو— بالکل بورژوا ہو— سُنا ہے کہ فرانس میں سوداگروں کا ایک طبقہ رہتا تھا اسے بورژوا کے نام سے پکارتے تھے لیکن یہ کافی عرصے کا ذکر ہے''۔

''یا پیرو مُرشد! ایوننگ اِن پیرس (Evening in Paris) کی نیلی شیشی پر ایک لفظ بورژوا لکھا ہوتا ہے۔''

''اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس کے کیے میں دخل دینا سخت نادانی ہے۔ تو میں نے لڑکیوں سے ان بورژوا حضرات کی خوب برائیاں کیں اور انھیں بہت سمجھایا۔ یہ بھی کہا کہ یہ سب سرمایہ دار ہیں اور سماج کے دشمن ہیں۔ وہ ہنسنے لگیں کہ کار کو چھوڑ کر ان کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ بینک میں ان کا حساب صفر ہے بلکہ مقروض رہتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ سرمایہ دار ہونے کے لیے سرمائے کی ضرورت نہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے جس پر غصہ آتا ہے۔ وہ بولیں۔ جب سرمایہ نہیں تو ذہنیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ میں خود پرولتاریت سے اُکتا چکا تھا لیکن یہ گلے کا ڈھول تھا کچھ عرصہ بجانا پڑا۔ آخر ایک دن میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ایک ذلیل سی پرانی موٹر کہیں

سے خریدی اور بورژوا بن گیا۔ دہنے بائیں ہر لڑکی سے فلرٹ کرنا شروع کیا اور ہرجائی کے نام سے شہرت پائی"۔

"آہا تو آپ ہرجائی بھی رہ چکے ہیں ——ملایئے ہاتھ —— یہ خاکسار بھی ہرجائی رہ چکا ہے آؤ نا سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ زندگی بے حد مختصر ہے اور حسین چہرے تعداد میں اتنے زیادہ ہیں۔"

"لیکن دو تین لڑکیاں تو سچ مچ پسند آ گئیں اور ارادہ اس خاکسار کا شادی کرنے کا تھا۔"

"ان سب سے"؟ خورد چونک پڑا۔

"نہیں، ایک سے۔ لیکن معلوم ہوا کہ لڑکیوں کی توقعات بہت زیادہ ہیں۔ کورٹ شپ (Courtship) میں وہ صرف لڑکے کے نقائص معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ انھیں فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ ہونے والی ساس کس مزاج کی ہے۔ کنبے میں بہت زیادہ لوگ تو نہیں۔ لڑکے کی تنخواہ کا گریڈ کیا ہے اور یہ گریڈ اسے ملے گا بھی یا نہیں؟ مزید بننے کے کیا امکانات ہیں۔ شکّی مزاج تو نہیں کہ ذرا دوسرے مرد سے بات کی اور خفا ہو گیا"۔

"پتہ نہیں —— البتہ شادی کے متعلق سنجیدگی سے صرف ایک طبقہ سوچتا ہے۔ خاوندوں کا طبقہ۔ یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ حقیقی مسرت سے انسان تب تک آشنا نہیں ہوتا جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی۔ لیکن تب بہت دیر ہو چکتی ہے"۔

"یار! تو بات مت کاٹ، چپ چاپ سُنتا رہ —— یہ لڑکیاں بے حد Materialistic تھیں۔ یونہی یونہی وقت گزرتا گیا۔ میں ہر چیز سے بیزار ہو گیا۔ یہاں تک کہ شادی سے ڈرنے لگا۔ ان لوگوں سے بھی خوف کھاتا جو خسر بنتے بنتے بال بال بچ گئے۔ ہر رات سونے سے پہلے اس قسم کی دعا مانگتا —— کہ اے پروردگار! میرے حال پر رحم فرما۔ رشیدہ کی کہیں شادی کر دے، نرگس بخت غفور کی کہیں منگنی ہی ہو جائے، مس ریتا معراج الدین اور ڈوروتھی فتوبل کا بھی کہیں انتظام کرا دے"۔

"لیکن اس کا بورژوا ہونے سے کیا تعلق ہے؟ کاش کہ موضوع بدل جائے" خورد جو اتنی دیر میں ڈکشنری دیکھ چکا تھا بولا۔

"بہت اچھا۔ اس سفر میں ایک چیز باقی رہ گئی ہے۔ تجھے یاد ہو گا کہ الف لیلہ کے سندھ باد کی ملاقات تسمہ پیر سے ہوئی تھی جس کے چنگل سے بڑی مصیبتوں کے بعد نکلا تھا۔ میرا بھی

ایک ایسے ہی مسخرے سے واسطہ پڑا۔ سفر سے لوٹتے وقت میں ایک بندرگاہ پر اُترا۔ جہاں بندر ہی بندر تھے۔ وہاں ایک انشورنس ایجنٹ میرے پیچھے لگ گیا۔ ایسا تعاقب کسی نے کسی کا نہ کیا ہوگا۔ چوبیس گھنٹوں میں وہ فقط چار گھنٹے مجھے چھوڑتا ورنہ ساتھ رہتا۔ اس سے دور رہنے کے لیے میں نے کیا کیا جتن نہ کیے۔ منت ساجت کی۔ ڈرایا دھمکایا، آخر تنگ آ کر خودکشی کی دھمکی۔ تس پہ وہ بولا کہ میں بھی ساتھ خودکشی کرلوں گا اور پالیسی دینے کے لیے اگلے جہاں تک پیچھا نہ چھوڑوں گا۔ جب میں نے سچ مچ پستول دکھایا تو بولا

''اے مردِ نیک خصلت! اگر تو واقعی خودکشی کر رہا ہے تو پالیسی مُفت لے لے لیکن وارث مجھے بنا جا!''

مجھے اتنا غصہ آیا کہ خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا اور سیدھا کباڑی بازار میں الف لیلہ کا قدیم نسخہ مطالعہ کرنے گیا تاکہ کوئی ترکیب نکالوں۔ سندباد نے اُس مردِ نابکار کو انگوروں کی شراب پلا کر مدہوش کیا تھا لہذا میں نے اسے بادۂ افرنگی پلایا۔ لیکن اثر اُلٹا ہوا، پی کر وہ اپنے تئیں ہوش میں نہ رہا۔ کچھ دیر واہی تباہی بکتا رہا پھر اس حقیر کو خُوب زدوکوب کیا۔ بے حد حیران ہوا کہ خود اپنے ہاتھوں اسیرِ دام بلا ہوا، خود گرفتارِ سحرِ ستم ہوا۔

جب اگلے روز وہ مجھے سڑک پر ملا تو شرما کر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس کے بعد جب کہیں ملتا خجل ہو کر رہ جاتا۔ خیر اس طرح میری نجات ہوئی۔ لیکن الف لیلہ سے عقیدہ اٹھ گیا''۔

''گستاخی معاف''۔ خورد بولا۔ ''شروع سے اب تک جو واقعات آپ نے اب تک سنائے ہیں بالکل الل ٹپ ہیں۔ غالباً آپ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ پتہ نہیں آپ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں آپ کا یہ سفر بھی بے کار رہا''

''مگر تو نے مجھے بار بار ٹوکا بھی تو ہے۔ شاید ایک دن میں دو سفر سن کر تو اُکتا گیا ہے۔ اب آئندہ تجھے ایک لفظ نہ سناؤں گا۔ جب تک تُو ہونٹ سی لینے کا وعدہ نہ کرے''۔

''کس کے ہونٹ؟ آپ کے؟''

''نہیں اپنے''۔

اور وہ دونوں خنداں ہوئے۔ فرحاں ہو کر شک و شبہات دور ہوئے، دل صاف ہوئے اور جہاز بادکلاں کا چوتھا سفر تمام ہوا۔

اگلے روز جب شاہباز نجوم نے آفتاب پر جال پھینک کر شکار کیا، سپاہ انوار کو شکست ہوئی، ظلمت کی حکمرانی ہوئی۔ تب جہاز باد خورد حاضر ہو کر بولا

"یا استاد کلاں! اپنا پانچواں سفر بیان کر کہ میں دو روز تک تیرے ہاں قیام کروں گا۔ اپنی گھڑی بھی کسی کو دے آیا ہوں اور دو دو بوتلیں ساتھ لایا ہوں اب مجھے سماعت کے لیے تیار سمجھ"۔

جہاز بادکلاں نے یوں کلام کیا۔

جہاز بادسنجمی کا پانچواں سفر

"دل دکھایا کسی گلچیں نے کوئی گل توڑا
باغ سے نالۂ بلبل کی صدا آتی ہے"

اس پر خورد پھر بول اٹھا

"بھائی ایک صلاح ہم دیں گے وہ یہ کہ آپ آئندہ ایسے اوٹ پٹانگ اور بے محل شعر کم از کم اپنے محل میں نہ پڑھا کریں۔ اب تک جو اشعار حضور نے پڑھے۔ ان کا قصے سے کوئی سروکار نہ تھا"

"اے نوجوان بلند بخت! اعتراض کرنا تیری سرشت میں ہے۔ یہ اشعار میں نے روایات قدیم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پڑھے۔ پرانے زمانے میں دستور تھا کہ داستان کوئی اشعار کے بغیر نامکمل تھی۔ اسے محض رواداری سمجھ — رواداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے"۔

"رواداری نہیں — وفاداری بشرطِ استواری"۔ خورد نے لقمہ دیا۔

"اچھا بابا وفاداری سہی۔ لیکن واسطہ ہے تجھے اپنے پیر کا — اگر تیرا پیر ہے تو — تو خاموش رہ۔ آج کا سفر بالکل مختصر ہے اور غالباً آخری سفر ہوگا۔ لہذا آج کی رات ساز درد نہ چھیڑ۔

سُن! میں زیادہ دیر بورژوا نہ رہ سکا۔ لوگ اس لفظ کے نہ ہجے کر سکتے نہ صحیح تلفظ کسی کو آتا تھا۔ بار بار معنے پوچھتے۔ ادھر میری کار بھی بک چکی تھی۔ سوچا کہ ذہنی ارتقا کی منزلیں طے کرنے کی غرض سے یہ سفر شروع کیے تھے ورنہ کافی ہاؤس بُرا نہ تھا۔ چنانچہ پھر باہر نکلنے کی ٹھانی۔ موسم گرما

گزارنے کے لیے سانگلہ ہل کا رُخ کیا کہ اسی بہانے بڑے بڑے آدمیوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ وہاں نہ جانے کیا ہوا کہ خیالات اس ناچیز کے دفعتہً بدل گئے۔ غالبًا یہ اونچے طبقے کی صحبت کا اثر تھا کہ خاکسار منزلیں مارتا کہیں کا کہیں جا نکلا۔ آخر کار اس جگہ پہنچ گیا جہاں تُو مجھے آج دیکھ رہا ہے۔ اب میں بالکل بے نیاز ہوں، کسی کی پروانہیں کرتا۔ مطلب ہو تو خیر ورنہ کسی کی مدد نہیں کرتا۔ کسی کو خط نہیں لکھتا۔ لوگوں سے تب ہی ملتا ہوں اگر کوئی کام ہو۔ بلا غرض کسی کو مدعو نہیں کرتا۔ نہ زیادہ سوچتا ہوں نہ محنت کرتا ہوں۔ بھلا دنیا کے جھمیلے آج تک کسی سے ختم ہوئے ہیں جو میں اور تُو انھیں ختم کر سکیں گے۔ ہر قسم کی تقریر و تحریر سے اعتبار اٹھ چکا ہے۔ پڑھنا، لکھنا، ملنا، جلنا، یہ سب بے کار باتیں ہیں۔ شہزادیوں کی متواتر بے وفائی سے شادی میں بھی دلچسپی نہیں رہی۔ بچوں کی سماجی حیثیت پالتو جانوروں پرندوں کی سی ہے، دو تین سال کھیلو پھر بڑے ہو جاتے ہیں اور ماں باپ کو بیوقوف سمجھنے لگتے ہیں۔ میرے پڑوسیوں نے میرے نظریوں کی اشاعت میں بڑی مدد دی ہے۔ آ تجھے بھی قدرت کا تماشہ دکھاؤں"۔

یہ کہہ کر وہ خورد کو دریچے تک لے گیا۔ کواڑ کھولنے کی دیر تھی کہ دوسرے گھر سے چیخم دھاڑ سنائی دی۔ کئی بچے بڑی بھیانک آواز میں چلا چلا کر رو رہے تھے۔ خورد نے کانوں میں انگلیاں ڈالیں تو کلاں نے دریچہ بند کیا۔

"اے میرے دوست! جب کبھی مجھے گھر بسانے یا آئندہ نسل کے متعلق خیال آتا ہے تو فوراً یہ دریچہ کھول کر بیٹھ جاتا ہوں اور عبرت حاصل کرتا ہوں اور پھر اگلی نسل کی مجھے پروانہیں، جس روز میں اس جہاں سے رخصت ہوا، وعدہ کرتا ہوں کہ بچوں کو خاندان کا نام روشن کرتے دیکھنے دوبارہ ہرگز نہیں آؤں گا۔"

"افوہ!۔۔۔ چچ۔۔۔ چچ۔۔۔ یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا۔" خورد نے اظہار افسوس کیا

"اب میں Nehilist ہوں، نی ہلسٹ!" کلاں نے اپنے سینے پر مکّوں کی بارش کرتے ہوئے کہا "خبردار جو اس لفظ کے معنی پُوچھے ہیں تو۔۔۔ اور اے مردِ جلد باز! میرے پانچوں سفر تمام ہوئے آفیشلی (Officially) مجھے سات سفر کرنے چاہیے تھے لیکن دنیا کے حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پانچ کافی ہیں۔ ویسے بھی محسوس ہو رہا ہے کہ ذہنی تگ و دو میں اپنی منزل میں نے پالی ہے،

میرا مقام مجھے ہاتھ آ گیا ہے اور تو جو یوں بے وقوفوں کی طرح دیکھ رہا ہے اگر چاہے تو بقیہ دو سفر تو کر آ۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

"جی نہیں۔ ایسے ماحول اور ایسا محل چھوڑنے کو کس کا جی چاہتا ہے۔"

"یہ محل میرا ہے۔ الاٹ شدہ ہے۔ شروع شروع میں خاکسار نے اخباروں، رسالوں میں بڑے دردناک بیانات چھپوائے کہ میں ایک ادبی اکادمی کھولنا چاہتا ہوں۔ پبلک نے زبانی حوصلہ افزائی تو بہت کی لیکن چندہ کسی نے نہ بھیجا۔ دراصل پبلک بڑی ہوشیار ہو گئی ہے۔ فوراً سمجھ جاتی ہے — (سرگوشیوں میں) اے رفیقِ تنہائی! یہ اکادمی کا ریکٹ چل جاتا تو دولت کا ڈھیر لگ جاتا اور برخوردار! تیری پوسٹ وار پلین (Post War Plan) کیا ہے؟ نوکری کے لیے اپنا نام رجسٹر کروایا"؟

"نام رجسٹر تو نہیں کرایا لیکن جس محلّے میں رہتا ہوں وہاں چوہے بلّیاں اور کتے بہت زیادہ ہیں، سوچ رہا ہوں کہ وہاں ایک چینی ریستوران کھول لوں"۔

"اس سے تو یہ بہتر ہے کہ میرے ساتھ شرکت کر۔ تُو کافی فرماں بردار نوجوان نظر آتا ہے کہ کام تجھے کوئی خاص نہیں ہے۔ تیری بلند پیشانی کو دیکھ کر میرا موڈ یک لخت ادبی و علمی ہو گیا ہے"۔

"یہ بلند پیشانی نہیں گنجے پن کی پہلی نشانی ہے"۔

"ایک بے بہا تُو نے کیوں کر پایا؟"

ایک دو مرتبہ سول سروس کے مقابلے میں شرکت کی تھی"۔

"اخاہ! پھر تو تُو یورینیم میں تولنے کے لائق ہے۔ پہلے اپنی ہیئت کذائی ٹھیک کر۔ حجامت کرا، عینک بدل، ہر ہفتے غسل کیا کر اور ہر روز شیو، کپڑوں کو دھلوا کر استری کرایا کر"۔

"کہیں مجھے انٹلکچوئل اپنی برادری سے نہ نکال دیں۔"

"تو کیا ہوا؟ خیال ہے کہ چند شرفاءِ ذی مرتبہ کو خوش کرنے کے لیے ایک بلند پائے کا معیاری رسالہ جاری کروں۔ ویسے کام دوسرے لوگ کریں گے لیکن نام ہمارا ہوگا۔ کیا ارادہ ہے۔"؟

"خاکسار آمادہ ہے"۔

"اب جب کہ تو نے سب کچھ سن لیا ہے بتا کہ تو بھی کبھی ایسی کٹھن منزلوں سے گذرا؟ کبھی ایسی مصیبتیں تجھ پر بھی پڑیں"؟

خورد نے کلاں کا ہاتھ پکڑا اور آنکھوں میں آنسو لا کر بولا

''آپ واقعی بڑے مصائب سے دوچار ہوئے، صبر اختیار ہوئے۔ اب آپ حظ اٹھائیں۔ دل کھول کر کھائیں اور کھلائیں۔ خدا کرے تمام عمر شاد رہو فائز بمرام و باثمر اور رہو''۔

اس پر جہاز بادسندھی کلاں نے خورد کے سر پر دستِ شفقت پھیرا، اس کا رتبہ اور بھی بڑھایا۔ جب تک زندہ ہے۔ دو جان اور دو قالب ہو کر رہے۔

خالق زمین و زمان، آفریندۂ ہر دو جہاں، کارسازِ مُطلق، قادرِ برحق کا ہر حال میں شکر ادا کرنا چاہیے....

....کہ بندوں کو کیسی کیسی مصیبتوں سے بچاتا ہے۔ گاڑھے وقت میں اسی کا فضل آڑے آتا ہے۔

نتیجہ:

پس اے پیارے بچو! نتیجہ اس کہانی سے یہ نکلا کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر کہانی سے نتیجہ نکلے۔

(ابن انشا)

اردو کی آخری کتاب

ایک سبق گرامر کا

لفظوں کے الٹ پھیر کے علم کو گرامر کہتے ہیں۔ لفظوں کا مجموعہ جملہ کہلاتا ہے۔ یہ مجموعہ زیادہ بڑا اور لمبا ہو جائے تو اسے میر جملہ کہتے ہیں۔

اب چونکہ جملے بازی اور فقرے بازی لوگ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اس لیے گرامر کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہو گئی ہے۔

شاعری کی گرامر کو عروض کہتے ہیں۔

پرانے لوگ عروض کے بغیر شاعری نہیں کیا کرتے تھے۔ آج کل کسی شاعر کے سامنے عروض کا نام لیجیے تو پوچھتا ہے وہ کیا چیز ہوتی ہے۔ ہم نے ایک شاعر کے سامنے زحافات کا نام لیا ۔۔بولے خرافات؟ مجھے خرافات پسند نہیں۔ بس میری غزل سنیے اور جائیے۔

عروض میں بحریں ہوتی ہیں جن میں بعض بہت گہری ہوتی ہیں۔ نومشق ان میں اکثر ڈوب جاتے ہیں۔ اسی لیے احتیاط پسند لوگ شاعری اور عروض کے پاس نہیں جاتے۔ عمر بھر نثر لکھتے رہتے ہیں۔

لفظ اور صیغے

پرانے زمانے میں تذکیر وتانیث کے قاعدے مقرر تھے۔ قاعدہ یاد نہ ہوتو لباس اور بالوں وغیرہ سے پہچان ہو جاتی تھی۔ اب مخاطب سے پوچھنا پڑتا ہے کہ تو مذکر ہے یا مونث ہے اور بتا تیری رضا کیا ہے؟ اس کے بعد اس سے صحیح صیغے میں گفتگو کرتے ہیں یا ایران ہو تو اس کے ساتھ صیغہ کرتے ہیں۔

بہت سے واحد ایک جگہ اکٹھے ہوں تو جمع کے صیغے میں آجاتے ہیں۔ جمع کے صیغے میں تھوڑی احتیاط ضروری ہے خصوصاً جن دنوں شہر میں دفعہ 144 لگی ہوئی ہو۔ ان دنوں جمع نہیں ہونا چاہیے۔ واحد رہنا ہی اچھا ہے۔

فعل ماضی

ماضی میں کسی شخص نے جو فعل کیا ہو اسے فعل ماضی کہتے ہیں۔ کرنے والا عموماً اسے بھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن لوگ نہیں بھولتے۔

ماضی کی کئی قسمیں مشہور ہیں۔ سب سے مشہور ''شاندار ماضی'' ہے۔ جس قوم کو اپنا مستقبل ٹھیک نظر نہ آئے وہ اس صیغے کو بہت استعمال کرتی ہے۔

ایک ماضی شکیہ ہے جن لوگوں کا ماضی مشکوک ہو وہ ماضی شکیہ کی ذیل میں آتے ہیں۔ عموماً ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔

ماضی شرطی یا ماضی تمنائی۔ جن لوگوں نے ریس میں یا تاش پر شرطیں بد بد کر اپنا ماضی تباہ کیا ہو۔ ان کی ماضی کو شرطی کہتے ہیں۔ چونکہ ان لوگوں کی تمنا ہوتی ہے کہ اور پیسے آئیں تو ان کو بھی ریس میں لگائیں اس لیے شرطی اور تمنائی دونوں ماضیاں ساتھ ساتھ آتی ہیں۔

ماضی کی دو اور قسمیں ماضی قریب اور ماضی بعید ہیں۔ ماضی کو حتی الوسع قریب نہ آنے دینا چاہئے۔ جتنی بعید رہے گی اور جتنے اس پر پردے پڑے رہیں گے۔ اتنی ہی بھلی معلوم ہوگی۔ ماضی کا بعید رہنا مستقبل کے لیے بھی اچھا ہے۔

فعل مستقبل

جو لوگ آج کا کام ہمیشہ کل پر ٹالتے ہوں اس کے ہر فعل کو فعل مستقبل کہا جاتا ہے۔ میں یہ کروں گا، میں وہ کروں گا۔ فعل مستقبل ہی کی مثالیں ہیں۔ الیکشن وغیرہ کے دنوں میں ساری گفتگو

عموماً فعل مستقبل کے صیغوں ہی میں ہوتی ہے۔

فعل کی دیگر قسمیں

فعل کی بنیادی قسمیں دو ہیں۔ جائز فعل، نا جائز فعل۔ ہم صرف جائز قسم کے افعال سے بحث کریں گے کیونکہ قسم دوئم پر پنڈت کوکا آنجہانی اور جناب جوش ملیح آبادی مبسوط کتابیں لکھ چکے ہیں۔

فعل کی دو قسمیں فعل لازم اور فعل متعدی بھی ہیں۔ فعل لازم وہ ہے جو کرنا لازم ہو۔ مثلاً افسر کی خوشامد، حکومت سے ڈرنا، بیوی سے جھوٹ بولنا وغیرہ۔

فعل متعدی عموماً متعدی امراض کی طرح پھیل جاتا ہے۔ ایک شخص کنبہ پروری کرتا ہے۔ دوسرے بھی کرتے ہیں ایک رشوت لیتا ہے۔ دوسرے اس سے بڑھ کر لیتے ہیں۔ ایک بناسپتی گھی کا ڈبہ پچیس روپے میں کر دیتا ہے دوسرا گوشت کے ساڑھے بارہ روپے لگاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ دونوں اپنے فعل متعدی کو فعل لازم قرار دیتے ہیں۔ ان افعال میں گھاٹے میں صرف مفعول رہتا ہے یعنی عوام۔ فاعل کی شکایت کی جائے تو وہ فائل میں دب جاتی ہے۔

فعل حال

یہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے۔ اچھا حال اور برا حال۔ بیمار کا حال عموماً برا حال ہوتا ہے لیکن ان کے دیکھے سے جو منہ پر رونق آ جاتی ہے تو وہ سمجھتا ہے اچھا ہے۔

''ان'' حرف اشارہ ہے۔ یہ اشارہ محبوب کی طرف ہے۔ عزیز طالب علمو! تم اپنے محبوب کی طرف یا محبوب سے اشارہ کر سکتے ہو۔ لیکن اپنی ذمہ داری پر۔

ریاضی کے قاعدے

ابتدائی حساب

حساب کے چار بڑے قاعدے ہیں:

جمع، تفریق، ضرب، تقسیم

پہلا قاعدہ: جمع

جمع کے قاعدے پر عمل کرنا آسان نہیں

خصوصاً مہنگائی کے دنوں میں
سب کچھ خرچ ہو جاتا ہے
کچھ جمع نہیں ہو پاتا۔
جمع کا قاعدہ مختلف لوگوں کے لیے مختلف ہے۔
عام لوگوں کے لیے 1 + 1 = 1/2
کیونکہ 1/2 انکم ٹیکس والے لے جاتے ہیں
تجارت کے قاعدے سے جمع کریں تو 1 + 1 کا مطلب ہے گیارہ۔
رشوت کے قاعدے سے حاصل جمع اور زیادہ ہو جاتا ہے
قاعدہ وہی اچھا جس میں حاصل جمع زیادہ سے زیادہ آئے بشرطیکہ پولیس مانع نہ ہو۔
ایک قاعدہ زبانی جمع خرچ کا ہوتا ہے
یہ ملک کے مسائل حل کرنے کے کام آتا ہے
آزمودہ ہے

تفریق

میں سندھی ہوں تو سندھی نہیں ہے
میں بنگالی ہوں تو بنگالی نہیں ہے
میں مسلمان ہوں تو مسلمان نہیں ہے
اس کو تفریق پیدا کرنا کہتے ہیں
حساب کا یہ قاعدہ بھی قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے

تفریق کا ایک مطلب ہے منہا کرنا
یعنی نکالنا ایک عدد میں سے دوسرے عدد کو
بعض عدد از خود نکل جاتے ہیں
بعضوں کو زبردستی نکالنا پڑتا ہے

ڈنڈے مار کر نکالنا پڑتا ہے
فتوے دے کر نکالنا پڑتا ہے

ایک بات یاد رکھیے
جو لوگ زیادہ جمع کر لیتے ہیں
وہی زیادہ تفریق بھی کرتے ہیں
انسانوں اور انسانوں میں
مسلمانوں اور مسلمانوں میں

عام لوگ تفریق کے قاعدے کو پسند نہیں کرتے
کیونکہ حاصل تفریق کچھ نہیں آتا
آدمی ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے
ضرب
تیسرا قاعدہ ضرب کا ہے
ضرب کی کئی قسمیں ہیں
مثلاً ضرب خفیف، ضرب شدید، ضرب کاری وغیرہ
ضرب کی ایک اور تقسیم بھی ہے۔
پتھر کی ضرب، لاٹھی کی ضرب، بندوق کی ضرب
علامہ اقبال کی ضرب کلیم ان کے علاوہ ہے
حاصل ضرب کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ ضرب کس چیز سے دی گئی ہے یا لگائی گئی ہے۔
آدمی کو آدمی سے ضرب دیں تو حاصل ضرب بھی آدمی ہی ہوتا ہے۔
لیکن ضروری نہیں کہ وہ زندہ ہو۔
ضرب کے قاعدے سے کوئی سوال حل کرنے سے پہلے تعزیرات پاکستان پڑھ لینی چاہیے۔

تقسیم

یہ حساب کا بڑا ضروری قاعدہ ہے۔ سب سے زیادہ جھگڑے اسی پر ہوتے ہیں۔ تقسیم کا مطلب ہے بانٹنا۔

اندھوں کا آپس میں ریوڑیاں بانٹنا۔

بندر کا بلیوں میں روٹی بانٹنا

چوروں کا آپس میں مال بانٹنا

اہلکاروں کا آپس میں رشوت بانٹنا

مل بانٹ کر کھانا اچھا ہوتا ہے

دال تک جوتوں میں بانٹ کر کھانی چاہیے

ورنہ قبض کرتی ہے

تقسیم کا طریقہ کچھ مشکل نہیں ہے

حقوق اپنے پاس رکھیے

فرائض دوسروں میں بانٹ دیجیے

روپیہ پیسہ اپنے کیسے میں ڈالیے

قناعت کی تلقین دوسروں کو کیجیے

آپ کو مکمل پہاڑہ گر یاد ہو

تو کسی کو تقسیم کی کانوں کان خبر نہیں ہو سکتی۔ آخر کو 12 کروڑ کی دولت کو 22 خاندانوں نے آپس میں تقسیم کیا ہی ہے؟

کسی کو پتہ چلا؟

سوالات

(1) تفریق کے قاعدے سے دودھ میں سے مکھی نکالو۔

(2) آدمی ضرب مسلسل کی تاب کہاں تک لا سکتا ہے؟

(3) جو اندھے نہیں وہ بھی ریوڑیاں اپنوں ہی میں کیوں بانٹتے ہیں؟

ابتدائی الجبرا

یہ بھی ایک قسم کا حساب ہے چونکہ طالب علم اس سے گھبراتے ہیں اور یہ جبراً پڑھایا جاتا ہے۔اس لیے الجبرا کہلاتا ہے۔

حساب اعداد کا کھیل ہے۔الجبرا حرفوں کا۔ان میں سب سے مشہور حرف "لا" ہے۔ جسے لا لکھتے ہیں۔اس کے کچھ معنی نہیں بلکہ یہ ایسا ہے— کہ کسی اور لفظ کے ساتھ لگ جائے تو اس کے معنی بھی سلب کر لیتا ہے جس طرح لا مکاں۔لا دوا، لاولد وغیرہ۔بعض مستثنیات بھی ہیں۔مثلاً لاہور، لاڑکانہ، لالٹین، لالوکھیت وغیرہ۔اگر ان لفظوں کے ساتھ 'لا' نہ ہو تو ہور۔ ڑکانہ' لٹین اور لوکھیت کے کچھ معنی نہ نکلیں۔

آزمائے کو آزمانا جہل کہتے ہیں' لیکن الجبرا میں آزمائے کو ہی آزماتے ہیں۔اچھے خاصے پڑھے لکھوں کو نئے سرے سے اب ج سکھاتے ہیں بلکہ ان کے مربعے بھی نکلواتے ہیں۔

الجبرا کا ہماری طالب علمی کے زمانے میں کوئی خاص مصرف نہ تھا اس سے صرف اسکولوں کے طلبہ کو فیل کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔لیکن آج کل یہ عملی زندگی میں خاصا استعمال ہوتا ہے۔ دکاندار اور گداگر اس قاعدے کو زیادہ استعمال کرتے ہیں۔

جیسے لا اور لا اور لا

بعض رشتوں میں الجبرا یعنی جبر کا شائبہ ہوتا ہے۔جیسے مدران لا' فادران لا وغیرہ مارشل لا کو بھی الجبرے ہی کا ایک قاعدہ سمجھنا چاہیے۔

سوالات

(۱) لا کا مربہ ڈالو۔بوتل میں ڈالو گے یا مرتبان میں؟

(2) لالالالچند کو لا سے تقسیم کرو۔

ابتدائی جیومیٹری

جومیٹری لکیروں کا کھیل ہے۔علمائے جیومیٹری کو ہم لکیر کے فقیر کہہ سکتے ہیں۔دنیا نے اتنی ترقی کرلی۔ہر چیز بشمول سائنس اور مہنگائی کہاں سے کہاں پہنچ گئی لیکن جیومیٹری والوں کے

ہاں اب تک زاویہ قائمہ 90 درجہ کا ہوتا ہے اور مثلث کے اندرونی زاویوں کا مجموعہ 180 درجے سے تجاوز نہیں کر پایا۔ امریکہ اور روس اور ہر معاملہ میں لڑتے ہیں اس معاملے میں ملی بھگت ہے۔ ہم اپنے ملک میں اپنی پسند کا نظام لائیں گے تو اپنی اسمبلی میں ایک قانون بنوائیں گے چند درجے ضرور بڑھائیں گے۔ مستطیل بھی جیسی پرانے زمانے میں چورس ہوتی تھی ویسی آج کل ہے۔ کسی کو یہ توفیق تک نہ ہوئی کہ اس کے چار سے پانچ یا چھ ضلعے کر دے۔ ایک آدھ فالتو رہے تو اچھا تھا ہے۔ مغربی پاکستان کے ضلعوں میں ہم ردوبدل کرتے رہتے ہیں تو مستطیل وغیرہ کے ضلعوں میں کیوں نہیں کر سکتے؟

جیومیٹری میں بنیادی چیزیں ہیں: خط، نقطہ، دائرہ، مثلث وغیرہ۔ اب ہم تھوڑا تھوڑا حال ان کا لکھتے ہیں۔

خط

خط کی کئی قسمیں ہیں۔

خط مستقیم: یہ بالکل سیدھا ہوتا ہے۔ اس لیے اکثر نقصان اٹھاتا ہے۔ سیدھے آدمی بھی نقصان اٹھاتے ہیں۔

خط منحنی: یہ ٹیڑھا ہوتا ہے بالکل کھیر کی طرح۔ لیکن اس میں میٹھا نہیں ڈالا جاتا۔

خط تقدیر: اسے فرشتے پکی سیاہی سے کھینچتے ہیں۔ یہ مستقیم بھی ہوتا ہے۔ منحنی بھی اس کا مٹانا مشکل ہوتا ہے۔

خط شکستہ: یہ وہ خط ہے جس میں ڈاکٹر لوگ نسخے لکھتے ہیں۔ تبھی تو آج کل اتنے لوگ بیماریوں سے نہیں مرتے جتنے غلط دواؤں کے استعمال سے مرتے ہیں۔

خط استوا: یہ اس لیے ہوتا ہے کہ کہیں تو دنیا میں دن رات برابر ہوں۔ کہیں تو مساوات نظر آئے۔

خط کی دو اور قسمیں مشہور ہیں۔

۱۔ حسینوں کے خطوط: یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن میں دور بہت دور افق کے پار جانے کا ذکر ہوتا ہے جہاں ظالم سماج نہ پہنچ سکے۔ یہ تصویر بتاں کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔

دوسرے وہ جو حسینوں کے چہرے پر ہوتے ہیں اور جن کو چھپانے کے لیے ہر سال کروڑوں روپے کی کریمیں، لوشن پوڈر وغیرہ صرف کیے جاتے ہیں۔

ایک خط پرانے اردو شعرا کے معشوقوں کے چہرے پر آیا کرتا تھا جس کے بعد عاشق کو یہ دوسری قسم کے خط بلکہ رجسٹری لفافے آنے شروع ہو جاتے تھے۔ کسی شاعر کا شعر ہے: ع

اب جو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگا

2۔ متوازی خطوط: یہ ویسے تو آمنے سامنے ہوتے ہیں لیکن تعلقات نہایت کشیدہ۔ ان کو کتنا بھی لمبا کھینچ کے لے جایئے یہ کبھی آپس میں نہیں ملتے۔ کتابوں میں یہی لکھا ہے، لیکن ہمارے خیال میں ان کو ملانے کی کوئی سنجیدہ کوشش بھی کبھی نہیں کی گئی۔ آج کل بڑے بڑے ناممکنات کو ممکن بنا دیا گیا ہے۔ یہ تو کس شمار قطار میں ہیں۔

نقطہ (•)

نقطہ یعنی بندی پوائنٹ۔ یہ محض کسی جگہ کی نشاندہی کے لیے ہوتا ہے۔ جیومیٹری کی کتابوں میں آیا ہے کہ نقطہ جگہ نہیں گھیرتا۔ ایک آدھ نقطے کی حد تک یہ بات صحیح ہو گی لیکن چھ نقطوں سے تو آپ سارا پاکستان گھیر سکتے ہیں۔

دائرہ

دائرے چھوٹے بڑے ہر قسم کے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قریب قریب سبھی گول ہوتے ہیں۔ ایک اور عجیب بات ہے کہ ان میں قطر کی لمبائی ہمیشہ نصف قطر سے دگنی ہوتی ہے — جیومیٹری میں اس کی کوئی وجہ نہیں لکھی گئی جو کسی نے پرانے زمانے میں فیصلہ کر دیا اب تک چلا آ رہا ہے۔

ایک دائرہ اسلام کا دائرہ کہلاتا ہے۔ پہلے اس میں لوگوں کو داخل کیا کرتے تھے آج کل داخلہ منع ہے۔ صرف خارج کرتے ہیں۔

مثلث

تکون کے تین کونے ہوتے ہیں۔ چار کونوں والی بھی ہوتی ہوں گی لیکن ہمارے ملک میں نہیں پائی جاتیں۔ کم از کم ہماری نظر سے نہیں گزریں۔

مثلثیں کئی طرح کی ہوتی ہیں مثلاً عشق کی مثلث، عاشق، محبوب اور رقیب فلم میں بھی یہی مثلث ہوتی ہے لیکن وہاں ان تینوں کو پیسے ملتے ہیں۔ رقابت سے لے کر شادی تک فلم ساز کے خرچ پر ہوتی ہے۔

سوالات

(1) خط نستعلیق۔ خط استوا اور خط وحدانی میں کیا فرق ہے۔

(2) مثلث کے چاروں اضلاع برابر کیوں نہیں ہوتے؟

(3) سبزۂ خط پر کتنے پیسے کے ٹکٹ لگتے ہیں؟

(انور سدید)

غالب کے نئے خطوط

میری جان اظہر جاوید!

ناسازیِ طبیعت دبے ربطیِ اطوار، بطریقِ داغ بالائے داغ، آرزوئے دیدار دو آتش شرارہ بار اور ایک دریائے ناپیدا کنار — "تخلیقِ نامدار" کہ میرے لیے طرّۂ دستار اور دشمنوں کی آنکھوں میں خار ہے۔ بصد تزک و احتشام کل روز یہاں پہنچا۔ ورق ورق پر تمھاری محبت کی مہر کندہ اور لفظ لفظ میں خلوص کی بوئے جاں نواز بسی ہوئی ہے۔ تم بنامۂ غالب بخطِ جلی بصد شان چھاپتے ہو، خود داد دیتے ہو، دوسروں کو داد پر اکساتے ہو، گویا مجھے حیاتِ جاوید عطا کرتے ہو۔ فقیر غالب کا ہر بُن مُو تمھارے احسان کا شکر گزار ہے۔ یہ تمھاری مروّت کا نشان میرے پایانِ عمر میں ایک اور سہی!

میاں۔ تمھاری آشفتہ خیالی میں مجھے ہرگز شک نہیں، پر تم نے "اپنی بات" مسئلہ ہندستانی ادیبوں کا پھر کیوں چھیڑا۔ کیا میری بات دل کو نہیں لگی، اور جو چھیڑا تھا تو اس میں پیوند سلطان سبحانی کا کیوں لگایا۔ تم نے از راہِ احتیاط نام نہیں لکھا، پر میں سمجھتا ہوں کہ گوجرانوالہ کے شہر سے تم نے اکبر حمیدی کو اور بلدہ راولپنڈی سے احمد داؤد کو مخاطب کیا ہے اور نام جن مدیرانِ جریدہ کے صیغۂ اخفا میں رکھے ہیں وہ اول ڈاکٹر وزیر آغا اور دوم احمد ندیم قاسمی ہیں۔ اس قیافے پر داد دو یا مردود

ٹھہراؤ لیکن از برائے خدا اردو کے دیس میں غالب خستہ جان کا داخلہ بند نہ کرو، پر چند کہ تم نے مسئلہ اہل رائے اور اہل ادب کے آگے رکھا ہے اور ارادہ اس ذیل میں تمھارا عمل کرنے کا نہیں اور روش تم نے ان لوگوں کی اختیار نہیں کی جو دوسروں پر حرف زنی اور طعنہ زنی کرتے ہیں، مگر در پردہ بھارتی ادیبوں سے تعلقات بسلسلۂ ترقی پسند تحریک برقرار رکھتے ہیں۔ واللہ باللہ، تم یہ روش اختیار نہیں کر سکتے۔ پھر اس مسئلہ کو کیوں دہراتے ہو اور مجھ کو افسردہ کیوں کرتے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ سخت ناانصاف ہوں گے۔ وہ ادبا جو تمھاری اس تحریر سے افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے۔

میری جان! تمھیں حق حاصل ہے کہ تم اسے جملۂ معترضہ کہو، پر ماجرائے حقیقت یہ ہے کہ 'تخلیق' کے آنے سے تین طرح کی خوشی مجھے حاصل ہوئی، ایک تو یہ کہ تم نے مجھے یاد کیا، دوسرے بعد مدت مدید ممتاز مفتی کا افسانہ چھاپا کہ مجھ بوڑھے کھوسٹ کے لیے لیکوررانگلیہ سے زیادہ محرک و ملذذ ہے، تیسرے اس جریدہ میں برخوردار بیکار خالد احمد سے فقیر غالب کی موانست کا ذکر کیا۔

میاں! کیا سمجھے ہو، سب تلوقات اظہر جاوید و غالب کیوں کر بن جاویں۔ طعنۂ اغیار اپنی جگہ مگر ہماری دوستی تو جنم جنم کی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ

مصرع: پر یکے را بہر کار ساختند!

انت منا سوہنا۔ مصری میٹھی، نمک سلونا۔ کبھی کسی شے کا مزا نہیں بدلے گا۔ خوشۂ انگور کو لیکر پرچ جاؤ گے تو ہر خوشہ زعماؤ گے۔ سو یہ کیفیت عزیز خالد کی ہے۔ جس طرح ذوق و شام اسے دو دیلوں سے ملا ہے اسی طرح اس کے ظاہر و باطن کی پرتیں بھی الگ الگ ہیں!

اے بھائی! اخبار امروز سے اس کے اخراج پر میں چونکا نہیں تھا۔ دم تحریر یہ شعر زبان پر آگیا ہے۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہ شعر اگر آج لکھتا تو روئے سخن خالد کی طرف ہوتا اور اس میں کوچۂ امروز شامل کرتا۔ یہ تو ں کا مقسوم تھا اور ایک روز سامنے آنا تھا۔ اس کے طور اطوار روز اول سے ہی موجب پریشانی

تھے۔ مبارک احمد سے چھیڑ چھاڑ، انتظار حسین سے نوک جھونک، انشائیہ کی بحث میں خفگی، ڈاکٹر وزیر آغا سے تکرار، انور سدید پر دشنام، ضلع جگت، پھبتی، دشنام، مزاح اور ہزل میں حد فاصل عدم قائم، حفظ مراتب اور پاس ادب کا خیال نہیں۔ حضرت احمق پھپھوندوی مجھ سے ملتے ہیں تو دل کو مسوستے ہیں کہ ان کے فرزند اصلی نے ادیبان خطۂ لاہور سے نکتہ سنجی نہ پائی۔ صرف بوم مزاجی اکتساب کی۔ لاریب حلقۂ ارباب غالب میں میرا نام عزت و احترام سے لیتا ہے لیکن یہ سب ظاہر ہے کہ دفتر ''فنون'' میں پہنچتے ہی قلمی شورہ ہو جاتا ہے اور ایک سانس میں سو سو ملاقات بکتا ہے۔ تم بتاؤ یہ صحبت نیک کا اثر ہے یا تربیت غیر کا۔ وزیر آغا اور قتیل شفائی دونوں کو یک زبان نشانۂ دشنام بناتا ہے اور جو اس کا احوال لکھو تو نظر اس بات پر رکھو کہ اب مجھے اوس شخص سے خس برابر علاقۂ عزیز داری کا نہیں رہا۔ دلّی بھاڑ میں چلی گئی۔ حلقۂ ارباب غالب بھاڑ میں جائے گا تو کیا ہوگا! اللہ باقی، اللہ باقی!

بندہ پرور! میں تو بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی نہیں گنتا۔ سب کو عزیز رکھتا ہوں اور بھائی مانتا ہوں۔ خالد احمد اگرچہ ناہنجار ہے لیکن بنی آدم سے ہے اور اولاد حضرت احمق پھپھوندوی ہے گو امروز سے اخراج کے بعد شکل خاصی بگاڑ لی ہے پر صورت اب بھی آدمیوں جیسی ہے، تم اس تصویر پر نہ جاؤ جو راغب شکیب نے رسالہ ''اردو زبان'' میں چھاپی۔ یہ تصویر تو کسی اور عالم کی ہے۔ از راہ اخلاق اسے عزیز اور فرزند دلبند نہیں لکھا۔ یہ میرا طور، میرا طریقہ ہے۔ اودھر سے آدمیت نہ ہوئی تو کیا، اوس کو سمجھانا لغو، بے فائدہ بلکہ مضر ہے۔ نہیں بھائی! فقیر غالب کی روش یہ ہے کہ بدی کے آگے ڈھال نہیں بن سکتے تو نیکی کا راستہ نہ روکو۔ دن کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہ کہو۔ تم اسے سمجھاتے رہو۔ صراط مستقیم دکھاتے رہو اور جو وہ عظیم انسانوں کی محفل سے اٹھ کر تمھاری مجلس میں آ بیٹھے تو اسے عطیہ ایزدی سمجھو اور اپنے جو خرید سکوٹر کے پیچھے جگہ دو! ادھر میرا حال سنو! بایں ہمہ خفقان خالد احمد کی صورت دیکھے ایک زمانہ گزر گیا تھا، دل اداس و ملول تھا۔ بارے کل اخبار ''نوائے وقت'' میں اس کا نام پڑھا اور صورت دیکھی۔ بہ تقاضائے دل چوما، آنکھوں سے لگایا۔ عطاء الحق قاسمی سے ملو تو شکریہ ادا کر دو اور کہو گو کہ خالد احمد امروز بدر ہے اور کسی عہدۂ سرکار پر بھی فائز نہیں، پر حیلے بہانے ادبی ایڈیشن میں ہر جمعہ کو اس کا نام بھی مظہر الاسلام کے نام کے

ساتھ درج اخبار کرے۔فقیر غالب کی روح خوش ہوگی اور عطاء الحق قاسمی کوتقویت فن اور مقبولیتِ کالم کی دعا دے گی۔

حضرت! میں نے جو شکوہ کیا تھا وہ بے جا نہ تھا۔اس کی اطلاع عطاء الحق قاسمی کو بھی پہنچی۔تخلیق بعد میں اور کتاب ''روزنِ دیوار سے'' پہلے پہنچی۔چہرہ مہرہ دیکھا۔صاحب کتاب کو سرورق پر روزنِ دیوار سے جھانکتے پایا۔ہر چند دیاردتی میں عادتِ قبیحہ میں شمار ہوتا تھا۔مگر سنا ہے کہ لاہور میں عطاء الحق قاسمی نے اسے فنِ لطیف کا درجہ دے دیا۔اب ہر شخص اپنی ذات سے چشم پوشی کررہا ہے۔اور روزن سے دوسروں کی خلوت میں جھانک رہا ہے۔سبحان اللہ، واہ وا۔ورق الٹا تو اپنے محسن و مربی ادب پیشہ احمد ندیم قاسمی کی رائے پر نگہ اٹک گئی۔میاں! انھیں کیا سوجھی کہ مزاح کو شائستگی کی ضد قرار دیا۔تمھیں مبدٔ فیاض نے ذوقِ لطیف عطا کیا ہے۔مجھے بتاؤ جولب پر اک تبسم گلگوں تحریر پڑھ کر بے ساختہ کھل اٹھے تو تم اسے ناشائستگی کہو گے۔تمھارے نام میرے رقعات میں جو خندہ ہے وہ کیا خندۂ ناخوشگوار ہے۔اور رتن ناتھ سرشار اور جوالا پرشاد برق اور نواب سیر محمد آزاد کو کیا شائستگی سے علاقہ نہیں۔دور کیوں جاؤ۔شفیق الرحمٰن، پطرس بخاری اور ضمیر جعفری نے جو شگوفے کھلائے ہیں اور کرنل محمد خاں نے میرے اشعار سے جو لذتِ لطیف پیدا کی ہے، اس میں ہمدردانہ اندازِ نظر کا فقدان ہے؟ دوست نوازی اپنی جگہ۔واللہ باللہ احمد ندیم قاسمی کی اس رائے پر انگشت بدنداں ہوں اور تر بھون ناتھ ہجر اور عظیم بیگ چغتائی اور چراغ حسن حسرت اور عبدالمجید سالک سے منہ چھپائے پھرتا ہوں۔ہجو، پھکڑ پن، ریختی اور دشنام کو مزاح سمجھو تو یہ واقعی ناشائستہ ٹھہرے گا۔لیکن وہ مزاح جو میں نے لکھا ہے اور اب مشتاق احمد یوسفی لکھتا ہے، اس کا ذکر جو تم اپنے کالم ''کنارِ راوی'' اور ''محفل محفل'' میں کرو تو اسے ناشائستہ کہو گے؟

ریاض مجید نے لکھا ہے کہ اس نے رونمائی اس کتاب کی فیصل آباد میں کرنے کی ٹھانی اور صدر انور سدید کو چنا کہ کتاب پڑھے بغیر تبصرہ بے نظیر کرتا ہے، لاگ سے لگاوٹ پیدا کرتا ہے۔انور محمود خالد، احسن زیدی نے تقریظیں لکھیں، ایک دوسرے پر گویا سبقت لی۔صفاتِ عالیہ سے مزین اور انوارِ معنی سے منور۔پر یہ سب بیکار گئیں، کیوں؟ عطاء الحق قاسمی نے آخری وقت پر شرکت سے معذوری ظاہر کی۔اور منتظمین نے جو تعریف ان کے سامنے کرنی تھی وہ ان کی

پیٹھ پیچھے کرنی مناسب نہیں سمجھی۔ پر میں ابھی تک مشوش ہوں، تم پوچھو گے کیوں؟

جانِ غالب! ذرا پتہ کر کے بتاؤ کہ دبستانِ سرگودھا نے تقریباتِ نمود اور رسومِ نمائش ادبا کے خلاف جو شور مچا رکھا ہے اور راغب شکیب نے اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا مضمون ''اردو زبان'' میں چھاپا ہے۔ تو کیا یہ اس کا نتیجہ ہے؟ اور کیا عطاء الحق قاسمی جیسے مصنفین با تمکین بھی کتاب کی رونمائی اور تعریفِ بے جا سے برگشتہ خاطر ہو گئے ہیں، اس باب میں جو کچھ معلوم ہو بلا تاخیر مجھے لکھو، اگر نہیں تو عطاء الحق قاسمی نے یہ موقعہ زیبائش و نمائش کیوں ضائع کیا؟ یہ سوال میں تم سے کرتا ہوں۔

میری جان! ''روزنِ دیوار سے'' کی رونمائی بصد تزک و احتشام کرنے کا خیال مجھے بھی ہے۔ ایں جہانی منشی شیو نرائن آرام، جواہر سنگھ جواہر، نبی بخش حقیر اور بدر الدین فقیر کہ میرے دمساز و دمباز ہیں، اس پر اصرار کرتے ہیں۔ رائے ان کی میری نظر میں وقیع اور بامعنی ہے۔ کہ اس بہانے فقیر غالب کا بھی کچھ چرچا ہو۔ غزل میری ''نوائے وقت'' میں جگہ پائے، تصویر میری دور دور تک پہنچے۔ حسینانِ پاک مجھے تعریف سے سرشار کریں، عمر میری دو گنی ہو، چوگنی ہو، مزید تقاضا احباب کا یہ بھی ہے کہ گلزار و فا چودھری اور امجد اسلام امجد ہم رکاب کتاب و مصنف ہوں۔ خلد آباد کے لوگ انھیں دیکھنے کے لیے مشتاق ہیں اور جو یہ دونوں صاحبان فرخ مقام یہاں حور و غلمان کے درمیان قیام دوام فرمائیں تو چشم ما روشن دل ناشاد، ایک کمرہ کسی نہ کسی طرح کہ ملحق بہ غسل خانہ ہو ان کے لیے بہم کراؤں، ساقی و شرابِ طہور ہمہ وقت حاضر! بھائی! یہ بات میں نے تم کو بشرط اخفا لکھی ہے۔ تم عطاء الحق قاسمی سے بصیغۂ راز بات کرو اور تاریخ موزوں مقرر کر کے مجھے اطلاع دو تاکہ انتظام طعام و قیام بدرجہ اعلیٰ کروں اور تمھارے کالم میں داد پاؤں، نیز مرار جی ڈیسائی سے کہہ کر نام ان سب کا ناپسندیدہ شخصیتوں کے لسٹے سے خارج کراؤں۔

جمعہ کے دن آٹھویں ستمبر کو دو پہر کے وقت تلوک چند محروم میرے پاس تشریف لائے اور تمھارے فرستادہ ''نوائے وقت'' کے بہت سے پرچے مجھے دکھائے۔ ایک میں فرزندِ دلبند محروم جگن ناتھ آزاد صدر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی کشمیر کا خط در مدح عطاء الحق قاسمی دیکھا۔ ایک پرچے میں جوش ملسیانی الموسوم بہ پنڈت لبھو رام کی باتیں چھپی تھیں۔ امرتسر کی صاحب جمال

خاتون کلدیپ کلپنا نے تحسین کا نیا انداز نکالا۔ایک بیت جو درج ذیل ہے بطریق خود سپردگی بخط گورمکھی لکھ کر پاکستان بھیجا۔

بچھڑ کے تجھ سے ملے اور بھی تجھ ایسے لوگ
مجھے یہاں کوئی تجھ سا دکھائی دیتا نہیں

ترجمہ اس کا سلیم رفیق نے راولپنڈی سے کیا۔علیم ناصری نے لاہور سے،بیگم مقبول ربانی نے گوجرانوالہ سے اور میاں غلام باری نے گجرات سے بھیجا۔تب کھلا کہ یہ شعر تو عطاءالحق قاسمی کا اپنا ہے۔تفصیل اس قصے کی بھی انھوں نے اپنے قومی اخبار میں چھاپی۔دل خوش ہوا کہ شہرت عزیز کی کا جھنڈا اکناف ہند میں گڑ گیا۔جتنیں اس کی زبان زد زنانِ ہند اور فن اس کے کا لفظ لفظ بیرونِ ملک قیمت گراں پا رہا ہے،پھر انعام الحق جاوید نے کیوں لکھا کہ عطاءالحق قاسمی بیرونِ ملک اچھی شہرت کے حامل قرار نہیں پائے۔بھائی! میں یہ معمہ نہیں سمجھ سکا۔اور جو تم پر کھلا ہو تو بلا کم و کاست مجھے لکھو۔

سنو! صوبہ اودھ اور بہار کی تمام مال و متاع و زر گوہر کی لوٹ پنجاب کے احاطے میں گئی ہے۔ان میں میرا فرزند دلبند سراج منیر بھی شامل ہے۔شاعر،افسانہ نگار،غزل گو اپنی شخصیت کی نفی تحریر میں کرتے ہیں۔یہ عزیز تقریر میں کرتا ہے،حلقہ ارباب ذوق ادبی ہو یا سیاسی اس کی تقریر کے بغیر رنگ نہیں پکڑتا۔تم نے درست لکھا کہ سراج منیر صاحب مطالعہ نوجوان ہے۔بہت پڑھتا ہے اور بیشتر ہضم بھی کر لیتا ہے۔پھر تم نے خواجہ زکریا کے بیان پر کیوں یقین کیا کہ سراج منیر جوشِ بیان میں غیر متعلق حوالے دے جاتا ہے اور غلط کتابوں کے نام بتا جاتا ہے۔میری دل شکنی ہوئی،سراج منیر کا حال کیا ہوگا،تم سے ایسی توقع نہ تھی۔میاں سنو! سراج منیر گفتار کا غازی ہے،زبان کی نرت سے بازی کھیلتا ہے۔بس اس کی داد دو۔یہ نہ دیکھو کہ کتاب کا نام یا حوالہ غلط اقتباس ہوا،مناظرہ،مباحثہ اور گفتگو حلقہ میں سب جائز ہے اور جو تمھارے شیشۂ خلوص میں اس کے بارے میں بال آگیا ہے تو اس کے علم و فضل اور عقل و دانش کی چہرت دور دور تک پہنچاؤ،عزیز الحق اور عارف امان اور محبوب الہٰ کی مسند پر اسے بٹھاؤ۔اسے نصیحت نہ سمجھو۔میرا حکم کہو کہ قلم تمھارا نصیحت پر اترا ہے اور یہ مجھے پسند نہیں۔

بھائی! تم نے سنا کہ گلزار وفا چودھری نے گندگی کا ٹوکرا اب عبدالعزیز خالد اور کشور ناہید پر پھینکا۔ عبدالعزیز خالد نے اس پر خط لکھا اور شکریہ ادا کیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اگلے ہفتے اس کی غزل ادبی صفحے پر شائع ہوئی۔ راولپنڈی میں قومی ادبی تحریک کا شاخسانہ اٹھ کھڑا ہوا۔ صدارت پہلے جلسے کی احمد ندیم قاسمی کو سونپی، مہمانِ خصوصی ڈاکٹر وزیر آغا کو بنایا لیکن دونوں حضرات بوجوہ جلسے میں حاضر نہ ہو سکے۔ جو لوگ وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کی باتیں سننے کے لیے گئے تھے ان کے پلے احمد فراز اور اختر امان پڑے۔ ارے بھائی! قومی ادب کے مسائل اب یہ لوگ سلجھائیں گے؟ ہیہات، ہیہات، اخبارات میں لکھا تھا کہ احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا دونوں نے قومی ادب کے مسئلے پر زبان بندی کر رکھی ہے۔ عدم شرکت جلسہ سے یہ بات بھلا کیسے نکلی، یہ ہوا اختر امان نے اڑائی ہے؟

اب کہ تم نے حورانِ پاک کی تصویریں نہیں چھاپیں۔ تخلیق اتنا پھیکا کبھی نہ ہوا تھا۔ اچھی تصویریں میرے لیے کحل البصر ہے۔ زنہار یہ کوتاہی کبھی نہ کرنا۔ اس وقت کوٹھری میں بیٹھا ہوں، ہوا آ رہی ہے، پانی کا جھجر دھرا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں، یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا۔ یہ باتیں کر لیں۔ اے لو وہ مولانا ماہر القادری آگے آگے اور طاہر فاروقی پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ ع اے آمدنت باعثِ خوشنودیٔ ما!

خط ختم کرتا ہوں۔ اللہ، اللہ، اللہ!

جمعہ 29 ستمبر 1978ء، 25 شوال 1938ھ

نجات کا طالب، سگِ دربارِ علی

اسد اللہ خاں غالب

(طغرل فرغان)

آبِ وفات

تمہید

ایک دن دوستوں سے خفا ہو کر بیٹھا مکھیاں مار رہا تھا کہ اچانک مکھی نے ناک پر بیٹھ کر مطلع عرض کر دیا۔

کیا سیکھتا ہے ظالم لطف و کرم کے بدلے
آخر تجھے ملیں گے ظلم و ستم کے بدلے

مجھے فوراً خیال آ گیا کہ میں واقعی بڑا ظلم کر رہا ہوں اور پھر یہ نہ بھی سہی تو مکھی مارنے سے کیا حاصل۔ اس سے بہتر تو یہی ہے کہ ادب ہی کی کچھ خدمت کر ڈالوں...... خیال آیا کہ ''مکھی نامہ'' لکھوں مگر پھر سوچا کہ ممکن ہے نقاد حضرات اسے موجودہ سماجی مسائل سے غیر متعلق چیز سمجھ کر مجھے دودھ کی مکھی ہی کی طرح ''دنیائے ادب'' سے نکال پھینکیں، اس لیے مناسب یہی معلوم ہوا کہ ''تذکرہ شعرا'' لکھ ڈالوں۔

اس سے پہلے بھی بہتیرے تذکرے لکھے جا چکے ہیں۔ جن کا مطالعہ کرنے سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ابھی تک سبھی ایک ہی لکیر کو پیٹتے چلے آئے ہیں...... کسی نے بھی چند مخصوص شعرا کے

علاوہ جنھیں زمانے کی کورذوقی نے خواہ مخواہ اُچھال دیا تھا کسی اور کا تذکرہ نہیں کیااور کرتے بھی کیوں کر جب کہ تحقیق وتجسس کا مادہ ہی نہ تھا......ایک نے دوسرے کا تذکرہ اٹھایا۔ اِدھر اُدھر زبان میں کچھ تبدیلیاں کیں اور ترتیب میں ردّوبدل کر کے دنیا کے سامنے پیش کردیا اور اس پر تمہید ایسی کہ پڑھنے والے افلاطون زماں سمجھ بیٹھے......کوئی میرجھکّن ہیں سنا ہے کہ انھوں نے بھی حال ہی میں کوئی نیا بکھیڑا کیا ہے......خودکوتذکرہ نویس کہہ کر شریفوں کی پگڑیاں اچھالتے ہیں......اللہ اللہ کیا زمانہ ہے کہ بلیے بقال بھی صاحبِ قلم کہلانے لگے......اور شریفوں کے منہ آنے لگے۔

خیر اس کا ماتم کہاں تک کیا جائے......یہ سب علامتیں قربِ قیامت کی دلیل ہیں۔ ابھی کیا ہے......کچھ دنوں بعد دجّال اونٹ پر سوار ہوکر آئے گا اور مصرعہ طرح تقسیم کر کے خاصی ہڑبونگ مچوائے گا! پھر یاجوج ماجوج آکر سب کو کھاجائیں گے......لہٰذا قبل اس کے کہ یاجوج ماجوج آکر سب کو کھا جائیں، میں اپنا تذکرہ مکمل کر کے یادِ الٰہی میں مشغول ہوجانا چاہتا ہوں تاکہ سند رہے اور وقتِ ضرورت پر کام آئے!۔

واضح رہے کہ میں اپنے تذکرہ میں صرف ان ہستیوں پر روشنی ڈالوں گا جن کو حلقہ بندی کی لعنت نے کبھی نہ اُبھرنے دیا......ان کو ایسی گہری تاریکی میں پھینک دیا جہاں کسی تذکرہ نویس کی نگاہیں نہ پہنچ سکیں۔

تذکرے کو شروع کرنے سے پہلے یہ بھی سمجھ لیجیے کہ میں خواہ مخواہ جائے پیدائش اور مقام وفات وغیرہ کے بکھیڑوں میں نہ پڑوں گا۔ اس کے لیے ایک موٹا سا اصول بتائے دیتا ہوں وہ یہ کہ ہر قدیم شاعر خواہ کہیں پیدا ہوا ہو دہلی ضرور پہنچا ہوگا اور اخیر عمر میں اسے لکھنؤ جانا پڑا ہوگا اور وہیں وفات بھی پائی ہوگی۔

تمہید ختم ہوئی اب ایسے ایسے صاحبان کمال کی آمد آمد ہے جنھوں نے گلزار اردو کو اپنے خون سے سینچ سینچ کر صحرائے نجد بنادیا!

شیخ پہلوان بخش مخنی

آبا واجداد منگولیا سے بغرض تجارت ہندستان آئے تھے۔ اکبر اعظم کا عہد زریں تھا...... اس لیے یہیں کے ہوکر رہ گئے......آپ کے آبا واجداد کا سلسلہ نسب براہ راست شیخ لندھور بن

سعدان سے ملتا ہے...... آپ کے بزرگوار صوفی منش آدمی تھے...... اس لیے ان کی شادی شیخ چغتائی کی صاحبزادی سے ہوئی۔ شیخ چغتائی عربی و فارسی کے ایک بلند پایہ شاعر تھے اس لیے ان کا طوطی بہت زور سے بولتا تھا اور نقار خانے میں اس کی صدا صاف سنائی دیتی تھی۔ شیخ پہلوان بخش مختی شروع شروع میں انھیں سے اصلاح لیتے رہے۔ ایک دن کسی بات پر برداشتہ خاطر ہو کر اپنی خالہ کے یہاں چلے گئے اور عرصہ تک ان کے دامن تلمذ سے بھی وابستہ رہے...... طبیعت میں حد درجہ تیکھا پن تھا اس لیے وہاں بھی نہ نبھی اور ایک دن اپنے خالو کو قلعہ جنگ کے داؤں پر لا کر جو مارا تو وہ چاروں خانہ چت گرے اور اللہ کو پیارے ہو گئے...... اس کے بعد میر شرافت علی پاکباز کے ہاتھ پر بیعت کی اور مرتے دم تک انھیں کا دم بھرے گئے۔

شیخ صاحب بھی اپنے والد ماجد کی طرح صوفی منش آدمی تھے اس لیے ہر وقت ان کے گرد ''طفلانِ پری رو'' کا جمگھٹا رہتا تھا۔ ''عشق مجازی سے عشق حقیقی تک'' پر ایمان رکھتے تھے...... اکثر فرماتے تھے کہ معشوق حقیقی تک پہنچنے کے لیے ایک عدد معقول قسم کے معشوق مجازی کی ہستی نہایت ضروری ہے...... عورتوں سے انتہائی نفرت کرتے تھے فرماتے تھے کہ یہی وہ عورت ہے جس نے آدم کو ورغلا کر معشوق حقیقی کی نافرمانی کرائی تھی بھلا اس کی وساطت سے کوئی اس تک کیوں کر پہنچ سکتا ہے۔

طبیعت کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ اکثر راہ چلتے پوری پوری غزلیں کہہ لیا کرتے تھے...... معمولی معمولی باتوں پر شعر ہو جانا تو کوئی بات ہی نہ تھی ایک دن بازار میں میانے پر سوار چلے جاتے تھے کہ اچانک عطار کے لڑکے پر نظر پڑی۔ چاند سا مکھڑا اس پر غضب یہ کہ لاپروائی اور الھڑپنے سے رخساروں پر زلفیں بکھیر رکھی تھیں...... دیکھتے ہی بے قابو ہو گئے...... سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا...... دیکھیے کیا موقع کا شعر کہا ہے ؎

ہائے ابر سیہ سر بازار
دل جو مچلا تو کیا کریں گے ہم

میانہ قد گندم گوں اور خس کھ آدمی تھے...... ڈیڑھ تھان کا پائجامہ اور تین تھان کا انگرکھا زیب تن فرماتے تھے...... جریب زیتونی کہ رفیقۂ حیات تھی کسی وقت جدا نہ ہوتی...... اکثر تفریحاً افیون سے بھی شوق فرمالیا کرتے تھے......۔

نمونۂ کلام انتہائی جستجو کے باوجود بھی نہ مل سکا جس کا افسوس ہے......اسی برس کی عمر میں ایک معشوق مجازی کے والدِ حقیقی کے ہاتھوں شہید ہو کر جنت الفردوس کو سدھارے......ابھی تک قطعۂ تاریخ وفات کی تلاش جاری ہے۔

میر تفضل حسین یتیم

میر تفضل حسین نام، یتیم تخلص فرماتے تھے......شرفائے نسیم آباد میں سے تھے......آباو اجداد محمد تغلق کے زمانے میں تبت سے آئے تھے......سرزمین ہند ایسی پسند آئی کہ پھر پلٹ کر نہ گئے......دربار شاہی میں بڑے بڑے عہدے حاصل کیے اور یہیں کے ہو رہے۔

میر تفضل حسین کو بچپن ہی سے شعر کہنے کا شوق تھا، چنانچہ نو برس کی عمر میں ایک مثنوی ''زورِ شباب'' کے نام سے کہی اور مشہور خلائق ہو گئے...... یہ وقت وہ تھا جب دلّی میں ایک سے ایک صاحب کمال موجود تھا......ایک طرف میر و مرزا کی چشمکیں تھیں تو دوسری طرف جانِ جاناں و آبرو کی چوٹیں تھیں...... یہ وہ زمانہ تھا جب کسی نہ کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنا سعادت جانتے تھے......چنانچہ میر یتیم بھی مرزا شباہت علی نمکین کے دامن تلمذ سے وابستہ ہو گئے۔

بے پناہ کہتے تھے......اور بات بات پر کہتے تھے۔ مشاعروں میں جب بھی شرکت کرتے تھے شش غزلہ اور ہفت غزلہ سے کم نہ کہتے اکثر تو ایسا ہوتا کہ مشاعرے کا آغاز و اختتام انھیں پر ہوتا۔ دوسرے شعرا منہ ہی تکتے رہ جاتے......یہی وجہ تھی کہ ان کے دوست کم اور دشمن زیادہ تھے۔ اسی دشمنی اور تعصب نے انھیں شاہی دربار تک نہ پہنچنے دیا۔

اس قسم کے دشمنوں کو نیچا دکھانے کے لیے آپ نے ایک غزل کہی تھی جس کا مقطع بڑی چھان بین کے بعد مل سکا ہے۔

پھونک دے گی تمھیں یتیم آہ
دل جلوں سےتم نہیں واقف

گٹھیلے جسم کے تنومند انسان تھے......فن سپہ گری، کشتی اور تیراکی میں ماہر تھے......گلا ایسا پایا تھا کہ دلی کی کنجڑیاں اور رمنیاں ان کی قسم کھاتی تھیں...... بہت ہی وضع دار بزرگ تھے امرود بکثرت کھاتے تھے......اکثر فرمایا کرتے تھے کہ امرود نہ ہوتا تو پھر ہم بھی دنیا میں نہ آتے۔

پچاسی برس کی عمر میں امرود کے درخت سے گر کر جاں بحق تسلیم ہوئے۔ کسی شاگرد نے قطعہ تاریخ وفات کہا جس کا آخری مصرعہ دستیاب ہو سکا ہے۔

شاعر امرود رخصت ہوگیا

نمونہ کلام کے لیے آپ کی کلیات خرید کر پڑھیے۔

سلام اللہ خان لذیذ

نام سلام اللہ خان، لذیذ تخلص...... آپ کے آبا و اجداد شاہان مغلیہ کی سرکار میں اچھے عہدوں پر فائز تھے...... آپ نے جب آنکھ کھولی تو خود کو سپاہیانہ ماحول میں پایا...... آپ کے والد ماجد نے لاکھ کوشش کی کہ آپ اپنے اجداد کے نقش قدم پر چلیں لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا...... جب آپ سات برس کے ہوئے تو باقاعدہ آپ کی بسم اللہ ہوئی اور اس کے بعد حافظ شرافت علی تلوار کے مکتب میں آپ نے کریما شروع کی...... استاد شاعر تھا اس لیے رواج کے مطابق آپ بھی شاعری میں دلچسپی لینے لگے۔ ایک عرصہ تک چھپ چھپ کر شاعری کرتے رہے آخر تا بکے ایک دن یہ راز افشا ہو ہی گیا! اس لیے مجبوراً آپ کو میر جھنگو کے دامن تلمذ سے وابستہ ہونا پڑا۔ کچھ دنوں کے بعد طبیعت اچاٹ ہوئی تو شیخ مرغ بخش تاریک کا دامن تھاما۔ پچیس سال کی عمر میں دربار تک رسائی ہوئی...... چونکہ اس درمیان میں استاد شاہ اتفاق سے رحلت فرما گئے۔ اس لیے آپ کو جلیل الشعرا کا خطاب عطا ہوا......۔

نہایت حاضر جواب اور بذلہ سنج بزرگ تھے۔

لطیفہ: ایک دن ڈیوڑھی سے سوار ہو کر محل سرا کی طرف جاتے تھے کہ راہ میں چھبیلی بھٹیارن کی دکان پڑی...... وہ انھیں دیکھتے ہی دوڑی...... آداب بجالا کر دست بستہ عرض کیا۔

''حضور کا اسم مبارک''؟

مسکرا کر فرمایا۔ ''مجھے سلام اللہ خان لذیذ کہتے ہیں۔''

بھٹیارن جھینپ کر چپ ہوگئی اور جملہ حضرات جو کہ ہم رکاب تھے ہنسی کے مارے بے حال ہوگئے...... ذہانت کا یہ حال تھا کہ بڑے بڑے صاحبانِ کمال ہر وقت لوہا ماننے پر تیار رہتے تھے...... ایک دن دربار میں حاضر تھے...... حضرت پناہ نے ان کی طرف اشارہ کر کے حاضر ین

سے کہا کہ بھئی سمجھ میں نہیں آتا کہ قطب مینار کیوں کر بنایا گیا۔ عقل سخت حیران ہے...... حضرت جلیل الشعرا سمجھ گئے کہ یہ ان کا امتحان مقصود ہے...... پہلے تو انکار کرتے رہے کہ کوئی اور یہی جواب دے مگر جب یہ دیکھا کہ سب کی عقلیں جواب دے گئی ہیں تو...... ریش مبارک پر ہاتھ پھیر کر فرمایا، "دلی نعمت سوال ایسا مشکل نہیں کہ عقل کو پیچ و تاب ہو...... عقلائے یونان تو کچھ اور کہتے ہیں۔ مگر میرے تئیں سب سے پہلے ایک بہت گہرا کنواں کھودا گیا پھر اسے الٹ کر اس پر اس قدر استرکاری کی گئی...... کہ قطب مینار ہو گیا"۔ یہ جواب سن کر جہاں پناہ اور تمام درباری انگشت بدنداں رہ گئے...... حاجب و دربان اس قدر روئے کہ شمال میں ہمالیہ پہاڑ اور جنوب میں بحر ہند کا قیام عمل میں آیا......

شعر پڑھنے کا انوکھا طرز ایجاد کیا تھا...... روٹھنے کا مضمون ہوتا تو شعر پڑھتے وقت اس بری طرح روٹھتے کہ سامعین کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا...... رقص کا مضمون ہوتا تو کھڑے ہو کر بھاؤ بتاتے...... اکثر گل و بلبل کے مضامین کے لیے گلے میں متعدد جھولیاں لٹکائے رکھتے تھے...... ادھر شعر پڑھ رہے ہیں اور ادھر دونوں ہاتھ جھولیوں میں گل و بلبل کی تلاش میں سرگرداں ہیں...... ایک ہاتھ سے بلبل نکالا اور دوسرے سے گل...... اور ایسا سماں باندھا کہ سامعین جھوم اٹھے...... ایک مشاعرہ میں غزل پڑھتے وقت اتفاق سے مضمون "تیر نظر" کا آ گیا...... کاندھے سے کمان اتاری۔ ترکش سے تیر نکالا...... چلے میں رکھ کر جو کھینچا تو میر مشاعرہ کے کلیجے کے پار تھا۔ دشمنوں نے کہا کہ بربنائے دشمنی ایسا کیا مگر اہل دل تاڑ گئے کہ معاملہ کچھ اور ہی ہے...... کسی دوسرے مشاعرے میں جب شمع ان کے سامنے آئی تو مطلع پڑھا......

دمک رہا ہے ان کا کھڑا شوخی کے انگاروں میں
ضبط کا خرمن پھونک رہے آگ لگے رخساروں میں

دوسرا مصرعہ پڑھتے وقت شمع اٹھائی اور قریب بیٹھے ہوئے ایک بزرگ کی ڈاڑھی میں آگ لگا دی...... ایک دوسری روایت ہے کہ لگائی نہیں صرف دھمکی دی تھی۔ مگر راقم الحروف کے نزدیک پہلا ہی بیان سچ معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اگلے وقتوں میں اس قسم کی باتیں آداب مجلس میں داخل تھیں...... اس وقت اساتذہ ایک دوسرے کی شان میں گالیاں نظم کرتے تھے اور اسے عیب نہ جانتے تھے......

ان دنوں میر نجابت علی کے مکان پر ماہانہ مشاعرے ہوا کرتے تھے...... وہاں صاحبانِ کمال کا اچھا خاصا جماؤ ہوتا تھا۔ یہ بھی کبھی کبھی صاحب مشاعرہ کے بے حد اصرار پر شرکت کرلیا کرتے تھے۔ ایک شب غزل پڑھتے پڑھتے جب اس شعر پر پہنچے ؂

عشق فنا کا نام ہے عشق کے ناز اٹھائے کون
اپنے پہ اے لذیذ کیوں نہ چھری پھیرلیں

تو دوسرا مصرعہ پڑھتے ہوئے بے ساختہ کرے خنجر کھینچ کر اپنا گلا ریت لیا...... انا للہ...... الخ

کسی نہ کسی شاگرد نے قطعہ تاریخ وفات ضرور کہا ہوگا۔ نمونہ کلام کے لیے کسی کتب فروش سے خط و کتابت کیجیے۔

بحمداللہ کہ پہلا حصہ بحسن وخوبی تمام ہوا اگر صاحبان عقل و دانش نے اسے سرمۂ چشم بصیرت بنانا منظور کیا اور فرمائش کی تو بہت جلد دوسرا حصہ بھی ہدیۂ ناظرین کروں گا۔

(احمد جمال پاشا)

آموختہ خوانی میری

(اردو کے ممتاز خود نوشت سوانح نگاروں سے معذرت کے ساتھ)

باتیں بنانا آسان ہوتی ہیں، بات میں بات پیدا کرنا اس سے بھی آسان، مگر باتوں باتوں میں اپنی تعریف کرنا مشکل ہوتی ہے، اور اپنے مطلب کی بات کہنا اس سے بھی زیادہ دشوار۔ میرا حال اس داستان طراز کا ہے جسے یاد نہیں کہ اس نے بات کہاں سے شروع کی تھی اور کہاں پر ختم کرنا ہے۔ گویا آج آپ کا سابقہ اس اناڑی لطیفہ گو سے پڑا ہے جو لطیفہ سنائے بغیر رہ بھی نہیں سکتا اور پورا لطیفہ سنا بھی نہیں سکتا۔ لہذا ہنسنا ہنسانا آپ کے ذمہ اور بھول چوک میرے۔

فرض کر لیجیے کہ میں ہندستان کے ایک بہت ہی اعلیٰ خاندان میں پیدا ہوا۔ بالفرض محال آپ "اعلیٰ ترین" نہ بھی تسلیم کریں تو لفظ "اعلیٰ" پر میں آخر دم تک اصرار کروں گا۔ یعنی یہ وہ افضل ترین ایشیائی خاندان ہے، جس کا سلسلۂ نسب باپ کی طرف حضرت آدم اور ماں کی جانب اماں حوا سے چل کر امت ابراہیمی پر ختم ہوتا ہے اور برادران یوسف کا یہ زلیخائی کارواں اگر ایک طرف اپنا سرا امام حسینؓ سے ملاتا ہے تو دوسری جانب جناب سیدہ سے اور ان خالص خوشبودار سیدوں کا خون ہندستان آتے آتے سیاہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ کالے سید جو حسب معمول سلاطین دہلی کی

متواتر درخواستوں پر مملکت ہندستان میں ظہور پذیر ہوئے تھے اور آتے ہی بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ خلعتِ اعزاز و جاگیر سے نوازے گئے۔ سلطنتوں کے عروج و زوال میں ہمیشہ ان کا بڑا دخل رہا۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ ان کا بھی زوال ہوا، کچھ پرانی حکومت کے وفادار ہونے کی وجہ سے جاگیروں کے ساتھ جان سے بھی گئے اور کچھ نئے حکمرانوں کے وفادار ہوجانے کی وجہ سے امپریل کاؤنسل اور برٹش پارلیمنٹ کے ممبر ہوئے، مقابلے کے امتحانوں میں کامیاب ہو کر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ پہلے والے وطن کی راہ میں شہید ہوئے اور بعد والے وقت کے ساتھ آگے بڑھے، آزادی کے بعد کچھ نے جا کر پڑوس کی باگ ڈور سنبھالی اور کچھ نے یہاں کی حکومت پر اکتفا کیا۔ ان میں سے بیشتر ہنر مند وزیر با تدبیر بنے اور حب الوطنی میں اپنا نام کر گئے۔ یہ سب میں نے اس وجہ سے بیان کیا ہے کہ اس سے ہمارے خاندان کے سیاسی وسماجی حالات و تاریخی پس منظر سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

اس عظیم الشان خاندان میں ہمارا گھرانا بھی شامل ہے۔ جس میں بیٹھے بیٹھے کھانے اور ''پدرم سلطاں'' کا رواج ہے بقول والد مرحوم ''تاریخ میں اگر کوئی قابلِ ذکر ہستی گزری ہے تو وہ کسی نہ کسی حیثیت یا تعلق سے ہم سے یا ہمارے خاندان والوں سے ضرور متعلق رہی ہے۔''

ہمارے گھرانے میں ہمیشہ سے مشاعرے، مناظرے، نوٹنکی اور بیت بازی وغیرہ کا رواج عام ہوتا جس میں بزرگوں سے لے کر دودھ پیتے بچے تک حصہ لیتے تھے۔

میں نے شیرخواری کے عالم سے وعظ کی محفلوں میں جانا اور سینما کے بہانے ان نشستوں میں شرکت کرنا شروع کر دی تھی، جہاں فلسفہ، حکمت، نجوم، ہیئت، رمل اور دوسرے علوم معقول و منقول پر بحثیں چھڑی رہتی تھیں۔ اس زمانے میں، میں شیشی کا دودھ پیتا اور علمائے کرام، اہلِ کمال و بڑے بوڑھوں کی صحبتوں سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ دنیا کے دوسرے بڑے لوگوں کی طرح میں بھی چھپ چھپ کر فلسفیانہ رسائل پڑھا کرتا۔

اس زمانے میں مجھے کروڑوں کی تعداد میں اشعار زبانی یاد ہو چکے تھے، بات بات پر شعر عرض کرنے لگا تھا۔ بلکہ اکثر آل انڈیا شاعروں سے گفتگو شعر و شاعری پر رہتی۔ اس زمانے کا آل انڈیا آج کل کے انڈیا سے بڑا اور بھاری بھرکم ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ اس میں موجودہ پاکستان کے

علاوہ برما اور سیلون بھی ہوا کرتے تھے، بعد میں لے دے کے سیلون رہ گیا اور وہ بھی تال وٹر کی حد تک۔ اگر اساتذہ میں سے کسی پر سرقہ یا توارد کا الزام عائد ہوتا تو وہ مجھ سے استفادہ کرنے کے لیے حاضری دیتا اور بامراد واپس ہوتا۔

پانچ سال کی عمر میں جب کہ ہمارے گھروں کے بچے کھلونوں اور غباروں کے لیے ضد کرتے ہیں۔ میں میونسپل پارک میں پتنگیں لوٹنے اور گلی ڈنڈا کھیلنے کے بجائے سیاسی جلسوں اور ادبی مباحثوں میں شرکت کرتا، تیسری جماعت میں جہاں درجہ کی پڑھائی اور کنگ ریڈر کی رٹائی میرے منہ کا ذائقہ خراب کر دیتی وہاں میں گلستاں، بوستاں و اخلاقِ ناصری سے لے کر اخلاقِ جلالی تک گھول کر پی چکا تھا، مگر ان کے اظہار کا موقع نہ پا کر بڑی گھٹن محسوس کرتا۔ عام طور پر میں بلا سبق پڑھے جماعت میں چلا جاتا اور اپنی باری پر پوری پوری کتاب مع صفحہ و سطر کے حوالے دے کر سنا دیتا۔ اکثر یہ بھی بتا دیتا کہ اس سبق میں بنیادی طور پر کیا خامی ہے اور اس کی کہاں تک ذمہ داری موجودہ طریقۂ تعلیم و نصاب کے ناقص ہونے پر ہے۔

چوتھی جماعت میں دوسرے مضامین کے ساتھ ساتھ صاحبِ دیوان شاعر بھی ہو چکا تھا اور ساتھ ہی ساتھ تمام اساتذہ کے دیوان کا حافظ بھی۔

بہ حیثیت طالب علم کے اسکول میں میرا کوئی ثانی نہ تھا۔ ہمیشہ اول پاس ہوتا۔ اسی زمانے میں، میں نے آفاقی ادب کے تمام قابل ذکر ناول اور فلسفے کی بیشتر اہم کتابیں چاٹ ڈالی تھیں۔ نتیجہ کے طور پر میری وسعتِ مطالعہ پھیل کر خود میرے لیے پیچیدگیاں پیدا کرنے لگی تھی۔ میری مثال اس پھل کی سی تھی جو اپنے وقت سے پہلے پک گیا ہو۔ یعنی بادی النظر میں ڈال سے زیادہ پال کا معلوم ہوتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے دوسروں کو مرعوب کرنے میں لطف آنے لگا۔ لہٰذا جو رعب کھا جاتا وہی میرا اہم نوا اور رَسیا ہو جاتا، یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اسی وجہ سے اپنے زمانے کے اہم ترین لوگ میرے مداح ہیں۔ اور جن سے میں خود نہ مل سکا وہ خود کسی نہ کسی بہانے آ کر مجھ سے مل لیے۔ یہ لکھتے وقت مجھے بری طرح وہ تمام بڑے لوگ بے اختیار یاد آ رہے ہیں جو میرے گرویدہ ہیں۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ ابھی میری مسیں بھی نہ بھیگی تھیں، مونچھوں کے کونڈے تک نہ ہوئے تھے کہ آفاقی ادب، ادیبوں و تحریکوں سے متاثر ہو چکا تھا۔ چھوٹا موٹا ادیب کو تو میں شروع ہی

سے خاطر میں نہ لاتا تھا۔ خصوصاً وہ لوگ جو نہ کسی اعلیٰ عہدے پر تھے نہ بہت اچھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے نہ بہت زیادہ خوش پوشاک بانکے طرح دار شخصیت و حیثیت کے مالک تھے۔ وہ جب اپنے آپ کو فن کار بتاتے تو میں سانس کھینچ لیتا، گم سُم ہو جاتا، اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کے لیے اور ان کو نظر انداز کرنے کی بڑی ہی کامیاب کوشش کرتا۔

اشراف کے سلسلے میں جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے میں نے ہمیشہ ان سے سیڑھیوں کا کام لیا۔ مثلاً جب مجھے صوبے کے وزیر اعظم سے ملایا گیا تو بہت سے سامریوں کو بھول گیا۔ مگر کچھ دن بعد پھر تائب ہوا اور گورنر صاحب کا کلمہ پڑھنے لگا جو ہمارے چانسلر بھی تھے اس کے بعد وائس چانسلر صاحب کو بھلا دینا قطعی فطری عمل تھا مگر وائس چانسلر صاحب مجھے نہ بھلا سکے لہٰذا میں نے انھیں بھی رام رکھا، کچھ دن بعد وہ رٹیائر ہو گئے اور ہر فانی چیز کی طرح انھیں بھی بھلا بیٹھا۔ ان کی خدمت میں میں نے جتنے سپاس نامے و تقریریں لکھی تھیں وہ سب مجھے اب تک حفظ ہیں۔ اس سلسلے میں وہ میرے بہت مداح و معترف تھے۔ اور ان کی وہ تعریفیں اس زمانے میں میرے بہت کام آتی تھیں۔

شاید ہی علم کا کوئی ایسا شعبہ اور فن کا ایسا خانہ ہو جس میں مجھے کمال کی حد تک عبور حاصل نہ ہو۔ اس کے باوجود میں قدرت کی طرف سے بڑی پر سوز شخصیت لے کر آیا ہوں۔ میں ہر اس واقعے سے انتہائی آبدیدہ ہو جاتا ہوں جس پر پبلک میں میری سنوائی کچھ اور زیادہ ہو جائے، خصوصاً بڑے آدمیوں کی موت، میرا عہد بڑے آدمیوں اور بڑائی سے رخصتی کا عہد ہے۔ میرے کتنے مداح، عزیز، احباب، حاکم یہ سب بڑے لوگ ایک ایک کر کے اس گنگا جمنی تہذیب کی بساط سے اٹھتے جا رہے ہیں۔ اور تعزیہ داری کے لیے اپنی خلوت گاہ میں میری وہی حیثیت رہ گئی جو شام غریباں میں ماتمی شمع کی۔

ایک بہت بڑے مفکر کا قول ہے کہ ”اپنے موقع پر سچ بولنا ناممکن ہے۔!“ میں کوئی میجک پروفیسر نہیں جو پبلک کو خوش کرنے کے لیے اور ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے شعبدہ بازی پر اُتر آؤں۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ اسی لیے میں ایک سرے سے جھوٹ بولتا چلا آ رہا ہوں۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں کہ میں سچ بول کر اپنے پول کھول دوں۔ یہ تو وہ زمانہ ہے جب کہ لوگ نجی خطوط بھی

تھوڑی سی شہرت پا جانے کے بعد بہت سجا بنا کر لکھنے لگتے ہیں تا کہ مرحوم ہو جانے کے بعد ان خطوط کے شائع کرنے میں وقت کم اور شہرت زیادہ ہو، یہ ٹھہری میری اپنی خود نوشت سوانح جو چھاپے جانے کے لیے لکھی جا رہی ہے۔ یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ کو میری خود نمائی کی عادت کو سمجھنے اور اس کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کا موقع مل سکے۔ کیونکہ یہی وہ حرکتیں ہیں جنھیں ہم مسلسل شعوری طور پر غیر شعوری بنا کر کرتے رہتے ہیں اور آخر میں سچ کی ابدی تاریخ میں اپنے لیے جگہ بنا لیتے ہیں۔

دوران تعلیم ایک دفعہ فرقہ وارانہ فساد ہو گیا۔ آپس کے تعلقات خاصے کشیدہ ہو چکے تھے اس بات کا میں نے اتنا اثر لیا کہ بیمار پڑ گیا، اور عرصہ تک بسم اللہ کے گنبد میں چاولوں پر قل ہو اللہ پڑھ پڑھ کر دم کرتا رہا۔ یہاں تک کہ دلوں کے بخار میری وجہ سے بڑی حد تک نکل گئے۔ البتہ میرے خاندان کے متعدد صلح پسند حضرات وخواتین اس صدمہ کی تاب نہ لا سکے اور اللہ کو پیارے ہوئے۔ مگر میں سخت جان تھا اس لیے بچ نکلا۔

کالج پہونچ کر آخر دم تک فیصلہ نہ کر سکا کہ میرے استاد اچھے نہ تھے یا میں خراب طالب علم تھا۔ ہر سال فیل ہو جانے کے باوجود دنیا کا تمام عظیم ادب گھول کر پی چکا تھا۔ کوئی شوق ایسا نہ تھا جو پورا نہ ہو چکا ہو، کوئی حسرت ایسی نہ تھی جو نکل نہ چکی ہو۔ سارے ''ازم'' میرے ناخنوں میں تھے، مگر گوتی پار کرنا میرے لیے معمہ بن کر رہ گئی تھی۔ اس کے باوجود میرا یہ عقیدہ راسخ ہو چکا تھا کہ جن استادوں سے میرا سابقہ پڑا ان سے پڑھ کر میرا علم گھٹ گیا جس کی وجہ سے بات کم کرنے لگا اور شاعری زیادہ۔

ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے جس کو ورثہ میں عظیم روایات ملی تھیں میں لکیر کا فقیر ہو گیا اور زندگی بھر ناک کی سیدھ پر چلنے کا عادی رہا۔ اس کا کچھ سبب تو یہ ہے کہ نہ تو اپنی زندگی کی وسیع شاہراہ پر گامزن رہنے کے لیے مجھے کسی پگڈنڈی سے گزرنا پڑا اور نہ کبھی اس گرینڈ ٹرنک روڈ پر کوئی کھانچا یا کھائی ملی۔

اب مجھے ان حقائق کی جانب آپ کو پھر متوجہ کر لینا چاہیے جن سے میری عظمت کے نقش آپ کے ذہن میں زیادہ واضح طریقہ پر اُبھر سکیں۔ مثال کے طور پر بچپن میں یا تو سر سید احمد خاں

کے ملازم کو جواب دینے پر گھر سے نکال دیا گیا تھا یا مجھے اس واقعے کی مماثلت کے بعد میں اور سر سید برابر ہو جاتے ہیں۔ مگر کچھ خوبیاں مجھ میں ایسی ہیں جن سے مرحوم محروم تھے۔ یہاں میں ان سے افضل و بہتر ہو جاتا ہوں۔ اگر اسی طرح آپ میرا موازنہ سر سید سے لے کر جدید ترین دور تک کی تمام اہم شخصیات واقعات سے کریں تو بار بار آپ پر یہ حقیقت واضح ہوتی چلی جائے گی کہ اس بر صغیر نے مجھ جیسا افضل و اشرف نہ مجھ سے کئی صدی قبل پیدا کیا اور نہ مجھ سے سیکڑوں برس بعد تک اس کی امید پائی جاتی ہے۔ حقائق آپ کے سامنے ہیں۔ بس پردہ اٹھانے کی دیر ہے اور یہی دیر میری بڑائی کی دلیل ہے۔

جیسا کہ بارہا عرض کر چکا ہوں قدرت نے شروع ہی سے جس فیاضی کے ساتھ میرے لیے مواقع فراہم کیے وہ لطفِ بیان سے خالی نہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاید ہی کوئی کام یا ادارہ ایسا ثابت ہو سکا ہو جو بغیر میرے کنٹرول کے اپنے ہنر دکھا سکا ہو۔ اور حاکم وحکومت جو خود سب سے بڑا ادارہ ہیں ان کی جا و بے جا سرپرستی کی وجہ سے میں شاید شمار کر کے نہ بتا سکوں کہ کتنے اداروں کی کار کردگی، دیکھ بھال، ترویج و اشاعت میرے ذمے آگئی، جن سے گریز میرے لیے ممکن نہ رہا۔ ہر چند کہ میں ذمے داریوں کی کسوٹی پر شروع سے پورا نہ اتر سکا۔ اس کے باوجود میری ذمہ داریوں کا حلقہ وسیع ہوتا گیا اور کامیابی دن دونی رات چوگنی میرے قدم چومتی گئی۔

میرے بچپن میں نوجوان، اساتذہ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور علم مجلس سے اپنا دماغ روشن کرتے تھے۔ میری نوجوانی میں اس بدعت کا چلن بگڑا اور پہلے تو اساتذہ مختلف سرکاروں، درباروں میں حاضری دینے لگے، بعد میں یہ رسم یہاں تک مقبول ہوئی کہ نوجوان بھی اُمراء کی ڈیوڑھیاں چومنے لگے، علم و ادب کے ایوان سونے ہو گئے اور شعر و ادب کی گونج کی جگہ بُوم کی ہاؤ ہو، نے لے لی۔ اس سے مجھے فائدہ ہوا اور میری افسری رنگ لانے لگی۔ نوجوان اور اساتذہ بھی ماتحتوں کے دوش بدوش حاضر ہوتے، داد سخن دیتے اور اپنا الّو سیدھا کرتے۔

نوجوانی کے ساتھ ساتھ فکر و نظر میں وسعت آئی، تازہ جہانوں کی سیر کے لیے مختلف مشینوں کے ساتھ مجھے مختلف ممالک کی سیاحت پر جانا پڑا۔ جانے کا طریقہ آسان تھا۔ جس ملک میں جانا ہوتا اس کے علمی و تہذیبی سرمائے پر صحافتی مضامین لکھتا اس کو عظیم ظاہر کرتا اور پھر اس کے

ساتھ اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کرتا۔ گرگٹ کی طرح ذرا بھی رنگ بدلتے ہی دعوت ناموں کی بھرمار ہو جاتی اور اس طرح ادب کی خدمت کے نت نئے مواقع فراہم ہو جاتے۔

میرے عہد کے ادیب عظمتوں کے جھگڑوں میں اپنے آپ کو اتنا الجھائے رکھتے تھے کہ سوائے عظمت کے ہر چیز ان میں مل جاتی تھی۔ پڑھنے لکھنے کی بیماری جو کبھی وبا کی شکل اختیار کر چکی تھی کم ہوتی جا رہی تھی۔ بڑے ادیب وہ ہوتے تھے جو بڑی باتیں بنا لیتے تھے۔ لکھنے سے زیادہ اپنے آپ کو منوانے اور ''ادب میں جمود ہے یا نہیں ہے؟'' قسم کی بحثیں چلوانے کا رواج عام تھا۔

اب خزاں کا دور دورہ ہے۔ ہر شے رخصت ہو رہی ہے۔ ان منتشر خیالات کو اس لیے یکجا کر رہا ہوں کہ وہ شخصیات و واقعات جن سے میں متاثر ہوا تھا اور میری شخصیت کی نشو و نما کو جنھوں نے ہوا دی وہ ماضی کی کتاب میں محفوظ ہو جائیں۔ عزت، دولت، شہرت، شخصیت اور ادب کی ان پرچھائیوں میں اگر آپ کو ہلکا سا بھی عکس نظر آ جائے تو اسے ''میں'' کی جھلک سمجھیے گا۔ یہی وہ ''میں'' ہے جس نے اوروں کی طرح مجھے بھی اپنی ''آموختہ خوانی'' پر مجبور کیا اور یہ چند سطریں لکھوائیں۔ اگر ان پر آپ ایمان لے آئے تو میں آپ کے ایمان کے بارے میں سوچوں گا، اور اگر نہیں لائے تو آپ کے تنقیدی شعور کے بارے میں۔

کپور ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

''جو ادیب طنز نگار ہیں اُن میں سے ایک آدھ سے مجھے بار بار ملنے کی خواہش ہوتی ہے۔ ان ہی میں سے یہ حضرت کپور بھی ہیں۔ کپور کی گرفت مجھ پر اس وجہ سے ہے کہ یہ ایک مزاح نگار ایک طنز نگار ہیں۔ اور اس سب کے باوجود ایسے ہیں جیسے کہ عام طور پر ہم آپ ہوتے ہیں۔ تنقید میں لوگ کبھی انھیں اچھا کہتے ہیں، کبھی بُرا۔ مجھے یہ دونوں باتیں ناپسند ہیں۔ آرڈی نینس (Ordinance) کسے پسند ہوتے ہیں۔ الٹی چیز سیدھی یا سیدھی الٹی نظر آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں مگر حیرت ضرور ہوتی ہے، کیوں کہ طنز کا تقاضہ ہے وہ یک رنگی میں ظرافت اور ظرافت میں یک رنگی پیدا کرے، مگر مجھ سے پوچھا جائے کہ اردو ادب نے ہم کو کیا دیا تو میں یہ تین نام لوں گا۔ غالب، اقبال اور کپور۔ غالب اور اقبال کی خطا اس وقت معاف کیجیے اور کپور کی بات کیجیے۔ جو طنز نگار اپنے قاری کو اپنا ہمراز و دمساز نہ بنا سکے وہ طنز نگار نہیں، مولوی یا لیڈر ہوگا؟ خود جل کر دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ کڑھنا اور ہنسانا وہ امتیاز ہے جو ان کے سوا کہیں نظر نہیں آتا۔ زمانے نے طنز نگاروں کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس لیے کہ طنز نگار خود زمانے کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ یہ بات ہمیشہ بھول جانی چاہیے۔ طنز نگاروں پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے یہاں وہ باتیں ثابت نہیں کرنی ہیں جو ابھی ابھی کہی گئی ہیں ان کے بہت سے مضامین ایسے ہیں جن پر خون خرابہ ہوسکتا ہے۔ خون زیادہ خرابہ کم، ایسے ہی مضامین پر میں سر دُھنا

کرتا ہوں۔ یہی تاثیر دلیری اور دلبری دونوں کا باعث ہوتی ہے۔ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے طنز کو ہمارا کلچر اور ہمارے کلچر کو طنز بنا دیا۔ طنزیات و مضحکات میں طنز کا یہ "تصرف دوام" مبارک سمجھا جائے یا نہیں، حیرت انگیز ضرور ہے۔ انھوں نے طنز کی وضاحت کی ہے امامت کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ یہ وہی طنز نگار کرسکتا ہے جس کی گرفت زندگی پر ہو نہ کہ وہ جو زندگی یا طنز نگاری کی گرفت میں ہو۔ اس گرفت میں کچھ ایسے آئے جیسے فلمی گانوں کے درمیان اور دوران میں پکے گانوں کا کوئی استاد وارد ہو جائے۔ کچھ ردو اور دو پانچ مانتے ہیں، ریاضی سے یہ لگاؤ دوسروں کو ناگوار ہو تو ہو مجھے گوارہ ہے۔"

(بہ طرز پروفیسر رشید احمد صدیقی)

"کچھ بڑے طنز نگار ہیں۔ ان کی ظرافت کا اجالا مانگے کا نہیں بلکہ درد داغ و سوز و ساز و جستجو کی شعبدہ بازی سے عبارت خیالوں کی لالہ کاری ہے۔ ان کے طنز کے غازے میں شعلے کی لپک، انبساط ذہنی کی چاندنی، شیریں دیوانگی، حدیث دلبری، افسانہ دفسوں کی آب و رنگ، انسانیت کے ساز پر خون جگر کی طلسم کاری سے دل کی دھڑکن بن کر ذہنی بیداری کا نشہ ہرن کرتی نظر آتی ہے۔ یہ آپ بیتی کو ستاروں سے آگے لے جاکر جگ بیتی کی طلسم بندی کے پیچ و خم سے بے وقت کی راگنی چھیڑ دیتے ہیں۔ اس ذہنی سفر کو عام طور پر چاندی کے سائے میں حقیقت کی کرنوں کی مدد سے طے کرتے ہیں۔ ان رنگین پناہ گاہوں میں ہمہ وقت مقدس آتش خانوں کی آگ روشن رہتی ہے۔ ہندی لے طاؤس و رباب کی مدد سے جس کو خالص عجمی سمجھنا چاہیے۔ اس بت ہزار شیوہ کے جلوۂ صد رنگ کی ماتمی لے کو پسی ہوئی بجلیوں کی مدد سے آئینہ تیار کرنے پر اکساتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر اس کے مزاج خانقاہی کی قندیل خودی، آئینہ عشوہ طراز کے نہ بناسکنے پر معذرت کرتی ہوئی چراغ سے چراغ روشن کر دیتی ہے۔ پھر یہ شمع ماتم خانہ اپنی شبنمی نگاہ کی زہرناکی سے مستوں کی پیاس بجھا کر ثابت کر دیتی ہے کہ ان برسے ہوئے بادلوں میں ابھی کتنی بجلیاں پوشیدہ ہیں جو پراسرار دھندلکوں میں کچلے ہوئے خوابوں کی بے رحم روشنی کی مستی کردار سے ایک لمحہ کی موسیقی بخش کر قاری کو جوئے شیر کا فرہاد بنا دیتی ہے۔ اس چشم تنگ کی کثرت نظارہ ان شیریں دھندلکوں میں جو تازہ خون جامد الفاظ کی چنگاریوں اور چمکتی ہوئی بجلیوں کی مدد سے بخش جاتی ہیں ان کی مدد سے یہ حضرت اپنے جذبات کی دوکان کے درو بام سجاتے ہیں۔ سماجی خیر کی یہ بغلی شر کے ساتھ جابجا

دھول دھپا کرتی نظر آتی ہے۔ جس سے قاری کے شوخ جذبات اور ناقد کے خندۂ تیغ اصل کے گریہ ابر بہار میں ایک ذہنی انقلاب پیدا ہوتا ہے۔

شیر پا تین سنگھ نے ایک جگہ بڑے پتے کی بات لکھی ہے ''ان کے طنز میں ظرافت کی تلاش ایسی ہے جیسے کہ گلستاں میں کانٹوں کی تلاش'' اگر چہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل غلط نہیں ہے۔ کیوں کہ ان کی ظرافت جب آسمانوں کی سیر کرتی ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ طنز کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ظرافت نگار ہیں۔ کیونکہ یہ بہت بڑے طنز نگار ہیں اور نہیں بھی ہیں یعنی ایک معنوں میں ہیں اس وجہ سے بہ حیثیت مجموعی ہم ان کو بہت بڑا طنز نگار کہہ سکتے ہیں۔ یہی وہ ذہنی دریچہ ہے جہاں ہنسی کے ساتھ فکر بھی پیدا ہوتی ہے اور شبہ ہوتا ہے کہ اس پُر شوکت دریا کی موجیں اس کی زنجیریں نہیں بنیں بلکہ رمز وایماء کے نشے کے سہارے ہلکی، نرم، شیریں ولطیف لہو کی دھار جوان کے طنز کے روزن در سے نکلتی ہے وہ اس نگار خانے کی تہذیبی مصوری کا جادو جگاتی ہے۔ اور اس ہفت سنگ دل کے جاگ پڑنے سے سرور چراغاں کی جو شوخ ومدھم فکر بیدار ہوتی ہے وہ اس کار گہہ شیشہ گری کے عیش امروز کے تاریک گوشوں کی عکاسی کرنے کے لیے بہت کافی ہے ان کی فکر فردا کی جوئے کم آب وہ آبِ حیات ہے جو بازار، خانقاہ اور دربار کے سرے ان کے طنز کے ڈانڈوں سے ملا دیتی ہے۔ اس تھرتھراتی ہوئی شمع پر ایسے آڑے وقتوں میں تنقید کی چاندنی، موسیقی کی مدھم پھوہار بن کر گرتی ہے اور شمع کی لو اور تیز ہو جاتی ہے''۔

(بہ طرز پروفیسر آل احمد سرور)

''کپور کی طنز نگاری ہمارے ادب کے تہذیبی سرمائے کے اُس سماجی اظہار سے منسلک ہے جو معاشی ومعاشرتی حالات اور میکانکی قوتِ نقد کے ارتقا کی جدوجہد، تخلیقی عمل اور جمود کے سماجی ٹکراؤ سے انفرادی پسندیدگی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ اس کا عمرانی مفہوم میرے نقطۂ نظر کے فلسفیانہ ربط اور اشتراکی حقیقت نگاری کی طبقاتی کشمکش کے اجتماعی شعور میں عام ہے۔ یہ ریاضیاتی تناسب اور مابعد الطبیعات کے لاشعوری تضاد کے بعد المشرقین میں مل جائے گی۔ کبھی کبھی یہ بُعد المغربین کی نامیاتی صورت میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ مگر یہ اجتماع ضدین مارکسی نقطۂ نظر سے قطعی غیر منطقی ہے کیونکہ اس کے مثبت ومنفی اثرات اپنے سطحی مفہوم کی توضیح کے لیے مروّجہ عصری روایات کی مادیت، ہیئت،

اور مواد کی گتھیوں میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔اس کے ساتھ ہی تاریخی جبریّت کی عینیت پرستی جو ادب برائے زندگی کی ترویج میں زمان ومکان کو اپنی گرفت میں لاکر رجعت پرستی کا تاریخی تجزیہ کرتی ہے، تاریخی مادّیت کے سماجی محرکات کی سطحی خارجیت کی داخلی کثافتوں سے آلودہ ہو کر اپنے مبہم مفہوم میں سماجی ڈھانچے کو پیش کرتی ہے۔ کپور کی واقعیت کا جامد تصور ان کے مزاحیہ نصب العین کی توجیہہ کر دیتا ہے۔طنز وظرافت کی یہی مادّی کشمکش سماجی نظام کی حکیمانہ پیروڈی پیش کرتی ہے۔اس سے سماجی پیچیدگیوں کے مافوق الفطرت مسائل پر روشنی پڑتی ہے اور بین الاقوامی بورژوا سماج کے مخصوص فلسفۂ حیات کی ذہنی کشمکش پرولتاری طبقے کے طبقاتی شعور کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔حاکم اور محکوم کی یہ کشمکش ان کے طنز کا نشانہ ہے۔'' (بہ طرز پروفیسر احتشام حسین)

طنز کپور کی فکر کا محور ہے۔ان کے طنز کے دھارے کو توڑا نہیں جاسکتا۔یہ ہمارے ادب کی غلام گردش میں مزاح کے دریچے سے در آئے ہیں۔ان کے جملہ مضامین کی کڑیاں ادب کی تاریخ سے ملتی ہیں۔مزاحیہ حقیقت کو گرفت میں لانا ان کے فن کا کمال ہے۔بنیادی طور پر اس حقیقت نے ادب کے اس یزدانی لمحہ کو پالیا ہے جس کو قدما دفن کر چکے تھے۔ادبی دور کی تشکیل اس ادبی حادثہ کو فراموش نہیں کرسکتی۔اس حادثے نے ظرافت کی منزل کا دائرہ تبدیل کر دیا۔انھوں نے متبذل میں پناہ لے کر پہلی بار نیا انداز بیان، نیا اسلوب، نیا پیکر، نئی تراش خراش اور نئے آہنگ سے پورے جمالیاتی رنگ وروغن کے ساتھ بنا سنوار اور نکھار کر پیش کیا۔اس گڑھنے اور بنانے میں جذبے کی گرمی، انھوں نے لفظی بازیگری سے پیدا کی ہے۔یہاں یہ اپنے پیش رووں کی طرح پیوندکاری کے ملبوس میں نظر نہیں آتے۔طنز کی روشنی ان کے خمیر میں پیوست ہے۔ان کے خارجی میڈیم سے احساس ہوتا ہے کہ تاریخ کا ورق الٹا جاچکا ہے۔

انھوں نے خاموش انقلاب کے ذریعہ ادب کی عاقبت سنواری ہے۔ذہنی حدبندی کے سانچے مسمار کر دیے ہیں۔توازن اور لچک کے تانے بانے سے خام مواد کی پرچھائیوں کو امیر کر لیا ہے۔مواد ان کے پاؤں کی زنجیر نہ بن سکا۔مگر یہ ادب کے پیر تسمہ پا ضرور بن گئے۔کیونکہ یہ آرزوؤں کے ہجوم میں کھو کر خبر بے کا گرہن نہیں لگاتے۔ان کی شخصیت کی نوک پلک بانکپن، بت تراشی کا انداز ہم کو ایک خیالی فردوس میں لے جاتا ہے۔جہاں بھاری بھرکم حقیقتوں میں مسائل کی انفرادی گونج

نثری پیکر میں ڈھل کر انبساطی شے بن جاتی ہے۔ جو مزاح پر طنز کی نمک پاشی کرتی ہوئی، ترقی پسند تحریک سے کہیں آگے بڑھ جاتی ہے اور ایک نئے نظامِ فکر کے مربوط خیر و شر سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس وقت رنگ آمیزی کی معنوی نقاب شفق کے روپ و رنگ میں اپنے پورے سماجی جلوؤں کے تمدنی پس منظر کے ساتھ آتی ہے جس میں یہ ذہنی مد و جزر کی مدد سے شطرنج کے نقشے افق انگیز خیالوں کے کھوکھلے گنبد کی ژولیدگیوں میں سجاتے ہیں اور موہوم تاروں میں ٹھکے ہوئے نظام کے سرسراتے ہوئے خیالوں کی پرچھائیوں کی جگمگاتی ہوئی قندیلوں کی چکور زدہ چاندنیوں میں اسیر کرنے کی کوشش میں حتی الامکان کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کا طنز ظرافت کی سوکن کو برداشت نہیں کرسکتا پھر بھی پرچھائیوں میں بات کرنے کے انداز کی موہوم لطافت ہم کو شیریں گھلاوٹ کی تگ و تاز میں احساس کی سرسراہٹ کا ہیولیٰ معلوم ہوتی ہے۔ کپور اپنے کرداروں میں جاہ و منصب کی تلاش بھٹکی ہوئی خودی کی مدد سے کرتے ہیں۔ اس وجہ سے انجانی منزل کی تلاش میں ستاروں پر کمند ڈال کر ہم کو فلسفہ کی گرانباری سے بچا لیتے ہیں۔ روشنی کے یہ مادی مینارے ہم کو ایک نئی بصیرت کی ادھوری سچائیوں سے ٹکرا دیتے ہیں۔ اس وقت ان کے فن کی بکھری ہوئی اکائیاں روایت کی زنجیر بن جاتی ہیں۔ اور تشکیک کے مدھم سائے ساعقہ بردوش گھوڑوں کی دلکی چال میں الغوزوں کی موسیقی بخشتے ہیں۔ اس ماورائی دھند میں ان کی نیابت فکر کا تاج، بے نمک کابوس کے جذباتی وفور کے مشینی، تمدن کی شوکت پاساں کے رنگ محل میں ایک پیغمبرانہ سطوت کے ساتھ نمودار ہوتا ہے اور ان کی انفرادیت کی کھنک، لہجہ کی گھن گرج، سمندروں کے زیر و بم، آتش فشانوں کے گیت ساربانوں کے نغمے، قوس و قزح کے مدھم رنگ ہمیں تخیل کے اس آذر کے سماوی تصور کے طلسماتی تموج کے ارضی تخیل میں اپنے پورے پیچ و خم کے ساتھ مشل جوئے خوش آب ایک ماورائی لمس سے بوس و کنار پر مجبور کرتے ہیں اور ان کا قاری حشل بلند مقام تماشائی بونوں کی دنیا کے موہوم امکانات کی قلعہ بندی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس مجبوری میں اسے ایک تھکا دینے والی یکسانیت کے مثبت کارنامے نرم کھال والی بلاؤ بلیوں کی طرح خراٹے بھرتے نظر آتے ہیں۔ جن کے انگاروں سے دہکے اور پنکھڑیوں سے مہکے ہوئے عکس محشر خیالی کی سوز دلبری کی ذات کے داخلی خول میں اپنے کو اسیر کر لیتے ہیں۔ پڑھنے والے کے خیالوں میں اودے شکر کے جسم کا لوچ پیدا ہو جاتا ہے اور بادی النظر میں وہ ایک بہت بڑا صفر معلوم

ہونے لگتا ہے۔ تخلیقی عمل کے اس تنہا سفر میں اسے فرد کی داستان کا سوز و گداز رومانوی دھند کے مرغولوں میں بادِظرافت کے پھولوں سے پرنظر آتا ہے جس سے رنگینیوں کی عینک، ادراک کی قلعہ بندی اور آرائش در و بام میں مصروف ہو جاتی ہے۔ کسی نثر نگار نے کیا خوب شعر کہا ہے۔

''طنز جہاں بھی ہے میرا کھویا ہوا مضمون ہے''

یہ مضمون کپور کے طنز پر صادق آتا ہے'' (یہ طرز ڈاکٹر محمد حسن)

''اردو میں طنز کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ صفر کا نقطۂ خیال ہے یا زبرے کی موہوم کر۔ اس طرز کے طنز اور صحیح ظرافت میں فرق مشرقین ہے۔ یہ فرق یہاں کم معلوم ہوتا ہے۔ مگر دوسروں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہے۔ یہ دلچسپ ضرور ہے لیکن اسے ظرافت سے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ اس کے پیش کرنے سے طنز و ظرافت کی اہمیت میں اضافہ ممکن نہیں۔ اس لحاظ سے یہ اوروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ دنیائے طنز میں اس کی وہی اہمیت ہے جس کی حامل پطرس کی ظرافت ہے۔ یہ گویا مزاح کا بلند ترین نقطہ ہے۔ اس سے آگے فکر کی رسائی نہیں، اس محدود طاقت پر پرواز کا ہونا نہ ہونا برابر ہے، تفصیل کی یہاں نہ گنجائش ہے نہ ضرورت، نہ وقت۔ غالباً یہ پطرس کو دیکھ کر میدان میں آئے، مگر افسوس کہ ان میں پطرس کے محدود اوصاف کا بھی مطلق پتہ نہیں۔ ان کی کتابوں کے دیباچے پڑھنا گویا جہاد کرنا ہے۔ لیکن اس جہاد سے بھی کوئی دینی یا دنیوی فائدہ متصور نہیں۔ کیونکہ ان کے خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، تخیل ادنیٰ، علمیت غائب، شخصیت اوسط، املا غلط، انشاء غلط، برخود غلط، پھر کورانہ تقلید میں مثل آفتاب روشن۔ اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ ان سے اور روحِ طنز سے کوئی لگاؤ بھی ہے۔ نظر حسب معمول جسم پر ہے۔ دوسرے کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کی عینک مانگے کی ہے۔ آواز اپنی نہیں، محض ایک صدائے بازگشت ہے۔ یہ آواز اردو طنز کی تکمیل ہے۔ یہاں جو کچھ لکھا جائے گا اس سے ان کی تحقیر مقصود نہیں، ان کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ان کی نظر سطحی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے قاری کو ذہنی جمناسٹک کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود کسی نے اب تک ''نرم گرم'' سے بہتر کارنامہ پیش نہیں کیا، یہ خیال کہ ''نرم گرم'' اردو میں طنز و ظرافت کا بہترین کارنامہ ہے، نہایت حوصلہ شکن ہے۔ جس کو یہ طنز کہتے ہیں اس کا ظرافت سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طنز و ظرافت کے بیچ میں معلّق ہیں۔ ان کی اہمیت باوجود قابل قدر اضافوں

کے بہت زیادہ نہیں، ان کی وقعت مشاعروں کے سبحان اللہ سے زیادہ نہیں۔ اس کا سبب ان کی مزاحیہ کجروی کے سوا کچھ نہیں، ان کی حیثیت ایک ایسے طالب علم کی ہے جن کی شخصیت ایسی ہے جیسی کہ عام طور پر شخصیت ہوا کرتی ہے جو ان کی قوتِ ایجاد کی کمی ظاہر کرتی ہے، ان کے مضامین پڑھنے کے لیے ایک عمر چاہیے۔ یہ ایک طالب علم کے کارنامے ہیں جو قابل رشک ہیں۔ یہ مضامین اتنے شگفتہ و دل بہار ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف اس کا اہل نہیں کیونکہ یہ عمر طبعی پر پہونچنے سے قبل ہی مصنف بن بیٹھے۔ یہ مضامین اسی عجلت اور کم سنی کا نتیجہ ہیں۔ اس سے ان کی مزاحیہ بوکھلاہٹ کا پتہ چلتا ہے۔ اس قسم کی بوکھلاہٹ مصنف کو دلیر بنا دیتی ہے۔ اور وہ ایسی حرکتیں کر بیٹھتا ہے جس سے فرشتے لرزتے ہیں اور نقاد قلم اٹھاتے ہیں۔" (بہ طرز پروفیسر کلیم الدین احمد)

"مجھے — یہ — کہنا ہے — کہ — کپور — کے مضامین میں جو وہ لکھتے ہیں وہ مضامین اور ان کے دوسرے مضامین جو طنزیہ و مزاحیہ ہوتے ہیں، ان مضامین میں میرے خیال میں جہاں تک میں نے اس کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے اور میں جن نتائج پر بالترتیب پہنچا ہوں اُن سے صرف ایک ہی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ مضامین اپنی جگہ پر ایسے مضامین ہیں جن میں میری دانست میں طنز ہے یعنی ان مضامین میں طنز ہے — طنز — میں یہ کہتا ہوں کہ ان مضامین میں اپنی جگہ پر جیسا کہ لکھ چکا ہوں طنز ہے۔ ایسا طنز جو سودا، غالب، اکبر، رشید احمد صدیقی، فرحت اللہ بیگ، پطرس، شوکت تھانوی، سید محمد جعفری، شفیق الرحمٰن، غلام احمد فرقت اور کنھیا لال کپور کے یہاں پایا جاتا ہے اور جس کی بے شمار مثالیں مغربی ادب سے پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً پوپ، سوئفٹ، لیوکاک، مارک ٹوئن وغیرہ کے یہاں جابجا آپ کو ملے گا۔ اور قدم قدم پر ملے گا، یہی وہ طنز ہے جس سے کپور اپنے مضامین میں طنز کا احاطہ کرتے ہیں۔ یعنی اپنے مضامین میں طنز کو جگہ دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے یہاں طنز آ جاتا ہے۔ دوسرے معنوں میں یوں سمجھیے کہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسا طنز جو دیکھنے میں عام طور پر طنز معلوم ہو اور جو کہ اپنی جگہ پر سوائے طنز کے اور کچھ نہ ہو۔ یہ بڑی اچھی بات ہے اور ہر جگہ اس بات کا ہونا مشکل ہے۔ مگر پھر بھی انھوں نے اس مشکل کو بخوبی نبھا دیا ہے، نبھانا بھی ایک آرٹ ہے اور اس آرٹ میں مجھے — طنز ملتا ہے طنز۔ لہٰذا اس سے یہ بات بخوبی واضح، ثابت، روشن اور صاف ہو جاتی ہے کہ ان کے یہاں قاری کے علاوہ ناقد کو بھی یہ

آسانی طنز دستیاب ہو جاتا ہے، اس طنز کو جوان کے یہاں ہے ہم سوائے طنز کے اور بھلا کہہ بھی کیا سکتے ہیں جو کہ طنز ہے یعنی طنز ہی ہے۔ اگر کچھ اور ہوتا تو بھی طنز ہوتا۔ طنز کا ہونا اس امر کی دلیل اور کلی شہادت ہے کہ ان مضامین میں ہم کو طنز مل جاتا ہے۔ ابھی میں نے دلائل وشواہد سے اس بات کو واضح کیا ہے کہ طنز نگار کپور کے یہاں مجھے طنز ملتا ہے جس میں ظرافت کی چاشنی، مغرب کے اثر سے آئی ہے اور بجنسہٖ موجود ہے جس کی وجہ سے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ان کے یہاں جو چیز ہے وہ سوائے طنز کے کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ طنز ہے۔ یہ موقع تفصیل میں جانے اور بحث کو طول دینے کا نہیں، اس لیے مختصراً عرض کرتا ہوں کہ ان کے یہاں طنز ہے جس کے لیے قسم خدا کی میں اب حلف اٹھانے تک کو تیار ہوں کہ ان کے یہاں طنز ہے۔"

(بہ طرز ڈاکٹر عبادت بریلوی)

"کپور نے اردو میں کتنے طنزیہ مضامین کے مجموعے شائع کروائے اس کا صحیح جواب مشکل ہے۔ اس وقت جو موجود ہیں ان کی صحیح تعداد دس ہے ان کا مختصر حال (نقوش بابت مارچ 1958 مخلوطہ 657/35 ن حبیب گنج لائبریری) رسالے کے "کپور نمبر" میں درج ہے۔ اس کی جو نقل لایا ہوں وہ دو نسخوں کے مقابلہ سے تیار ہوئی ہے۔ لیکن اس پر بہت سے مقامات مشتبہ ہیں۔ خصوصاً سید محمد جعفری کی نکالی ہوئی تاریخ "حیف کپور خورد برد" کا مادہ صحیح نہیں۔ اس کے علاوہ ان کے مجموعے 'چنگ ورباب' صفحہ 24، سطر 22 (حاشیہ 22 ملاحظہ ہو) کو میں مستند نہیں مانتا، کیونکہ یہ حاشیہ نفس مضمون سے منسوب ہے بلکہ ان کی دوسری کتابوں میں اس کا مطلق ذکر نہیں ملتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ 1948 کے قبل اس کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے۔ ملاحظہ ہوں احتشام حسین "تنقید اور تنقید" صفحہ 52 سطر 2، محمد حسن ڈاکٹر "تنقید اور تقریظ" صفحہ 972 سطر 112 (حاشیہ غائب) جس سے ثابت کرنے میں کوئی عار نہیں کہ اس نسخے میں کوئی نئی بات ان جملہ مضامین کے متعلق کہی بھی گئی ہے۔ میرے خیال میں اس نسخے کی اشاعت اول ایک خیالی شخص غفور نے کی تھی جس کو غلطی سے کپور کی جانب منسوب کر دیا گیا ہے۔ شہیر کی غزل کے ابہام سے ان کے دسویں خود سوختہ دیوان باتصویر کے بہتر دیں عکس سے خود اس بیان کی تردید ہو جاتی ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ اس کتاب کی تاریخ تصنیف میں سخت اختلاف ہے۔ بعض بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی اشاعت مارچ 1948 میں ہوئی مگر

تصنیف 1955 کے بعد ہوئی۔ یہ امر قرین قیاس بھی معلوم ہوتا ہے۔ ذیل کے جملے میں اس کے متعلق میں اشارے کروں گا۔ کچھ نے اکتوبر کی 1، 2، 3، 4، 5، 6، 7، 8 اور 9 تاریخیں بتائی ہیں مگر کہیں پر بھی دو تذکرہ نگار کسی ایک تاریخ پر متفق نہیں ہوتے۔ اشتباع ہوتا ہے کہ یہ کتاب تصنیف کرنے میں اکتوبر کا پورا مہینہ لگ گیا ہوگا۔ یہاں میرے اس قیاس کی بنیاد "تذکرہ برائے تذکرہ" (سطر غالباً نہیں ہے) صفحہ 2 کے دوسرے پیراگراف کے آخری الفاظ پر ہے۔ جو یقیناً غلط ہے۔ یہاں پر ہم کو یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ اس کتاب کو کپور کے نام سے کیوں منسوب کیا گیا، جب کہ غفور کی شہرت مسلم ہے۔ مخطوطہ 58/2/3 الف ب پ مگر اس مخطوطہ کا نام مشتبہ ہے۔ اس کا دیباچہ سرور (انجمن والے) کا تحریر شدہ ہے۔ جس میں اس کی تائید تو ہو جاتی ہے مگر قیاس خفیف ہے کیونکہ یہ خط تو لکھتے تھے مگر مضمون یا مقالہ کہاں لکھتے تھے۔ اُخیر عمر میں تو دیباچے لکھنے اور سرورق کے قولِ محال تک بند کر دیے تھے۔ قاضی وودو نے غالباً اسی نسخے کو دیکھا ہوگا اور خط کا مضمون دیکھ کر بھانپ گئے ہوں گے یہ سراسر ناانصافی ہے۔ مجھے ان دونوں بزرگوں سے سخت اختلاف ہے کاش ان دونوں نے بھی آپس میں اختلاف روا رکھا ہوتا۔ اگر اس تصنیف کی عمر اس وقت اتنی مان بھی لی جائے تب بھی یہ اس دور میں نہیں ہو سکتی پھر اس کے مطابق تو مصنف کے دودھ پینے کے دن ہوں گے۔ بچپنا بھی مشتبہ ہے۔ پھر اس نام کا انسان شمالی ہند میں تو ممکن بھی ہے مگر شمالی مشرقی ہند میں کسی طرح ذہن میں نہیں آتا۔ پوری بحث ملاحظہ ہو "اشتباع نام کپور" 1848 عیسوی مطابق دو ذیقعدہ یعنی 4 ر فروری ...... رسالہ 'سویرا' صفحہ 32 جز، دوئم۔ اس مضمون میں جو تین صفحات پر مشتمل تھا میری رائے تین سو اٹھتر صفحات جہازی۔ ایک مختصر رسالے کی صورت میں شائع ہو چکی ہے اور لٹن لائبریری (جدید) میں اس کے نسخے شعبہ مخطوطات میں موجود ہیں۔ ان کو دیکھتے ہوئے۔ ان کا یہ دعویٰ حیرت انگیز ہے۔ اول تو غلط بحث اٹھائی گئی ہے۔ جس میں تاریخی غلطیاں عام ہیں جس کی وجہ سے مجبوراً میں نے مضمون میں تکرار جان کر پیدا کی ہے۔ یہ لکھ چکا ہوں کہ یہ روایت غلط ہے۔ حق صاحب نے جو لکھا ہے وہ بھی غلط ہے۔ انھوں نے جس نسخے کی سند پر لکھا ہے وہ نسخہ سخت ناقص ہے۔ ان سے یہ امید رکھنا کہ انھوں نے یہ نسخہ دیکھا ہوگا بے کار ہے۔ اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کا سنہ متعین کرنے میں ان سب کو بڑا دھوکا ہوا ہے۔ کیونکہ بعد کا جملہ اس کی نفی کرتا ہے۔ ہم اوپر بار بار لکھ چکے ہیں کہ یہ نسخہ غلط اور مشتبہ ہے۔ اس سے

محقق کے شبہات رفع نہیں ہوتے۔ امکان کی بحث بار بار صفحۂ ذہن سے صفحۂ قرطاس پر لا کر خواہ مخواہ کی تکرار پیدا کی گئی ہے۔ گو کہ یہ قرینے کے خلاف ہے۔ اس مفروضے کی بناء پر نسخے کی صحت کا یقین مشکل ہے یہ مستحسن نہیں ایک غلط جگہ میں ایک صحیح نسخے "جنگ و رباب" (کیونکہ یہ جنگ کے زمانے میں لکھا گیا تھا) کے طنز و ظرافت کے نکتے اور معنوی کاوش وغیرہ کی تلاش بے سود ہوگی۔ ان بیانات میں صریحی غلطیاں بھی ہیں۔ نتائج برعکس نکلتے ہیں اور تشریح طلب ہیں۔ سوال اٹھتا ہے کہ یہ بیانات کہاں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ کہاں کہاں سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے اور کیوں؟ میرے نزدیک یہ ایسا قیاس ہے جس میں تاریخی اسقام بہت ہیں۔ ان سے ان کے ترقی پسند اسقام اور نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ مصنف خط شکست میں لکھتا تھا، نسخ یا نستعلیق یا خط کتابت میں، پھر اس کے پاس ٹائپ رائٹر تھا یا یہ ہاتھ سے لکھتا تھا۔ اگر ہاتھ سے لکھتا تھا تو اسے قلم و روشنائی کہاں سے ملی۔ کاغذ کس قسم کا استعمال کرتا تھا۔ اس کو لکھنے پر کون مجبور کرتا تھا۔ اس کا آخر میں کیا حشر ہوا۔ اس کی صراحت میں نے ایک علاحدہ مضمون میں کی ہے۔ بہر حال اتنا تو مسلم ہے کہ 'اردو' اس کی گفتگو اور روزمرہ کی زبان تھی۔ اور کپور اگر نام تسلیم کر لیا جائے تو تخلص کے سلسلے میں ہمیں ایک دوسرے نام کا یقین کرنا ہوگا۔ یہ ایک تاریخی بحث ہے دیکھو تذکرہ 'سیر پنجاب' صفحہ غائب منظر 1957 حاشیہ اول تا ثانی۔ اس نسخے کے اول الفاظ اور فقروں کو اس کتاب کے عنوان سے عبارت سمجھنا چاہیے۔ چند قرائن سے ان کو مضامین سمجھنا چاہیے۔ ان کا نسخہ شائع ہو کر مارچ 1958 میں کلیم الدین کے بیان کے مطابق بازار میں آ گیا تھا مگر فروری 1958 میں پبلک نے اسے جا بجا پڑھ لیا تھا۔ اس اعتبار سے اس کی تصنیف کی تاریخ اشاعت مارچ سے قبل ثابت ہوتی ہے۔ مہینہ کے تعین میں گڑبڑ اس وجہ سے ہے کہ وہ سال زائد (Leap year) تھا۔ تعجب ہے کہ بعض مستند تذکرہ نگار تک اس سلسلہ میں خاموش ہیں نسخے کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ دیباچے کا کتاب سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ یہ غالباً کتاب سے قبل تکمیل پا کر شائع ہو چکا تھا۔ دیباچہ دیکھ کر مصنف کو تصنیف کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ملاحظہ ہو رضیہ کا شاہی دسترخوان 'نسخۂ حمیدیہ طبع نول کشور 1926 صفحہ 9 سطر 26 ترکیب استعمال و تیاری۔ تعجب ہے کہ ان میں قرائن کی وضاحت نہیں کر رہا ہوں جس سے اس بیان کی صداقت کا اندازہ شدت سے ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ کتاب اور دیباچے دونوں کا وزن برابر ہے قطعی غلط

ہے۔ میں نے اس کو ٹال پر وزن کرا کے دیکھا تھا۔ دیباچے کا وزن آدھ پاؤ زیادہ ہے۔ ممکن ہے کہ تذکرہ نگار کے زمانے میں یہ مجلد ہو۔ اور جلد ساز نے اس کی کمی کو پورا کر دیا ہو۔ مگر اب یہ جلد نایاب ہے۔ منقولہ بالا قول سے یہی نتیجہ نکلتا ہے مگر یہ قول اگر کسی اور کا ہے تو خلاف قیاس ہے۔ آٹھ نسخے اس کتاب کے اس سے قبل میری نظروں سے گذر چکے ہیں۔ مگر بچے نہیں۔ اس سے ذہنی قیاس کی پوری تائید ہو جاتی ہے۔ مگر پھر بھی اس کو بیسویں صدی کی اردو کا نمونہ قرار دینا صحیح نہیں۔ اس کے لیے ہمیں قبل مسیح کی تاریخوں میں تضاد کا تعین کرنا ہوگا۔ یہ نسخہ نہایت مخدوش حالت میں ہے۔ جابجا اسے کیڑوں نے پڑھا ہے اور بہت سخت تنقید کی ہے۔ کیڑوں کی حاشیہ آرائی خطِ ریحان میں ہے جن کی وجہ سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ کیڑے سوائے دیمک کے اور کیا ہو سکتے ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ بقیہ تذکرہ نگار اس باب میں خاموش ہیں۔ اس خاموشی کو غلط قرار دینے میں ہم حق بجانب ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ بحث سر دست میری گفتگو سے خارج ہے جس کا صریحی اقرار اپنی داخلی شہادت کے بعد بلاخوف تردید دے سکتا ہوں۔ یہ نسخہ شعبۂ مخطوطات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ہے۔ بیسوی صدی میں علی گڑھ بہت مشہور صوبہ تھا جس کے تاریخی شواہد موجود ہیں۔ ہماری تحقیق ہے کہ اس کا پایہ تخت اتر پردیش تھا۔ جو بعد کو ممالک متحدہ آگرہ واودھ کے نام سے مشہور ہوا۔ بعد میں اہلِ ہند نے اس کو اپنا مرکز قرار دیا تھا۔ قرائن کی بنا پر قیاس ہے کہ اس نسخہ کا کاتب نامعلوم ہے۔ سنہ کتابت ندارد ہے، اوراق منتشر، خط نسخ اور نستعلیق کا مرکب ہے۔ جو الفاظ غائب ہیں ان کا پتہ چل گیا ہے اور جو ہیں وہ غلطی سے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سرخیاں جابجا غائب ہیں، آسانی کے لیے ہم کاتب ہی کو اس کتاب کا اصل مصنف قرار دیتے ہیں۔ جو نہ کپور ہے اور نہ غفور بلکہ مغفور ہے۔ اگر یہ قیاس تسلیم کرلیا جائے تو یہ نسخہ کافی قدیم ٹھہرتا ہے۔ نسخے میں حسب ذیل خامیاں موجود ہیں (1) مصنف کا مسئلہ نزاعی ہے (2) دیباچے کو کیڑوں تک نے منہ نہیں لگایا ہے (3) مضامین کو دیمک نے مطالعہ میں لا کر تنوع پیدا کر دیا ہے (4) کہیں پر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ مضمون شروع ہو رہا ہے یا ختم ہو رہا ہے۔ کاتب کی اصلاحوں نے اس نسخے میں ایک دوسری کتاب کی شان پیدا کر دی ہے۔ (6) یہ ایک ایسا اعتراض ہے جس پر بحث ختم ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اب اس نسخے میں مزید اضافے کی قطعی گنجائش نہیں ہے"۔

(بہ طرز ڈاکٹر نذیر احمد)

''لسانیات اور صوتیات کے طالب علموں کے لیے کپور کی طنز وظرافت کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان کا کمال یہ ہے کہ اردو کی خالص آوازیں استعمال کرتے ہیں۔ اور لسانیات کی بیانیہ سطح پر آواز صوت سے کام لے کر دولبی آوازوں کی گونج پیدا کردیتے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ہونٹوں کی لپ لپاہٹ سے آواز پہچان لیتے ہیں۔ جہاں تک میرا مطالعہ ہے ان کے زخرے کی آوازیں، غشائی آوازوں سے قطعی مختلف ہیں۔ یہی مرچیے اور مزاحیے کا بنیادی فرق ہے جوان کے لہجے میں نرمی پیدا کر کے طنز کی دھار کو غیر مسموع حروف علت میں تبدیل کردیتا ہے جس کی لرزش سے کان کے پردے گونجنے لگتے ہیں۔ ان گونجیلی آوازوں کا اخراج ہمیں ارتعاش زدہ موسیقی سے آشنا کردیتا ہے۔ جس کی نوک پلک اپنی نوکیلی آوازوں کے نشتروں کی غنائیت سے نثر کو شاعرانہ پیکر میں ڈھال لیتی ہے۔ اس میں ان کی فکر اور خیالات کی اڑان پوشیدہ ہے۔ مگر جب ان آوازوں کو یہ بجائے حلق کے نرم تالو سے ادا کر کے رگڑ دار آوازوں میں تبدیل کر لیتے ہیں تو یہ سخت تالو والی مزاحیہ آوازیں بن جاتی ہیں۔ مجھے تشویش ہے کہ ان کے یہاں ''لام الف اور دو چشمی ہ'' کی صحیح نمائندگی نہیں۔ اس لسانی غلطی کو کوئی بھی لسان مرتے دم تک معاف نہیں کرسکتا۔ یہ چھوٹے حروف علت کا استعمال نہیں کرتے جس سے عبارت میں اشتباع رہتا ہے۔ اور صوتی ترنگ اپنی علامت سے ہٹ کر ایک صوتی لہر میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ بہ حیثیت ایک ادیب کے ان کا یہ فعل مستحسن نہیں سمجھا جائے گا۔ اس کے بجائے یہ اردو کے کوز یعنی مڑی ہوئی آوازوں کو بطور عنوان جا بجا استعمال کرتے ہیں۔ جن کو اگر پوری صحت کے ساتھ نہ ادا کیا جائے تو ''پشتو'' کا دھوکا ہوسکتا ہے۔ معلوم نہیں یہ پشتو جانتے بھی ہیں یا نہیں۔ کاش یہ پشتو جانتے ہوں۔ اس سے اردو کا فائدہ ہوگا۔ مجھے مسرت ہے کہ نیم حروف علت کی گولائیاں ان کے یہاں عام ہیں جو اپنی جگہ پر جامع اور مکمل ہیں۔ اسی وجہ سے 'لب دندانی ظرافت' جسے 'خندۂ زیر لبی' بھی کہا جاتا ہے اور جو دولبی آوازوں کے ردعمل سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کے یہاں لاطینی رسم خط کے اثر سے آتی ہے۔ اگر یہ اس میں ناکام رہتے تو ہم ان کو علم صوت کی اصطلاح میں 'کوزی تجھوتیا' کہہ کر نظر انداز کردیتے۔ جس میں ایک کیفیت لامیہ کا انتشار ملتا ہے۔ اور 'ہائے ہوز' کی پوزیشن کو سخت خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ عبارت پر ڈلیش لگ جاتا ہے اور مرکب عبارت کے امکانات ختم ہوجاتے ہیں۔

اپنی ظرافت کو نکھارنے کے لیے یہ دولبی آوازوں کی مدد سے اچھی کردار متعارف کرتے ہیں۔ یہ کردار ہوا کو ہونٹوں پر بند کر کے غنا کی کیفیت پیدا کرتے ہیں اور 'م' کی فصاحت کو برقرار رکھتے ہیں۔ اردو سماج اس قسم کی صوتی ظرافت کے 'مضحک پہلوؤں' سے خاصی آشنا ہے اور اس لسانی مفہوم پر قادر ہے۔ ایسے مقامات پر اکثر ان کی ظرافت ہائے مخلوط دائروں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جہاں یہ لہجہ بدلتے ہیں وہاں زبان کے ڈھانچے کی نوک پلک سے تجاوز نہیں کرتے۔ اور ہندی آہنگ کو بحر زخار کے زحافات کی گردانوں کے ساتھ لاتے ہیں۔ ان کی گاڑی موسیقی کے ان کھٹکوں کی مدد سے صوتی اور لسانی فاصلے حرکت اور سکون کی مزاحیہ اٹکل کے ساتھ طے کرتی نظر آتی ہے اور ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ یہ حضرت تقطیع کرنا بھی جانتے ہیں یا نہیں"۔ (بہ طرز ڈاکٹر مسعود حسین)

"اس مخطوطے کو اختلاط طباعت کی کثرت کی وجہ سے کالعدم سمجھا جائے اس لیے میں اس سے استشہاد نہیں کروں گا، اقتباس بالا 29، سطر 20 خط جو میں نے اپنی خوش دامن کو تحریر کیا تھا۔ حاشیہ 7 مجھے بانکی پور لائبریری میں ایک مخطوطہ بوسیدہ اور سقیم حالت میں کپور کے مضامین کا مل گیا ہے۔ خاندان میں جملہ پرسانِ حال کو اس کی خوش خبری پہونچا دو کہ فی زمانہ اس سے جہاد میں مصروف ہوں۔ اندازہ ہے کہ اس کا تعلق بیسویں صدی کے نصف آخر سے ہے" جزئی باتوں سے قطع نظر 12 کتابوں کے 74 دفتروں میں ایک نسخہ اور وہ بھی ناقص مقدمہ 101 نہ ہونے کے برابر ہے اگر اس کو تسلیم نہ کیا جائے تو مصنف کے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حاشیہ "دھوبی کی کاپی" صفحہ 7 سطر 5 باوجودیکہ مضامین طنزیہ ہیں اور ظرافت کے باب میں اضافہ کرتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان میں جابجا مصدر کی علامتیں واضح نہیں کی گئیں ہیں۔ صفت مشتبہ حالت میں ملتی ہے، کتاب میں صرف ایک بار اس کا استعمال ملتا ہے اس سے مراد غالباً کاتب ہے، جس کو شارحین نے کتاب کا غلط مطلب اخذ کر کے نہ جانے کیا قرار دے دیا ہے (ج چ 11) صحت سے بعید ہے۔ یہ نسخہ بیسویں صدی سے متعلق ہے۔ (چ غ 3/5) جہاں تک میرا علم ہے یہ مضامین نصاب میں داخل کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔" ہنگامہ تحریر" نسخہ طبریزی مطبوعہ الناظر جلد ششم ۱۲ حوالہ بلا سند کے ہے اس وجہ سے اسے مسترد سمجھا جائے۔ یہ مسئلہ مابہ النزاع ہے کیونکہ کسی مستند فرہنگ میں اس کا حوالہ نہیں ملتا۔ یہ مہملات کا ایک نادر مجموعہ ہے جو 12x22 فٹ کے 663 رم صفحات پر مشتمل

ہے۔17 سطری صفحہ اب بھی مل جاتے ہیں۔ مگر نایاب ہیں۔اس سلسلے میں ایک خط کا اقتباس قابل توجہ ہے۔ ''میرا خط میرے نام'' رسائل میں شائع کروانے کی غرض سے تحریر کیا گیا تھا۔اب تک کئی سال ناموں میں معمولی سی ردوبدل و ترمیم کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔ حافظہ کے لیے ملاحظہ ہو رسالہ ''نرالی دنیا''، ''الٹی دنیا''، ''سیدھی دنیا'' اور ''ہنگامی دنیا'' اس کے بعد چھپنے کی نوبت نہیں آئی ۔ کیونکہ ہنگامہ ہو گیا تھا گو کہ میرے اعتراضات سنگین اور صحیح ہیں۔ ملاحظہ ہو' گھریلو جھگڑے 123'، موٹر گائیڈ 21'، کرامات الو عرف کالا جادو یعنی ساجن موہنی 22' اصولی بحث میں یہاں صرف چند اعتراضات پر اکتفا کروں گا مثلاً کتاب کے صفحے 34 سطر 31 میں 'لا' کا غلط استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے مصنف کی تنبیہ ضروری ہے اور ہماری بحث سے خارج ہے۔ کیونکہ اس کو معاف کرنے پر بھی اعتراض ہرگز رفع نہ ہوگا۔ پھر سند تو قطعی غلط ہے، حروف تہجی کی ترتیب سرے سے غلط ہے۔ ابجد کے لحاظ سے کتاب کا پہلا لفظ الف سے شروع کرنے کے بجائے 'ے' سے شروع کیا گیا ہے۔ مصنف سخت تنقید کا مستحق ہے 1/2/3/4//5/67/8/9 اس بات کو معترض الیہ کی جانب ہرگز نہ منسوب ہونا چاہیے۔اس کے مایوس کن رویہ سے برانگیختہ ہو کر فحش و دشنام سے کام لینا بھی ایک کام ہوگا۔اس قسم کے کاموں کی سخت ضرورت ہے۔ جن تحقیق کے شہ سواروں نے اس نسخے پر اب تک بھروسا کیا، ان کے ساتھ تنبیہی کارروائی کا ہونا سخت ضروری ہے۔ الفاظ سے جا بجا مترشح ہوتا ہے کہ سہولا زنار روا رکھا گیا ہے۔ الف......ب، پ، ت، ٹ، ث، ج، چ، ح، خ، د، ڈ، ذ، ر، ز، ژ، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک، گ، ل، م، ن، و، ء، لا، ھ، ی، ے، 7، 8، 9، 10، 11، 12 مثلاً 'ج' کی جگہ 'ح' کا استعمال کم از کم ۱۷ جگہ صریحاً کیا گیا ہے جس کا نہ تو مزاح سے کوئی تعلق ہے اور نہ کاتب سے۔ یہ کھلا ہوا طنز ہے۔ 'رسالہ حزعہ' 25، 24، 23، 22 فتح میں 'ذ' اور 'ظ' نیک الحت ، فی انی لحت، الفتحہ کا مصدر مفارعی سکوت کی حالت میں ملتا ہے۔ مزاح میں مرثیہ کی کیفیت کی ذمہ داری اسی لاابالی پن پر ہے۔ 25، 25 لفظ کی تصغیر میں بامعنی لفظ کثیرالاستعمال محتاج ثبوت و سند کے اعتبار سے خبط کرنے کے لائق ہیں۔ فقرات نثر جا بجا نسخے میں ملتے ہیں جو قطعاً نامعتبر ہیں۔ عبارت ذیل کے نکتے اس سلسلے میں حوالے کے بعد بھی فراموش نہیں کیے جا سکتے، کیونکہ ہ ہ ہ ہ ہ ہمہمہمہمہمہ پس جس

سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اس نسخے کا تعلق بیسویں صدی سے ہرگز نہیں بلکہ اٹھارھویں صدی سے ہے۔ اور مصنف مرد نہیں بلکہ کوئی خاتون ہیں جن کی اردو دانی میں ہمیں شبہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عروس ظاہر کے قسمتیں بہ صفحۂ اول و صفحۂ ثانی میں جا بجا اشتباع ہے۔ پھر یہ کہ کرۂ ہمزہ بحذف الف لغو سراسر مہمل دنا مستعمل، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خاتون جن کو ہم کپور کے نام سے فی الحال فرض کیے لیتے ہیں ان کے لیے 'سہو طبعی بود' کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ 2ے، 22ے، 32ے، 42ے، 52ے، 62ے، 65ے، 58ے، 59ے، 57ے، 56ے، 55ے، 54ے، 53ے، 52ے، 51ے ——————— ان طنزیات میں 'ش' کے ساتھ محترمہ 'خ' بھی آئی ہیں اور 'ب' کے ساتھ 'پ' بھی۔ مگر افسوس کہ 'ت' کے ساتھ 'ٹ' نہیں ہے ورنہ ان طنزیات کی کچھ اور ہی شان پیدا ہو جاتی۔ 'ہائے ہوز' کی سخت مٹی پلید کی گئی ہے۔ مصنف خود اس میں اپنے طنز کا نشانہ بن گیا ہے۔ 'ہائے حُطّی' کی ٹھونسم ٹھانس سے طبیعت میں ایک قسم کا بھاری پن اور گراوٹ محسوس ہوتی ہے۔ طنز سطحی ہو کر رہ جاتا ہے۔ دو چشمی ہے اور حمزہ کے ساتھ بے توجہی کھٹکتی ہے۔ 'واؤ' کا کثرتِ استعمال کلاسکی شان کے خلاف ہے۔ اس کو روایت سے بغاوت متصور کیا جائے گا۔

مخترعات مصنوعی جو منافقوں نے بعد میں بطورِ حاشیہ پیش کیے ہیں، جمع حاضر، واحد متکلم غائب کے صیغے میں 'چغد' کا استعمال نہایت بے باکی سے کیا گیا ہے مگر اس سے محترمہ کا احمق ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ مگر یہ سند ہے کہ بیسویں صدی میں 'چغد' سنجیدہ مضمون میں بلا تکلف استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ لفظ غریب نہیں تھا بلکہ سماج میں اس کی اہمیت تھی۔ مگر اس سے غلط فہمی پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اس کے لیے کوئی مستند لطیفہ پیش کیا جانا چاہیے تھا۔ ضمائر میں مذکر و مؤنث کا التزام نہیں رکھا گیا ہے۔ اس میں مغرب کا اثر صاف جھلکتا ہے۔ ضمیر۔ فاعل۔ مکل۔ صفت۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مصدر۔ ۔ حرف۔ ۔ ۔ ۔ مفعول۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ زیرِ نظر مخطوطے میں کپور نام کا فرد مرد نہیں بلکہ عورت تھی اور طنز نگاری میں ید طولیٰ رکھتی تھی جس کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ پر مسلّم ہے۔ اس پر مزید تحقیق کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ عورت بھی تھی یا نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب"۔ (بہ طرز قاضی عبدالودود)

چین و بنگال کا جادو

'ہدایات' برائے عامل و کامل

مبتدی کا فرض ہے کہ وہ اپنے استاد سے اس فن پر کمال حاصل کرے۔ مؤلف کے عرض حال کو شروع سے آخر تک نہایت بغور پڑھے یا دوسروں سے بار بار پڑھوا کرنے پھر مطابق مرضی استاد اُن پر بیشک ''فنافٹ'' عمل کرے۔

اپنے دل کو ایک طرف لگا دے ورنہ منتر سدھ نہ ہوگا اور ٹونا بیکار ہو جائے گا دشمن کے سامنے خوار اور راہوں میں ذلیل ہوگا۔ عمل کے دوران برہمچر یہ رکھے۔ مانگ کر ہلکی غذا کھائے۔ منتر چاندکی کسی بھی بتائی گئی تاریخ سے پڑھنا شروع کرے سوائے سوموار، منگلوار، بدھ وار، برہسپت وار، ویروار، سنیچر وار، اور 'ایت وار'' کے ورنہ تر دشی سدھ نہ ہوگی اور وار خالی جائے گا اور آ ہو کو راہو بھرسٹ کردے گا۔ مشکل کاموں کے لیے دوج، تیج، چوتھ، پنچمی یا پورنماشی اچھے ہیں برے کاموں کے لیے جیٹھ یا اساڑھ اپنا جواب نہیں رکھتے، اس میں موتی مالا سے داشی کرن کا جاپ واجب ہے۔ واضح ہو کہ مالا میں صرف 28 موتی (امی ٹیشن) ہونا چاہئے۔ اور اسے ہزارے کی تسبیح کہنا لازم ہے۔

نہایت لازی بلکہ ضروری ہدایات

مبتدی عامل کو معمول بن کر دل و دماغ سے سب کچھ نکال کر پیٹ اور جیب بھر کر منتر شروع

کرنا چاہیے جگہ ایسی ہونی چاہیے جہاں پاپ نہ ہو۔ جنادرنہ ہو۔ پنادرنہ ہو — پڑھنے والے کو اس کا پتہ نہ چل پائے کہ وہ خود کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔

منتر پڑھ کر اپنے بدن پر تین بار پھونکے۔ پھونک پیٹ پر پڑنا چاہیے کہ سب اسی کی کرنی اور پبلک کی بھرنی ہے۔ آسن کے گرد تین حصار قائم کر کے اس کے اندر بیٹھے۔ آسن پر سے نظر نہ اٹھے نہ کسی سے بات کرے نہ کسی کی سنے۔ نہ ڈرے۔ لکشمی کو برابر آنے دے۔ بیٹھنے کا طریقہ سیکھنے کے لیے عامل کو الکشن کے موقع پر کسی وزیر کے غریب خانے پر جا کر اُس کے جنتا پورد ک آسن کا مطالعہ از بس مفید و لازمی ہے۔ منتر ختم ہونے پر جادو کروانے والے کو آواز دے کر سیدھا دوان فوراً طلب کرنا چاہیے۔

آدمی کو کرسی سے چمٹا دینے کا 'طریقہ دریقہ'

کسی عارضی ملازمت والے استاد کو امتحان میں نقل کر کے ایل ٹی کروانے کے لیے بروز اتوار یعنی "سنڈے"، آدمی کو کرسی پر بٹھا کر اس کے امتحان میں آنے والی پرچیاں تیار کروادے۔ دوڑ دھوپ سے معمول نہ بھاگے۔ پھر وہ آدمی زندگی بھر کرسی سے چمٹا رہے گا۔

شاستروں میں ہے کہ "اگر کسی مہاجن یا دھنوان سے لابھ اٹھانے کے لیے ویٹا منتر دھارن کرلے تو پُرش کامیاب ہوگا۔ مثلاً جیسے کسی "نودولتی" کے الکشن کا کام کرنے کے علاوہ پولنگ سے پہلے بیلٹ بکس پر کالا دھاگہ نظر بندی باندھ کر ویٹا منتر دھارن کرلے تو دشمن کے ووٹ بھی اُس "بکسے" میں دھڑا دھڑ گریں گے اور اس کے آدمی جتنے بھی بوگس ووٹ ڈالیں ہرگز ہرگز نہ بھید کھلے گا اور پُرش کامیاب ہوگا۔ اور اسمبلی پارلیمنٹ کی کرسی سے برابر چمٹ جائے گا۔ جب چھوڑنا منظور ہو تو دھاگا اگلے موقع پر الگ کردے۔ مستقبل کے امتحان میں بھی ایسا کرنے سے پھر اُسے کرسی سے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔

کتوں کو بھونکنے سے بند کرنے کا ٹوٹکا

کوئی نیتا، مہاپرش، سجن، منتری مہودے لومڑی کا گوشت اپنے پاس کوٹنے والے کاغذ میں لپیٹ کر پرمٹ کے ڈبے میں بند کر کے رکھے اور جہاں جی چاہے جائے، کتے اس کو دیکھ کر نہیں بھونکیں گے۔

خراب گھی درست کرنے کا ٹونا

جو گھی بالکل خراب ہو گیا ہو۔ اس کو درست کیا جا سکتا ہے۔ پیاز کی چربی بھر کر گھی میں ڈال دیا جائے۔ جب پیاز گھی میں جل اور چربی پگھل جائے تو اس کو نکال کر باہر پھینک دیں۔ گھی بالکل خالص ہو جائے گا۔

آدمی کی ناک کاٹ کر دوبارہ ثابت دکھانا

پہلے دو استرے لے جو ایک ہی قسم کے ہوں۔ ایک استرے کی دھار کو درمیان سے اس طرح کاٹ لیا جائے جیسے حریف کے ووٹ کاٹے جاتے ہیں۔ جو کہ ناک کے برابر آ جائے اور وہ استرا کسی کی ساکھ پر لگا دیا جائے تو معلوم ہو گا کہ استرا ناک کے اندر چلا گیا اور ضمانت تک ضبط ہو گئی مگر دراصل استرا درمیان سے کٹا ہوا ہو گا اور اندر ہی اندر برادریوں کے چودھریوں کو رقم دے کر ووٹ واپس لائے جا سکتے ہیں۔

میز پر چاقو چلانا

آسام اور بنگال کے کامروپ اور سندربن کے علاقوں میں بہت عام ہے۔ افسر لوگ سروس بک پر نظر بندی کر کے محض قلم سے چاقو کا کام لے لیتے ہیں۔ جو چلتا تو میز کے اوپر ہے مگر اندر تک پیٹ کٹ جاتا ہے۔ قلم کی، چاقو کی موافق اس حرکت سے پورے پورے خاندان تک کے پیٹ کاٹے جا سکتے ہیں بہت منہ زور نسخہ ہے اور صرف ''دست غیب'' ہاتھ نہ آنے اور غصہ آنے کے وقت بلا کھٹکے آزمایا جا سکتا ہے۔

راستے میں شیر سے حفاظت کا جنتر

اگر جنگل میں آپ کہیں جا رہے ہیں اور سامنے کہیں سے شیر آ رہا ہے تو یہ منتر جنتر پڑھ کر پھونک دو۔

''مکھ باندھ بگھائن باندھوں بگھ کے سارے بچے باندھوں، گھاٹ میدان باندھوں۔ دوہائی بس دیو کی لوناں چماری کی چھُو۔''

زیادہ بہتر ہو گا کہ شیر کو سامنے سے آتے دیکھ کر سات منگل تک یہ جنتر پڑھنے کے بعد شیر کی طرف پھونک دے۔ شیر پیچھے ہٹ جائے گا۔

نوٹ:۔ شیر اگر پانی میں آجائے تو دیکھ کر اطمینان کرلیا جائے کہ محض شیر ہے یا مہا شیر۔
اسی طرح خشکی میں بھی خاص طور سے شہر میں شناخت ضروری ہے کہ صرف شیر ہے یا شیر سنگھ ہے۔
دوسرا نوٹ:۔ اگر کوئی مہاپرش چار بار الکشن جیت کر شیر ہو گیا تو اس پر یہ منتر کام نہیں دے گا۔

آفات سے بچنے کا طریقہ

یہ منتر پڑھ کر تالی لگادو۔ سب آفات و بلیات دفع ہو جائیں گی:۔
"فرید کی باسری اور امبھاری تس تینوں چیزیں برائے آگ اولا پانی برسے یا آگ یا اولے پڑیں الیابلیتا کی کھوپڑی گنجی ہو کے پلپلا جائے۔"
روزی، روٹی اور چاکری پر اگر آفت آنے والی ہو تو اس کو مرغ و ماہی اور دان سے ٹالا جا سکتا ہے۔ بڑی سے بڑی مصیبت کھلا پلا کے ٹالی جا سکتی ہے۔

درد دانت کا تیر بہدف علاج

اگر کسی نے دانت کھٹے کر دیے ہیں یا آپ نے گنے یا چنے کا استعمال کرلیا ہے اس صورت میں دانت کے درد سے بیتاب ہیں تو دانتوں پر ہاتھ رکھ کر سات دفعہ کلی کریں اور ہر بار یہ منتر پڑھیں:۔
"ہے دمتا ائم کوکلنا ہی ننھی سنگ بھائیں اور ہم یکدم تم تھیں ہمری ہمری بھیم پڑاخ کونسی الس ہم کمائیں تم بیٹھے کھاؤ۔ مت کسی کے سنگ بدیس جاؤ۔ بتیسی میں تڑپڑ واپس آؤ۔"
اس منتر کے جاپ سے درد تو درد ہلتے ہوئے دانت تک ٹھیک ہو جائیں گے۔ اگر کوئی دانت گر چکا ہو تو اس کو بھی منتر کے زور سے واپس لگایا جا سکتا۔

کنویں سے دودھ نکالنا

اگر کہیں دودھ نہ مل رہا ہو یا دودھ کا کاروبار کرنا ہو تو کسی کنوئیں میں بڑ کے دودھ میں بھگویا ہوا کپڑا خشک کر کے ڈول پر غلاف کی طرح چمٹا دیں اور کنوئیں سے پانی نکالیں تو دودھ نکلے گا۔ اس دودھ سے بالٹی بھر کر نکالیں اور دوسروں کے لیے بیشک استعمال کریں۔
بمبئی دیس میں ہوٹلوں اور چائے خانوں میں کنوئیں کا تازہ دودھ ہر کہیں بہت عام ہے۔

کلکتہ کے علاقے میں جس کے پاس کنواں نہیں ہوتا اس گھوسی کو دودھ بیچنے کا لائسنس تک نہیں ملتا۔

بالائی بنانا

مکھیا دودھ کو کڑھاؤ میں جوش دو، دودھ کو گاڑھا کرنے کے لیے سنگھاڑے کا آٹا حسب ضرورت ملاؤ، اس کے بعد بلاٹنگ پیپر جس کو سوختہ بھی بولتے ہیں۔ ڈال کر آنچ دھیمی کر دو۔ بہترین قدرتی بالائی تیار ہو جائے گی۔

محبوب کو خط لکھنا

نوشادر کے پانی سے خط لکھ کر خشک کر لو۔ کاغذ پھر سفید ہو جائے گا اور جب محبوب اسے آگ کے سامنے پڑھے گا تو حروف فوراً نظر آ جائیں گے۔ عاشق و معشوق کی خط و کتابت اور سیلس ٹیکس، انکم ٹیکس کا اصلی حساب رکھنے اور بلیک منی کے لیے یہ نسخہ نہایت مجرب و مفید ہے۔

جس کو چاہو اپنا عاشق بنا لو

بروز جمعرات عروج ماہ میں انار کے قلم سے بھوج پتر پر یہ نقش بناؤ:۔

"9113 ‌ ‌11 ‌11 ‌11 ‌7111911 — اب 1611ء21"

اس نقش کو سوا سال تک روزانہ رات بھر پڑھ کر اپنے اوپر دم کرو ہر بار کہو:۔

"فلاں بنت فلاں در محبت و عشق۔ فلاں در فلاں زوجۂ فلاں یا مادر فلاں یا مادر مادر فلاں۔ فریفتہ و بے قرار و بے آرام ہو کر میرے پاس بے دھڑک چلتی چلی آئے ورنہ نقش کی کشش اس کو تڑنت کھینچ لائے۔"

بس یہ نقش وارنٹ گرفتاری کا کام کرے گا اور معشوق مثل عاشق کھنچا چلا آئے گا۔ معشوق کے آنے پر کہ دوبارہ بھڑک کے نہ نکل جائے، احتیاطاً انار کے قلم زعفران میں ذیل کا نقش لکھ کر معشوق کے بازو پر باندھیں:۔

؟/ طالب/ مطلوب/ نام/ معرفت/ سکونت/ موضع/ ڈاکخانہ/ ضلع/ ؟

معشوق اور افسر کو زیر کرنے کے لیے یہ جنتر مجرب اور لاجواب ہے۔ اس کو کنول پر صندل سے روزانہ ہزار بار لکھ کر جھیل میں بہایا جائے (آج کل مفرور چوروں کو پکڑنے کے لیے پولیس یہی نقش استعمال کرتی ہے)

420	x	فلاں بنت فلاں		
99	+	حاکم فلاں		
840	x	فلاں بن فلاں		

جنتر کام میں لاتے ہی معشوق کھٹ سے قدموں پر آ جائے گا۔ محبت کو قائم رکھنے اور برابر بڑھانے گھٹانے کے لیے حسب ذیل تانترک چیپل کے پتے پر کاجل کی سیاہی سے لکھیں اور محبوب کو گھول کر پلا دیں۔ محبوب خود سے شادی کی درخواست وغیرہ کرے گا جو منظور کر لو۔

بال ہا	گولر کا پھول	عنقا
شدی	تو	من
شدم	من	تو
فلاں بنت فلاں	پری	حور

اس جنتر کی کامیابی کے ساتھ ساتھ فیملی پلاننگ کا ضرور خیال رکھا جائے۔

محبت کا ایک تنتر یہ بھی ہے کہ ساہی کے تازے خون میں آگ کی جڑ اور چولائی کا رس گھول کر اس کے کاجل سے ہاتھی دانت کی سلائی سے محبوب کو خط لکھیں۔ محبوب فوراً جواب دے گا۔ بس آنکھ لڑ جائے گی۔ دونوں طرف سے بیقراری ہوگی آخر میں کامیابی ہوگی۔

تنترک ودیا میں آیا ہے۔ اگر کالی جمعرات کو مور اور ہدہد کا پتہ اور چوراہے کی مٹی لے لو۔ چوتھی چیز اپنا پسینہ۔ ایک خاص احتیاط یہ رکھیں کہ یہ سب چیزیں ایک جگہ نکال کے گولیاں بنالیں جس عورت یا افسر کو گولی دی جائے گی بیشک شیدا اور مطیع ہوگا۔

نوع دیگر

چوہے کو پکڑ کر اس کے سر کے بال اتار لو اور بلی کی دم کے بال مہیا کرو۔ تیسری بات کہ کوّے کے گھونسلے کی لکڑی اور چمگادڑ مسلم شنبہ کو جلا کر راکھ کر دیں جس کسی سے بنائی ہو اس کی پیٹھ پر ایک چٹکی چھڑک دو۔ دم بھر میں پیچھے پیچھے قاضی کے گھر تک چلی جائے اور دو بول پڑھوا لے۔ اگر پان تمباکو کے بہانے کھلا دو گے تو دل و جان سے فریفتہ ہوگی۔

ایک پھول راکھ میں لگا کے جس کسی سے سچی محبت کرتا ہو اس پر مارے اور ''حرام پن'' سے باز رہے اگر ہوا تو اثر نہ رہے گا ورنہ محبت بالکل سچی رہے گی۔ منتر کے درمیان معشوق کی تصویر دل میں یا کم از کم لاکٹ میں رکھے شرطیہ معشوق بے قرار اور بے چین ہو کر ملے گا۔ نہایت مجرب و آزمودہ ہے کالج کے لڑکوں، لڑکیوں کے لیے بالکل ''فشٹ'' کلاس چیز ہے۔

پرائی عورت پھانسنے کا ٹوٹکا

امچور کی پھانک میں قیمہ کا جوارش جالینوس بھرو، اس کو بناسپتی میں تل لو، جب پاپڑ ہو جائے تو ٹھنڈا کر کے جیب میں رکھ لو۔ جس حاکم سے کام نکالنا ہو اس کی عورت جس راستے سے گزرے امچور کی پھانک مسل کے چورہ کر کے زمین پر سڑک کے آر پار بکھیر دو۔ جب عورت اسے پار کر لے تو خود بخود پھنس جائے اور سو کام نکالے۔

مرد کو رام کرو

اپنا مرد بس میں نہ ہو، پرائی عورتوں میں اٹکا پھرے۔ غائب رہے، آئے تو غصہ گرمی دکھائے۔ ایسی مہاراروکو چاہیے کہ وہ یہاں کا خیال رکھے، کھانے پینے میں کمی نہ کرے، بن سنور کر آدمی کے پاس جائے اور اخلاق سے پیش آئے ہنسے بولے اور محبت جتائے، مرد برابر رام ہوگا۔ لیکن مرد کے پاس جانے سے پہلے اس بات کا دھیان رکھے کہ ہر جمعرات کو ''چڑیل'' کی شکل ذہن میں لا کر تین بار پورب کی طرف ہش ہش کر کے تالی بجادے بہت جلد مرد کو پرائی عورت سے نفرت اور گھر میں محبت پیدا ہو جائے گی اور بالکل بس میں آجائے گا۔ آوارگی ختم ہو جائے گی۔

پھر کسی چھٹی کے دن اس کو گدھے کا دل اور دماغ کھلا دو، مرد بالکل گدھا ہو جائے گا اور اشارہ پر چلنے لگے گا۔

ہاتھ میں آگ پکڑنا

''میڈوک'' کی چربی ایمونیا اور پیاز کا عرق ملا کر ہاتھ یا پیر میں مل لو۔ پھر اپنے ہاتھ میں جلتا کوئلہ رکھ لو یا آگ پر بے کھٹکے چلو۔ بالکل آگ سے نہ جلو گے۔

سرکاری روپیہ کا حساب کاغذ پر پکار کھنے کے بعد لاکھوں کے گول مال سے بھی کبھی کوئی آنچ نہیں آسکتی۔ ریلیف فنڈ و چندے ونذے کی رقم ''غڑپ'' کرنے میں کاغذ کی درستگی بھی ضروری ہے۔

فائر پروف ہو جانا

اپنے کپڑوں کو پھٹکری اور انڈے کی زردی میں بھگو لو پھر خشک کر لو اور نمک کے پانی وانی سے دھو دھا کر سکھاؤ پھر کھا لو۔ اس کے بعد آگ یا چولھے میں داخل ہو، ہرگز کپڑے میں آگ نہ لگے گی۔

جن یا بھوت دور کر لو

جس پرش یا استری پر آسیب ہو اُسے بھنگ لے کر تھوم کے پانی سے تر کر کے دھونی دو بھوت ترنت بھاگ جائے گا۔

طریقہ دیگر

بلی کے گوبے اور مرچوں کی دھونی سے ہمیشہ آسیب دور بھاگتا ہے پریت کو قبضہ میں لانے والے کو سیدھا جنگل کا رخ کرنا چاہیے۔ اور کیکر کے درخت کے نیچے سادھی لگا کر مولا چھپتر کا تین دن تک سوا لاکھ بار جاپ کرے۔

''اوم شری دھن دھن بھون بھوتیشور کم کرو بھر سواہا۔''

منتر پڑھنے سے چوتھے روز سوامی استاد جگت گروکل کرپا سے پریت خود آ کر درشن دے گا اور دوستانے سے پوچھے گا۔

''فرماؤ جناب! مانگ کیا مانگتا ہے۔ ہمکو کیوں پکارتا ہے؟''

بس جو مانگو گے کھٹ سے پا جاؤ گے۔ ہرگز ملنے میں دیر نہ لگے گی۔

آدمی کا گھوڑا بن جانا

بروز اتوار مردہ گھوڑے کا سموچا سر کاٹئے اس کے منہ میں سن کے بیج اور کھیت کی مٹی بھر کر ایسی جگہ گاڑو جہاں کبھی، چالیس چالیس کوس تک انسان کا گذر نہ ہوا ہو۔ ہر روز اسے پانی دو تب اس جگہ درخت نمودار ہوگا۔ درخت کی چھال کی مالا بناؤ، یہ مالا جس مہاپرش کی گردن میں ڈالی جائے گی بالکل گھوڑا معلوم ہوگا۔

اگر گدھے کے دماغ میں اس مالا کا مانا پلان کر کے اس کو چالیس روز تک بلا ناغہ کھایا جائے تو آدمی گھوڑے سے منسوخ ہو سکتا ہے جو دیکھنے میں آدمی یا گھوڑے سے زیادہ گدھا معلوم ہوگا۔ لیکن

ایسی صورت میں اس کی دوستی سے بچنے کی کوشش کی جائے۔

ایک کے دو دو نظر آئیں

شیشے کے گلاس میں روپیہ ڈال کر گلاس ہاتھ سے بند کر لو۔ دیکھنے والے کو ایک کے دو دو نظر آئیں گے۔ روپیہ اور سونا دونا کرنے کے لیے اگر گلاس ناکافی ہے تو یہی کام جگ سے لو۔ لیکن خیال رہے کہ روپیہ دونا کرنے سے پہلے دوڑ کی بہت اچھی مشق ہونا چاہیے۔

رد بلا کا گنڈا

بلاؤں کا سامنا ہو، آسیب تنگ کرے۔ بھوت پریت نظر آئیں۔ نظر بندی میں گھر گئے ہو تو گھبرانا مت۔

کچھوے کا تازہ انڈا لاؤ، اس میں ناگ پھنی سے سوراخ کر کے ایک بیر بہوٹی ڈالو اور دھوپ میں پکاؤ۔ اس کے بعد انڈے کا چھلکا سالم الگ کر لو اور انڈے کی زردی سفیدی ملا کر کسی بلی کو کھلا دو۔ انڈے کا چھلکا سل پر باریک پیس کر سایہ میں سکھا لو، اس کے سفوف کو زمین میں بو دو تب ایک بوٹی زمین سے پیدا ہو گی جس کا ست نکال کر بوٹی کے ڈنٹھل پر پلس کر دو۔ اور چاروں کھونٹ لاحول نقش کر کے گنڈا بنا لو اور بازو پر باندھ لو۔ کبھی بھوت پریت تنگ نہ کریں گے۔ آسیب نظر نہ آئیگا نظر بندی کا اثر نہ ہوگا۔ بلائیں قریب نہ پھٹکیں گی۔

طلسماتی تختی

پبلک کی آنکھوں میں دھول جھونکنے اور ادیبوں کی پگڑی اچھالنے کے لیے ایک طلسماتی تختی تیار کرو۔

صندل کی سوا انچ کی تختی پر یہ نقش ہیرے کی کنی سے کھدوا کے اسے زعفران سے دھو کر ٹریلین کے دھاگے سے گلے میں لٹکا لو۔ اور ہر جمعرات کو جنات والی مسجد میں چراغ جلاؤ پھر بڑے بڑوں کا تمھارے آگے چراغ نہ جلے گا۔ ٹیڑی شاعری، نثر اور افسانے خوب چلیں گے۔ آڑی ترچھی نثر اور نئی تنقید کا بول بالا رہے گا۔ میر اور غالب تک کو بآسانی نیچا دکھا سکو گے۔ طلسمی تختی کے اثر سے سب پر برابر بھاری پڑو گے۔

نقش برائے دیگر روزی

اس نقش کو بروز سوموار سبز کپڑے پر زعفران سے لکھیں۔ نہا کر اچھے کپڑے پہنیں۔ دل صاف کریں پھر نقش کو لوبان اور صندل کی دھونی دے کر تانبے کے تعویذ میں دستار کے ساتھ باندھیں اور ایمپلائمنٹ ایکسچینج کا رخ کریں۔ فوراً پروانہ تقرری ملے

بے روزگاری کا قصہ پاک کیجیے				جناب
944	29	425	256	نوکری دلوایئے
0	82	1	127	

نوٹ:۔ اس نقش کو گروکٹ ہرگز ہرگز نہ استعمال کریں۔ تمام جرائم پیشہ اس سے بالکل نقصان اٹھا جائیں گے اور خوامخواہ میں پکڑ لیے جائیں گے۔

روزگار اپنے پاس بلا لے

اگر آپ نے 'روزی سے نہیں لگ رہے ہیں تو کہیں سے ایک خالی شجرہ لایئے اس پر بھاری بھرکم حاکم لوگوں کے پرکھوں کے نام معلوم کر کے لکھیے۔ پھر ان کو اپنے شجرے میں جوڑیے پھر اسے حاکم کی عورت کو دکھایئے۔ عورت تم پر فوراً مہربان ہوگی اور حاکم سے ملائے گی۔ حاکم تم کو روزگار سے لگا دے گا۔

جس کے پاس روزگار ہو اس کی مٹھی گرم کرنے کی کوشش کرو برابر روزگار دے گا۔

دولت حاصل کرلو

"رام رام جپنا پرایا مال اپنا۔"

اس منتر کو حفظ کرلو۔ روزانہ ربڑ کے پیڑ کے نیچے اس وقت تک جاپ کرتے رہو جب تک کہ لکشمی دروازہ نہ کھٹکھٹائے۔

دستیابیِ گمشدہ

اگر کوئی صاحب یا ان کی کوئی چیز گم ہو گئی ہے تو اُن کو چاہیے کردہ مندرجہ نقشے کو کام میں لا دیں۔

7	3	9
8	6	5
3	10	5

ایک ہزار آٹے کی گولیوں میں نقش رکھ کر روزانہ دریا میں بہائیں دسویں دن کامیابی ہو۔ مگر دوسروں کی چیزیں تلاش کرنے کے لیے یہ نقش نہ آزمایا جائے ورنہ خلق خدا کو پریشانی اور معمول پر گناہ پڑے گا۔

ڈائنی کو حاضر کرنے کا منتر

گرہن کی رات گھی کا چراغ جلا کر ایک "لات" پر کھڑے ہو کر ڈیڑھ سو بار یہ منتر جاپیں تو ڈائنی حاضر ہو گی۔ اس کی شکل نہایت ڈراؤنی ہو گی مگر تم مت ڈرنا لیکن جس سوال کی خواہش ہو بیشک دلیر ہو کر کرنا اور دل میں جو خیال ہے مانگ لینا:۔

"سوچ ہو، دھرتی چڑھ جانا پگ پال ایڑی بیڑی تیری چال۔ انگیا ملا کے جیا برما کے چلی نہیں جاتا۔ آ جا سوری بالما تیرا انتظار ہے۔ جیا بیقرار ہے۔ اتوار ہے۔ اتوار ہے۔ اتوار ہے۔ ہے......

دل کا ہول دور ہونے کا منتر

امتحان یا الکشن وغیرہ کے نتیجے کے ہول کا مرض لاعلاج ہے۔ جس دم نتیجہ معلوم ہونے والا ہو۔ یہ چلہ کھینچیں۔

"گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں۔"

بار بار خدا کو یاد کریں اور پڑھیں۔ دل شیر ہو جائیگا۔

منتر برائے زیادتی عقل و فہم

ایک پرندہ باد ہے۔ اسکی بائیں آنکھ کو انگوٹھی میں نگینہ کی جگہ لگوا لیا جائے۔ جس وقت "آپ نے"

کہیں جانا ہو۔انگوٹھی پہن کر جائیں کوئی عقل وفہم میں تک نہ پا سکے گا۔

دشمن کو اپنا فرمانبردار بنالو

''عج عج عج دق ہی فی النساء ہم'' فلاں بن فلاں'' ''اس طلسم کو ایک کاغذ پر لکھے اور لکھ کر آگ میں جلادے۔تم دیکھو گے کہ تیسرے روز ہی دشمن مثل پالتو کتے کے فرمابردار ہو جائے گا۔ اول تو اس کا عمل کرتے ہی وہ مثل بھائی کے تابع ہو جاوے گا۔اگر اس طلسم یعنی ہمارے نقش کو دشمن کی دہلیز کے نیچے لگا دو تو خدا کی مہربانی سے دشمن کے گھر کے تمام آدمی بیمار ہو جا

تان سین گولیاں

''اگر آپ'' بے سرے ہو۔دوسرے کا کلام سناتے وقت مشاعرے میں ہوٹ جاتے ہو، مشاعرے میں بلائے نہ جاتے ہو۔دیوان نہ بک رہا ہو، تو گوالیار جاؤ میاں تان سین کے مزار پر بیری کی سات پتیاں توڑ کر مزار شریف پر فاتحہ پڑھو اور الٹے پاؤں واپس آؤ۔

پتیاں شبنم میں تازہ کر کے چالیس دن تک گراموفون میں رکھو۔چالیسویں دن نہادھو کر پتیاں پان کی طرح چبا کر ان کا لعاب ایک تام چینی کے طشت میں جمع کرلو اور سورج کی روشنی میں سکھاؤ پھر ان کی چالیس گولیاں بنا کر ان پر چاندی کے ورق چڑھا کر ایک پلاسٹک کی شیشی میں رکھ لو۔جب مشاعرے میں جاؤ گولی منہ میں ڈالو۔مشاعرہ الٹ جائے گا۔بس تم ہی تم ہو گے۔مگر یہ راز ہرگز ہرگز کسی کو نہ بتانا ورنہ گولی کام نہ دیگی اور بے اثر ہو جائے گی۔

پامیسٹری یعنی ہاتھ ریکھا کا علم

بھائی ریکھا کسی لڑکی وڑکی کا نام نہیں۔ بلکہ انگلیوں پر اور ہتھیلی میں جو موٹی لکیریں ہوتی ہیں۔ان کو ریکھا یعنی لکیریں بولتے ہیں۔جس کے جتنی کم اور صاف لکیریں ہوتی ہیں وہ اتنا ہی بھاگوان ہوا کرتا ہے۔جس کی زندگی کی لکیر جتنی گہری اور دور تک ہوگی اس کی عمر اتنی زیادہ ہوگی۔ ہلکی لکیریں عمر کی کمی اور بیماریاں بتاتی ہیں اگر کسی کے زندگی کی لکیر نہیں ہے تو وہ یا تو ابھی پیدا نہیں ہوا ہے ورنہ ضرور پریت ہے۔اسی طرح دوسری ریکھائیں شادی، غمی، لکشمی وغیرہ کے بارے میں بتاتی ہیں۔

حاضر کے واپس آنے کا خیال

فلاں آدمی باہر سے کب آئے گا۔ اس کے لیے دیکھیں عامل اور سائل کا بایاں سُر چلتا ہے تو دیر میں آئے گا ورنہ جلدی لوٹے گا دائیں سُر سے تبادلے کے بارے میں پتہ لگایا جاسکتا ہے۔

فن شریف

کسی اچھے استاد سے جیب کاٹنے کے گر سیکھو۔ اس کے بعد پاکٹ ماری کا فلیتہ حاصل کرنے کے لیے ایک شکرا پکڑو۔ اس کی بائیں آنکھ کا تل نکال لو اور گھی کے چراغ میں ڈال کر رات بھر جلاؤ، صبح اس کی بتی کو نکال کر سایہ میں سکھا لو اور داہنے ہاتھ میں امام ضامن کی طرح باندھ لو۔ چراغ کے گھی میں قینچی اور ریزر کو دم پخت کر کے جیب میں رکھ لو۔ فن شریف میں بس طاق ہو جاؤ گے۔

دیگر نسخہ

اگر پاکٹ ماری راس نہ آئے تو اخبار نکالنا سیکھ لو۔ سب سے بڑا فن شریف ہے یاد رکھو گرہ کٹ اگر کسی ایک آدمی کی پاکٹ ماری کر سکتا ہے تو اخبار نویس پوری قوم کی با آسانی جیب تراش سکتا ہے۔

وزیر بننے کے گر

کہیں سے ''بلیک منی'' لاؤ، پھر اس سے الکشن لڑو، کامیاب ہونے کے بعد اس پارٹی میں شامل ہو جاؤ جس کی حکومت ہو، وزیر بنا دیے جاؤ گے۔

آسان نسخہ یہ ہے کہ پہلے کسی پارٹی کے داس بنو اور اس کے ذریعہ مختلف لائسنس اور پرمٹ بنواؤ، خود بخود ''بلیک منی'' باافراط ہو جائے گا۔ اس کے بعد تم سے پارٹی خود الکشن لڑوائے گی۔ وزیر بنوائے گی اور تم بہت جلد داس سے باس ہو جاؤ گے۔

کام نہ کرنے اور محنت سے جی چرانے کا تعویذ

کام میں دل نہ لگتا ہو۔ پیسہ باافراط ہو یا بالکل قلاش ہو تو کہیں سے گولر کا پھول لاؤ اس کو ایک طشت میں زعفران سے دھوؤ اس کے بعد سیندور کی راکھ سے اس پر سرخاب کے پر سے یہ نقش بناؤ:۔

359 65x	موج ہو موج ہو
موج ہو موج ہو	137 -- 58

نقش کو موم جامہ کر کے ہاتھی دانت کے لاکٹ میں کسی نو چندی جمعرات کو بند کر واور گلے میں ڈال لو۔اس کے بعد کام کرنے کا بالکل جی نہ چاہے گا۔دل سیاست اور لیڈری کی طرف مائل ہوگا۔شعروشاعری میں دلچسپی بڑھے گی۔مچھلی کے شکار کا شوق پیدا ہوگا۔صحت بہتر ہوگی۔

نوٹ:۔اگر تعویذ زیادہ اثر نہ کر رہا ہو تو افیم کھانی شروع کر دو۔تعویذ جادو کی طرح اثر کرے گا اور کامیابی ہوگی۔

بلا پڑھے پاس ہو جاؤ

امتحان میں کیا رکھا ہے۔اگر پڑھنے میں من نہ لگتا ہو تو ایک لومڑی مار و اس کی مونچھیں اُکھاڑ لو اور جس کے پاس پرچہ جائے اس کے دروازے پر مونچھ کے بال ڈال دو۔ماسٹر سادی کاپی پر نمبر دے گا ورنہ نہا دھو کر ایک چاقو لو اس کو زعفران سے دھو۔اس پر یہ نقش لکھو:۔

چاقو اور کتاب لے کر امتحان دینے جاؤ۔میز پر کتاب رکھ کر چاقو گاڑ دو اور ممتحن کو دیکھ کر دل میں تین بار لاحول پڑھ کر پرچہ پڑھو اور کتاب سے نقل بے کھٹکے شروع کر دو۔کسی کی ہرگز نگاہ نہ پڑے گی اور دیکھے گا تو خاموش ہو جائے گا۔پرچہ اچھا ہوگا اور امیدوار پاس ہو جائے گا۔

امتحان سے اگر اطمینان اور ڈھارس نہ ہو تو گھر سے نکلو اور جہاں جہاں کاپی جائے منقش چاقو لے کر پہونچو۔

مکان پا جاؤ

اگر مکان نہیں مل رہا ہے اور زندگی ریلوے پلیٹ فارم یا فٹ پاتھ پر گذر رہی ہے تو مکان پھانسنے کا بہت آسان نسخہ ہے۔اخبار میں اپنا ضرورت رشتہ نکال دو۔جہاں سے بات چیت آئے مکان کی شرط رکھ دو سب بھاگ جائیں گے۔مگر ضرورت مند پنڈ نہ چھوڑے گا اور شادی کے ساتھ خانہ آبادی بھی ہو جائے گی مکان پا جاؤ گے۔گھر گرہست لوگ کہیں سے ''نقش جیسا'' لائیں اور

اس کے چاروں طرف "یا ہو یا ہو" لکھ دیں اور جو مکان رہنے کے لیے پسند ہو اس کی چوکھٹ کے نیچے نقش دبا دیں۔ مکان میں فوراً آسیب ہو جائے گا اور خالی مکان ملے گا اس میں رہنے لگیں اور نقش کسی ایسے کنوئیں میں ڈال دیں جس میں سے کبھی پانی نہ نکالا گیا ہو۔ آسیب بھی کنوئیں میں قید ہو جائے گا اور آپ مکان پا جاؤ گے۔

داماد ڈھونڈنے کا ٹوٹکا

پہلے ایک گدھا ڈھونڈو۔ پھر اس کے پیر کی خاک لو۔ اس میں ایک بھیڑ کی دُم اور فاختہ ملاؤ سب کو ایک کر و اس کا ایک دیا جلا کر اس میں گھی کا چراغ جلاؤ اور اس کا کاجل آنکھ میں لگا کر داماد کی تلاش میں نکلو قدم قدم پر دامادی کے لائق بر ملے اور فوراً رشتہ ہو جائے۔ بہت کامیاب رہے۔ لڑکا سیدھا اور لڑکی خوش رہے۔

منتر اشاہ علیؓ رضی اللہ تعالیٰ مردانِ شیر خدا

دشمن کو تباہ یا تابع کرنے کے لیے یہ منتر انیت درست کر کے ہر روز چالیس مرتبہ پڑھے۔ جس کام کے لیے پڑھے اس کی نیت کرے۔ یہ منتر انہایت مفید ہے:۔

"مردانِ علی دھنوں کھینچ باندھا سید سلطان احمد کبیر کی زنجیر تان مارا وہ شاہ اشرف قلندر کی سبز نشانِ بااستاد جب اسی مرشد کی کان پکڑ کر منترا قید کیا۔ شکست زنجیر شک ڈھال کر قید کیا سبھی ہتھیار باندھ ڈھول کو تنبو باندھ زنجیر تھول شیطان مار یہ جن بھوت باندھ سمندر، دریا مار دہائی میرے علی پیر کی دہائی علی غوث دستگیر کی دہائی —— یا اللہ! یا اللہ! یا اللہ ہو! یا اللہ یا الرحمٰن یا الرحیم۔ ختم شدہ"۔

(حسن مثنیٰ انور)

اطلاع مزید منسلکۂ درخواست مراعات

جناب وارڈن صاحب بالقابہ!

جناب عالی

یوں تو خاکسار ذرہ بے مقدار نے دفتر کے چھپے ہوئے فارم کی شکل میں دست سوال دراز کر دیا ہے۔ لیکن زیادہ سچ بات تو یہ ہے کہ میں اپنی غربت اور عسرت کی زندگی کو پیش کرنے میں بڑی حد تک ناکام ہو رہا ہوں۔ اس لیے مجھے خوف تھا کہ کہیں میری مجمل درخواست آپ کی تفصیل پسند طبیعت کے لیے قابل توجہ نہ ہو۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے چھپے ہوئے فارم کے ساتھ مزید اطلاع (Additional Information) کا 'دم چھلا' بھی لگانے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ اس طرح اگر ایک طرف آپ کو میری خارجی اور داخلی زندگی کا پورا پورا علم ہو سکے گا تو دوسری طرف میرا یہ شبہ بھی یقین کی حد تک پہنچ جائے گا کہ میں اب آپ کی انصاف پسند طبیعت کی حمایت سے محروم نہ رہوں گا۔

میرے غم کی داستان کچھ زیادہ طویل نہیں البتہ پیچیدہ ضرور ہے سچ پوچھیے تو میری مصیبت اور بے چارگی کا زمانہ 1952 سے شروع ہوتا ہے جب کہ کانگریس سرکار نے 'خاتمہ زمینداری' کا قانون نافذ کر کے مجھ غریب کی آمدنی کے سارے دروازے یکا یک بند کر دیے۔ ابتدا میں باپ دادا کی جمع

کی ہوئی تھوڑی بہت دولت تھی جس نے زخم پر مرہم کا کام دیا لیکن رفتہ رفتہ جب جمع شدہ رقم ہاتھ سے نکلتی گئی تو گویا زخم کا مرہم بھی ختم ہوتا گیا چنانچہ آج مرہم تو نہیں ہے البتہ زخم اپنی جگہ پر بدستور ہے۔ زمینداری ختم ہونے کے بعد کھیتی باڑی کا دھندا بھی اختیار کیا گیا اور انتہائی عرق ریزی و جانفشانی کے باوجود بھی کوئی اطمینان بخش صورت نہ پیدا ہو سکی۔ کبھی فصل کی فصل سیلاب کے نذر ہوئی، کبھی باران رحمت کی قلت نے ترسایا اور کبھی ٹڈی دل کے حملوں نے ہری بھری کھیتی کو ویران کر ڈالا۔ غرض کہ ہر طرف سے آفت آئی اور اس طرح آئی کہ آج تک کمر سیدھی نہ ہو سکی۔ اسی دوران میں میرے بزرگوں نے مجھے وظیفہ زوجیہ کی تعلیم پر مجبور کیا اور افکار و علائق میں ایک مزید جائداد اضافہ کی شکل ظہور پذیر ہوئی۔ میں نے اس سے قبل کبھی Concession کے لیے کوئی درخواست نہیں کی تھی۔ میں پہلے اسے کچھ بہتر بھی نہیں سمجھتا تھا۔ جب تک غموں پر بس تھا کسی نہ کسی طرح سے زم گرم حالات سے زندگی کو گذارتا رہا لیکن آج جب کہ دم لبوں پر آ گیا ہے اور افکار نے اس قدر رنجور حال کر دیا کہ حوصلے شکستہ ہو گئے ہیں اور مستقبل بھی کچھ بے نور سا دکھائی دیتا ہے تو خدا کا نام لے کے کلیجہ پر پتھر باندھ کر، دل کو مضبوط کر کے اور شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر آپ کے حضور درخواست امداد پیش کرنے کی جرأت ہوئی ہے۔ بہر حال یہ تو میری زندگی کا ایک غم انگیز نقشہ تھا جسے تاریخی پس منظر کے ساتھ دکھانے کی کوشش کی ہے لیکن میری ناگفتہ بہ احوال کی آئینہ داری میرے اشعار کریں گے جن کا تعلق میرے قلب کی گہرائیوں اور زندگی کے حقائق سے ہے اگر آپ 'شعری صداقت' کے منکر نہیں ہیں تو مجھے توقع ہے کہ آپ میرے اشعار کو میری داخلی اور خارجی زندگی کے سمجھنے اور پرکھنے کا معیار قرار دیں گے۔ اب میں چند اشعار درج ذیل کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو:۔

سوزش دل کی فراوانی نہ پوچھ — ہر تمنا آج اک ناسور ہے
لوگ دیکھیں نہ کہیں میری تباہی کے نشاں — آؤ للہ مٹا دو مرے ماتھے کی شکن
ہزار کوئی مسیحائے وقت ہو لیکن — غم حیات کی دشوار ہے مسیحائی
کچھ اس طرح سے بنے داغ دل کے گل بوٹے — کوئی نہ دیکھ سکا زخم ہائے گونا گوں
شب فراق میں تابانیوں کے حال نہ پوچھ — تمام رات جلا ہے چراغ سوز دروں
مت سناؤ مرا فسانہ غم — جل نہ جائے کہیں تمھاری زباں

زندگی تشنۂ محبت ہے ڈھونڈئے کس کا سایۂ داماں
نہ پوچھو دوستو اعجاز آتش غم دل سلگ رہا ہے بدن اور دھواں نہیں ملتا
نور و نکہت کے طلبگار کہاں پہونچے ہیں حزن مظلوم سے دیکھا ہے چراغاں ہوتا
لو کشمکش عقل و جنوں کا ہے یہ انجام اب پھول بھی کانٹا ہے مسرت میں بھی غم ہے
کبھی تو خواب ہی رو دئے کبھی رہے خاموش غرض حیات ہماری ہے بحر و بر کی طرح

مجھے ڈر ہے کہ کہیں اشعار کا طویل انتخاب آپ کی طبع نازک پر گراں نہ گزرے میں انھیں اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔اب آپ سے مؤدبانہ التماس ہے کہ آپ مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں میرے اقتصادی اور سماجی بدحالی کے ساتھ میرے ذہنی انتشار اور سیاسی بحران کا بھی جائزہ لیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان اشعار میں جو درد و کرب، اذیت، غم انگیزی، مایوسی، تباہی اور شدت احساس زوال کی واضح طور پر جھلکیاں ہیں ایک جانب اگر بھیانک اور ہولناک ہیں تو دوسری جانب مجھے قابل رحم بھی بناتی ہیں میرے منہ میں وہ زبان نہیں کہ میں آپ سے Full Freeship، Free Food اور R.R. کی درخواست وضاحت کے ساتھ کرسکوں تاہم دبی زبان سے اتنا ضرور عرض کروں گا کہ میں آپ کی عنایت کا زیادہ سے زیادہ مستحق ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ میری Academic qualification بھی میری اقتصادی زندگی کی طرح غریب اور کمزور ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بات بعض حضرات کی نگاہوں میں کھٹکے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں کمزوریاں تقریباً لازم و ملزوم ہیں اور Concession کی راہ میں کوئی روڑا نہیں اٹکاتیں۔ میرے خیال میں ان دونوں کمزوریوں نے مجھے زیادہ قابل التفات بنادیا ہے۔ ایک کمزوری اگر تعلیمی التفات چاہتی ہے تو دوسری مادی اور ان دونوں کے ملاپ نے مجھے آپ کی ذات بابرکات سے مستفیض ہونے کا زیادہ سے زیادہ موقع دیا ہے۔ اب آخر میں اس قطعہ پر اپنا عریضہ ختم کرتا ہوں:۔

پہلے ایف ایف پہ توجہ ہو ضرور دوسرے ایف ایف کا دوہرا شکریہ
دیجیے از راہ شفقت آر آر زندگی ہے درد و غم میں مبتلا

فقط،

طالب خیر، امداد علی مستحق

(مشفق خواجہ)

رسالہ در معرفت ابن انشا

تمہید

دنیائے ادب بھی عجیب جائے عبرت ہے کہ جہاں شہرت اور گم نامی دونوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ کل جو شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں صفِ اوّل میں تشریف فرما تھے، آج ان کا نام و نشان صفِ نعال میں بھی نہیں ملتا۔ ادبی تاریخوں کے متن تو کیا، حواشی بھی اُن کے تذکرے سے خالی ہیں۔ بشرطیکہ یہ ادبی تاریخیں اُنھوں نے خود نہ لکھی ہوں۔ کل استاد ذوق کے سامنے غالب کی کوئی اہمیت نہ تھی اور آج استاد ذوق کی اتنی بھی اہمیت نہیں ہے کہ جتنی استاد اختر انصاری اکبرآبادی کی ہے۔ اس صورتِ حال سے ادب کو جو نقصان پہنچتا ہے وہ تو ظاہر ہے۔ لیکن محققوں کو جو ناقابلِ تلافی زحمت اٹھانی پڑتی ہے، اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ ان بے چاروں کو پھٹے پُرانے کرم خوردہ آب رسیدہ اور سرد و گرم زمانہ چشیدہ مخطوطوں اور کتابوں کے حوالے سے گم نام "مشاہیرِ ادب" کا سراغ لگانا پڑتا ہے اور مبہم، بے کار اور بے مصرف اشاروں کی مدد سے اِن رفتگانِ ادب کی شخصیت اور کارناموں کو عظیم ثابت کرنا پڑتا ہے۔ اور جب زندگی بھر کی محنت کے بعد کسی شاعر یا ادیب کے حالات پردۂ خفا سے نکال منظرِ عام پر لائے جاتے ہیں تو بے

ہمارے محقق کو کوہ کندن اور کاہ برآوردن کا طعنہ سننا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ تحقیق نے مرزا مینڈھو سرسبز، سرمست خاں سرمست، میر گھسیٹا عشق اور میر کلو حجام کے بارے میں جو تحقیق کی ہے، بعض عاقبت نااندیش اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اگر مینڈھو سرسبز جیسے شعرا کے سال ہائے پیدائش و وفات معلوم نہ ہوتے تو اس سے ادب کا کیا نقصان ہوتا۔ افسوس کہ یہ عاقبت نااندیش یہ نہیں سوچتے کہ اگر اس قسم کے کام نہ ہوتے تو محقق حضرات اپنا خالی وقت کس طرح گزارتے۔ وہ اپنی صلاحیتوں کا یا اُن کے ضائع ہونے کا مظاہرہ کس طرح کرتے۔ آج جو لوگ محققوں پر اعتراض کرتے ہیں، انھیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کل اُن کی ذاتِ گرامی بھی کسی نہ کسی محقق ہی کی وجہ سے حیاتِ ثانی حاصل کرے گی۔ لہٰذا محققوں پر اعتراض کرنا خود اپنی ادبی حیات بعد الموت کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

سببِ تالیف

اس تمہید کے بعد ہم اصل مقصد کی طرف آتے ہیں اور ایک ایسے ادیب سے آپ کو متعارف کراتے ہیں جس کا نام گزشتہ صدی کی پانچویں دہائی سے لے کر موجودہ صدی کی پہلی دہائی تک سکۂ رائج الوقت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس طرح دار ادیب نے دنیائے ادب میں بڑے بڑے معرکے سر کیے، متعدد کتابیں لکھیں، ہر چھوٹے بڑے سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ اور خراج کے وصول کرنے میں کسی سے نرمی برتی نہ رعایت کی۔ اخباروں میں اس ادیب کے مضامین اشتہاروں کی طرح کثرت سے اور نمایاں طور شائع ہوتے تھے۔ مگر افسوس کہ آج یعنی اکیسویں صدی کے ربع آخر میں بیشتر لوگ اس عظیم صاحبِ قلم کے کارناموں سے تو کیا نام سے بھی واقف نہیں۔ نئی نسل تو خیر اُردو زبان ہی سے نابلد ہے، وہ بھلا اس ادیب کو کیا جانتی ہوگی۔ ہاں کچھ پُرانے زمانے کے بزرگ ایسے موجود ہیں جنھوں نے اپنے بچپن میں اس ادیب کو دیکھا یا پڑھا تھا، سو اُن کے تعاون سے اور بعض دستیاب شدہ نادر تذکروں اور کتابوں کی مدد سے ہم یہ رسالہ لکھ رہے ہیں جس کا نام ''رسالہ در معرفت ابن انشا'' رکھا ہے کہ شاید اس سے تاریخ تصنیف نکلتی ہو۔ امید ہے علمی حلقوں میں ہماری اس کوششِ رائیگاں کو پسند کیا جائے گا۔

نام

اس گمنام ادیب کا نام ابن انشا تھا۔ ہم نے جہاں تک اس نام کی ساخت پر غور کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصلی نام نہیں ہے۔ ابنِ انشا کا مطلب ہے، انشا کا بیٹا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انشا کون تھا، اور یہ اُس کا کون سا بیٹا تھا۔ کیوں کہ گزشتہ صدی میں کسی بھی شخص کے صرف ایک ہی بیٹا نہیں ہوتا تھا۔ ہم اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں کیوں کہ ہم ابنِ انشا کے حسب ونسب اور خاندانی حالات ومناقشات وتنازعات سے ناواقف ہیں۔ نام کے سلسلے میں خود ابن انشا کا ایک بیان ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہمارے اصلی نام میں ایک چوپائے (ابن انشا کا اصل نام شیر قیصر تھا) کا نام آتا ہے، اس لیے ہم نے اصلی نام ترک کر کے "ابن انشا" اختیار کیا۔ یہ جاننے کے لیے کہ کس چوپائے کا نام ابن انشا کے اصلی نام میں شامل تھا، ہم نے حیوانیات کے متعدد ماہرین سے رجوع کیا اور حیوانیات کی خاص خاص کتب حوالہ دیکھیں، لیکن افسوس کہ ہمیں کسی چوپائے کا ایسا نام نظر نہیں آیا، جو ابن انشا سے مطابقت رکھتا ہو۔ یہ مسئلہ مزید تحقیق کا محتاج ہے اور چونکہ ہم حیوانیات کے ماہر نہیں، اس لیے اس مسئلہ کو یہیں چھوڑتے ہیں تاکہ کوئی دوسرا محقق اس کو اٹھالے، اور پھر جھاڑ پونچھ کر اس پر مزید تحقیق یا طبع آزمائی کرے۔ البتہ اس امر کی تردید کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جو لوگ ابن انشا کو مشہور شاعر انشاء اللہ خاں انشا سے منسوب کرتے ہیں، وہ سخت غلطی پر ہیں۔ انشاء اللہ خاں ابن انشا سے کم از کم ڈیڑھ سو برس پہلے کے شاعر ہیں۔ ظاہر ہے کہ باپ بیٹے کے درمیان کئی نسلوں کا واسطہ نہیں ہوسکتا اور کوئی بیٹا باپ کے مرنے کے اتنے عرصے بعد پیدا نہیں ہوسکتا۔

وطن

ابن انشا کے وطن کا مسئلہ بھی متنازع فیہ ہے۔ چونکہ اُن کی ساری زندگی سیر وسفر میں گزری اور انھیں کسی ایک جگہ جم کر بیٹھنے کا موقع نہیں ملا اس لیے ان کا کوئی وطن متعین نہ ہوسکا۔ جن لوگوں نے ابن انشا کے کلام (نثر ونظم دونوں) کا مطالعہ کیا ہے ان کی رائے ہے کہ وہ دہلی یا لکھنؤ کے رہنے والے تھے کیوں کہ اُن کے ہاں بے شمار ایسے محاورے ملتے ہیں جنھیں دہلی اور لکھنؤ والے استعمال کرتے ہوئے جھجکتے بلکہ ڈرتے ہیں۔ لیکن بعض ایسے بزرگ جنھوں نے ابن انشا کا آخری زمانہ دیکھا یا جھیلا ہے، یہ کہتے ہیں کہ موصوف پنجابی تھے۔ ہم نے تمام ماخذوں کی چھان بین کرنے

کے بعد اور ابن انشا کے بعض جاننے والوں سے ملاقات کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ابن انشا بنیادی طور پر رہنے والے تو پنجاب کے تھے لیکن لکھنے والے پنجاب سے باہر کے تھے۔ یعنی یہی بات اگر یوں کہی جائے تو زیادہ مناسب ہوگی کہ موصوف جب بولتے تھے تو پنجابی معلوم ہوتے تھے لیکن جب لکھتے تھے تو لکھنؤ اور دہلی والوں کے بھی کان کاٹتے تھے۔ گو وہ اِن دونوں مقامات میں سے کسی کے روڑے نہیں تھے، لیکن محاورے کے ہاتھ پاؤں توڑنے میں وہ اہلِ زبان کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے تھے۔ ہمارے لیے یہ نہایت حیرت کا مقام ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے کبھی زبان کے ان مراکز کی سیر نہ کی ہو، وہ کس طرح ایسی زبان لکھ لیتا تھا جو اِن مراکز والوں کے لیے بھی باعث حیرت یا موجب عبرت تھی۔ اردو ادب کی تاریخ میں استاد امام بخش ناسخ لاہوری کے بعد ابن انشا دوسرے پنجابی اہل قلم ہیں جنھوں نے لسانی اکھاڑے میں اہل زبان پر فوقیت حاصل کی ہے اور خود ابن انشا کو ناسخ پر فوقیت حاصل ہے کہ وہ زبان سیکھنے کے لیے ناسخ کی طرح کبھی لکھنؤ نہیں گئے بلکہ لکھنؤ والوں کو یہیں بُلا کر پہلے اُن سے زبان سیکھی اور پھر اُن کی زبان درست کی، گو اِس عمل میں خود ابن انشا کے حواس درست ہوتے ہوتے رہ گئے۔

تعلیم و تربیت

ابن انشا کی تعلیم و تربیت اور ابتدائی زندگی کے حالات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا، لیکن ان کی جو تصانیف دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ گئی ہیں، اُن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اچھے خاصے تلمیذ الرحمٰن یعنی پڑھے لکھے آدمی تھے۔ علوم رسمیہ و غیر رسمیہ میں انھیں دست گاہ کامل تھی۔ البتہ یہ روایت بھی سننے میں آئی ہے کہ موصوف اپنے مضمون اور کالم دوسروں کو املا کراتے تھے اور پھر اُنھیں سے پڑھوا کر سُن بھی لیتے تھے تا کہ یہ اندازہ کر سکیں کہ کاتب کی اصلاحوں کا معیار کیا ہے۔ اصلاح اگر موقع و محل کی مناسبت سے ہوتی تو قبول کر لیتے ورنہ کاتب سے کہتے کہ مزید غور و فکر کرو اور طبیعت پر زور دے کر اصلاح دو۔ کبھی کبھی کاتب غصّے میں آ کر طبیعت کی بجائے کاغذ پر زور دے دیتا تو ابن انشا کو سارا مضمون دوبارہ املا کرانا پڑتا۔

ابھی تک ابنِ انشا کے ہاتھ کا لکھا ہوا کوئی مسوّدہ دستیاب نہیں ہوا اور نہ ہم اُن کے خط پر بحث کر کے یہ معلوم کرتے کہ وہ خطِ غبار میں لکھتے تھے یا خطِ بہار میں۔ موصوف چونکہ شاعر کی

حیثیت سے خاصے شکستہ دل تھے اس لیے گمانِ غالب ہے کہ خط شکستہ ہی میں لکھتے ہوں گے۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ عموماً قلم کان پر ہی رکھتے تھے، ہاتھ میں کم لیتے تھے، ہاں کبھی کبھار رقم وغیرہ وصول کرنے کے بعد رسیدوں پر دستخط بہ نفسِ نفیس کر دیا کرتے تھے۔ انگوٹھا اس لیے نہیں لگاتے تھے کہ بے انتہا صفائی پسند تھے۔ لیکن صفائی کا خیال صرف انگوٹھے تک محدود نہیں تھا بلکہ پورے ہاتھ کی صفائی کا خیال رکھتے تھے۔ مختصر یہ کہ نہایت قابل اور ذہین انسان تھے۔ یہ قابلیت اُن میں زیادہ تر اپنی تحریروں کے مطالعے سے پیدا ہوئی تھی۔ تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ابن انشا کی کفایت شعاری کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے، لیکن اُن کی یہ خصوصیت اکتسابی نہیں وہبی تھی۔ اس لیے اس کا ذکر ہم کسی دوسرے باب میں کریں گے۔

تصانیف

جس طرح بعض منصوبے کثیر المقاصد ہوتے ہیں، اُسی طرح ابن انشا بھی کثیر التصانیف مصنف تھے۔ لیکن اُن کی یہ تصانیف کسی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں تھیں۔ وہ اخبارات میں کالم لکھا کرتے تھے۔ کچھ عرصے بعد یہ کالم کتاب کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ کتاب سازی کا یہ طریقہ خاص اُن کی ایجاد تھا۔ اس طریقے پر عمل کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کالم نگاری جو ابنِ انشا کے بعض ہم عصروں کو لے ڈوبی، ابنِ انشا کے لیے سودمند ثابت ہوئی اور کالم نگار کے ساتھ ساتھ انھیں ادیب کی حیثیت سے بھی تسلیم کیا جاتا رہا، حالانکہ ان دونوں میں بعد مشرقین ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ادیب انھیں کالم نگار کہہ کر اپنا دل خوش کرتے تھے اور کالم نگار انھیں ادیب کہہ کر دل کی بھڑاس نکالتے تھے۔ ابنِ انشا کی کالم نگاری کا سب سے بڑا فائدہ یا نقصان یہ ہوا کہ لوگوں نے انھیں شاعر کی حیثیت سے بالکل فراموش کر دیا۔ حالانکہ ابنِ انشا کو اپنی اردو شاعری پر اتنا ہی فخر تھا جتنا غالب کو اپنی فارسی شاعری پر۔ اس صورتِ حال کا ابنِ انشا کو خود بھی پوری طرح احساس تھا اور انھوں نے اپنی تحریروں میں جا بجا اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ شاعر اُنھیں شاعر نہیں مانتے اور نثر نگار شاعروں میں شمار کرتے ہیں۔ ابن انشا کے اس اظہارِ افسوس میں ہم برابر کے شریک ہیں، گو ہمارے نزدیک ان دونوں طبقوں میں ابن انشا کی شمولیت یا عدم شمولیت سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ جو شخص ابنِ انشا بن جائے وہ شاعروں یا نثر نگاروں میں شمار ہوئے بغیر بھی اپنا کام چلا سکتا

ہے۔اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ موصوف اپنا کام نہایت خوش اسلوبی سے چلاتے رہے۔

اِبنِ انشا کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کی بسیار نویسی تھی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق موصوف نے تقریباً دس ہزار صفحات سیاہ کیے۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ سوچیں کہ ایک بسیار نویس سے کسی اعلیٰ ادبی معیار کی توقع نہیں رکھنی چاہیے، لیکن یہ خیال غلط ہے۔ ابنِ انشا کا کمال ہی یہ ہے کہ وہ بسیار نویس ہونے کے باوجود خوش نویس، یعنی عمدہ نویس تھے۔ اُن کی ایسی کوئی تحریر ابھی تک دستیاب نہیں ہوئی جس کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ یہ محض لکھنے کے لیے یا قارئین کے خلاف انتقامی کارروائی کے طور پر لکھی گئی ہے۔

یہاں یہ امر ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ ابن انشا اپنے ایک بزرگ ہم عصر نقاش فرصت، حضرت ایم، اسلم کی طرح بسیار نویس نہیں تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابنِ انشا صرف فرصت کے اوقات میں لکھتے تھے اور ایم، اسلم صاحب کو لکھنے سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ بسیار نویسی کے باوجود ابن انشا کی تحریروں میں وہ عیوب پیدا نہیں ہوئے جن سے بعض کم لکھنے والوں کی تحریریں بھی عام طور پر خالی نہیں ہوتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابن انشا اپنی تحریروں میں اپنے ذاتی عیوب اس قدر فراخ دلی سے بیان کر دیتے تھے کہ مزید کسی قسم کے عیوب کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی تھی۔ اپنے عیوب بیان کرنے والی بات ذرا وضاحت طلب ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ابن انشا جب کسی دوسرے کا مذاق اڑانا چاہتے تھے تو پہلے اپنے گریبان پر ہاتھ ڈالتے تھے اپنے بارے میں وہ ایسی باتیں بھی لکھ جاتے تھے کہ اگر کوئی دوسرا لکھ دیتا تو وہ اُس پر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ کر کے اچھی خاصی رقم حاصل کر سکتے تھے۔ مثلاً اگر آپ کسی شخص کے بارے میں یہ کہیں کہ وہ بلا کا کنجوس ہے۔ خالی پیٹ بھی ہاضمے کی دوا کھاتا ہے تاکہ اپنے آپ کو اپنی نظر میں پیٹ بھرا ثابت کر سکے تو وہ شخص یقیناً آپ سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ لیکن ابنِ انشا نے یہی بات اپنے بارے میں لکھ کر حق گوئی و بے باکی کا عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔

ویسے ابن انشا دوسروں کے وار بھی ہنس کر سہہ جاتے تھے، بلکہ بعض اوقات اس پر فخر بھی کیا کرتے تھے۔ مثلاً مشرقی پاکستان والے پرنسپل ابراہیم خان نے ایک بار انھیں اردو کا ملا دو پیازہ کہا تھا۔ یہ بات ابن انشا کو اس قدر پسند آئی تھی کہ انھوں نے اسے بطور سند اپنی ایک کتاب کے

دیباچے میں درج کیا تھا۔ معلوم نہیں ابراہیم خان صاحب نے ابن انشا سے مذاق کیا تھا یا ملا صاحب مرحوم و مغفور سے، کیونکہ ہمیں تو ان دونوں بزرگوں میں کسی قسم کی مماثلت نظر نہیں آتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ملا صاحب کے بارے میں لطیفے دوسروں نے گھڑے تھے اور ابن انشا اپنی رسوائی کا سبب خود آپ تھے۔

سننے میں آیا ہے کہ ابن انشا کے زمانے میں مشہور خونخوار قوم پری چہرگاں نے فتنہ و فساد برپا کر رکھا تھا۔ ابن انشا بھی اس قوم کی فتنہ سامانیوں سے نہ بچ سکے۔ آئے دن موصوف کے دل پر چرکے لگائے جاتے تھے جس کی وجہ سے انھیں مجبوراً ہر وقت آہ بلب رہنا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اُس زمانے کا شریف آدمی اس سے زیادہ جوابی کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔ اس آہ کی لے جب بڑھی تو وہ شاعری کا روپ اختیار کر گئی۔ گویا شعر کہنے کا مقصد وارداتِ دلی اور کیفیات بے دلی کو رقم کرنا تھا۔ جب یہ مسائل تصوّف شاعری سے حل نہ ہوئے تو ابن انشا نے اپنے غم زدہ چہرے کے آگے ہلسی کا پردہ لٹکا لیا یعنی طنز و مزاح سے دل بہلانا شروع کر دیا۔ ان کی شاعری تو صرف دل زدگاں اور از خود رفتگاں میں مقبول تھی۔ لیکن طنزیہ و مزاحیہ مضامین ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگوں میں پسند کیے گئے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اُن کے قلم سے نکلی ہوئی ہر تحریر کو طنز و مزاح کا شاہکار سمجھا جانے لگا، خواہ وہ تحریر تعزیتی شذرہ ہی کیوں نہ ہو، معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ اُن کی دل دوز اور دل سوز نظموں، غزلوں کو بھی طنز و مزاح کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ لوگ اُن کا کلام سُن کر اپنا سر دھننے کی بجائے دوسروں کا سر دھنتے اور فلک شگاف قہقہے لگاتے۔ شروع شروع میں یہ صورت حال ابن انشا کے لیے خاصی تکلیف دہ تھی، لیکن آخر آخر میں وہ خود بھی اپنا کلام پڑھ کر زیرِ لب مسکرا دیتے تھے۔

ابن انشا کی شاعری کے بارے میں کوئی رائے دینا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے کیونکہ ان کا مجموعۂ کلام دست بردِ زمانہ کی نذر ہو چکا ہے۔ البتہ یہ سننے میں آیا ہے کہ اُن کا کلام بعض گانے والوں اور گانے والیوں کی وجہ سے خاصا مقبول تھا، لہٰذا ابن انشا کی شاعری کا ذکر تفصیل کے ساتھ ہم اُس وقت کریں گے جب ان گانے والوں اور گانے والیوں کے بارے میں کوئی رسالہ لکھیں گے، فی الحال ہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ابن انشا اپنے عہد کے اچھے شاعر تھے، گو اُن کا عہد اچھی شاعری

کا عہد نہیں تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس عہد کی تشکیل میں ابن انشا کی مخلصانہ کوششوں کو بھی پورا پورا دخل تھا۔ بعد میں صرف دخل ہی رہ گیا تھا۔ کوششیں انھوں نے ترک کر دی تھیں۔

ابن انشا بنیادی طور پر سیاح تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ عالمِ سفر ہی میں رہتے تھے۔ وہ سال چھ مہینے میں چند دنوں کے لیے وطن بھی آتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انھیں اپنے وطن سے بے حد محبت تھی، لیکن حیرت ہے کہ انھوں نے کبھی وطنی اور قومی نظمیں نہیں لکھیں، حالانکہ اُن کے بعض ہم عصر اور دوست شعرا نے وطنی و قومی نظمیں لکھ لکھ کر وطن و قوم کے ساتھ ساتھ شاعری کو بھی امتحان میں ڈالا تھا۔ ہاں تو بات سفر کی ہو رہی تھی۔ ابن انشا کے لیے سفر وسیلۂ ظفر نہیں تھا بلکہ وہ ہمیشہ خود تزکیۂ نفس کے لیے سفر کیا کرتے تھے۔ اپنے گھر میں اُنھیں ہر طرح کا آرام میسر تھا۔ لیکن اُن کا خیال تھا کہ آرام انسان سے جدّ و جہد کرنے کا جوہر چھین لیتا ہے، لہٰذا ابن انشا اپنے آپ کو تکالیف اور نت نئے امتحان میں ڈالنے کے لیے سفر کرتے تھے۔ ابن انشا کی تکالیف کا ریکارڈ ان کی تصانیف کی صورت میں دستیاب ہو سکتا ہے لیکن ان لوگوں کی تکالیف کا کوئی ریکارڈ ہمارے سامنے نہیں ہے جن کے ملکوں میں جا کر ابن انشا اپنے آپ کو امتحان میں ڈالتے تھے۔ گو ابن انشا کا یہ دعویٰ ہے کہ انھوں نے اپنے سفرناموں میں دوسروں کی تکالیف بھی بیان کی ہیں، لیکن ہمیں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔

ابن انشا جب کسی غیر ملک میں جاتے تو وہاں وہ ہمیشہ ایسے ہوٹل کا انتخاب کرتے جس کا کرایہ کم ہو، بلکہ اُن کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ کوئی بغیر کرائے کا ہوٹل مل جائے تو وہیں قیام کریں۔ جب وہ کسی نئے شہر میں پہنچتے تو پہلا کام یہ کرتے کہ تمام ہوٹلوں، سراؤں، بھٹیار خانوں وغیرہ کا جائزہ لیتے۔ پورا ایک دن اسی کام کی نذر ہوتا۔ اس طرح وہ ایک دن کے قیام کا کرایہ بچا لیتے۔ پھر کسی ایسے ہوٹل کا انتخاب کرتے جہاں برسوں سے کوئی مسافر نہ آیا ہوتا۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ ہوٹل والے ابن انشا کو خود اُنھیں کی شرائط پر اپنے ہاں ٹھہرا لیتے ـــ ایسے کئی ہوٹلوں کا ذکر ابن انشا نے اپنے سفرناموں میں کیا ہے۔ ان ہوٹلوں کے کمروں کے دروازے ادوائن کی رسّی سے بند کیے جاتے تھے اور یہ رسی اتنی لمبی ہوتی تھی کہ اس کا کچھ حصہ ابن انشا بطور ازار بند بھی استعمال کر لیتے تھے۔ موصوف جب سفر سے واپس آتے تھے تو اُن کے سامان میں سب سے زیادہ تعداد اُنھیں

ازار بند کی رسّیوں کی ہوتی تھی جنھیں وہ اپنے احباب میں غیر ملکی سوغات کے طور پر تقسیم کر دیتے تھے۔

دورانِ سیاحت موصوف غیر ممالک کے نظاروں سے زیادہ اُن کی کرنسی پر نظر رکھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ کسی غیر ملک میں ضرورت سے زیادہ تو کیا ضرورت کے مطابق خرچ کرنے سے بھی اس ملک میں افراطِ زر کا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ابن انشا کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے کسی غیر ملک میں افراطِ زر کا مسئلہ پیدا نہیں ہونے دیا۔ یہ کارنامہ اردو ادب کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ یہ آب ابن انشا کے جمع کردہ زر کا نہ ہو۔ یہ بتا دینا بے موقع نہ ہوگا کہ ابن انشا روپے پیسے کے معاملات میں بے حد بے نیاز تھے۔ اُن کے بنک میں ڈھیروں روپیہ جمع ہوتا رہتا تھا لیکن وہ کبھی بھول کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھتے تھے اور نہ کسی اور کو دیکھنے کا موقع دیتے تھے۔ روپے کو انھوں نے ہمیشہ ہاتھ کا میل سمجھا بشرطیکہ روپیہ دوسروں کا ہو اور ہاتھ اُن کا اپنا۔

ابن انشا نے بے شمار ممالک کا سفر کیا تھا اور اپنے سفرناموں میں انھوں نے تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ ان سفروں کے دوران اُن پر کیا گزری۔ وہ جب بھی کسی سفر سے لوٹتے تھے تو اُن کا وزن کچھ پونڈ کم ہو جاتا تھا، اور آخر آخر میں تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ لوگ رئیس امروہوی کو ابن انشا سمجھ کر یہ مشورہ دیتے تھے کہ ''حضرت اب سیاحت کا شوق ختم کر دیجیے کیونکہ آپ کے جسمِ مبارک میں مزید کمی کی گنجائش نہیں رہی۔'' رئیس امروہوی یہ بات سُن کر شیروانی کے بٹن بند کر لیا کرتے تھے اور ابن انشا کے دیے ہوئے ادوائن کے تختے کو کس لیتے تھے۔

ہمیں بعض لوگوں کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ ابن انشا محض سفرنامے لکھنے کے لیے سفر کرتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو اُن جیسے ذہین آدمی کو سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی، وہ گھر ہی میں بیٹھ کر بہتر سے بہتر سفرنامے لکھ سکتے تھے، جس طرح ان کے بعض ہم عصروں نے لکھے ہیں۔ یہ ابن انشا کی دیانت داری کا بیّن ثبوت ہے کہ انھوں نے صرف سفرنامے ہی نہیں لکھے سفر بھی کیے تھے۔ انھیں سفرنامہ لکھنے کے لیے کوئی خاص اہتمام نہیں کرنا پڑتا تھا، وہ اتنے مستعد اور فرض شناس تھے کہ سفر کے دوران ہی سفرنامہ لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ ذہین اور دور اندیش اتنے تھے کہ بیشتر

اوقات اگلی منزل پر پیش آنے والے واقعات پیشگی لکھ لیتے تھے جو اُس منزل پر پہنچ کر حرف بحرف درست ثابت ہوتے تھے، اگر کوئی واقعہ تحریر شدہ صورت سے مختلف ہوتا تو واقعے میں تحریف گوارا کر لیتے لیکن اپنی تحریر میں تحریف پسند نہ کرتے۔ اگر اتفاقاً اگلی منزل بدل جاتی تو وہ اپنے پیشگی لکھے ہوئے سفرنامے میں صرف مقام کا نام بدل دیتے اور اپنے لکھے ہوئے واقعات کے مطابق ہی سفر کو انجام تک پہنچاتے۔

سفر کے دوران ابن انشا کو سارقوں اور رہزنوں سے بھی واسطہ پڑتا تھا۔ یوں تو اُن کے سامانِ سفر میں کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی تھی جسے کوئی چوری کر کے اپنی دنیا یا عاقبت خراب کرتا، لیکن ابن انشا خود سارقوں اور رہزنوں کی حوصلہ افزائی کرتے کہ اور کچھ نہیں تو اُن کا دل ہی چرا لیں۔ دل وحدت میں کثرت کے وہ تماشے دکھاتا کہ قدم قدم پر چوری ہو جاتا۔ ان چوریوں کے واقعات دلچسپ بھی ہیں اور معنی خیز بھی۔ لیکن افسوس کہ یہ واقعات ابن انشا کے سفرناموں میں اشاروں کنایوں میں بیان کیے گئے ہیں، تفصیل کہیں نہیں ملتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جس زمانے میں ابن انشا کے سفرنامے شائع ہوئے، اس زمانے میں اُن کے ملک میں پریس آرڈی ننس نافذ تھا جس کے تحت کوئی مخربِ اخلاق چیز شائع نہیں ہو سکتی تھی۔ ابن انشا کا ارادہ تھا کہ جب پریس آرڈی ننس کے ذریعے اخلاق کو نافذ کرنے کا سلسلہ ختم ہوگا تو وہ اپنے سفرنامے دوبارہ لکھیں گے۔ افسوس کہ ابن انشا کے جیتے جی اخلاق تو نافذ نہ ہو سکا، البتہ پریس آرڈی بدستور نافذ رہا، اس لیے موصوف کو اپنے سفرنامے دوبارہ لکھنے کا موقع نہ مل سکا۔

ابن انشا نے ایک مترجم کی حیثیت سے بھی نام پیدا کیا۔ اُن کے عہد میں لوگ تراجم کو طبع زاد تصانیف کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔ لیکن ابن انشا نے انتہائی فراخدلی سے کام لیتے ہوئے اپنی بعض طبع زاد تصانیف کو تراجم کی حیثیت سے پیش کیا۔ خصوصاً چینی نظموں کے تراجم کے بارے میں عام طور پر یہ رائے تھی کہ یہ ابن انشا کی وہ نظمیں ہیں جنھیں بوجوہ اپنے نام سے وہ پیش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ایک جگہ یہ روایت بھی پڑھنے میں آئی ہے کہ ابن انشا کی چینی نظموں کا ترجمہ چینی زبان میں ہوا تو اہلِ چین نے اسے بہت پسند کیا۔ چینی نقادوں کی رائے تھی کہ ایسی عمدہ چینی نظمیں تو خود چینی شاعروں کو بھی لکھنی نصیب نہیں ہوئیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ابن انشا کی تمام تصانیف تو دستیاب نہیں ہوسکیں۔البتہ ان کی آخری کتاب خوش قسمتی سے ہمیں مل گئی ہے،اس کا نام ہے''اُردو کی آخری کتاب'' نام سے یہ اندازہ ہوتا ہے جیسے اس کتاب کے بعد اردو میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہوگی،لیکن یہ خیال غلط ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق اس کتاب کے بعد اردو زبان میں کم از کم دو اور کتابوں کے لکھے جانے کا سراغ ملتا ہے۔ایک تو مرزا ظفرالحسن کا مجموعۂ کلام''ذکر یار چلے'' ہے اور دوسری کتاب سید محمد تقی کی 'داس کیپیٹل' جو انھوں نے مارکس نامی ایک مصنف کے اشتراک سے لکھی تھی۔اس میں خیالات سید صاحب کے تھے اور اسلوب بیان مارکس کا تھا۔ممکن ہے معاملہ اس کے برعکس ہو لیکن نتیجہ یکساں تھا۔(جملۂ معترضہ: یہاں مرزا ظفرالحسن کے بارے میں یہ بتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ آپ ابن انشا کے ہم عصر تھے۔خدا نے زبان اور قلم دونوں پر زبردست قدرت دی تھی،لیکن زبان کے سامنے قلم مرفوع القلم تھا۔موصوف مجمع لگانے کے شوقین تھے'ذکر یار چلے' اُن کی مجمع آرائیوں کا مرقع تھا۔ یہ کتاب صیغۂ واحد متکلم میں لکھی گئی تھی اور اسی صیغے کی گردان پر مشتمل تھی۔جملۂ معترضہ ختم ہوا۔)ہاں تو ذکر ہو رہا تھا ابن انشا کی 'اردو کی آخری کتاب'' کا'اس کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال تھا کہ یہ اردو کی نہیں بلکہ غلط اُردو کی کتاب تھی۔ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔کیونکہ ابن انشا غلط اردو کبھی ارادتاً نہیں لکھتے تھے،ہاں کبھی کبھی عادتاً لکھ لیتے ہوں تو دوسری بات ہے۔ معترضین کو اگر اس پر اصرار ہے کہ ابن انشا غلط اردو لکھتے تھے تو ہم اُن کا یعنی معترضین کا دل رکھنے کی خاطر یہ بات مانے لیتے ہیں۔لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی عرض کریں گے کہ جیسی غلط اردو ابن انشا لکھ گئے ویسی لوگوں کو صحیح اردو لکھنی بھی نصیب نہیں ہوتی۔''اردو کی آخری کتاب'' اگر غلط اردو کی کتاب ہے تو کاش اردو میں ایسی دو چار کتابیں اور بھی ہوتیں۔یہ کتاب دراصل ایک چھوٹا سا انسائی کلو پیڈیا ہے جس میں ریاضی،ابتدائی سائنس،حیوانیات،تاریخ اور اخلاقیات کے بارے میں بیش بہا معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔یہ معلومات بالکل نئی ہیں۔ابن انشا سے پہلے کسی مصنف یا مفکر نے ان علوم کو اتنی خوبصورتی سے سمجھنے سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔(سمجھنے کی کم، سمجھانے کی زیادہ) اس کتاب کے مطالعے سے ابن انشا کے وسیع و عریض مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے۔انھوں نے مشکل سے مشکل مسئلے کو پانی کر دیا ہے۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے

سامنے اس کتاب کا جو نسخہ ہے وہ دریدہ ہونے کے ساتھ ساتھ آب رسیدہ بھی ہے۔ یعنی مسئلے مسائل کا پانی کتاب کے اوراق تک بھی پہنچ گیا ہے۔ اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن انشا محض کالم نگار یا شاعر ہی نہیں تھے، بلکہ صحیح معنوں میں عالم بھی تھے۔ افسوس کہ تذکرۂ علمائے پاک و ہند میں ابن انشا کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

معاصرین

- ابن انشا کے بے شمار معاصرین تھے، جن میں سے اکثر کو تو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ ابن انشا اُنھیں کے زمانے کا کوئی فرد ہے۔ لیکن بعض سے موصوف کے تعلقات محض معاصرانہ ہی نہیں بلکہ دوستانہ اور عاشقانہ تھے۔ اس قسم کے معاصرین میں محمد خالد اختر، مشتاق احمد یوسفی، اور جمیل الدین عالؔی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اختر اور یوسفی کے بارے میں صرف اس قدر معلوم ہوسکا ہے کہ یہ دونوں بھی مقبول و معروف مصنف تھے اور ادبی دنیا میں ان کا نام بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ افسوس کہ اب ان دونوں کی تحریریں بھی بڑی حد تک نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو چکی ہیں۔ البتہ اختر نے ابن انشا کی ایک کتاب کے فلیپ پر جو رائے لکھی تھی اور یوسفی نے ''اردو کی آخری کتاب'' پر جو دیباچہ تحریر کیا تھا، وہ ان دونوں ادیبوں کے نمونہ کلام کے طور پر باقی رہ گئے ہیں۔ محمد خالد اختر نے فلیپ پر ابن انشا کی جو تعریف کی ہے اُس کا پہلا جملہ یہ ہے:

> ''ابن انشا بخیل اور گھٹے ہوئے لکھنے والوں میں سے نہیں جو دو سال میں ایک شاہکار کو جنتے ہیں۔ وہ فیاضی سے، فراوانی سے اور آسانی سے لکھتے ہیں۔''

ہماری رائے میں یہ ابن انشا کی تعریف نہیں، تنقیص ہے۔ محمد خالد اختر نے بخل اور گھٹن کا جننے سے اور فیاضی، فراوانی اور آسانی کا لکھنے سے تعلق دکھایا ہے۔ اگر معاملہ برعکس ہوتا تو اس جملے کو یا ابن انشا کو چار چاند لگ جاتے۔ معلوم نہیں محمد خالد اختر نے یہ بات سنجیدگی سے لکھی تھی یا بطور مزاح۔ ویسے سننے میں آیا ہے کہ اختر کا مزاح بہت سنجیدہ ہوتا تھا اور خاص خاص لوگ ہی اُس سے محظوظ ہوتے تھے۔ عام لوگ جب محظوظ ہونا چاہتے تھے تو وہ دورانِ مطالعہ اپنے دائیں بائیں دو آدمیوں کو گدگدی کے لیے بٹھا لیتے تھے۔ اس طرح وہ پڑھتے بھی جاتے تھے اور ہنستے بھی جاتے تھے۔

مشتاق احمد یوسفی نے ابن انشا کی کتاب پر جو دیباچہ لکھا ہے وہ نثر میں قصیدہ گوئی کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس دیباچے میں یوسفی نے ابن انشا کا دل رکھنے کو اُنھیں مزاح نگاروں کے قبیلے کا تارا کہا ہے تاکہ چاند کسی اور کو کہا جا سکے۔ اور اپنے دل کی بات اس طرح بیان کی ہے کہ ''بچھو کا کاٹا روتا اور سانپ کا کاٹا سوتا ہے۔ انشاجی کا کاٹا سوتے میں مسکراتا ہے۔'' گویا یوسفی یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ابن انشا کاٹا بھی کرتے تھے۔ اس انداز میں کوئی ہماری کسی کتاب کا دیباچہ لکھتا تو ہم اُس کتاب کو اپنی تصانیف سے اور دیباچہ نگار کو اپنے حلقۂ احباب سے خارج کر دیتے۔ ابن انشا کی یہ وسیع القلبی ہے کہ انھوں نے یوسفی کی اس بات کو نہ صرف برداشت کیا بلکہ بطور دیباچے کے اپنی کتاب میں شامل کیا کہ کتاب کے ساتھ یہ دیباچہ بھی ایک دوست کی واحد یادگار کے طور پر محفوظ رہ جائے۔

ابن انشا کے تیسرے ہم عصر جمیل الدین عالی اپنے عہد کے مشہور شاعر، کالم نویس اور قومی نغمہ نگار تھے۔ ان کے بارے میں ابن انشا کی یہ رائے تھی کہ اُن کی شاعری کو کالم نویسی اور کالم نویسی کو اُن کی قومی نغمہ نگاری لے ڈوبی۔ لیکن الحمدللہ کہ قوم محفوظ رہی۔ ابن انشا کی یہ رائے تعصب اور حسد پر مبنی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ عالی میں بہت سی خوبیاں ایسی تھیں جو ابن انشا کو چھو کر بھی گزر جاتیں تو ابن انشا کچھ سے کچھ ہو جاتے۔ اس لیے ابن انشا عالی کے مقابلے پر اپنے آپ کو ہمیشہ ایک احساسِ محرومی کا شکار پاتے تھے۔ مثلاً عالی اپنے دور کے مشہور شاعر تھے، جب وہ مشاعروں میں پڑھتے تھے تو علمِ موسیقی کے اسرار و رموز سے ماہرانہ آشنائی کا ثبوت دیتے ہوئے پڑھتے تھے۔ اس کے برعکس ابن انشا کو اول تو مشاعروں میں بلایا نہیں جاتا تھا اور اگر بلایا جاتا تھا تو پڑھوایا نہیں جاتا تھا۔ عالی کے نغمے بچے بچے کی زبان پر تھے اور آخری زمانے میں تو صرف بچوں ہی کی زبان پر رہ گئے تھے۔ لیکن ابن انشا کی شاعری بچوں میں بھی مقبول نہ تھی، حالانکہ اُس کا ایک حصہ بطور خاص بچوں ہی کے لیے لکھا گیا تھا۔ سننے میں آیا ہے کہ جب ابن انشا شاعری کے معاملے میں بڑوں سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے بچوں کو شیشے میں اتارنے کے لیے بہت سی نظمیں لکھیں۔ ان نظموں کے مجموعے کا نام ''بلّو کا بستہ'' ہے۔ جسے بچوں سے زیادہ بڑی عمر کے تبصرہ نگاروں نے پڑھا اور تعریفی تبصرے لکھے۔

عالی سے حسد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عالی ابن انشا سے بڑے سیاح تھے۔ انھوں نے بعض ایسے ممالک کی بھی سیاحت کی تھی جن کا ابن انشا کے سفرنامے میں نام تک نہیں آیا۔ عالی نے سفرنامہ لکھنے کی روایت قائم کی اور ابن انشا نے اُن کی تقلید کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ عالی سفر میں آگے نکل گئے اور ابن انشا سفرنامے میں۔ لیکن ہم سچی بات کہیں گے، عالی کا سفرنامہ ایک علمی چیز ہے اور ابن انشا کا سفرنامہ علم سے تہی ہے۔ عالی کے سفرنامے میں جو معلومات ملتی ہیں وہ ابن انشا کے سفرنامے میں تو کیا، انسائی کلوپیڈیا برٹنیکا میں بھی نہیں ملتیں۔ عالی کے سفرنامے سے لوگ عبرت حاصل کرتے تھے اور ابن انشا کے سفرنامے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا تھا۔

ابنِ انشا اور عالی ایک ہی اخبار میں کالم لکھتے تھے اور دونوں اپنے اپنے قارئین میں مقبول تھے۔ البتہ ایک معاملے میں عالی کو ابن انشا پر فوقیت حاصل تھی اور وہ یوں کہ ابن انشا کا کالم معرّی یعنی بغیر تصویر کے ہوتا تھا اور عالی کے ہر کالم کے ساتھ ان کی تصویر ہوتی تھی۔ اس وجہ سے عالی کا کالم ابن انشا کے کالم سے زیادہ دیکھا جاتا تھا۔ یہ امر بھی ابن انشا کے لیے تکلیف دہ تھا۔ اپنی تکلیف دور کرنے کے لیے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مہینے میں دو ایک مرتبہ عالی کو موضوع بنا کر شگفتہ اردو لکھنے کی مشق کرتے۔ مشتاق احمد یوسفی نے وہ جو کاٹنے والی بات لکھی ہے۔ اس کا اشارہ شاید اسی بات کی طرف تھا۔

کبھی کبھی عالی اپنے اشہبِ جہندۂ قلم کو میدانِ وسیع بیان میں گرم عنان و جولان کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے اور ابن انشا پر بے تکلفانہ جملے کس دیتے تھے۔ لیکن اس بے تکلفی کا فائدہ بھی ابن انشا ہی کو پہنچتا تھا اور وہ بات سے بات نکال کر عالی کے مداحوں کو مزید گمراہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

عالی اور ابن انشا ایک دوسرے کے بارے میں جو کچھ لکھتے تھے، اُسے بعض لوگوں نے ''ملی بھگت'' کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی مشہوری کے لیے طے شدہ پروگرام کے مطابق کالم لکھتے تھے اور چھپنے سے پہلے ایک دوسرے کو دکھا لیتے تھے۔ بلکہ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس قسم کے کالم ان دونوں میں سے ایک ہی شخص لکھتا تھا اور یہ کالم باری باری دونوں کے نام سے چھپتے تھے۔ لیکن ہمیں اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں کالم جداگانہ

اسلوب کے حامل ہوتے تھے۔ ابن انشا کا کالم ''واہ'' ہوتا تھا تو عالی کا '' آہ'' گویا میر و سودا والا معاملہ تھا۔ بہر حال اس ''ملی بھگت'' کا یا معاصرانہ چشمک کا یہ نتیجہ نکلا کہ عالی نے نثر لکھنی تو کیا نثر میں گفتگو تک کرنی چھوڑ دی۔

خاتمہ

ابن انشا کے بارے میں ہمیں جو کچھ معلوم تھا اور جو کچھ معلوم نہیں ہو سکا، وہ سب کچھ ہم نے اس رسالے میں بلا کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ ہم اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں، اس کا اندازہ کچھ ابن انشا ہی کر سکتے تھے۔ کاش وہ آج ہم میں موجود ہوتے تو دیکھتے کہ ہم نے اُنھیں حیاتِ نو عطا کرنے کے لیے کس قدر زحمت اٹھائی ہے۔ اتنی زحمت تو ابن انشا نے اپنے سفروں کے دوران بھی نہیں اٹھائی ہوگی۔ آخر میں قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر اُنھیں اس رسالے میں کوئی غلطی نظر آئے تو اُسے موضوع کی خوبی سمجھ کر نظر انداز فرمائیں اور اگر کوئی خوبی نظر آئے تو ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

(مجتبیٰ حسین)

قصہ پہلے گریجویٹ درویش کا

اے بزرگانِ ذی احترام، خواتینِ خوش خرام، نوجوانانِ بدکلام و طفلانِ بے لگام، راوی اس جھوٹے قصے کا یوں بیان کرتا ہے کہ کسی زمانے میں ایک شہر آباد تھا کہ جس کے کھنڈرات اس کے شاندار مستقبل کی جھوٹی گواہی دیتے تھے اور چونکہ باشندے یہاں کے بہت خوش حال تھے یعنی غربت سے مالا مال تھے۔ اسی لیے اس شہر میں عوام کی تفریح کے لیے ایمپلائمنٹ ایکسچینج کا ایک دفتر بھی قائم تھا جہاں بڑے بڑے نامی گرامی تعلیم یافتہ نوجوان اپنے اسم ہائے گرامی درج کروانے آتے اور اوقاتِ فرصت میں اس دفتر کے احاطے میں بیٹھ کر خوش گپیوں اور کبھی کبھار "رنج گپیوں" میں مصروف رہتے تھے۔ جب بھی کوئی ناعاقبت اندیش نوجوان یونیورسٹی میں علم کی پیاس بجھالیتا تو وہ اپنی بھوک مٹانے کے لیے اس دفتر کا رُخ کرتا اور برسوں اس دفتر سے واپس نہ لوٹتا۔

سو اس قصہ کا راوی غیر معتبر پیچھے ہٹ کر یوں بیان کرتا ہے کہ ایک دن اس دفتر کے احاطہ میں کہ جس کا قطر 25 میل تھا، چار گریجویٹ درویش اپنے ایمپلائمنٹ کارڈوں کی پانچ سو چھٹی مرتبہ تجدید کروانے آئے۔ لیکن دفتر کے کھلنے میں ابھی بہت دیر تھی، یعنی ہر طرف اندھیر تھی۔ اسی

لیےان چاروں درویشوں نے جو شدتِ غم سے نڈھال تھے مگر شجاعت میں بے مثال، تھے یہ طے کیا کہ ہر نوجوان اپنی زندگی کا قصہ بیان کرے اور یوں اپنا غم ''صیح'' کرے۔

صاحبو! یہ قصہ بہت طولانی ہے اور جان بھی ایک دن جانی ہے۔ پس، اے صاحبان اپنی عینکوں کے شیشوں کو صاف کیجیے اور اس قصہ کو غور سے سنیے اور اگر ہو سکے تو ایک دوسرے کے کلیجے بھی تھام لیجیے۔

پھر پہلے گریجویٹ درویش نے کہ جس کی ایک آنکھ سے آنسوؤں کا سیلاب مسلسل بہہ رہا تھا دوسرے درویش کی ٹیڈی پتلون کی جیب سے ایک ٹوٹی ہوئی کنگھی نکالی اور اپنے بالوں کو سلیقے سے جمانے کے بعد ایک ایسی زوردار مصنوعی آہ کھینچی کہ اس کی شدت سے اس کے بال پھر بکھر گئے۔ پہلے گریجویٹ نے دوسرے گریجویٹ کو کنگھی واپس کی، پھر تیسرے گریجویٹ کی پتلون کی جانب متوجہ ہوا اور بولا:

''اے میرے پیارے بھائی! قبل اس کے کہ میں اپنی داستان سناؤں، مجھے ایک سگریٹ پلا کہ میں نے تین دن سے ایک سگریٹ بھی نہیں پی ہے''۔

اس پر تیسرا گریجویٹ رونی صورت بناتے ہوئے بولا ''پیارے رفیق، تونے صرف تین دن سے سگریٹ نہیں پی ہے مگر میں نے تو ایک ہفتہ سے سگریٹ کی شکل تک نہیں دیکھی، لہذا مجبوری ہے، پس اپنی داستان سگریٹ کے بغیر ہی سنائیو۔'' یہ سن کر پہلے گریجویٹ کی دوسری آنکھ سے بھی آنسو بے اختیار بہنے لگے۔ اس نے اپنے حواس درست کیے اور بولا:

''اے میرے درویش بھائیو! تب تو کوئی فکر کی بات نہیں۔ میں سگریٹ کے بغیر ہی اپنی داستان سناؤں گا، تو صاحبو، کان کھول کر سن لو کہ یہ حقیر فقیر کہ نام جس کا لیس، اے غلام بخت، قسمت جس کی کم بخت اور عقل جس کی محتاج بخت ہے، رہنے والا مملکتِ دکن کا ہے جہاں کی ہر شے نرالی ہے، جہاں کا ہر شخص موالی ہے اور جس کا محبوب مشغلہ قوالی ہے۔''

پہلے درویش نے اپنی داستان یہیں تک سنائی تھی کہ چوتھے گریجویٹ نے جو بظاہر ادب کا گریجویٹ معلوم ہوتا تھا مگر بباطن نان میٹرک نظر آتا تھا اُٹھ کھڑا ہوا اور جھاڑو سے اپنے کپڑے جھاڑ کر بولا: ''اے میرے منہ بولے بھائی، تمھاری داستان کا آغاز ہی غلط ہوا ہے، کیونکہ صدیوں

سے یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ جب بھی کوئی درویش اپنی داستان سناتا ہے تو وہ اپنی داستان سے پہلے ایک غیر متعلق شعر بھی سنا دیتا ہے پس تو بھی ایک شعر سنا اور اپنے آبا و اجداد کی بھٹکی ہوئی روحوں کو باغ باغ کر دے۔'' پہلا گریجویٹ بولا: ''اے ادب کے ویران خانقاہ کے مجاور، مجھے یونیورسٹی سے نکلے ہوئے چھ سال ہو چکے ہیں۔ لہٰذا اب ایمپلائمنٹ کارڈ کے نمبر کے سوا کوئی شعر یاد نہیں ہے۔ پھر بھی جو تیری خواہش کی تکمیل کروں گا۔ یہ کہہ کر پہلا گریجویٹ سوچ میں اتنا غرق ہو گیا کہ ڈوبتے ڈوبتے بچا اور جب ابھرا تو بولا: ''لو صاحبو، مجھے شعر یاد آ گیا ہے، نہ جانے کس افسانہ نگار کا ہے۔ عرض کیا ہے کہ۔

ہزاروں سال 'نمی' اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس شعر کو سن کر ادب کا گریجویٹ پھر اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا: ''اے برادر خورد، اپنی زبان سنبھال اور شعر کو غلط نہ پڑھ۔ کیونکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ شعر علامہ اقبال کا ہے اور اس شعر میں تو جہاں اداکارہ 'نمی' کا ذکر کر رہا ہے وہاں پدما شری نرگس کا ذکر ہونا چاہیے تھا۔''

پہلا گریجویٹ بولا: ''اے ادب کے بے ادب گریجویٹ تو ہمارے نقار خانے میں اپنے طوطی کو بار بار بولنے پر کیوں مجبور کرتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ شعر میں 'نمی' کا ذکر ہے یا پدما شری نرگس کا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ استاد محترم تو یہاں بیگم پارہ پڑھایا کرتے تھے۔'' اس استدلال کو سن کر ادب کے گریجویٹ کو اتنا غصہ آیا کہ وہ لیڈر کی طرح رنگ بدلنے لگا۔ پھر وہ پہلے گریجویٹ پر حملہ آور ہونا ہی چاہتا تھا کہ تیسرے درویش نے مداخلت کی اور بولا: ''بھائیو! میں سمجھتا ہوں کہ اس شعر میں 'نمی' اور نرگس دونوں کا ذکر موزوں معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ 'نمی' اور نرگس دونوں بھی ایک ہی کیا لیبر کی اداکارائیں ہیں۔ اس طرح شعر کی معنویت اور اس کی نزاکت کو ٹھیس پہنچنے کا کوئی خدشہ نہیں ہے۔ پس اے پہلے گریجویٹ، اپنے قصہ پارینہ کو جاری رکھ اور ادب کے گریجویٹ کی بے ادبی پر اتنا کف افسوس نہ مل کہ تیرے منہ سے کف نکلنے لگ جائے۔'' پہلا گریجویٹ سنبھلا اور بولا: ''تو صاحبو! یہ حقیر فقیر پُرتقصیر جو ستم ہائے روزگار کا مارا ہوا، کرم ہائے بے روزگاری کا ستایا ہوا، یونیورسٹی سے نکالا ہوا، کالج کی نازنینوں کا نچایا ہوا، والدین کا

دھتکارا ہوا، رہنے والا ملک دکن کا ہے جہاں کا مشہور میوہ املی ہے، جہاں کا مشہور درخت املی کا درخت ہے اور جہاں کا مشہور بن، املی کا بن ہے۔ صاحبو! میرا جنم ایک تحصیل دار کے گھرانے میں ہوا۔ پس مجھے وہ ساری سہولتیں حاصل تھیں جو دیگر تحصیل داروں کے بیٹوں کو حاصل تھیں۔ میری ابتدائی تعلیم جو اتفاق سے میرے حق میں آخری تعلیم بھی تھی، گھر پر ہوئی۔ یہ گھر کرایہ کا تھا اور قلب شہر میں واقع تھا جس کے حدود اربع یہ تھے کہ اس کے شمال میں ایک ہوٹل تھا، اس کے جنوب میں ایک خانہ، اس کے مشرق میں ایک ریسٹورنٹ اور اس کے مغرب میں گلنار کیفے واقع تھا۔ غرض ہوٹلوں نے نام بدل بدل کر ہمارے گھر کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ دوستو، وہ بھی عجیب دن تھے کہ جب ہر صبح مرغانِ خوش الحان ریڈیو سے فلمی نغمے سنایا کرتے تھے۔ اور کانوں میں گنے کا رس گھولا کرتے تھے۔ قصہ مختصر، میں نے جب ہوش سنبھالا تو میرے والد کے ہوش ٹھکانے لگ گئے اور انھیں میری تعلیم کی فکر ہوئی۔ مگر افسوس کہ میرے والد نے خود اپنی تعلیم کی فکر کبھی نہیں کی، کیونکہ والد میرے مڈل کامیاب تھے۔ خیر میری تعلیم شروع ہوئی اور گھر پر استادوں کا تانتا بندھ گیا۔ تاریخ کے اُستاد، اُردو کے اُستاد، ریاضی کے اُستاد، جغرافیہ کے اُستاد، گوشمالی کرنے کے اُستاد، مرغا بنانے کے اُستاد، کھانا پکانے کے استاد، سودا سلف لانے کے استاد، وغیرہ وغیرہ۔

اُستادوں کی اتنی افراط تھی کہ میں تو کرسی پر بیٹھا رہتا اور بے چارے استاد میرے سامنے پنجوں پر کھڑے رہتے۔ میرے لیے بہت مشکل تھا کہ میں بیک وقت اتنے سارے استادوں کا احترام کرتا، لہٰذا میں صرف ریاضی کے استاد کا احترام کرتا تھا اور بقیہ سارے استادوں کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ریاضی کے استاد کا احترام مجھ پر اس لیے بھی لازم تھا کہ ریاضی میری سب سے بڑی کمزوری تھی۔ تو صاحبو! ان دنوں میری حالت اس مرغی کی سی تھی جو دو ملاؤں کی لڑائی جھگڑے کے درمیان موقع پا کر فرار ہو جاتی ہے۔ میں پڑھتا رہا اور میرا غم بڑھتا رہا۔ میں صبح دوگنی اور دوپہر چوگنی زوال کی منزلیں طے کرتا رہا۔ حساب میں جس کا تخلص ریاضی ہے اتنی بار فیل ہوا کہ جس کا حساب نہیں رکھا جا سکتا۔ اُردو چونکہ میری مادری زبان تھی اور چونکہ میں اپنی والدہ کا احترام نہیں کرتا تھا اس لیے مجھ سے جگہ جگہ املا کی غلطیاں سرزد ہو جایا کرتی تھیں۔ والد میرے اس زوال کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے کیونکہ میں انھی کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ بالآخر مجھے ایک سرکاری مدرسہ میں داخل

کروایا گیا۔ سرکاری مدرسہ میں جاتا تھا کہ میری بے پناہ صلاحیتیں اچانک اُجاگر ہونے لگیں اور میں کھیل کود، سیر سپاٹوں اور شرارتوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا، اور چوری چھپے داخل درنصاب فلمیں جیسے سکندر اعظم، راجہ ہریش چندر اور شکنتلا دیکھنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے میٹرک کے امتحان میں جوگل کھلائے وہ دنیا کے کسی باغ میں دستیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ مثلاً تاریخ کے پرچے میں میں نے سکندر اعظم اور راجہ پورس کی لڑائی کا حال یوں لکھا تھا کہ: ''سکندر اعظم جب ہندستان پر حملہ آور ہوا تو اس وقت تک پانی پت کا میدان تیار نہیں ہوا تھا۔ اسی لیے سکندر اعظم اور راجہ پورس کو مجبوراً یہ لڑائی دریائے جہلم کے کنارے لڑنی پڑی۔ یوں تو لڑائی میں دونوں بادشاہوں کے سپاہی حصہ لے رہے تھے، لیکن لڑائی میں بار بار سکندر اعظم اور راجہ پورس ہی نمایاں نظر آتے تھے۔ ایک مرحلے پر سکندر نے میان سے تلوار نکالی اور پورس پر حملہ آور ہوا۔ لیکن پورس نے ڈھال کی مدد سے سکندر کے وار کو بیکار کر دیا۔ اور بڑی تمکنت کے ساتھ بولا: ''اے سکندر اعظم، اپنی جان کی خیر منا اور اسی وقت اپنی فوجوں کو لے کر واپس چلا جا ورنہ تو اپنی لاش خود اپنے کندھوں پر اٹھا کر یہاں سے واپس جائے گا۔'' سکندر اعظم مسکرایا اور پرے ہٹ گیا، اس نے پینترا بدلا اور پورس پر دوبارہ حملہ آور ہوا لیکن یہ وار بھی پروگرام کے مطابق خالی گیا۔ اب سکندر اعظم کی آنکھوں سے آگ کے شعلے برسنے لگے، اس کے چہرے پر خون سمٹ آیا، اس کے دانت بجنے لگے، اس نے پھر تلوار اُٹھائی اور پورس پر حملہ آور ہوا ہی چاہتا تھا کہ اچانک پیچھے سے آوازیں آنے لگیں ''چائے گرم، چائے گرم، سوڈا لیمن، پان بیڑی سگریٹ''، لوگ کرسیوں پر سے اٹھ کر باہر جانے لگے، ہم لوگ بھی انٹرول میں سگریٹ پینے کے لیے باہر چلے گئے۔ واپس ہوئے تو دیکھا کہ راجہ پورس کو گرفتار کر کے سکندر اعظم کے حضور میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سکندر اعظم نے ہمارے غیاب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راجہ پورس پر فتح حاصل کر لی تھی۔ لوگ سکندر اعظم کو بڑا بادشاہ مانتے ہوں تو شوق سے مانیں لیکن میں یہ کہوں گا کہ سکندر اعظم لاکھ اعظم سہی، اُسے اداکاری مطلق نہیں آتی تھی۔''

میرے درویش بھائیو! میں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں کئی کارنامے انجام دیے اور اگر میں ان کارناموں کو تفصیلی طور پر بیان کروں تو شاید تمھاری دو روزہ زندگی ختم ہو جائے اور تم لوگ میرا قصہ سننے کے بعد گھروں کی طرف جانے کی بجائے سیدھے قبرستان کا رخ کرو۔ ایک بار تاریخ

کے استاد نے مجھ سے پوچھا: ''بتاؤ فرانس میں کتنے لوئی گزرے ہیں؟'' اس پر میں گننے لگا کہ لوئی اول، لوئی دوم، لوئی سوم، لوئی چہارم، لوئی پنجم، لوئی ششم، لوئی ہفتم، لوئی ہشتم، لوئی نہم، لوئی دہم، لوئی میٹرک، لوئی بی اے (جونیر) اور لوئی بی اے (فائنل)۔ خوش قسمتی سے ہمارے تاریخ کے استاد اتنے رحم دل تھے کہ جہانگیر بادشاہ بھی اتنا رحم دل نہ رہا ہوگا۔ لہٰذا وہ از راہِ رحم دلی بچوں کو زدوکوب کرنے کی بجائے خود اپنا سر پیٹ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے میرے جواب کو سن کر مجھے پیٹنے کے بجائے اپنا سر پیٹ لیا اور بولے ''بیٹا، تو فرانس کے لوئیوں کو غلط گن رہا ہے، دماغ پر بار ڈال، کیونکہ لوئی دہم کے بعد لوئی میٹرک نے حکمرانی نہیں کی تھی۔'' اس پر میں نے دماغ پر زور دیا اور لوئیانِ فرانس کو پھر یوں گننے لگا: ''لوئی اول، لوئی دوم، لوئی سوم، لوئی چہارم، لوئی پنجم، لوئی ششم، لوئی ہفتم، لوئی ہشتم، لوئی نہم، لوئی دہم، لوئی چہلم۔''

استاد نے پھر سر پیٹ لیا اور بولے: ''بیٹا لوئی دہم کے بعد لوئی چہلم کس طرح آسکتا ہے؟''
میں بولا: ''کیوں نہیں آسکتا۔ جب کہ ہمارے دادا کے انتقال پر دہم کے بعد ان کا چہلم ہی ہوا تھا۔
''تاریخ کے ایک اور پرچے میں، میں نے شاہجہاں کی فنِ تعمیر سے دلچسپی کا حال یوں لکھا تھا کہ:

''شاہجہاں کو فنِ تعمیر سے بہت دلچسپی تھی۔ اسے جب بھی موقع ملتا، پھاوڑا اور تھاپی لے کر عمارتیں تعمیر کرنے لگ جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ملک میں اتنی عمارتیں نمودار ہوئیں کہ ان میں رہنے کے لیے لوگوں کو تلاش کرنا پڑتا تھا، ان کی منت سماجت کرنی پڑتی تھی۔ جب کوششِ بسیار کے بعد بھی عمارتوں کے لیے مکین فراہم نہ ہوسکے تو بادشاہ نے حکم دیا کہ ان عمارتوں میں مردوں کو دفن کردیا جائے تاکہ ان عمارتوں کو بنانے کا مقصد پورا ہو، چنانچہ خود بادشاہ بھی اپنے حکم کی تعمیل میں ایک عمارت میں دفن ہوا۔ حوالے کے لیے ملاحظہ ہو تاج محل جو آگرہ میں ہے۔ بادشاہ نے جب خوب سیر ہوکر عمارتیں تعمیر کرلیں تو وہ فنِ تعمیر کے دیگر شعبوں کی جانب متوجہ ہوا۔ چنانچہ اس نے بڑے بڑے پہاڑ بنوائے اور وسیع و کشادہ دریا کھدوائے۔ ہمالیہ پہاڑ شاہجہاں ہی نے بنوایا تھا۔ ایک سمندر بھی بنوایا تھا جسے تاریخ میں بحرِ ہند کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سمندر کو تعمیر کرنے کے بعد بادشاہ بہت پریشان ہوا، کیونکہ اس میں پانی نہیں تھا لہٰذا اس نے رعایا کو حکم دیا کہ وہ خلیجِ بنگال سے پانی بالٹیوں میں بھر کر کے بحرِ ہند میں ڈالے۔ چنانچہ لگاتار دس برس تک بحرِ ہند میں پانی ڈالا گیا۔ دوسرے سمندروں

کی مچھلیاں اور وہیل مچھلیاں پکڑ پکڑ کر اس سمندر میں چھوڑ دی گئیں، تب کہیں جا کر یہ سمندر تعمیر ہوا۔" پہلے درویش نے اپنی داستان یہاں تک سنائی اور اچانک چھ زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر دیگر درویشوں کی جانب متوجہ ہو کر بولا: "بھائیو! میں تو قصہ سنانے میں مصروف ہوں اور تم اسے شوق سے سننے میں مصروف ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ دفتر کھل کر بند ہو جائے، ایمپلائمنٹ کارڈ تقسیم ہو جائیں اور ہم یہیں بیٹھے رہیں۔ لہٰذا ہر درویش باری باری سے دفتر کے حالات پر کڑی نظر رکھے۔"

دوسرا درویش بولا: "اے درویش! تجھے غلط فہمی ہوئی ہے کہ میں تیرا قصہ سن رہا ہوں۔ میں تو برابر ٹکٹکی باندھے ایمپلائمنٹ کارڈ تقسیم کرنے والے کلرک کی کھڑکی کو دیکھ رہا ہوں۔ پس تو سکونِ قلب سے اپنے قصہ کو جاری رکھیو۔" اس پر پہلا درویش اُٹھ کر قریبی نل کے پاس گیا، جب خوب سیر ہو کر پانی تناول کر چکا تو دوبارہ واپس ہوا اور یوں گویا ہوا: "اے صاحبو! تو قصہ یوں چلتا ہے کہ میرے میٹرک کا امتحان کامیاب کرنے تک میرے والد کو طرح طرح کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ میری ایک کامیابی کے لیے میرے والد کو کئی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر میرے والد نے میرے خلاف گہری سازش کی اور ممتحن پر اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے مجھے امتحان میں کامیاب کرا دیا۔"

جب میں کالج میں داخل ہوا تو زندگی نکھار پر آئی ہوئی تھی۔ ہر طرف رنگینیاں تھیں لیکن میری زندگی کا وہی حال تھا یعنی میرا کلاس میں ٹکنا محال تھا۔ صاحبو! میں نے پڑھنے کی بہت کوشش کی لیکن چند جاسوسی ناولوں کے سوا کچھ نہ پڑھ سکا۔ انگریزی اور اردو میں میری استعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ مگر خوشی اس بات کی تھی کہ میرے دوستوں کی انگریزی بھی اتنی ہی کمزور تھی جتنی کہ میری۔ چنانچہ میں آپ حضرات کو اپنے ایک دوست کا قصہ سنانا چاہتا ہوں کہ ایک بار کینٹین میں ایک شخص سے لڑائی ہو گئی۔ اس شخص نے میرے دوست سے کہا: "یو ڈیم ایڈیٹ! میرے دوست نے اس کا کچھ نوٹس نہ لیا۔ البتہ وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ آدھا گھنٹہ نہ گزرا ہوگا کہ وہ پھر واپس ہوا اور نہایت غصہ کے عالم میں پوچھنے لگا" وہ شخص کہاں گیا جس نے ڈیم ایڈیٹ کہا تھا۔" ہم نے کہا وہ تو چلا گیا۔ اس پر وہ بولا" مجھے اس کا اتا پتہ بتاؤ میں اسے مزہ چکھانا چاہتا ہوں۔" ہم لوگوں نے کہا جب اس نے تمھیں ڈیم ایڈیٹ کہا تھا تو تم نے اسی وقت مزہ کیوں نہیں چکھایا؟ وہ بولا:۔ "بھائیو میں ابھی ابھی ڈکشنری میں اس لفظ کے معنی دیکھ کر آ رہا ہوں اور مجھ پر ابھی ابھی دوست پہلے یہ

انکشاف ہوا ہے کہ اس نے آدھا گھنٹہ پہلے مجھے گالی دی تھی۔"

غرض دوستو، انگریزی کی بات تو بہت بڑی ہے خود میری اُردو اتنی کمزور تھی کہ میں بات چیت کرتے وقت بھی املا کی غلطیاں کر بیٹھتا تھا۔ اگر آپ اسے مذاق سمجھیں کہ ایک شخص بات چیت میں املا کی غلطیاں کس طرح کر سکتا ہے تو میں اس کے لیے آپ کو بیت بازی کے اس مقابلہ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس میں شریک ہوا تھا۔ مخالف ٹیم کے ایک طالب علم نے شعر پڑھا۔

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

اس پر میں نے تڑاخ سے یہ شعر پڑھ دیا تھا۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اے میرے موئسو وغم خوارو! یہی وہ دن تھے جب میں پڑھنے پڑھانے سے عاجز آ چکا تھا کہ ایک دن میری نظر کالج کی ایک حسینہ پر پڑی کہ جس حسینہ کا نام مہ لقا تھا اور جس کا محبوب عطر، عطر لخلخہ تھا۔ پہلی نظر میں تو میں اس لڑکی پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا لیکن دوسری نظر میں اس پر بمشکل پانچ سو جان سے عاشق ہو سکا۔ کیونکہ جب میں نے اسے دوسری بار دیکھا تو اس کا میک اَپ اُتر چکا تھا۔ میں آٹھوں پہر عشق کی آگ میں جلنے لگا۔ ایک دن میں نے فیصلہ کیا کہ اس پری چہرہ حسینہ پر اپنے عشق کا اظہار کرنا چاہیے۔ اس وقت تک میرے عشق کی حالت یہ تھی کہ بس ایک ہی طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ مگر اس حسینہ کے حضور میں جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ سو میں نے ایک ترکیب نکالی اور اس کی ایک سہیلی کی خدمت میں حاضر ہو کر گڑگڑانے لگا۔ اے شہزادی مہ لقا کی سہیلی، بوجھ تو سہی میری پہیلی کہ میں مریض عشق ہوں اور دوا چاہتا ہوں تیری مہ لقا سے شفا چاہتا ہوں۔ وہ بولی: "اے، ایں۔ اے غلام بخت، کیا تو نے آج صبح آئینہ میں اپنی صورت دیکھی ہے کہ یوں بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔" میں نے کہا: "خدا کے لیے مجھ عشق کے مارے پر بہکنے کا الزام عائد نہ کر۔ بات دراصل یہ ہے کہ مجھے تیری سہیلی سے محبت ہو گئی ہے، اس کی ہر شے سے مجھے الفت ہو گئی ہے اور میں تیرے وسیلے سے اپنی محبت کو پروان چڑھانا چاہتا ہوں۔ وہ بولی: "میری

سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ میرے وسیلے سے بھلا تم دونوں کی محبت کس طرح پروان چڑھ سکتی ہے؟'' میں نے کہا: ''اے نادان لڑکی! تو اتنی سی معمولی بات بھی نہیں سمجھتی، جبھی تو بی، اے میں دو سال سے فیل ہو رہی ہے۔ اگر تو نے واقعی میری بات نہیں سمجھی ہے تو سن لے کہ ان دنوں ہر طرف سفارش کا سکہ چل رہا ہے اور جہاں سفارش نہیں چلتی وہاں مکھن بازی چل رہی ہے۔ میں عشق کا ایک شاہ بے تاج ہوں اور تیری ایک سفارش کا محتاج ہوں۔ لہٰذا شہزادی مہ لقا کے نام ایک سفارشی خط لکھ دو تا کہ اس کے دل کی مستقل جائداد محبت پر مجھ ناچیز کا عارضی تقرر عمل میں آئے، مجھے یقین ہے کہ تیری سفارش سے میرا کام بن جائے گا اور باقی تیرا نام رہ جائے گا۔'' بالآخر اس لڑکی نے میرے دل کا مدعا پہچان لیا اور ایک گلابی رنگ کے کرم خوردہ کاغذ پر ایک سفارشی خط لکھ دیا۔ میں اس سفارشی خط کو لے کر خوشی خوشی شہزادی مہ لقا کے گھر کی طرف روانہ ہوا لیکن ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ میری نظر ایک مرد ٹریلین پوش پر پڑی جو اپنے مکان کے برآمدے میں کھڑا زار و قطار رو رہا تھا غالباً اس کی بیوی مر گئی تھی اور وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا ''ہائے میں لٹ گیا، میں تباہ ہو گیا۔ اب مجھے بد مزہ سالن کون کھلائے گا۔ اب مجھ سے بات بات پر لڑائی جھگڑا کون کرے گا۔ ہائے اب میری شیروانی میں سے پیسے کون چرائے گا۔ اب مجھ سے میری تنخواہ کا حساب کون پوچھے گا''؟

اس مرد ٹریلین پوش کے دکھ کا یہ عالم تھا کہ اس کے آنسو تھامے نہ تھمتے تھے۔ مجھے اس کی حالت پر بڑا رحم آیا۔ میرے دل میں ہمدردی اور ایثار کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ میں مثل ایک تیر کے اس غم زدہ شخص کی جانب بڑھا اور بولا: ''اے زود رنج انسان تیری آہ و بکا کو سن کر میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ تو ایک 'عادی شوہر' ہے اور بیوی کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا۔'' پھر میں نے اپنی محبوبہ کے نام اس کی سہیلی کا دیا ہوا سفارشی خط اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا ''اے مرد ٹریلین پوش! اپنی زندگی سے یوں مایوس نہ ہو کہ تیرے درد کا علاج میرے پاس ہے۔ یہ سفارشی خط لے کر اور اسی وقت اس نازنین کے در دولت پر جا، جس کا پتہ اس لفافہ پر درج ہے۔ انشاءاللہ تیری مراد بر آئے گی''۔ اصل میں یہ سفارشی خط میرے حق میں لکھا گیا تھا۔ لیکن میں نے تیری گریہ و زاری کو سن کر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور میں تیرے حق میں شہزادی مہ لقا سے دستبردار ہو رہا ہوں۔''

جذب وایثار کے اس بے مثال واقعہ کے بعد میں مثل دیوداس، اُداس رہنے لگا۔ میری اداسی کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان دنوں میں ملک کے بعض سیاسی قائدین کی سوانح عمریوں کے مطالعہ میں مصروف تھا۔ ان سوانح عمریوں میں بار بار یہ ذکر ملتا کہ فلاں لیڈر صاحب نے "ہندستان چھوڑ دو تحریک" میں حصہ لیا اور تعلیم ترک کردی۔ فلاں لیڈر نے "عدم تعاون کی تحریک" میں سرگرمی دکھائی اور تعلیم ترک کردی۔ مجھے ان لیڈروں پر رشک آتا تھا، جنھوں نے "ہندستان چھوڑ دو تحریک" میں حصہ لینے کے بہانے اسکول چھوڑ دیا تھا۔ ان دنوں ہاسٹل میں رہتا تھا۔ اور مجھے بار بار یہ احساس ہوتا تھا کہ میں بعد از وقت پیدا ہوا ہوں۔ کیونکہ اب کالج چھوڑنے کے لیے کوئی بہانہ ملنا دشوار تھا۔ اس غم میں میں اچانک بیمار پڑا اور بستر مرگ بچھا کر سو گیا۔ ہاسٹل کے وارڈن صاحب بہت پریشان ہوئے۔ دور دور سے ڈاکٹروں بشمول ڈاکٹرز آف فلاسفی کو طلب کیا گیا۔ لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بالآخر ایک دن ایک حکیم صاحب نے جو یکتائے بیروزگار تھے، میرا طبی معائنہ کیا اور وارڈن صاحب سے کہا: "مرض نہایت معمولی ہے اور اس کا علاج تو اس سے بھی معمولی ہے۔" وارڈن صاحب نے فرمایا: "حکیم صاحب تو پھر نسخہ تجویز فرما دیجیے۔" حکیم صاحب بولے: "نسخہ یہ ہے کہ اس مرد کو ہاسٹل کا فوڈ مانیٹر بنا دیجیے۔ چند دنوں میں نہ صرف بھلا ہو جائے گا بلکہ چنگا ہو جائے گا۔"

غرض مجھے فوڈ مانیٹر بنا دیا گیا اور میری صحت دن بہ دن اچھی ہونے لگی۔ ادھر میری صحت بہتر ہونے لگی۔ اور اُدھر کالج میں میرے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ دشمنوں نے میرے خلاف گہری سازش کی اور مجھے بہلا پھسلا کر کالج یونین کے انتخابات میں کھڑا کر دیا۔ انتخابات میں دشمنوں نے مجھے جی کھول کر ووٹ دیے اور میں بھاری اکثریت سے کالج یونین کا صدر منتخب ہو گیا۔ دشمنوں کی اس گہری سازش کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے دشمن تو پڑھائی لکھائی میں مصروف رہنے لگے اور میں خارج از نصاب سرگرمیوں میں حصہ لینے لگا، یہاں تک کہ میرے دشمنوں نے امتحان میں ٹاپ کیا اور میں فیل بھی نہ ہو سکا کیونکہ مجھے نقل کرنے کے الزام میں کالج سے ایک سال کے لیے ریس ٹیکیٹ کر دیا گیا۔

مگر اے میرے درویش بھائیو! میں نے کالج یونین کے صدر کی حیثیت سے جو کارنامے انجام دیے وہ کالج کی تاریخ میں سفید روشنائی سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ جب کبھی کالج

جانے کو میرا جی نہیں چاہتا تھا تو میں ہڑتال کروا دیتا تھا۔ جب بھی میرے ساتھیوں کا جی ہوٹنگ کرنے کی طرف مائل ہوتا تھا تو ایک عدد مشاعرہ منعقد کرڈالتا تھا۔ میں نے کالج میں بے شمار ڈرامے کھیلے اور سارے اہم کردار خود ادا کیے۔ ڈرامہ ''شیریں فرہاد'' میں، میں نے فرہاد کا رول اس قدر اثر انگیزی کے ساتھ ادا کیا کہ نہر کھودنے کے منظر میں سارے اسٹیج کو کھود کر رکھ دیا اس کے بعد اس اسٹیج پر کوئی ڈرامہ نہ کھیلا جاسکا۔ ڈرامہ ''رستم وسہراب'' میں، میں سہراب بنا لیکن میں نے ڈرامے کے آخری منظر میں رستم کو اس بری طرح پیٹا کہ وہ بے ہوش ہوگیا۔ اور ڈرامے کے مطابق مجھے ہلاک کرنے کا اہل نہ رہا۔ واضح ہو کہ جس لڑکے نے رستم کا کردار ادا کیا تھا وہ وہی تھا جس نے مجھے بہلا پھسلا کر کالج یونین کے انتخابات میں کھڑا کیا تھا۔

تو صاحبو! اس کے بعد میں لگا تار چار برس تک بی اے کا امتحان دیتا رہا۔ پھر خدا کا کرنا یوں ہوا کہ کالج کے پرنسپل صاحب مجھ پر مہربان ہوگئے۔ کیونکہ میں فرصت کے اوقات میں ان کے گھر کا سودا سلف لانے لگا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کلید کامیابی یہی ہے۔ غرض جوں توں کر کے میں نے بی اے کا امتحان کامیاب کیا۔ اور گذشتہ چھ سال سے بیروزگار ہوں۔ یعنی اپنی ہی قسمت پر ماتم گسار ہوں۔

صاحبو! میری عمر اس وقت 30 سال ہے اور روزگار کا ملنا محال ہے۔ گرانی اتنی بڑھ چکی ہے کہ صبح میں والد کی شیروانی سے ایک روپیہ چراتا ہوں تو شام تک ختم ہوجاتا ہے۔ صبح میں کھانا کھاتا ہوں تو دوپہر تک پھر بھوک لگ جاتی ہے۔ صبح میں سائیکل کے پہیئے میں ہوا بھراتا ہوں تو شام تک پہیہ پنکچر ہوجاتا ہے۔ غرض گرانی نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ قیمتیں اس قدر تیزی سے بڑھ رہی ہیں کہ دو پیسے میں ایک سگریٹ خرید کر پینے لگتا ہوں تو اس کا آدھا حصہ ایک پیسے میں پیتا ہوں اور جب بقیہ آدھا حصہ جلنے لگتا ہے تو مجھے پھر یہ دو پیسے میں پڑتا ہے۔''

پہلے درویش نے اپنی داستان ختم کی اور زاروقطار رونے لگا۔ وہ دراصل رونے کے لیے اپنی داستان کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہنے لگا، تو تیسرے درویش نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا: میرے اچھے درویش بھائی! اب زیادہ رنج نہ کر کیونکہ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، یعنی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی چٹا ہے اور کوئی بٹا ہے۔''

پہلے درویش نے ایک آہِ سرد کھینچی اور تیسرے گریجویٹ کو پرے ہٹاتے ہوئے بولا: ''مگر بھائی کچھ تو معلوم ہو کہ ہمیں ملازمت کب ملنے والی ہے اور ہمارے دل کی مرجھائی ہوئی کلی کب کھلنے والی ہے۔''؟

اس پر تیسرا درویش بولا: ''اے میرے رفیق، تو ابھی تک خواب غفلت میں پڑا جاگ رہا ہے۔ معلوم یوں ہوتا ہے جیسے تو نے ایک خوشخبری ابھی تک نہیں سنی ہے۔''

خوشخبری کا لفظ سنتے ہی پہلا درویش گیند کی طرح اچھل پڑا اور تیسرے درویش کا گریبان پکڑ کر پوچھنے لگا۔ :یار بتادے ناوہ خوشخبری کون سی ہے۔''

تیسرا درویش بولا: ''اے میرے پیارے درویش بھائیو! میں آج تمھیں یہ خوشخبری سنانا چاہتا ہوں کہ حکومت نے ہم جیسے بیروزگاروں کی سہولت کے لیے وظیفہ پیرانہ سالی کی اسکیم منظور کی ہے، جہاں ہم نے اپنی زندگی کے تیس سال نا اُمیدی میں گزار دیے ہیں کیا ہم وہاں مزید تیس سال امیدِ روزگار میں نہیں گزار سکتے؟''

ابھی چاروں درویشوں نے اس خبر پر اچھی طرح مسرت کا اظہار بھی نہیں کیا تھا کہ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے کلرک نے آواز لگائی: ''صاحبان! اپنے اپنے ایمپلائمنٹ کارڈ لایے اور ان کی تجدید کروایے۔'' سارے درویش کاؤنٹر کی طرف دوڑ پڑے اور پہلے درویش کی داستان وہاں ختم ہوئی جہاں سے اسے شروع ہونا چاہیے تھا۔

(تخلص بھوپالی)

غالب کا غیر مطبوعہ خط

تخلص بھوپالی کے نام

سن میری جان— مکتوب ملا— مہر انگیز اور محبت خیز باتوں نے غم تنہائی بھلا دیا۔ وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ بلا شبہ میرا خیس پڑھ پائیں تو اکبر آباد آبادی ہو جائیں۔ ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ میں خوشامدی نہیں جو منہ دیکھی کہوں۔ ہنوز تمھارا منہ دیکھا نہیں۔ دیکھنے کی آرزو ہے۔ غالب کی تعریف کرنا کیا عیب ہے۔ خدا تمھیں دولت و اقبال روز افزوں عطا کرے اور اس فراوانی سے کہ محنت سے جی چرانے والے نکھٹو لوگ سوشلزم کے نعرے لگا کر اس میں حصہ دار بن جائیں اچھا اب سنو احوال واقعی ایک خط تمھارا اشفا گوالیاری لائے دوسرا اب تمھارے شہر کے ایک وکیل حبیب احمد لائے۔ ایک قرینہ سے معلوم ہوا کہ تمھاری عمر اور صحت پا بہ رکاب ہے۔ پھر کیا حجاب ہے یہاں آنے میں کیا دیر ہے۔ موت جیسے عظیم فرض کی ادائگی میں ٹال مٹول کیوں؟ معلوم ہوتا ہے کسی سیاسی جماعت کے رکن ہو کہ موت سے بھی فریب کھیل رہے ہو اللہ تمھیں توفیق عطا کرے تو میری شکایت دور ہو۔

اور سنو میاں! ایک نئی افتاد آپڑی بیکنٹھ سے ہرگوپال تفتہ خالص محبت میں مجھ سے ملنے آئے۔ پروانہ راہداری (پاسپورٹ) ملا نہیں، آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ کھوکر اپار کیا اور آدھمکے۔ فرشتوں نے پتہ نہیں کیا سمجھا۔ پکڑ لیے گئے۔ قالوان اللہ وان الیہ راجعون۔ پاؤں میں بیڑی ہاتھ میں ہتھکڑی چولہے میں جائے ایسی محبت جو ایک مخلص کو حوالات پہونچا دے! تمھارے حبیب احمد نے جو یہ قید اور قفس کی بات سنی تو فی الفور صدر الصدور کی عدالت میں تفتہ کی طرف سے وکالت نامہ داغ دیا۔ دلائل پیش کیے۔ مخبر نہ جاسوس۔ رہائی نصیب ہوئی، کیا غالب کہاں کا غالب۔ غالب پہ لعنت بھیجی۔ راتوں رات پھر بیکنٹھ جا پہونچا۔ اب ذلت کا احساس رفع ہو تو پھر میرا خلوص زور مارے تو ملنا نصیب ہو۔ دیکھو اللہ کب ملاتا ہے۔ ویسے بھگوان کی مرضی کو بھی دخل ہے۔ سو بھگوان تک سفارش لے جانے کی سکت نہ ہمت۔ خدا اور بھگوان میں احتجاجی مراسلے چوبیس برسوں سے آجا رہے ہیں دونوں اپنی جگہ پر نامطمئن دعا کرو خدا اور بھگوان میں مصالحت کی کوئی صورت نکلے تو شرفا کو پناہ ملے۔ انسانیت کو امان!

جب تمھارے حبیب احمد شروع شروع آئے تو سخت پریشان اور بیزار رہے۔ شب و روز دنیا کو یاد کر کے زار و قطار روتے تھے۔ ہمہ وقت کی گریہ وزاری نے خستہ حال کر دیا تھا۔ جب فرشتوں نے فرد جرم کا ایک دفتر سامنے لا کر رکھا تو ہوش کھو بیٹھے۔ رونا دھونا بھول گئے۔ گناہوں کی فہرست بہ طریق گناہ ہائے کبیرہ وصغیرہ طویل ہے۔ ابھی تک مجھے صرف ایک گناہ کا پتہ چلا ہے کہ موصوف نے دنیا میں رہ کر بہت سارے قاتلوں کو سزا اور قضا سے کیوں بچایا۔ جواب دیا کہ یہ فرد جرم قبل از وقت ہے۔ ایسے تمام مفروضہ قاتلوں کو عدالت میں پیش کیا جائے تا کہ ان کے روبرو اس باب کا آغاز ہو۔ درخواست منظور! اللہ اللہ اس ذہانت کا کوئی جواب ہے۔ آج تک کسی گناہ کا اقرار کیا، نہ ہی اپنے پر ذمہ داری لی۔ بلکہ جواباً عرض کیا کہ کراماً کاتبین کو طلب کیا جائے۔ تا کہ ان سے جرح بحث کرنے کا موقع مل سکے دیکھو عدالت سے کیا اب حکم ہوتا ہے۔ کراماً کاتبین کا حاضر ہونا ممکن نہیں ہمہ وقت مصروف! اس عرض داشت پر جید گناہ گاروں میں خاصی چہل پہل ہے۔

برادرم حبیب احمد کے پاس کوئی منشی نہ اہل مند پیش دامن نہ پیش دست تن تنہا مصروف، کہتے ہیں ایسے وقت پر اگر لاڈلی سرن سنہا وکیل آپہونچے تو کام ذرا آسان ہو۔ یہ کون سنہا ہیں ان

کو مرحوم کا پیغام پہونچا دو۔ تاکید جانو۔ لوگوں نے کہا یہاں ہندو نہیں آسکتا۔ حبیب نے کہا وہ ہندو ہے نہ مسلمان۔ بیک وقت دونوں کا ہونا وہ ثابت کر سکتا ہے اللہ اللہ کیسے کیسے بزرگ آج بھی دنیا میں ہیں جو ہندوؤں میں ہندو اور مسلمانوں میں مسلمان۔ میرے زمانہ اور زندگی میں ایسی سیکولر مخلوق کہاں تھی۔

اور کیا لکھوں، روٹی کی فکر نہ پانی کی پیاس، نہ جاڑے کی شدت، نہ گرمی کی حدت، نہ خوف ودہشت نہ پولیس کا ڈر۔ نہ کوئی مخبر نہ کوئی جاسوس، نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے نہ کپڑا خریدنا پڑے۔ نہ گوشت منگاؤں، نہ روٹی پکاؤں، نہ مئے نہ ساغر نہ تبرید۔ نہ قرضدار بس عالم نور سراسر سرور! اگر باز پرس اور ختم ہو لے تو پھر کیا ہے نور علیٰ نور۔ اچھا بس سب کو سلام کہو۔ رہا میرا تو میں۔ یکے مردہ شخصم بمردی رواں۔ اللہ بس باقی ہوس۔

نجات کا طالب

غالب

(فاروق نشتر)

ایک معتقد ابوالکلام کا کھلا خط

مولانا آزاد کے نام

میسور فٹ پاتھ، بھارت

صدیق مکرم!

رات کے بارہ بجے ہیں اور میں تن تنہا رات کے اندھیرے میں فٹ پاتھ پر کسی الو کی طرح بیٹھا تاروں کی روشنی میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ گزشتہ تین روز سے پیٹ اور شہر میں گڑبڑ ہے۔ میں ایک غیر آباد سرکاری پل کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن جب ذہن سے خوف رفع نہ ہوا تو اس خوف کو دور کرنے کے لیے فٹ پاتھ پر آبیٹھا۔ شہر سے فوج اور پولس کے چلے جانے کے باوجود شہر میں خوف کی حکمرانی ہے اور مختلف قسم کی افواہیں گرم ہیں۔ وہ تو اچھا ہوا میں نے اس غیر آباد پل میں پناہ لی ورنہ نیزہ جو میرے ساتھی کے پیٹ میں گھس چکا تھا۔ میری پیٹھ میں بھی گھس چکا ہوتا۔ گزشتہ دنوں آپ کے "چھپائے ہوئے" تیس صفحات، ایک برس کی مسلسل جدوجہد کے بعد اس طرح منظر عام پر لائے گئے جس طرح ایک پاک دامن دوشیزہ کو طوائف کے روپ میں پیش کیا جائے۔ ان صفحات کی رونمائی کے ساتھ آپ کی یادوں اور فسادات کے سلسلے بھی تازہ ہو گئے۔ آپ کو تو فسادات سے بہت زیادہ سابقہ پڑا تھا۔

گزر چکی تھی یہ فصل "فساد" آپ پر بھی

میں آپ کی خدمت میں ایک بڑے فساد کا چھوٹا سا منظر ضرور پیش کرتا لیکن گزشتہ دنوں کے بھیانک مناظر اور فوجی گاڑیاں گزرنے کے مناظر اس طرح گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ کوئی منظر بھی خالص نہیں بچا۔ حالانکہ میں نے "غبارِ خاطر" سے مناظر کی عکاسی اس خوبی سے سیکھی ہے کہ ایک فلمی اسکرپٹ رائٹر نے مجھے دعوت اسکرپٹ رائٹنگ دی ہے۔ آپ تو صرف نام کے آزاد تھے۔ لیکن آج ہر تحریر فیشن ایبل عورتوں کی طرح آزاد ہے۔

میں تو چاہ رہا تھا کہ کسی منظر کی منظر کشی میں اپنا وقت اور کاغذ ضائع نہ کروں کیوں کہ ہمارے یہاں گرانی کی وجہ سے کاغذ کھانے اور انسان جلانے کے کام آنے لگے ہیں۔

مولانا! ابھی دیکھیے گزشتہ ہفتہ میں نے آپ کے نام پر منائی جانے والی ایک تقریب میں شرکت کی۔ ان تقریبات کی وجہ سے سیاست دانوں کو سستی شہرت کے مواقع ہاتھ آ گئے ہیں۔ بعض گم نام سیاست داں آپ کے فن، شخصیت اور خدمات پر روشنی ڈال ڈال کر اپنا مستقبل روشن کر چکے ہیں اور وہ صرف آپ ہی کے لیے وقف ہو کر رہ گئے ہیں یعنی وہ آئی اسپشلسٹ (Eye Specialist) کی طرح صرف آزاد اسپشلسٹ ہو کر رہ گئے ہیں — یہ لوگ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے جاگتے، آپ کے نام، آپ کے کام اور آپ کے فن کے تذکرے کر کر کے دست بہ گریبان ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے مولانا آزاد ایک مکمل لیڈر تھے تو کوئی اس بات پر زور لگاتا ہے کہ آپ مکمل صحافی تھے اور کوئی استدلال پیش کرتا ہے کہ آپ پورے ادیب تھے۔ بلکہ ایک شخص نے تو آپ کو "مچھلی" کا لقب دیا ہے جو اردو کے سمندر میں تیرتی تھی۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ میرا یہ خط پڑھ کر بور ہوں لیکن میں آپ کو دنیا کا اصلی رنگ دکھلا کر ہی دم لوں گا۔ یہ لوگ اس قسم کی حرکت صرف آپ کے ساتھ ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہر بڑا ادیب و شاعر ان حضرات کے چنگل میں چوہے کی طرح پھنسا ہوا ہے۔ کوئی غالب پرست ہے تو کوئی غالب شکن۔ میں نے ایسے نقاد بھی دیکھے ہیں جو اقبال کی شاعری میں اپنے دماغ کے کیڑے نکال کر ڈالتے ہیں۔ بہر حال "انڈیا ونس فریڈم" کے منظر عام پر آنے سے بیروزگار سیاست دانوں پر روزگار کے دروازے کھل گئے ہیں۔ اور وہ اپنے

آپ کو "قطب مینار" تصور کرنے لگے ہیں۔ بعض تو آپ کی تقلید میں سلیمانی چائے سڑکوں پر پینے لگے ہیں۔

خیر، مولانا! آپ دل برداشتہ مت ہو جایئے۔ اچھا۔ اب اجازت دیجیے کیوں کہ وہ دیکھیے چند لوگ میرے ساتھی کی لاش کی طرف دوڑے آ رہے ہیں، شاید انھیں میری بھی تلاش ہو، میں پھر سے اس پل کے نیچے قید ہو جاتا ہوں۔ فقط آپ کا معتقد۔

(عبدالرحمٰن وکیل)

تفہیمِ غالب (جدید)

ہمارے شعر ہیں اَب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

غالب کے بعد تو جو ہوا سو ہوا لیکن خود غالب کی زندگی میں شارحین نے ان کے کربِ ذات اور حبسِ فکر کے علامیوں کو روایتی شاعری کا گل و بلبل سمجھ کر ان کے اشعار کی جو تشریح کی اس سے دل برداشتہ ہو کر غالب نے مندرجہ بالا شعر کہا۔ جیسا کہ آئندہ اشعار کی تشریح سے ثابت ہو جائے گا۔ غالب کو بجا طور پر جدید شاعری بلکہ تمام جدید ادب کا جدِ امجد کہا جا سکتا ہے۔ غالب تو ایک چھوڑ دو دو ذاتوں کی مصیبت کا شکار تھے ممکن ہے کہ جدید نفسیین اس کو محض دوہری شخصیت سے تعبیر کریں۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ غالب کے یہاں کبھی دو ذاتوں کا ادغام نظر آتا ہے۔ کبھی انضمام اور کبھی بھرپور تصادم۔ حیرت ہے کہ آج تک ناقدین نے اس بات پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ انھوں نے دو تخلص کیوں اختیار کیے تھے۔ حالانکہ ہر دو تخلصین کے ذیل میں کہے گئے اشعار کا تقابلی مطالعہ واضح کر دیتا ہے کہ غالب کے فکرِ شعر کے پسِ پردہ کبھی ان کی ایک ذات کارفرما ہوتی تھی اور کبھی دوسری۔ جیسا کہ خود کہتے ہیں۔

بینم از گدازِ دل در جگر آتشے چو سل
غالب اگر دمِ سخن رہ بر ضمیرِ من بری

پس غالب کے کلام کو سمجھنے کے لیے لازم ہے کہ ان کی دونوں ذاتوں سے قارئین کی واقفیت ہو۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کیے ہوئے

غالب نے انضمامِ ذات کا یہ وطیرہ اختیار کیا تھا کہ جب وہ دونوں میں سے کسی ایک ذات کے زیرِ اثر ہوتے تھے اور اس مخصوص ذات کا کرب ایک حد سے تجاوز کر جاتا تھا تو وہ وفورِ شوق میں دوسری ذات کو بھی مدعو کرلیا کرتے تھے۔ یہاں یار سے مراد وہ نہیں جو فاضل شارحین نے سمجھا ہے بلکہ وہ دوسری ذات جو اس وقت موجود نہیں ہوتی تھی جس وقت وہ وفورِ شوق میں اس کو یعنی غیر موجود ذات کو مدعو کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ مدعو اس کو کیا جائے گا جو موجود نہ ہو۔ جو موجود ہو اسے کیا مدعو کرنا۔ رہی جوشِ قدح والی بات تو سبھی جانتے ہیں کہ غالب رندِ خراب تھے۔ خود بھی پیتے تھے ذاتوں کو بھی پلاتے تھے۔

درد منّت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

اس شعر میں غالب نے اچھائی اور برائی کے تمام قدیم تصورات کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔ نسخۂ حمیدیہ میں 'درد' کی جگہ 'کرب' ہے اور لفظ 'میں' اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ شعر میں ذات اور فرد کی باہمی کشاکش سے پیدا شدہ کرب کو حیطۂ اظہار میں لایا گیا ہے۔

تیر پر تیر چلاؤ تمھیں ڈر کس کا ہے
دل یہ کس کا ہے مری جان جگر کس کا ہے

یہ شعر غالب کا ہے ہی نہیں۔

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگۂ دیدۂ تصویر نہیں

بادی النظر میں پہلا مصرعہ دوسرے مصرعے سے لمبا نظر آتا ہے لیکن دراصل دونوں مصرعے ایک ہی بحر میں ہیں۔ ارکانِ تقطیع مشکل ہیں اس لیے ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔ ڈیکارتے (جس کو جرمن سے نابلد حضرات ڈیکارٹس لکھتے ہیں) نے جس نظریہ تشکیک کی بنیاد ڈالی تھی اس کو غالب نے منتہائے کمال تک پہنچا دیا۔ فرق بس یہ ہے کہ ڈیکارتے غالب کی طرح کج بحث اور ضدی نہیں تھا۔ کیوں کہ ان کا تو یہ حال تھا کہ ع ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے۔ ڈیکارتے نے سب سے پہلے خود اپنی ذات کو تشکیک کا نشانہ بنایا اور تمام اسرارِ کائنات کو اسی احاطے میں لے لیا۔ اس کے برعکس غالب نے پوری کائنات پر شک کیا۔ ع عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اور پھر تمام کائنات کو خود پر منطبق کر لیا۔ ڈیکارتے تو جاتے جاتے اپنا وجود ثابت کر گیا لیکن یہ زندگی بھر تمام کائنات کو بشمولہ چرند، پرند، درند ہستیِ موہوم کی کر سمجھنے پر ہی مصر رہے۔ اس شعر میں 'شوق' کربِ ذات کی نمائندگی کرتا ہے اور 'دشت' اس معاشرے کی جس میں فرد خواہ مخواہ یا تقلیدی دباؤ میں خود کو تنہا سمجھنے پر مجبور ہے اور اسی لیے اس معاشرے کے کسی بھی جادہ (یعنی قدر) کو غیر از نگۂ دیدۂ تصویر سمجھنے کو تیار ہیں۔

ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گل فروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز

اگر فرد سے اس کی ذات چھین لی جائے تو اس کے پاس کچھ نہیں رہ جاتا سوائے اس غرور کے کہ اس نے قدیم اور بے معنی اقدار سے مجبور نہ ہوتے ہوئے ذات تک کی قربانی دے ڈالی اور پھر زندگی بھر وہ بے ذات کا فرد اسی غرور کے پھولوں کی دوکان سجا کر پیٹ بھرتا رہتا ہے۔ اس شعر میں زر سے مراد ذات ہے۔

(فیاض احمد فیضی)

مقدمہ فلمی شعر و شاعری

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

تمہید

فی زمانہ اس روئے زمین پر سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ اپنے لیے اسی دنیا میں جنت آباد کی جائے، چاہے اس کے لیے ہمیں دوسروں کو جہنم میں کیوں نہ جھونکنا پڑے۔ اسی عظیم مقصد کو پانے کے لیے انسان کے مختلف گروہ اپنے اپنے مذاق اور استعداد کے موافق جدا جدا کاموں میں مصروف ہیں اور دوسروں کی کوششوں سے اپنی ضرورتیں رفع کرتے ہیں تاکہ اپنا کوئی کام اٹکا نہ رہے۔ اگرچہ ان میں بعض افراد اور جماعتوں کے کام ایسے احمقانہ بھی ہیں جو سوسائٹی کے حق میں سودمند ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے پاس عقل سلیم کی کمی اور بدقسمتی کی فراوانی ہے۔ اس لیے یہ اپنی بیوقوفیوں پر قانع اور خوش رہتے ہیں اور بغلیں بھی بجاتے ہیں۔ مگر خدائے بزرگ و برتر کا بڑا احسان ہے کہ سوسائٹی میں ایسے افراد اور ایسی جماعتوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے اور نمک بھی اتنا کم جتنا بلڈ پریشر کے مریض استعمال کرتے ہیں۔

چھوٹا کسان اپنی کوشش سے بڑے کسانوں اور زمینداروں کے پیٹ اور تجوریاں بھرتا ہے اور اپنے خالی پیٹ کو پکڑ کر اور اپنے خالی سر کو کھجاتے ہوئے سوچتا ہے کہ وہ ایک عالم کی پرورش کرتا ہے۔ شہر میں مزدور اپنے بیوی بچوں سمیت زیر تعمیر عمارتوں میں اینٹیں ڈھوتا ہے اور یہ سوچ کر خوش ہوتا ہے کہ اس کے بنائے ہوئے مکانات سے لوگ گرمی، مینہ اور آندھی کی گزند سے بچتے ہیں اور نہیں جانتا کہ اس کے بوجھ ڈھونے کے عمل سے بلڈر کیسے راتوں رات کروڑوں اور اربوں سے کھیلنے لگتا ہے، اور سرکاری محکموں کے نہ جانے کتنے افسر خوشحالی کے پالنے میں جھولنے لگتے ہیں۔ ایک بانسری بجانے والا جو کسی سنسان ٹیکرے پر تن تنہا بیٹھا بانسری کی لے سے دل بہلاتا ہے اپنے اس بیکار مشغلے کو نادان کسان اور مزدور کے مشغلے سے کچھ کم ضروری اور مفید نہیں سمجھتا اور نہیں جانتا کہ بمبئی کی فلمی نگری میں کیسے کیسے بے سرے اور بے ہنر سازندے، میوزک ڈائرکٹر بنے دوسروں کی دھنیں چرا کر کروڑوں میں کھیل رہے ہیں اور ان نئی گلوکاراؤں سے اپنا جی بہلا رہے ہیں جو 'پلے بیک سنگر' بننے کا خواب لے کر کسی بھی دھن پر گانے اور رقص کرنے کو تیار رہتی ہیں۔

یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ فلمی شاعری اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ جس میں شاعری کا مادہ بالکل نہیں ہوتا ہے، وہی فلمی شاعر بنتا ہے۔ فلمی شاعری کی سب سے پہلی علامت غیر موزونی طبع سمجھی جاتی ہے۔

فلمی شاعری شائستگی کے زمانے میں ترقی پاتی ہے......

فلمی شعر اگر اصلیت کے بالکل خلاف اور محض بے بنیاد ہو تو تاثیر اور دل نشینی اس کے نیچر میں داخل ہے۔ ضرورت سے زیادہ تہذیب یعنی مغربی تہذیب کا اثر فلمی شعر پر بہت اچھا ہوتا ہے لیکن اگر فلمی شاعر کتابوں کا مطالعہ کرنے لگے اور اس کے علم میں اضافہ ہو جائے تو یہ فلمی شعر کے حق میں سم قاتل ہے۔ جب تک سوسائٹی غیر معمولی مہذب ہو مگر اس کا علم اور واقفیت محدود ہو، اس وقت زندگی خود ایک کہانی معلوم ہوتی ہے......

زندگی اور کچھ بھی نہیں، تیری میری کہانی ہے

......اور فلمی شاعر کا دریا بہا دینے کی آسانیاں از خود پیدا ہو جاتی ہیں۔ فلمی شعر دل پر ویسا ہی پردہ ڈالتا ہے۔ جیسا میجک لینٹرن آنکھ پر ڈالتی ہے، جس طرح اس لالٹین کا تماشہ بالکل

اندھیرے کمرے میں پورے کمال کو پہنچتا ہے، اسی طرح فلمی شعر محض تاریک زمانہ میں اپنا پورا کرشمہ دکھاتا ہے۔ اسی لیے فلمیں اندھیرے میں دکھائی جاتی ہیں اور فلمی عشقیہ گیتوں کا مزہ نوجوان جوڑے سینما ہال کی سب سے پچھلی نشست پر آنکھیں بند کرکے اٹھاتے ہیں۔

فلمی شاعری کا تعلق اخلاق کے ساتھ......

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کلاسیکی، ادبی اور غیر فلمی شعر سے نفسیاتی جذبات کو اشتعال انگیزی کا سامان فراہم کیا جاتا ہے۔ مثلاً......

منہ دکھا دیتے ہو جوبن تو دکھاتے بھی نہیں
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

اس کے برخلاف فلمی شاعری سے روحانی خوشیاں اور سائنسی فکریں بیدار ہوتی ہیں جن کو بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ پھر بھی ہم یہاں ایک مثال دیتے ہیں تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ فلمی شاعر بوالہوس نوجوانوں کو سمجھاتا ہے کہ محبوب اپنے دل کو چھپانے کی خاطر چولی دامن کا سہارا لیتا ہے تاکہ اس کے دل کا حال عاشق کو معلوم نہ ہو جائے کہ اس میں سوائے شریانوں اور وریدوں کے کچھ نہیں ہوتا جو صاف خون لانے اور گندہ خون لے جانے کے عمل میں بالترتیب مصروف رہتی ہیں۔ مگر ہم اپنی کم نگاہی کے سبب محبوب کے دل کی دھڑکنوں کو سن نہیں پاتے۔

اگر افلاطون کے خیالی کانسٹی ٹیوشن کے مطابق تمام فلمی شاعروں کو جلاوطن کر دیا جائے تو یہ قوم کو اخلاقی پستی کی طرف لے جائے گا اور ایک سرد مہر، خود غرض اور بے مروت سوسائٹی قائم ہو جائے گی۔ کیونکہ جب تک فلمی شاعری کا رواج ہے، ہماری قوم اخلاق اور کردار کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہے گی۔

یوں تو پرانے زمانے کی غیر فلمی اور ادبی شاعری میں بھی اخلاقیات کے درس کبھی کبھی دیے گئے مگر ہماری قوم پر ان کا مطلق اثر نہیں ہوا اور اس نے اپنی پرانی روش نہیں چھوڑی۔ ہم اخلاقیات اور تعلیمی درس سے معمور ایک شعر پیش کرتے ہیں......

اکہتر، بہتر، تہتر، چوہتر
پچھتر، چھہتر، ستتر، اٹھتر

اس پر اثر شعر میں شاعر بہتر فرقوں میں بٹی اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ تم اکہتر سے بہتر فرقوں میں بٹ گئے۔ خدا کے لیے اس سلسلے کو روکو ورنہ تم تہتر، چوہتر، پچھتر، چھہتر، ستتر، اٹھتر اور نہ جانے کتنے فرقوں میں منتشر ہو جاؤ گے اور غیر قومیں تمھارے اس انتشار کا فائدہ اٹھائیں گی اور تمھارے زوال کا سبب بنیں گی۔ ہمیں اس شعر کے خالق کی نیت پر ذرا سا بھی شک نہیں۔ بحر، وزن، قافیہ، ردیف، ہر چیز کا خیال اس شعر میں بحسن وخوبی رکھا گیا ہے۔ لیکن شاعر شعر کہتے وقت بھول گیا کہ اس کی قوم کے بیشتر افراد ناخواندہ ہیں۔ (دیکھیے سچر کمیٹی رپورٹ)۔ اگر اس شعر کے پڑھنے والے کو ایک سے ستر تک گنتی نہ آتی ہو تو وہ کیسے اس شعر کا لطف اٹھائے گا اور اس کی تعلیمی اور اخلاقی سطح کیسے بلند ہوگی؟

لیکن خدا بڑا مسبب الاسباب ہے۔ اس نے فلمی شاعروں کے دل میں قوم کا درد کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ چنانچہ اس کمی کو دور جدید کے فلمی شاعروں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا، ان کا دل قوم کی جہالت اور ناخواندگی پر تڑپا اور انھوں نے کہا......

ایک دو تین/چار پانچ چھ سات آٹھ نو/دس گیارہ بارہ تیرہ/تیرا کروں دن گن گن کے
انتظار/آ جا پیا آئی بہار

اس سبق آموز تعلیمی اور درسی گیت سے ہماری قوم کے نونہالان نے بآسانی گنتی بھی سیکھ لی اور اپنے پسندیدہ موضوع یعنی عشق ومحبت کا نغمہ بھی سن لیا۔ آج جب کہ اسکولوں میں سیکس ایجوکیشن کی باتیں کی جارہی ہیں، ہم اس کی ابتدا اس قبیل کے تعلیمی عشقیہ گیتوں سے کر سکتے ہیں اور پروجیکٹر کی مدد سے بچوں کو گیت کے ساتھ فلمی ہیروئین کا ہیجان انگیز اخلاقی رقص بھی دکھا سکتے ہیں۔

شعر کی تعریف......

شعر کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں اور ہر تعریف قابل تعریف ہے۔ لیکن فلمی شاعری کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کی کوئی تعریف متعین نہیں کی جاسکتی۔ فلمی شاعری کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ غزل کے حصار سے باہر نکل آئی ہے اور آزاد غزل، غزل نما اور نثری نظم سے ملتی جلتی کوئی شے معلوم ہو جاتی ہے۔ فلمی شاعر بننے کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ آپ کو نثر لکھنا آتا ہو نہ نظم لکھنا۔

فلمی شاعروں کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ نقاد فلمی شاعری کی بہت اچھی سمجھ رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ ان کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھتے۔ اسی طرح سے فلمی شاعری کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ شاعر بڑی آسانی سے خود کو غالب، میر اور اقبال کا ہم پلہ شاعر قرار دے سکتا ہے۔ اگر یہی اعلان کوئی غیر فلمی شاعر کرے تو لوگ اس کو بشیر بدر کے معیار کا شاعر سمجھیں گے۔ کامیاب فلمی شاعر جب کوئی ایسا دعویٰ کرتا ہے تو لوگ سچ مچ اسے غالب و میر کا جانشین سمجھ کر آٹوگراف اور انٹرویو لینے دوڑ جاتے ہیں، کیونکہ لوگ......اور خاص طور پر میڈیا کے لوگ جانتے ہیں کہ فلمی شاعری اتنا مشکل کام ہے کہ غالب جیسا بڑا شاعر بھی فلموں کے لیے سات آٹھ نغموں سے زیادہ نہیں لکھ سکا۔ فلمی شاعروں کی عظمت کا ایک جیتا جاگتا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے کبھی دولت کا سہارا لے کر اپنی شخصیت اور خدمات کے موضوع پر کسی غریب اور خوبصورت طالبہ سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ نہیں کروائی۔ ورنہ چاہتے تو یہ کام اپنے صرف ایک فلمی گیت کے معاوضہ کے عوض کرا سکتے تھے۔

فلمی شاعری کے لیے کیا کیا شرطیں ضروری ہیں......؟

اب ہم چند مثالوں سے فلمی شاعر اور غیر شاعر کے نازک رشتہ کو ظاہر کریں گے۔ اب ہم کو یہ بتانا ہے کہ فلمی شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لیے کون سی شرطیں غیر ضروری ہیں اور فلمی شاعر میں کون سی خاصیتیں ہیں جو اس کو غیر شاعر کا ہم پلہ بناتی ہیں۔

تخیل......

تخیل ایک ایسی قوت ہے کہ جس فلمی شاعر میں جس قدر اعلیٰ درجے کی ہوگی، وہ اتنا ہی ناکام شاعر ہوگا اور جس قدر یہ ادنیٰ درجے کی ہوگی، اس کی فلمی شاعری اتنی ہی کامیاب اور ہٹ ہوگی۔ حالی کا قول ہے کہ تخیل وہ ملکہ ہے جس کو شاعر ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ لے کر نکلتا ہے اور جو اکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے کچھ مائیں بچے کی پیدائش کے فوراً بعد اسے بھی بچے کی ناف کے ساتھ کاٹ کر زمین میں دفن کر دیتی ہیں تاکہ وہ بڑا ہو کر فلمی شاعر ہی نہ بننے پائے۔ لیکن پھر بھی اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ایک بہت مشہور غیر فلمی شعر ہے......

تم مخاطب بھی ہو، قریب بھی ہو
تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں

اس شعر میں شاعر کے تخیل اور خود شاعر کی کمزوری ملاحظہ فرمایئے کہ اول تو محبوب شاعر کے قریب نہیں آتا کہ شاعر کے لباس سے اٹھنے والی ایک مخصوص مہک اسے ایسا کرنے سے روکتی ہے۔ دوسرے محبوب عام طور پر شاعر کو مخاطب بھی نہیں کرتا اور اگر کوئی ضروری بات کہنی بھی ہو، جیسے......''بابا، معاف کرو'' یا ''میری نظروں سے دور ہو جاؤ'' وغیرہ۔ تو دور ہی سے بات کرنے میں محبوب اپنی عافیت سمجھتا ہے۔ بالفرض محال محبوب بائیں بازو سے تعلق رکھتا ہے اور مفلسوں سے ہمدردی جتانے کو اپنی پارٹی کے حکم کے مطابق ضروری سمجھتے ہوئے قریب آ کر بات کر بھی رہا ہے تو شاعر کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ موقع نہ اسے دیکھنے کا ہے نہ بات کرنے کا، بلکہ یہ موقع سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہے۔ اس شعر میں شاعر کا تخیل بالکل ناکام ہے۔ اس کے برعکس ایک فلمی شاعر کے ادنیٰ تخیل کی اونچی اڑان ملاحظہ فرمایئے......

تو میرے سامنے/ میں تیرے سامنے/ تجھ کو دیکھوں کہ پیار کروں/ یہ کیسے ہو گیا تو میری ہو گئی/ کیسے میں اعتبار کروں......ٹوٹ گئی ٹوٹ کے میں چور ہو گئی/ تیری ضد سے مجبور ہو گئی/ تیرا جادو چل گیا او جادوگر......

دیکھیے شعر کو مکالمے کی شکل دے کر ان بے ترتیب مصرعوں میں کتنی خوش اسلوبی سے شاعر نے محبت کے تمام مراحل طے کر لیے ہیں۔

غیر فلمی شاعری کا مطالعہ

فلمی شاعر کے لیے ازبس ضروری ہے کہ وہ اور کچھ پڑھے نہ پڑھے، روزانہ اخبار ضرور پڑھے تاکہ کم از کم اخباری زبان سے اس کی واقفیت رہے۔ نئی نسل کے لیے مخصوص نغمے تحریر کرنے کے لیے ٹی۔ وی چینلوں پر بولی جانے والی ''جذباتوں، الفاظوں، حالاتوں''، والی زبان جاننا بھی بے حد ضروری ہے۔ فلمی شاعر اپنی بیکاری کے زمانے میں البتہ کبھی کبھی غیر فلمی استاد شعرا کا کلام محض اس نیت سے اور یہ جاننے کے لیے پڑھتا ہے کہ وہ ان سے بہتر کیسے لکھ سکتا ہے۔ اب جوش ملیح آبادی نے اپنی نظم ''فاختہ کی آواز'' میں یہ مصرعے لکھے......

جیسے یعقوب غرق شیون میں
جیسے سیتا کی جستجو بن میں

جیسے وادی میں دھیمی دھیمی پھوار
جیسے جو بر نہ آئی ہو وہ مراد
جیسے بچھڑے ہوؤں کی دل میں یاد
جیسے اشکوں کی لہر سینے میں

......تو ہمارے فلمی شاعر نے ان بے رس اور پھیکے سیٹھے مصرعوں کے مقابلے میں گیت لکھا تو جوش کی روح کے ہوش اڑ گئے اور فلمی نغموں کی مقبولیت کے سب ریکارڈ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئے......

ایک لڑکی کو دیکھا تو ایسا لگا/ جیسے کھلتا گلاب/ جیسے شاعر کا خواب/ جیسے اجلی کرن/ جیسے بن میں ہرن/ جیسے چاندنی رات/ جیسے نغمے کی بات/ جیسے مندر میں ہو......ایک جلتا دیا۔

آخری مصرعے میں لفظ 'ہو' کی معنویت ملاحظہ فرمائیں کہ 'ہو' کو آپ جتنا کھینچ کر پڑھتے ہیں۔ دیے کی لو اتنی ہی تیز ہوتی جاتی ہے۔

فلمی شعر میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں......؟

ملٹن نے لکھا ہے کہ شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو، جوش سے بھرا ہوا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو۔ اب ہم آپ کو ایک نہیں، دو اشعار سناتے ہیں......

میں بلاتا ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن آئے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

اور یہ بھی دیکھیے......

نہ سیر باغ، نہ ملنا، نہ میٹھی باتیں ہیں
یہ دن بہار کے اے جان! مفت جاتے ہیں

اب ہمارے فلمی شاعر نے کتنی سادگی سے ان دو اشعار اور ایسے نہ جانے کتنے اشعار کے موضوعات کو اپنے فلمی نغمے کے صرف مکھڑے میں سمیٹ دیا ہے۔ سنیے اور سر دھنیے......

اے کیا بولتی تو / اے کیا میں بولوں / سن / سنا / آتی کیا کھنڈالا / کیا کروں آ کے
میں کھنڈالا / ارے گھومیں گے پھریں گے ناچیں گے گائیں گے عیش کریں گے
اور کیا

اس دلکش مکھڑے کے آخری مصرعے میں 'اور کیا' کا ٹکڑا بہت ہی بلیغ ہے اور عاشق اپنے محبوب کو اشارہ کر رہا ہے کہ کھنڈالا جانے کے باوجود صرف عیش کرنا چاہتا ہے، عیاشی نہیں...... اور اس طرح شاعر نے نئی نسل کی بے راہ روی پر لگنے والے الزامات کا بڑی کامیابی سے دفاع کیا ہے۔ ایک اور مثال ملاحظہ فرمایئے......

نہیں مجھے جستجوئے منزل کہ خود ہے منزل مری طلب میں
کوئی تو مجھ کو بلا رہا ہے کسی طرف کو تو جا رہا ہوں

اس شعر کو پڑھ کو مطلق سمجھ نہیں آتا کہ شاعر کہاں جا رہا ہے۔ کون اسے بلا رہا ہے اور اس کی منزل کہاں ہے۔ لیکن فلمی شاعر کو دیکھیے۔ کتنی سادگی، جوش اور اصلیت کے ساتھ اپنی منزل کو چیلنج کر رہا ہے......

میں تو رستے سے جا رہا تھا / میں تو سیٹی بجا رہا تھا / میں تو بھیل پوری کھا رہا تھا / تجھ
کو مرچی لگی تو میں کیا کروں؟

فلمی شعرا کے ہاں ایسے بے شمار اشعار ہیں جن میں معمولی خیالات، سادگی اور صفائی کے ساتھ نرالے اسلوب میں بیان ہوئے ہیں کہ ان کا مقابلہ غالب کے اشعار بھی نہیں کر سکتے۔ اب مرزا غالب کے اسی شعر کو لیجیے......

وہ بادۂ شبانہ کی اب سرمستیاں کہاں
اٹھیے، بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

اس شعر کو سمجھنے کے لیے غالب کے متعدد شارحین سے الجھنا پڑتا ہے، مگر دیکھیے، ہمارے فلمی شاعر نے اس شعر کی کتنی آسان تشریح اپنے اس گیت میں کر دی ہے......

رات کا نشہ ابھی آنکھ سے گیا نہیں / تیرا نشیلا بدن باہوں نے چھوڑا نہیں / آنکھیں تو
کھولیں مگر سپنا وہ توڑا نہیں / ہاں وہی سانسوں پر رکھا ہوا / تیرے ہونٹوں کا سپنا
ابھی ہے وہی

نیچرل شاعری......

نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً اور معناً دونوں حیثیتوں سے نیچرل یعنی بدنصیب شاعر کی فطرت یا عادت یا حیثیت کے مطابق ہو۔ مومن کا شعر ہے......

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

بقول حالی، یہ بھی نیچرل شعر سمجھا جائے گا کیونکہ جس سے تعلق خاطر بڑھ جاتا ہے یا بڑھا لیا جاتا ہے۔ اس کا تصور تنہائی میں ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے۔ جب تک کہ کوئی اور اس تنہائی کو دور کرنے کے لیے جھم سے نہ چلا آئے۔ ہمارا اس شعر پر اعتراض یہ ہے کہ جب شاعر اور محبوب دونوں موجود ہیں اور تیسرا کوئی نہیں ہے تو نیچرل شعر یوں ہونا چاہیے......

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی تیسرا نہیں ہوتا

یہ شعر سہل ممتنع کی بھی ایک اچھی مثال ہے۔ اس لیے کہ سہل ممتنع کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اگر شعر کو نثر میں تبدیل کیا جائے تو لفظوں کی ترتیب میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو۔ ہمارے فلمی شاعر سہل ممتنع اور نیچرل شاعری دونوں میں بے مثال مہارت رکھتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے......

کسی ڈسکو میں جائیں/کسی ہوٹل میں کھائیں/کہیں گھوم کے آئیں/ چلو عشق لڑائیں صنم، چلو عشق لڑائیں صنم......

اب ہم اس شیطان کی آنت مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ یہ خیال کرنا فضول ہے کہ جو کچھ اس میں لکھا گیا ہے وہ سب واجب التسلیم ہے۔ اس خیال سے کہ ہمارے ہم وطن فلمی شاعر ابھی اعتراض سننے کے عادی نہیں ہیں، بلکہ تنقید کو تنقیص سمجھتے ہیں۔ اس مضمون میں کسی خاص فلمی شاعر کے کلام پر کوئی گرفت یا اعتراض نہیں کیا گیا ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ شاعری کے اصول سے ناواقف ہے یا اس نے کوئی گریمر یا عروض کی غلطی کی ہے۔ یوں بھی فلمی شاعری کی کوئی گریمر نہیں ہوتی ہے۔ اسی لیے یہ اسکولوں میں پڑھائی نہیں جاتی اور فلمی شاعر کبھی اسکول کا رخ نہیں کرتے۔ با ایں ہمہ اگر بشری تقاضے کے سبب کوئی ایسی بات لکھی گئی ہو جو ہمارے کسی ہم وطن فلمی شاعر کو

ناگوار گزرے تو ہم نہایت عاجزی اور ادب سے معافی کے خواستگار ہیں کیونکہ ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں اس مضمون کی پاداش میں ہمارا اپنا ہی کوئی رفیق فلمی گیت کار طیش میں آکر ہمیں مولانا حالی کے پاس ہی نہ بھیج دے۔ ویسے ہمیں قبل از وقت مولانا حالی کے پاس جانے پر بھی اعتراض نہیں لیکن ذرا اس بات کا ہے کہ ہمارے ہم وطن فلمی شاعر کو اس کارنامے کے عوض جلاوطنی اختیار کر کے لندن میں گوشہ عافیت و ندامت تلاش کرنا ہوگا۔ ہم اپنے تمام ہم وطن فلمی شعرا کو یقین دلاتے ہیں کہ اس مضمون کو صفحہ قرطاس کی زینت بناتے وقت ہمارا مقصد وہی تھا جو ایک بہت بڑے فلمی شاعر نے یوں نظم کیا ہے.....

اک پل کا ہے جینا/ پھر تو ہے جانا/تحفہ کیا لے کے جایئے/دل یہ بتاتا/ خالی ہاتھ
آئے تھے ہم/خالی ہاتھ جائیں گے/بس پیار کے دو میٹھے بول جھلملائیں گے/تو
ہنس کیونکہ دنیا کو ہے ہنسانا/اے میرے دل تو گائے جا/اے آ اے آ، او آ اے آ۔

(محمد خالد اختر)

رفتارِ ادب

(تبصرے کے لیے چار جلدوں کا بھیجنا ضروری ہے۔ دو مدیر اور تبصرہ نگار کے لیے اور دو ان کے احباب میں تقسیم کرنے کے لیے۔ تبصرے کے بعد مدیر اور تبصرہ نگار کی جلدوں کو مکتبہ کی طرف سے آدھی قیمت پر فروخت کیا جاتا ہے۔ چار سے کم جلدیں بھیجنے پر تبصرہ نہیں کیا جائے گا۔ ادارہ کے قواعد کے مطابق جلدیں واپس نہیں ہوں گی)

نام کتاب —— اندھے بٹیرے و دیگر پرندے
مصنفہ —— بہادر علی فلکی
ناشر —— حاجی رب نواز اینڈ سنز۔ سوداگران کتب جونا مارکیٹ، کراچی
صفحات —— 225 (پچاس صفحے کا دیباچہ اور پچیس صفحے کے اشتہارات اس میں شامل ہیں)
قیمت —— پانچ روپے فی جلد (عام خریداروں سے) ایک روپیہ آٹھ آنے (تاجران کتب سے)

"اندھے بٹیرے و دیگر پرندے" اردو زبان میں اپنے اچھوتے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ فلکی صاحب تو بہ ٹیک سنگھ کے مشہور بٹیر بازوں اور شکاریوں میں سے ہیں اور ادب میں نئے

نئے جلوہ نما ہوئے ہیں۔ ہم اسے ادب کے لیے نیک فال سمجھتے ہیں اور وفورِ مسرت سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فلکی صاحب قلم کے بھی اتنے دھنی ثابت ہوئے ہیں، جتنے جال اور غلیل کے۔ ان کے قلم نے رنگینی بیان میں کھل کر طرارے بھرے ہیں۔

فلکی صاحب نے کتاب کے شروع کی تقریظ میں اپنے بچپن اور جوانی کے سیر حاصل حالاتِ زندگی لکھ دیے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طائرنوازی اور صیادی ان کی گھٹی میں ودیعت ہوئی تھی۔ ان کے والد ملتان کے نامی کبوتر بازوں میں سے تھے۔ فلکی صاحب لکھتے ہیں کہ بچپن ہی سے مجھے بٹیر بازی، کبوتر بازی اور تیتروں کی لڑائی کا خبط تھا۔ میرے والد مجھے اس سے منع کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ بیٹا تم میری دیکھا دیکھی کیوں عاقبت خراب کرتے ہو۔ آج کل اسے معزز پیشہ نہیں سمجھا جاتا۔ فلکی صاحب بھلا خاندانی پیشے کو کیسے چھوڑ دیتے۔ ایک دو بار والد نے انھیں پیٹا بھی لیکن اس کا ان پر الٹا اثر ہوا۔ ایک دن کبوتر اڑاتے کوٹھے سے نیچے آ گرے۔ اور ٹانگ ٹوٹ گئی۔ دو مہینے ہسپتال میں رہے۔

بعض باتیں فلکی صاحب نے کتاب میں ایسی لکھ دی ہیں۔ جن کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ مثلاً وہ اقرار کرتے ہیں کہ وہ ایک مدت تک یاروں کے کبوتر چرا چرا کر اپنا کابک بھرتے رہے۔ آخر پکڑے گئے اور یار لوگوں نے ان کی مرمت کی اور ان سے حلف نامہ لکھوایا کہ پھر ایسا نہیں کروں گا۔ ایک دفعہ یہ گوشت کی مارکیٹ سے بٹیروں کا ایک ٹوکرا دوکاندار کی نظر بچا کر اٹھا لائے۔ ہماری نظر میں ایسی باتیں لکھنا ان کے لیے واجب نہ تھا۔ ایسی صاف گوئی سے خام طبع طائرنواز غیر صحت مند اثر قبول کریں گے۔ فلکی صاحب کو چاہیے کہ اگلے ایڈیشن میں سے یہ قابل اعتراض حصے حذف کر دیں۔ ایک نقص اور بھی کھٹکتا ہے۔ فلکی صاحب پرندوں کے متعلق ذکر کرتے کرتے یہ سمجھنے لگے ہیں کہ گویا وہ خود بھی پرندہ ہیں اور ان کے ساتھ پرواز کر رہے ہیں۔ اس سے مضمون کی سنجیدگی پر حرف آتا ہے۔

نام کتاب، اندھے بٹیرے، کی موزونیت کا جواز پیش کرتے ہوئے فلکی صاحب نے رائے ظاہر کی ہے کہ بٹیرے جب پکڑے جاتے ہیں تو دانے کے لالچ میں اندھے ہو جاتے ہیں اور ان کو پس و پیش بھائی نہیں دیتا۔ فلکی صاحب یہ کہتے ہیں کہ تو ایسا ہی ہوگا۔ ہمارا علم اس میدان میں

صفر ہے۔ بہر حال نام کے موزوں ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ ادبی جمود کے اس دور میں یہ جدت قابل ستائش ہے اور فرح بخش بھی۔

دوسرے پرندے جو اس نادر کتاب میں فلکی صاحب کے ہمراہ کلکاریاں بھرتے ہیں کبوتر، مینا، کوا، چیل اور بلبل ہیں۔ تقے کبوتر، ملنگ کبوتر اور قلندر کبوتر پر الگ الگ باب ہیں۔ جن میں کام کی باتیں ہیں اور کبوتروں کی نجی زندگی کی حیرت خیز جھلکیاں فلکی صاحب نے نہایت خوش اسلوبی سے بیان کی ہیں اور کمال یہ ہے کہ ایسا کرتے ہوئے انھوں نے عریانی سے دامن بچالیا ہے اور کہیں بھی قانون کی زد میں نہیں آتے۔ چیل کے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ بات کہ چیل دھوپ میں انڈہ چھوڑ دیتی ہے غلط ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ چلچلاتی دھوپ میں کئی کئی گھنٹے اس امر کی تحقیق اور مشاہدے کی خاطر سرگرداں پھرے ہیں لیکن ایک بار بھی کسی چیل کو انڈا چھوڑتے نہیں دیکھا۔ ہمیں ان سے اختلاف ہے دیکھا تو ہم نے بھی نہیں مگر محاورہ غلط نہیں ہوسکتا۔ بہر حال اس موضوع پر دلچسپ بحث ہوسکتی ہے جس کے لیے اس پرچے کے صفحات ہمیشہ حاضر ہیں۔

عبارت سلیس اور عام فہم ہے کیونکہ فلکی صاحب نے آٹھویں کے بعد ہی اسکول کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ کتابت کی غلطیاں البتہ جا بجا ہیں۔ کاتب اچھا نہیں ملا اور فلکی صاحب خود دیگر مصروفیتوں کی وجہ سے نظر ثانی نہیں کر سکے۔ پہلے ہی صفحے پر فلکی صاحب کا نام فلکی کے بجائے نکلی پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح کاتب نے ہر جگہ چیل کو چپل لکھا ہے۔ دو تین مقام پر بلبل کلکل ہو گیا ہے ممکن ہے کاتب اندھا ہو۔

ہم فلکی صاحب کو ان لغزشوں سے بری الذمہ قرار دیتے ہیں۔

کتاب کے شروع میں فلکی صاحب کے ایک دوست کا دیباچہ بھی شامل ہے یہ صاحب طائر نواز کا لقب استعمال کرتے ہیں اور جلد ساز ہیں چنانچہ اس کتاب کی جلد بھی انھی نے باندھی ہے۔ جلد مضبوط ہے۔ سہ رنگے سرورق پر ایک بلبل کی تصویر ہے۔ جو چیل سے زیادہ مشابہ ہے۔ کسی جدید آرٹسٹ کا اعجاز ہے۔ مجموعی طور پر کتاب خوب ہے ہمارے احباب نے بھی اسے پسند کیا ہے۔ ناشران سے گزارش ہے کہ ہو سکے تو دو جلدیں اور بھجوادیں۔

کیونکہ مکتبہ کے لیے اب کوئی جلد اس کتاب کی ہمارے پاس موجود نہیں۔

تسخیر جنات

حصہ اول و دوم

بمعہ تصویر مصنف و جنات

مصنفہ —— خاکپائے اولیا فقیر جلال شاہ صاحب

ناشر —— جناب پبلیکیشنز

صفحات —— دوسو

ہدیہ —— دو روپے (عام خریداروں سے) تین روپے (اشراف وامرا سے)

متذکرہ بالا کتاب اردو ادب میں اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف ہے اور ہمیں امید ہے کہ یہ ہمارے روحانی اور جناتی ادب میں ایک بڑے خلا کو بطریق احسن پورا کرے گی۔ اہل ذوق اور جنات کے ستائے ہوئے تیرہ بختوں کے لواحقین ایک مدت سے ایسی ہی کتاب کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ ہم نے ماہنامہ ''چمگادڑ'' میں ایسے حضرات کے متعدد خطوط بھی شائع کیے ہیں جن میں انھوں نے ہم سے یہ درخواست کی تھی کہ جنات کے رام کرنے کی کوئی معیاری کتاب ہماری نگاہ میں ہو تو انھیں مطلع کریں ہم عدیم الفرصتی کی وجہ سے ان خطوط کا جواب نہ دے سکے۔ سچ یہ ہے کہ کوئی معیاری تصنیف اس موضوع پر ہماری نظر میں بھی نہ تھی۔ حالانکہ ''چمگادڑ'' کے

ڈیکلریشن داخل کرنے کے وقت ہی سے ہم خود ایسی کتاب کی تلاش میں تھے۔ قارئین کے خطوط میں سے ایک خط ایک جن کا بھی تھا۔ اس نے اپنا پتہ نہیں لکھا تھا۔ بعض باتیں جو اس نے ہمارے متعلق لکھی تھیں، غالباً غلط فہمی کی بنا پر تھیں ورنہ ہمیں اہل جنات سے کسی قسم کی ذاتی پرخاش نہیں۔

عرصہ ہوا کہ درگاہ بک ڈپو کی مطبوعہ ایک کتاب جنات کے پوشیدہ اور پراسرار حالات پر ایک کرم فرما کے پاس دیکھی تھی، لیکن وہ تصنیف کچھ اس لحاظ سے ادھوری اور تشنہ تھی کہ کئی ایک مشہور جنوں کے نام اور سوانح عمریاں تک اس میں درج نہ تھیں۔ اس کے علاوہ اس میں خامی یہ تھی کہ جنات کی تسخیر کے جو طریقے اور نسخے بتائے گئے تھے وہ بے حد مشکل اور پرانے تھے۔ مصنف یا خود جنات ہی ان پر عمل کر سکتے تھے وہ کسی انسان کے بس کا روگ نہیں تھے۔ جلال شاہ صاحب کی تصنیف جامع تو نہیں کہی جا سکتی پھر بھی بڑی حد تک ان خامیوں سے مبرا ہے۔ اس میں تقریباً سب اہم جنات کی مکمل سوانح عمریاں موجود ہیں اور کتاب کے اخیر میں اشاریہ بھی ہے جس سے فوراً پتہ چل سکتا ہے کہ کس جن کے حالات یا ذکر کتاب کے کس صفحے پر ہے البتہ جنات کے نام پہلے معلوم ہونا ضروری ہیں۔ سب سے بڑی خوبی کتاب کی یہ ہے کہ جنات کی تسخیر کے طریقے سہل ماڈرن اور سائنٹیفک ہیں۔ مصنف کا طرز نگارش بھی کھلتا ہوا ہے۔ ان کا اصلی نام بتانے کی ہمیں اجازت نہیں، لیکن وہ اردو کے ایک مشہور و معروف تنقید نگار ہیں۔ ادبی جمود کے بعد تنقید نگاروں کے لیے کوئی کام نہیں رہا۔ اس لیے وہ ادب کی دوسری اصناف کی طرف توجہ دے رہے ہیں۔ یہ اردو کے لیے نیک فال ہے۔

شاہ صاحب کو جنات اور بھوت پریت کا خاصا علم ہے جو ہماری رائے میں معدودے چند اردو دان ادبا کو ہی نصیب ہوگا۔ چنانچہ صفحہ چہتر پر خود رقم طراز ہیں "جنات کا بادشاہ ڈخداب والد صاحب قبلہ سے درس لینے آیا کرتا تھا اور ان سے بیعت تھا۔ اس فقیر کا بھی دخواہ اور دوست ہے"۔

ان کے جنات کو تسخیر کرنے کے نسخے خود ان کے اپنے آزمودہ ہیں۔ شاہ صاحب کے سہل اور تیر بہدف نسخوں کو پرانے مشکل اور ناقابل عمل نسخوں سے وہی نسبت ہے جو غالباً ہومیو پیتھی کو ایلو پیتھی سے ہے، گویا وہ جناتی امراض کے ہومیو پیتھ ہیں جو ایک چار آنے کی خوراک سے برسوں کی بیماری کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر صفحہ اڑتالیس پر ہری سنگھ جن کو دور کرنے کا نسخہ یوں لکھا ہے "سولا ہٹ سر پر رکھو اور مصلے پر بیٹھ کر چار سگریٹ (بگلے کے یا کسی اور بڑھیا

برانڈ کے ہوں تو بہتر ہے) بیک وقت منہ میں لے کر سلگاؤ۔ دھوئیں کو نتھنوں کی راہ سے چھوڑو۔ انشاءاللہ ہری سنگھ نتھنوں سے دھوئیں میں تحلیل ہو کر خارج ہو جائے گا۔ میرا اپنا آزمودہ ہے"۔

اس سہل نسخے کے برعکس ہری سنگھ جن کو دور کرنے کا جو نسخہ پرانے عاملوں اور حکمائے روحانی کی بیاضوں میں درج ہے اس میں باقی ریاضتیں اور ورزشیں تو ایک طرف صرف بیس روز کا چلہ (بکری کے دودھ پر) ہی خود عمل کرنے والے کو جن بنانے کے لیے کافی ہے۔

اس نسخے سے کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو جانا چاہیے۔ شاہ صاحب کے نزدیک کئی انسانی امراض کا سبب جنات ہیں۔ دق کی بیماری کا ذمہ دار انھوں نے جن ہوچا موچی کو بتایا ہے ایسا ہی ہوگا۔ ہم نے تو ہوچا موچی کا نام بھی پہلے نہ سنا تھا۔ اسی طرح انھوں نے ہماری کئی معاشی خرابیوں کو بھی جنات سے منسوب کیا ہے اور فرمایا ہے کہ رشوت خوری، ذخیرہ اندوزی، خودنمائی، غزل گوئی، یہ سب امراض جنات کی پیدا کردہ ہیں۔

انھوں نے ایک دوست کا ذکر کیا ہے جو پہلے بھلا چنگا تھا۔ یک لخت غزل گوئی کرنے لگ گیا۔ پانچ پانچ غزلیں روزانہ نظم معرا میں لکھتا تھا اور انھیں ڈاک میں بھیج کر ٹھنڈی آہیں بھرتا تھا۔ شاہ صاحب تاڑ گئے کہ اس پر سلطانہ نامی کوئی جن سوار ہے اس شخص کے والدین سخت پریشان تھے۔ شاہ صاحب نے اس کا علاج کیا اور کیہر 'سلطانہ' جن کو نکالا۔ آج کل بقول مصنف وہ شخص بالکل صحت یاب ہے اور برسر روزگار ہے۔ ''سلطانہ'' کے جانے کے بعد اس نے معرا چھوڑ مقفے غزل تک نہیں لکھی۔ حقیقتاً شاہ صاحب نے یہ کتاب لکھ کر جنات کی ریشہ دوانیوں اور فتنہ پردازیوں کو بے نقاب کر کے ملک وقوم کی ایک خدمت سرانجام دی ہے۔ ادارہ ''چمگادڑ'' نے اس تصنیف گراں پایہ کو اول درجے کا انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے چنانچہ اس ماہ سے 'چمگادڑ'، جلال شاہ صاحب کے نام ایک سال کے لیے بالکل مفت جاری کر دیا گیا ہے۔

کتاب صوری و معنوی محاسن سے بھی آراستہ ہے۔ اندر جنات کی دس تصاویر اور خاکے شامل ہیں۔ مصنف کی اپنی تصویر بھی تصاویر میں آ گئی ہے جس سے بعض اصحاب کو غلط فہمی ہو جانے کا احتمال ہے۔ حرج تو کوئی نہیں، لیکن ان کی تصویر کتاب کے شروع میں ہوتی تو زیادہ موزوں تھا۔ گردپوش پر ہری سنگھ کی سہ رنگی تصویر ہے۔ حالانکہ نام نیچے مصنف کا لکھا ہے۔

ہمیں مجلد ایڈیشن کی دس جلدیں برائے تبصرہ موصول ہوئی ہیں۔ دوسرے ناشرین کو بھی چاہیے کہ اس معاملے میں خست سے کام نہ لیا کریں۔

یہ کتاب مصنف سے پوری قیمت پر یا مکتبہ چگاوڑ سے نصف قیمت پر حاصل کی جا سکتی ہے۔

مندرجہ ذیل موصول شدہ کتب پر تبصرہ آئندہ کے 'چگاوڑ' میں ہوگا۔

1۔ درد نامہ یک جرس کارواں (طویل ترین تمثیلی نظموں کا مجموعہ) از حضرت ادریس الکلامی۔

2۔ نورالدین پاشا عرف ترکی حرم کے راز، اسلامی تاریخی ناول۔ از تمکین خلد آبادی۔

3۔ آسمانی سفرنامہ از مولانا عبدالقدیر فانوس

4۔ تفہیم التنقید (بہت ٹھوس تنقیدی مقالے) از پروفیسر ڈاکٹر کرم الٰہی نقاد۔

نوٹ:۔۔۔ مقالات حالی پر تبصرہ نہیں کیا جائے گا۔ ناشرین نے ہمیں صرف تین جلدیں کتاب کی بھیجی ہیں۔

(ظفر کمالی)

فلیپ نگاری

"یوں تو بے سرے پن یہاں تک کہ پھٹی ہوئی آواز کی بھی اہمیت ہے لیکن ظفر کمالی کی شاعری میں خوش آہنگی ہے۔ ان کے یہاں لفظوں کی ترتیب و نشست کا نظام ایسا ہے جس کے ذریعے اترتے چڑھتے جذبات کو خوبصورت آہنگ عطا کرنے میں مدد ملی ہے۔ یہ چیز مجموعی نظم کی موسیقانہ ساخت کے لیے بے حد ضروری ہے۔ ظفر کمالی نے اپنی ظریفانہ نظموں میں اس کا خیال رکھتے ہوئے انھیں وزن و وقار عطا کیا ہے۔ وہ اپنے ظریفانہ مذاق کو ایک اکائی کی شکل میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور بالآخر ایک نظریۂ حیات تک پہنچنا جانتے ہیں۔ انھیں لطف اندوزی اور مذاق کو فلسفہ میں تبدیل کرنے کا ہنر معلوم ہے۔ اس سے ان کا فن زیادہ گہرا، زیادہ وسیع اور زیادہ ترقی یافتہ ہو گیا ہے۔ ذکاوت و ہوش مندی، فہم و فراست اور اس جیسی دیگر صفات ایک ساتھ شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ظفر کمالی کے یہاں ان کی یکجائی حیرت زدہ کرنے والی ہے شاعری کی اگر کوئی چوتھی آواز ہو سکتی ہے تو اس کی سب سے روشن مثال ظفر کمالی کی شاعری ہوگی"۔

(ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ)

''ہم نے بوطیقا میں کامیڈی کو بری سیرتوں کی نقل قرار دیا تھا۔ جس کا موضوع مضحکہ خیز برائیاں ہوتی ہیں جو تکلیف دہ ہوتی ہیں اور نہ تباہ کن جب کہ ٹریجڈی ہماری نظر میں ایسے عمل کی نقل تھی جو اہم اور مکمل ہو، جو مزین زبان میں لکھی گئی ہو اور جس سے حظ حاصل ہوتا ہو۔ ان خیالات کی بنیاد یونانی ڈرامے تھے۔ ظفر کمالی کی نظمیں ہماری نظر سے گزریں تو ہم تذبذب میں پڑ گئے۔ یہ نظمیں مزین زبان میں لکھی گئی ہیں اور ہر اعتبار سے مکمل ہیں۔ یہ ایسی کامیڈی ہیں جن کی سرحدیں ٹریجڈی سے مل جاتی ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی بنیاد ہی ٹریجڈی پر رکھی گئی ہے دیواروں کی تعمیر بھی اسی مناسبت سے ہے صرف پلاسٹر کامیڈی کا ہے۔ ان کے تبسم میں آنسوؤں کی آمیزش صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہ چیز معاشرے کے تئیں ان کی دردمندی کی علامت ہے۔ ظفر کمالی کی نظموں میں زبان کی صفائی ہے۔ انھوں نے عامیانہ محاروں کو بھی ایک خاص اسلوب میں بیان کیا ہے۔ ان کی نظموں میں انوکھا پن بھی ہے جس سے طرز بیان میں رفعت پیدا ہوگئی ہے۔ ان نظموں کی روشنی میں اپنے خیالات سے رجوع کرتے ہوئے ہم کامیڈی کی اہمیت پر ایمان لاتے ہیں۔ اور ظفر کمالی کو اہم ظریف شاعر تسلیم کرتے ہیں''۔

(ارسطو)

''میں نے اپنی ریاست میں نوجوانوں کے صحت مند جسم کے لیے ورزش اور روح اور دماغ کے لیے موسیقی کی تعلیم ضروری قرار دی تھی۔ چونکہ شاعری میں انسان کے متعلق انتہائی غلط بیانی سے کام لیا جاتا ہے، یہ خالی لذت بخشنے کے علاوہ انسانی زندگی کے لیے قطعی غیر مفید بھی ہے اور اس کی تعلیم سے نوجوانوں کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا لہٰذا اس فن کو تعلیم گاہوں سے اور شاعروں کو اپنی ریاست سے خارج کیا تھا لیکن ظفر کمالی کی شاعری کے مطالعے نے مجھے اپنے افکار پر نظر ثانی کے لیے مجبور کردیا۔ ظفر کی ظریفانہ شاعری میں غلط بیانی کا عنصر نہیں بلکہ اس میں ادب و سیاست اور معاشرے کی سفاک حقیقتوں کا بیان نہایت ہنرمندی کے ساتھ مزاح کے پردے میں کیا گیا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ انسان کو بہت ہنسنے کا عادی نہیں ہونا چاہیے کیونکہ زور سے قہقہہ لگانے کے بعد تقریباً ہمیشہ ردعمل کے طور پر ایک پژمردگی سی طاری ہوجاتی ہے۔ یہ بات قابل تعریف ہے کہ ظفر کمالی کی ظرافت تبسم زیرلب کی دعوت تو دیتی ہے لیکن ان کے یہاں کھوکھلے قہقہوں کا گزر نہیں۔ ان کے مزاح کا ردعمل پژمردگی کا نہیں اس سے روحانی بشاشت اور ادبی انبساط میں اضافہ ہوتا

ہے۔ ان کی نظموں کے مطالعے سے ہمارے نوجوانوں کے ساتھ ساتھ بزرگوں کا بھی بھلا ہوگا۔ اس خصوصیات کی بنا پر میں انھیں اپنی مثالی ریاست میں مستقل قیام کی اجازت دیتا ہوں"۔

(افلاطون)

ماخذ

1۔ جعفر زٹلی، زٹل نامہ (کلیاتِ جعفر زٹلی)، مرتب: رشید حسن خاں، انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی، 2003، ص ص۔ 54--53، 108

2۔ شاہ حاتم، 'نسخہ حکیم'، تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر جمیل جالبی، جلد دوم حصہ اول، طبع پنجم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 1993، ص ص۔ 449--447

3۔ ملا رموزی، 'لندن کا عنابی دربار'، نقوش طنز و مزاح نمبر، ادارہ فروغ اردو لاہور، مرتبہ محمد طفیل، جنوری، فروری، 1959، ص ص۔ 569--567

4۔ پطرس بخاری، 'اردو کی آخری کتاب'، پطرس کے مضامین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2006، ص ص۔ 44--33

5۔ ـــــ 'لاہور کا جغرافیہ'، پطرس کے مضامین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2006، ص ص۔ 103--96

6۔ شوکت تھانوی، 'بار خاطر'، انتخاب شوکت تھانوی، مرتبہ، وجاہت علی سندیلوی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1984، ص ص۔ 298--303

7۔ سند باد جہازی، 'جدید جغرافیہ پنجاب'، نقوش طنز و مزاح نمبر، ادارہ فروغ اردو لاہور، مرتبہ محمد طفیل، جنوری، فروری، 1959، ص ص۔ 390--399

8۔ خضر تمیمی، 'استاد بولے خاں گلزار کا حال'، نقوش طنز و مزاح نمبر، ادارہ فروغ اردو لاہور، مرتبہ محمد طفیل، جنوری، فروری، 1959، ص ص۔ 418--421

9۔ کنھیا لال کپور، 'غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'، اردو طنز و مزاح، احتساب و انتخاب، ابن اسمٰعیل، گلشن پبلیشرز سری نگر، 1988، ص ص۔ 298--303

10۔ ـــــ 'سلیم اور انارکلی'،

11۔ ـــــ ' میر کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ'، شیشہ و تیشہ، مکتبہ جدید لاہور، 1961، ص ص۔ 147--155

12۔ ـــــ 'کمہار کھاتر'، بال و پر، لاجپت رائے اینڈ سنز اردو بازار دہلی، 1971، ص ص۔ 144--146

13۔ فرقت کاکوروی، 'غالب کے خطوط'، غالب خستہ کے بغیر، مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی، 1970، ص ص۔ 92--113

14۔ فکر تونسوی، 'آسمانی کتاب'، ساتواں شاستر، مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی، 1950، ص ص 86–67

15۔ یوسف ناظم، 'انگریز ہندوستان میں'، شگوفہ پیروڈی نمبر، مدیر، فضل جاوید، ستمبر/1976، ص ص۔ 79–65

16۔ شفیق الرحمٰن، '(ڈاکٹر) ترک نادری'، شگوفہ پیروڈی نمبر، مدیر، فضل جاوید، ستمبر/1976، ص ص۔ 52–31

17۔ ـــــ 'سفرنامہ جہاز بادشاہی کا'، اردو طنز و مزاح، احتساب و انتخاب، ابن اسماعیل، گلشن پبلیشرز، سری نگر، 1988، ص ص۔ 288–254

18۔ ابن انشا، 'اردو کی آخری کتاب'، کتاب والا، 2794، گلی جھوٹ دائی، پہاڑی بھوجلہ، دہلی، 2002

19۔ ظفر الفرقان، 'آپ و قات'، ماہنامہ نکہت، الٰہ آباد

20۔ احمد جمال پاشا، 'آموختہ خوانی میری'، ماعربلہ شہر، پنچ پبلیشرز، امین آباد، لکھنؤ، ص ص۔ 145–137

21۔ ـــــ 'کچھ ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'، اسکالر پیروڈی نمبر، سر سید ہال، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1957

22۔ ـــــ 'مشن بنگال کا جادو'، ماہنامہ کتاب، لکھنؤ، اکتوبر/1985، کراچی

23۔ حسن مثنیٰ انور، 'اطلاع مزید شکایہ درخواست مراعات'، اسکالر پیروڈی نمبر، سر سید ہال، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1957

24۔ مشفق خواجہ، 'رسالہ در معرفت ابن انشا'، تخلیقی ادب، مدیر، مشفق خواجہ، شمارہ ۵، اکتوبر/1985، کراچی

25۔ مجتبیٰ حسین، 'قصہ پہلے گریجویٹ درویش کا'، شگوفہ پیروڈی نمبر، مدیر، فضل جاوید، ستمبر/1976، ص ص۔ 92–86

26۔ تخلص بھوپالی، 'غالب کا غیر مطبوعہ خط'، شگوفہ تخلص بھوپالی نمبر، شمارہ 11، جلد 10، مدیر، مصطفیٰ کمال، نومبر/1977

27۔ فاروق نشتر، 'ایک مقتدر ابوالکلام کا کھلا خط'، شگوفہ، شمارہ 2، جلد 21، فروری/1989

28۔ محمد منظر اختر، 'تبصرہ نگاری'، کچھ اپنا اپنا افق، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، 2000، ص ص۔ 97–89

29۔ عباس احمد نفیسی، 'مقدمہ رشید کی شعر و شاعری'، تخلیق کار پبلیشرز، دہلی، 2008، ص ص۔ 22–12

30۔ ظفر کمالی، 'تعلیب نگاری'، ظرافت نامہ، شمشاد علی فاؤنڈیشن، 2005، کتاب کے فلیپ سے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

مکتوبات اُردو کا ادبی و تاریخی ارتقا

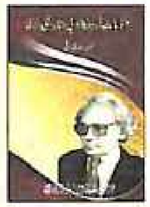

مصنف: خواجہ احمد فاروقی

صفحات: 718

قیمت :-/193 روپے

ڈیوڈ کاپر فیلڈ (جلد دوم)

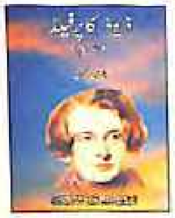

مترجم : فضلِ حسنین

صفحات: 626

قیمت :-/170 روپے

کلیاتِ سرور جہاں آبادی

مرتب : کلدیپ گوہر

صفحات: 410

قیمت :-/108 روپے

حسن نعیم اور نئی غزل (تجزیہ و تنقید)

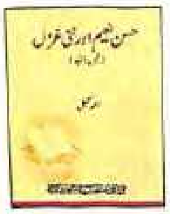

مصنف: احمد کفیل

صفحات: 284

قیمت :-/104 روپے

تاریخ نثر اردو (نمونہ منثورات)

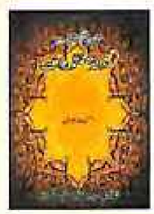

مصنف: احسن مارہروی

صفحات: 496

قیمت :-/130 روپے

یک بابی اردو ڈرامے (انتخاب)

ترتیب و انتخاب: زبیر رضوی

صفحات: 494

قیمت :-/325 روپے

₹ 133/-

ISBN: 978-81-7587-927-0

9 788175 879270

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025